بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

اگست 2018

سالگرہ نمبر

BOOKSPK
Books & Magazines

BOOKSPK
Books & Magazines

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — اذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

BOOKSPK
Books & Magazines

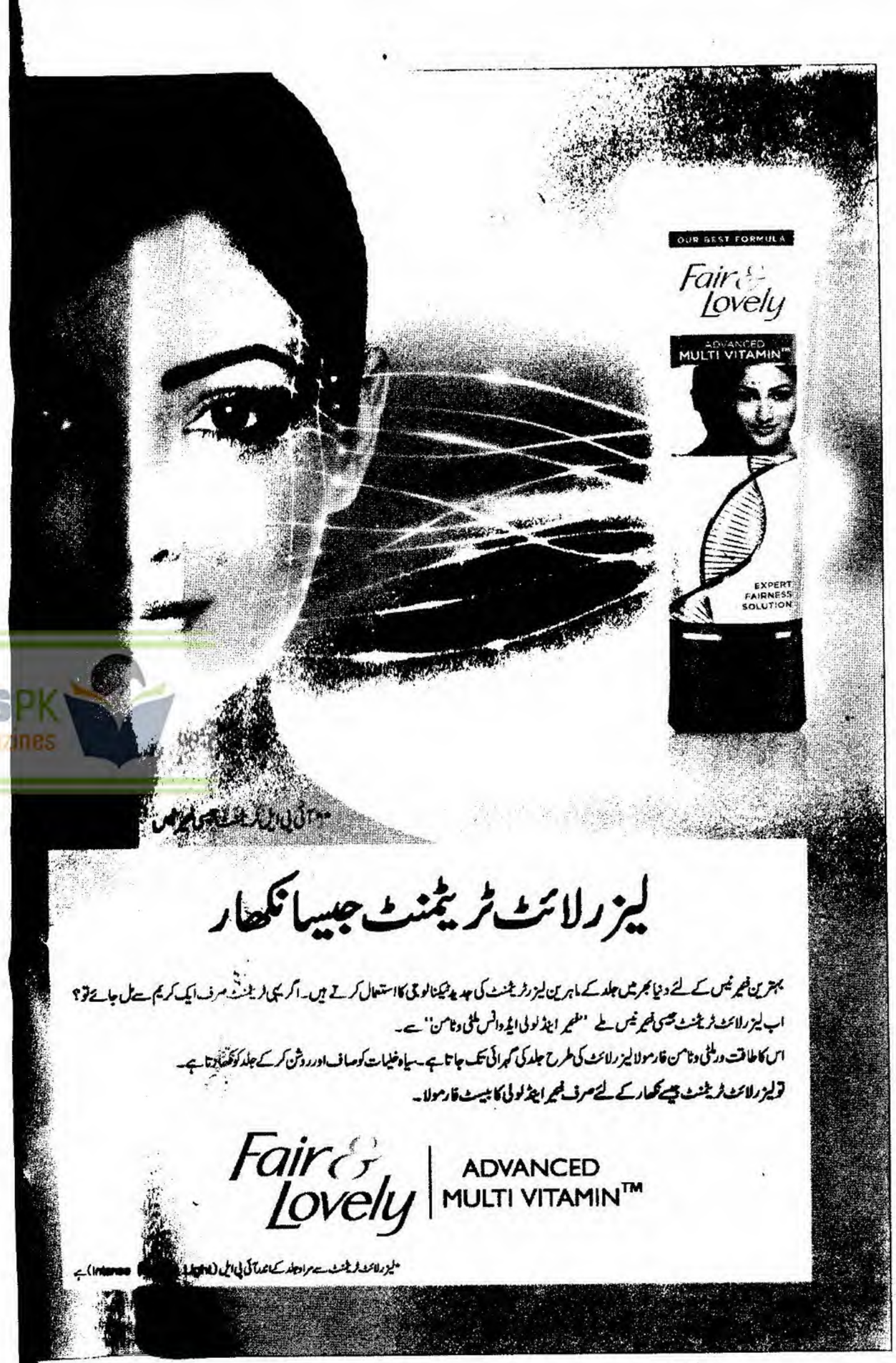
OUR BEST FORMULA
Fair & Lovely
ADVANCED MULTI VITAMIN™
EXPERT FAIRNESS SOLUTION
لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار
بہترین فیئر نیس کے لئے دنیا بھر میں جلد کے ماہرین لیزر ٹریٹمنٹ کی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسی فیئر نیس ملے "فیئر اینڈ لولی ایڈوانس ملٹی وٹامن" سے۔
اس کا طاقت ور ملٹی وٹامن فارمولا لیزر لائٹ کی طرح جلد کی گہرائی تک جاتا ہے۔ سیاہ خلیات کو صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔
تو لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسے نکھار کے لئے صرف فیئر اینڈ لولی کا بیسٹ فارمولا۔
Fair & Lovely | ADVANCED MULTI VITAMIN™

پہلی شعاع، حمد، نعت، نبیؐ کی باتیں — رضیہ جمیل 10 — تنویر پھول 11 — اعجاز رحمانی 11 — ادارہ 12

انٹرویو

روشن لمحوں کا سفر — ادارہ 17
بندھن — رابعہ اکرم 26
دستک — شاہین رشید 31
جب تجھ سے ناتا — م۔الف 270

ناول

شہرزاد، خوابشیشے کا — صائمہ اکرم 36 — عفت سحر طاہر 242

مکمل ناول

راہ نور — سمیرا حمید 192
بن پاکھی — فرح بخاری 146
سب اچھا ہے — انیشن نعیم 66

نادلٹ

ہے سر اٹھا کے جینا — ام ایمان قاضی 110

افسانے

قصہ ایک دوپہر کا — فاخرہ جبیں 259
وسائی — سدرۃ المنتہیٰ 134
سبق — توبیہ عمران 61
زید اور — عاصمہ فرحین 53
دو قدم جنت — عندلیب زہرا 105

نظمیں غزلیں

غزل — عظمیٰ جون 265
نظم — پروین قنا سید 265

مستقل سلسلے

خط آپ کے — رضیہ جمیل 276
مسکراہٹیں — ادارہ 266
آئینہ خانے میں — واصفہ سہیل 282
بالوں سے خوشبو آئے — شگفتہ جاہ 268
تاریخ کے جھروکے — امت الصبور 284
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی 287
خوبصورت بنئے — ادارہ 290

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

اگست 2018
جلد 32 شمارہ 12
قیمت 70 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل خاور حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [illegible]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

BOOKSPK
Books & Magazines

رخصیہ جمیل

اداریہ

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر لیے حاضر ہیں۔

اگست کا مہینہ برصغیر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء وہ تاریخ ساز دن جب ہمیں ہندوؤں کے تسلط اور انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک علیحدہ وطن عطا کیا۔

قارئین کو یوم آزادی مبارک ہو۔

اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ شعاع اپنی عمرِ عزیز کا ایک اور سال کامیابی سے طے کر کے 34 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔

سالوں کی یہ طویل اور کڑی مسافت آپ کے ساتھ یوں طے ہوئی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا، ایسا لگتا ہے کہ کل کی بات ہو جب شعاع کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا۔

شعاع کے اجرا کے وقت جہاں دل میں کچھ خدشات تھے وہاں ایک لگن، شوق، جستجو اور مقصد بھی تھا۔

وہ خواتین جو گھر کی چار دیواری تک محدود ہیں، ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے تاکہ ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خواتین جو تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو سامنے لانے ان کے اظہار کا موقع مل سکے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعاع آگے بڑھتا رہا۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی مصنفین کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے شعاع کی پالیسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا۔ ان کی مثبت سوچ اور روشن تحریروں نے قارئین کے ذہنوں کو جلا بخشی۔ انہیں زندگی کے روشن پہلوؤں سے روشناس کیا۔ ہم اپنی مصنفین کے تہہ دل سے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے مقاصد کی تکمیل میں ہمارا ساتھ دیا۔

شعاع کی ایک خصوصیت اس کے سلسلے ہیں جو دیگر پرچوں سے منفرد اور متنوع ہیں یہ ہماری قارئین کی ذہانت اور محنت ہے جس کی وجہ سے ہم ان سلسلوں کو دلچسپ اور خوبصورت بنا سکے۔ بلاشبہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اچھی مصنفین کے ساتھ ساتھ ذہین اور باصلاحیت قارئین کا ساتھ حاصل رہا۔ ہم اپنی قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے، شعاع اسی طرح کامیابی کی منازل طے کرتا رہے اور اس کی شعاعیں اندھیروں کا سینہ چاک کر کے روشنی پھیلاتی رہیں۔ آمین۔

نیا ناول،

"محبت خواب سفر" "زندگی ایک روشنی" اور "ایک تھی مثال" جیسے مقبول اور بے مثال ناول لکھنے والی ــــ رخسانہ نگار عدنان کسی تعارف کی محتاج نہیں ــ انہوں نے جب بھی لکھا، خود کو منوالیا۔ موضوع کا تنوع اور بہترین کردار نگاری ان کی تحریروں کو ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

قارئین کے لیے خوش خبری ہے کہ آئندہ ماہ یعنی ستمبر کے شمارے سے رخسانہ نگار عدنان کا ناول شروع کیا جا رہا ہے۔

اس شمارے میں،

- سمیرا حمید کا مکمل ناول ــ راہِ نور،
- فرح بخاری کے ناول بن پاکھی کی آخری قسط،
- انشین نعیم کا مکمل ناول ــ سب اچھا ہے،
- اُمِ ایمان قاضی کا ناولٹ ــ ہے سر اٹھا کر جینا،
- عاصمہ فرحین، ثوبیہ عمران، عندلیب زہرا، سدرۃ المنتہیٰ اور فاخرہ جبیں کے افسانے،
- عفت سحر طاہر اور صائمہ اکرم کے ناولز
- پی بی سی کی ڈائریکٹر ربیعہ اکرم کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ــ دستک،
- تجھ سے ناتا جوڑا ہے ــ
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

BOOKSPK
Books & Magazines

(سالگرہ نمبر)

حمد

وہی رحیم ہے، معبود ہے وہی سب کا
وہ ذاتِ یکتا ہے، مسجود ہے وہی سب کا

زمیں میں اُس نے سمیٹا ہے ساری خلقت کو
ہر اک وجود کو، مردہ ہو یا کہ زندہ ہو

بنائے اُس نے ہیں گلزار اور پربت بھی
دیا ہے آبِ مصفا بھی خوانِ نعمت بھی

اُسی نے بھیجا جہاں میں رحمتِ عالم
ہے اُس کا نام ہی افگار قلب کا مرہم

اُتارا اُس نے ہے قرآن لاجواب جو
جہانِ علم کی سب سے بڑی کتاب ہے جو

اُسی کے سامنے بے شک جھکے ہیں سر سارے
گواہی اُس کی ہی دیتے ہیں چاند اور تارے

اُسی کے نور سے روشن ہیں ارض و سما
زباں پہ پھول کی ہر دم رہے اُسی کی ثنا

تنویر پھول

نعت

رسولِ مقبولؐ

حمدِ رب کے لیے مصطفیٰ چاہیے
نعت خیر البشرؐ کو خدا چاہیے

لب نہیں آنکھ سے التجا چاہیے
احترامِ درِ مصطفیٰ چاہیے

ناز کر اپنی قسمت پہ نوعِ بشر
مل گئے مصطفیٰ اور کیا چاہیے

سوئے کعبہ چلو، سوئے طیبہ چلو
گر تمہیں خلد کا راستہ چاہیے

اور کوئی نہیں راستہ دوستو!
مصطفیٰ سے ملو گر خدا چاہیے

جسم کیا روح کے زخم بھر جائیں گے
مجھ کو طیبہ کی آب و ہوا چاہیے

سخت اعجاز مدحت کا ہے مرحلہ
کچھ سلیقہ تو کچھ حوصلہ چاہیے

اعجاز رحمانی

ادارہ

رشوت لینا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اس روز، دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔'' (الزخرف۔68)

فائدہ آیت:

1- مطلب یہ ہے کہ قیامت والے دن نیک لوگوں کی باہمی محبت اور دوستی قائم رہے گی کیونکہ ان کی دوستی اللہ کے لیے اور ایک دوسرے کی خیر خواہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سے امام نووی رحمتہ اللہ نے بجا طور پر استدلال فرمایا کہ حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی نیک لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ وزیر، مشیر، اہلکار اور دیگر تمام مناصب کے لیے ایمان و تقوی کو بنیاد بنایا جائے تاکہ وہ صحیح مشورہ دیں اور صحیح کام کریں۔

2- اور اگر حکمران نے برے اور خود غرض لوگوں کو اپنا ہم نشین اور عہدیدار (وزیر و مشیر وغیرہ) بنالیا اور ان کی باتوں اور ہدیوں کو قبول کرنا شروع کر دیا تو جس طرح وہ خود غلط ہیں، حکمرانوں کو بھی غلط راستے پر لے جائیں گے اور قیامت والے دن یہ سب ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کو کوتاہیوں اور غلطیوں کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔

حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا اور اس کے بعد جسے بھی خلیفہ بنایا تو اس کے دو راز دار ساتھی ہوتے تھے۔ ایک محرم راز اسے نیکی کا حکم دیتا اور اس پر اسے آمادہ کرتا اور دوسرا محرم راز اسے برائی کا حکم دیتا اور اس پر اسے آمادہ کرتا۔ اور محفوظ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بچائے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- اس میں گویا ترغیب دی گئی ہے کہ اپنا مشیر اور محرم راز ایسے افراد کو بنایا جائے جو صلاح و تقوی اور امانت و دیانت میں معروف و ممتاز ہوں تاکہ وہ حکمران کو خیر خواہانہ مشورے دیں اور شر و فساد پھیلانے والوں سے بچائیں۔

2- حاکم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے تابع ہو کر چلے کیونکہ یہی چیز اس کی عصمت کی ضامن ہے اور اس طریقے سے ہی وہ برے لوگوں اور ان کی شرارتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے راست باز (خیر خواہ) وزیر عطا کر دیتا ہے۔ وہ اگر بھولتا ہے تو وہ وزیر اسے یاد کرا دیتا ہے۔ اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد کرتا ہے۔ اور جب بھلائی کے علاوہ کسی اور بات (برائی) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے برا وزیر مقرر کر دیتا ہے۔ اگر وہ بھول جائے تو اسے یاد نہیں کراتا اور اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد نہیں کرتا۔''

(اسے ابوداؤد نے جیّد سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل:

1- اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی حاکم کے پاس اگر صاحب ایمان و تقویٰ لوگ موجود ہوں اور وہ ہر وقت اسے صحیح مشورہ دیتے اور برائیوں سے روکتے ہوں تو یہ اللہ کی طرف سے اس کی رضامندی کی دلیل ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی حکمران کو وزیر و مشیر اور ورکرز وغیرہ ایسے ملیں جو خود غرض، ابن الوقت اور چڑھتے سورج کے پجاری ہوں جو اسے صحیح مشورے نہ دیں بلکہ غلط خطوط پر ڈالیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس حکمران کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے حکمرانوں کا دنیوی انجام بھی اچھا نہیں ہوتا، آخرت میں حسن انجام تو بہت دور کی بات ہے۔

حکومت کا سوال کرنا

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جن (علاقوں) پر اللہ نے آپ کو حکمران بنایا ہے ان میں سے بعض کی گورنری (وغیرہ) ہمیں عنایت فرما دیں۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ کی قسم! ہم حکومتی عہدوں پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو خود اس کا سوال کرے، نہ ہی ایسے شخص کو جو اس کی خواہش رکھے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

1- کسی ایسے شخص کو عہدہ و منصب نہ دیا جائے جو خود اس کا طالب یا حریص ہو، کیونکہ ایسے لوگ عموماً اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان عہدوں کو حاصل کرتے ہیں، جس سے عام لوگوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ جبکہ حکومت کا مقصد تو عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے نہ کہ چند مراعات یافتہ مخصوص لوگوں کو یا حکومتی منصب پر فائز لوگوں کو۔

تصویریں بنانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس آئے اور میں نے گھر کے سامنے کے چبوترے پر ایک پردہ ڈالا ہوا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو آپ نے (فوراً) ان تصویروں کو بگاڑ دیا اور (غصے سے) آپ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور فرمایا۔

''اے عائشہ! قیامت والے دن اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عذاب والے لوگ وہ ہوں گے جو اللہ کی پیدائش (کی صفت) میں مشابہت اختیار کرتے ہیں۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- اس میں بھی دینی معاملات میں کوتاہی کرنے پر غصے کے بھرپور اظہار کا جواز ہے۔ دوسرے، تصویریں بنانا اور گھروں میں لٹکانا، دونوں باتیں ہی ناجائز ہیں۔ اور اگر انہیں تعظیم و تقدیس کے طور پر لٹکائے گا تو اس میں اندیشہ شرک و کفر ہے۔

2- علمائے راسخین و محققین کے نزدیک ہر طرح کی تصویر بنانا اور رکھنا ناجائز اور حرام ہے، چاہے وہ ہاتھ کی بنی ہوئی ہو یا کیمرے کے ذریعے سے، بشرطیکہ وہ کسی ذی روح (جاندار) کی ہو۔ غیر ذی روح (بے جان) کی تصویر بنانا اور رکھنا جائز ہے، جیسے جمادات و نباتات وغیرہ کی تصاویر۔

3- ناگزیر صورتوں میں بقدر ضرورت تصویر کھنچوانا جائز ہے، جیسے پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور اسی قسم کی دیگر ضروریات کے لیے۔ کیونکہ تصویر کے بغیر یہ چیزیں نہیں بن سکتیں۔ اس میں انسان مجبور ہے، وہ اپنے شوق کی تسکین کے لیے یا اسے جائز سمجھ کر نہیں کھنچواتا بلکہ حکومتی قوانین کی وجہ سے ایسا کرتا

ہے، اس لیے اس حد تک تصویر سازی میں امید ہے وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کسی صورت میں اس کا جواز نہیں۔

مدعی اور مدعا علیہ کی ذمہ داری

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر لوگوں کو محض ان کے دعوے کی بنا پر چیز دے دی جائے تو لوگ دوسرے افراد کے جان و مال پر دعوے کر دیں، لیکن قسم کھانا مدعا علیہ کے ذمے ہے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ گواہی پر ہوتا ہے۔ اس میں گواہ کا قابل اعتماد ہونا ضروری ہے، اس لیے خرید و فروخت کے موقع پر گواہ بنا لینا ضروری ہے، خاص طور پر جب کہ سودا قیمتی ہو، یا ادھار کی رقم اتنی زیادہ ہو جس کے ادا ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں جھگڑا ہونے کا امکان ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (البقرۃ ۲:۲۸۲) ''اور اپنے مردوں میں سے دو مرد گواہ مقرر کر لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرو۔''

2۔ جب کسی مقدمے میں مدعی گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی اور وہ اللہ کی قسم کھا کر اپنے موقف کے برحق ہونے کی گواہی دے گا۔

3۔ مدعی کی قسم پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے گواہ پیش کرنا ہی ضروری ہے۔

اللہ کے عہد کی فروخت

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

" زمین کا ایک ٹکڑا میری اور یہودی کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس نے میرا حصہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''کیا تیرے پاس کوئی گواہ ہے؟''

میں نے کہا: نہیں۔

نبی علیہ السلام نے یہودی سے کہا: ''قسم کھا۔''

میں نے کہا: وہ تو (جھوٹی) قسم کھا کر میرا مال لے لے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (آل عمران: ۵۵) ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ تعالیٰ نہ تو ان سے بات چیت کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ جھوٹی قسم کھانا کبیرہ گناہ ہے۔

2۔ کسی کی چیز ناجائز طور پر حاصل کرنے کے لیے اس پر جھوٹا دعویٰ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

2۔ قاضی گواہوں اور شواہد کی بنا پر اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کرنے کا مکلف ہے۔ اگر اس نے اپنی سمجھ کے مطابق قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ گناہ گار نہیں، خواہ وہ فیصلہ حقیقت میں غلط ہی ہو، لیکن اگر مدعی کو معلوم ہے کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے تو اس کے لیے کسی کی چیز لینا جائز نہیں، خواہ اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا ہو۔

3۔ اللہ تعالیٰ بات نہیں کرے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ رحمت اور خوشنودی سے بات نہیں کرے گا بلکہ غضب کے ساتھ زجر و توبیخ کے طور پر یا محاسبے کے لیے بات کرے گا۔

4۔ کلام کرنا اللہ کی صفت ہے۔ وہ جب چاہتا ہے جس سے چاہتا ہے جیسے چاہتا ہے کلام فرماتا ہے، تاہم اس کی کوئی صفت مخلوق کی صفت سے مشابہ نہیں۔

جن لوگوں کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور گناہ کم اور معمولی ہوں گے، اللہ ان کے گناہ معاف کر کے

انہیں پاک و صاف کر دے گا جب کہ عادی مجرم اور بعض کبیرہ گناہوں کے مرتکب اس معافی سے محروم رہیں گے۔

جھوٹی قسم کھانا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے کوئی قسم کھائی جب کہ وہ قسم کھاتے ہوئے گناہ (جھوٹ) کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس (جھوٹ) کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس (جھوٹی قسم) کے ذریعے سے کسی مسلمان کے مال کا کچھ حصہ حاصل کرتا ہے، جب اللہ سے اس کی ملاقات ہوگی تو اللہ اس پر ناراض ہوگا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ جھوٹی قسم بڑا گناہ ہے، خاص طور پر جب کہ مقصد کسی کا مال چھیننا ہو۔

2۔ غیر مسلم کا مال ناجائز طور پر حاصل کرنا بھی جرم ہے لیکن ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال ناجائز طریقے سے لے لے، یہ اور بھی بڑا گناہ اور جرم ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بعض گناہ گاروں پر ناراضی کا اظہار بھی فرمائے گا۔

غضب اللہ کی صفت ہے، اس پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اور اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے نیکیاں کرنا چاہئیں اور گناہوں سے بچنا چاہیے۔

حق مارنا

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

''جو شخص قسم کھا کر کسی مسلمان آدمی کا حق مارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام اور جہنم واجب کر دیتا ہے۔''

حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا۔

''اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگرچہ پیلو کی ایک مسواک ہو۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی بھی فرض ہے۔

2۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کی وجہ سے بھی جہنم کی سزا مل سکتی ہے، لہٰذا ان سے بھی زیادہ سے زیادہ اجتناب کرنے کی کوشش ضروری ہے۔

3۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں سے جہنم واجب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے جہنم میں ضرور جانا پڑے گا، سزا بھگتنے کے بعد اس کو نجات مل سکتی ہے۔ اور اگر اس گناہ سے بڑی کوئی نیکی موجود ہو تو اس کی وجہ سے بھی نجات ہو سکتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے خاص فضل سے بھی اسے معاف کر سکتا ہے لیکن شرک اکبر اور ایسے کفریہ کام جو اسلام سے خارج کر دیتے ہیں ان کی سزا دائمی جہنم ہے۔

4۔ بعض گناہ بظاہر معمولی ہوتے ہیں لیکن اللہ کی نظر میں وہ بہت بڑے ہوتے ہیں، اس لیے ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچنا چاہیے۔

5۔ اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانا کبیرہ گناہ ہے اور معمولی سی چیز کے لیے اس کا ارتکاب اور بھی زیادہ برا ہے۔

جہنم واجب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس منبر کے پاس جو بھی بندہ یا بندی گناہ والی (جھوٹی) قسم کھائے گا، خواہ تازہ مسواک کے لے کھائے، اس کے لیے جہنم واجب ہو جائے گی۔'' (مسند احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ باہمی اختلاف اور جھگڑے کے فیصلے کے لیے قسم لینا اور قسم کھانا جائز ہے بشرطیکہ سچی قسم ہو۔ گناہ صرف جھوٹی قسم کھانے میں ہے۔

2۔ کسی عام جگہ گناہ کرنے کی نسبت احترام

BOOKSPK Books & Magazines

والی جگہ گناہ کرنا زیادہ برا ہے اور اس کی سزا بھی زیادہ سخت ہوگی۔

3۔ مسجد دوسرے مقامات سے زیادہ احترام کی مستحق ہے۔

تمام مساجد میں سے سب سے زیادہ احترام والی مسجدیں تین ہیں: مسجد حرام، جس میں کعبہ شریف ہے، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔

4۔ مسجد میں منبر کے قریب کی جگہ زیادہ تقدس کی حامل ہے، خصوصاً مسجد نبوی میں منبر کے قریب کی جگہ کو ''جنت کا باغیچہ'' فرمایا گیا ہے۔

ارشاد نبوی ہے: ''میرے گھر (حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا) اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔'' (بخاری و مسلم)

اس مقام پر جھوٹی قسم کھانا انتہائی بری حرکت اور بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے، خاص طور پر جب کہ قسم کسی معمولی چیز کے لیے ہو تو اور بھی بری بات ہے۔

اہل کتاب کی قسم

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم کو بلایا اور فرمایا:

''میں تجھے اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔''

مال کی زیادتی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا، اور فرمایا:

''لوگو، قسم ہے اللہ کی! مجھے تمہارے بارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔''

ایک آدمی نے کہا: ''اللہ کے رسول! کیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا: ''تم نے کیا سوال کیا؟''

اس نے کہا: میں نے کہا تھا: کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے، کیا وہ خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا۔)

موسم بہار میں جو سبزہ اگتا ہے، اس سے جانور اپھارے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے، مگر وہ چرنے والا جانور (بچ جاتا ہے) جو کھاتا ہے، پھر جب اس کی کوکھیں بھر جاتی ہیں تو دھوپ کی طرف منہ کر کے گوبر اور پیشاب کرتا ہے، پھر جگالی کرتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے۔

جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس میں برکت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھاتا رہتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔''

فوائد و مسائل:

1- مال و دولت کی حرص انسان کے دین کے لیے خطرناک ہے۔

2- مال اللہ کی نعمت ہے، اس لیے حلال طریقے سے حاصل کرنا منع نہیں۔

3- حلال کمائی سے حاصل ہونے والا مال بھی خرچ نہ کرنا بلکہ سینت سینت کر رکھنا نقصان دہ ہے۔

4- گھاس اور سبزہ جانور کے لیے مفید ہے بشرطیکہ پہلا کھایا ہوا ہضم ہونے کے بعد اور کھائے۔ اگر مسلسل کھاتا جائے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسی طرح مال مفید چیز ہے بشرطیکہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ بھی کیا جائے۔

کہانی کا آغاز کب ہوا؟

اس کائنات کی بنیاد کے ساتھ ہی کہانی کا جنم ہوا جس کا عنوان تھا ''زندگی'' پہلے انسان کے ساتھ ہی پہلی کہانی وجود میں آئی اور تب سے آج تک جتنی کہانیاں لکھی گئی ہیں جتنے کردار وجود میں آئے..... ان کا ماخذ زندگی ہے..... جب تک اس کائنات میں زندگی کا وجود ہے کہانیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ اتنے ہی کردار سامنے آتے رہیں گے۔ کہانیاں کرداروں سے جنم لیتی ہیں حالات و واقعات آغاز و انجام کا تعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں میں ہر شخص کو اپنی زندگی کا کوئی رنگ نظر آتا ہے۔ کہانیوں کے ان کرداروں میں انسان کہیں نہ کہیں خود کو محسوس کرتا ہے۔

شعاع کے سالگرہ نمبر کے لیے ہم نے اسی حوالے سے سروے کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

سوال یہ ہیں:

1۔ آپ شعاع کب سے پڑھ رہی ہیں؟ کیا گھر والے شعاع پڑھنے پر روک ٹوک کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں کوئی واقعہ۔

2۔ شعاع کی وہ کہانی جس نے دنوں اپنے سحر میں مبتلا رکھا؟

3۔ کسی کہانی کا وہ کردار جسے پڑھ کر آپ نے سوچا کہ کاش آپ ایسی ہوتیں؟

4۔ کبھی ایسا ہوا کہ شعاع کی کوئی کہانی پڑھتے ہوئے اتنی محو ہوئیں کہ سالن جل گیا۔ روٹی پکانا بھول گئیں یا نمک دوبار ڈال دیا تو گھر میں خوب ڈانٹ پڑی؟ کہانی کا نام بھی لکھیں۔

روشن لمحوں کا سفر

ادارہ

کوثر خالد سودا..... جڑانوالہ

(1) باقاعدہ شعاع بیٹی نے لگوا کر دیا نعتیں چھپوانے کے لیے۔ جنوری 2012ء کو پہلا شمارہ خریدا۔ اب تو سات رسالے خرید رہی ہوں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ شعاع نام سے محبت آٹھویں کا میتھ پڑھتے ہوئے ہوئی..... ہمیں نام رکھنے کا کریز ہے۔ خالہ کے بیٹے کا نام عمران سیریز سے متاثر ہو کر عمران رکھا، بہت ضد کر کے۔ اب شعاع کی گردان ذہن میں شروع ہوگئی۔ مگر کسی کے بیٹی ہوتی تو ہی ناں۔

پھر اچانک لگا۔ دعا قبول ہوگئی۔ وہ یوں کہ ''شعاع'' ناول نادرہ خاتون، کا ملا۔ پڑھا بس دیلی سی ہیروئن یاد ہے۔ پھر اچانک شادی کے بعد، 1982ء میں پتا چلا کہ شعاع رسالہ بھی آ رہا ہے۔ بس ایک آدھ کہیں سے ملا۔

ماں کے گھر پڑھا۔ ماں کے گھر بڑا بھائی رسالوں کا دشمن تھا۔ حتیٰ کہ ادھار کا رسالہ تھا۔ وہ اس نے آگ میں ڈال دیا۔ پھر ہم نے ادھار لینا ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ ہمسائی سے معافی مانگی اور اللہ کے حضور فریاد رکھ دی۔ اللہ کا کرنا..... پتا اس دن چلا، جب اسی بھائی نے اخبار کی ہاکری کی اور رسائل و اخبار گھر آنے لگے۔ نوائے وقت میں، امروز میں پاکیزہ میں لکھا، اخبار جہاں خوب پڑھے۔ مگر شادی

کے بعد ..... یہاں ٹی وی ، وی سی آر تو دن رات دیکھا جاتا۔ مگر کتاب ندارد۔ نماز بھی ، جمعہ، عید اور صبح کی۔ وہ بھی صرف کوئی کوئی پڑھتا۔ ہماری نمازیں ہی چھوٹ گئیں باقاعدہ والی۔ تو رسالوں کا شوق ہم کیوں پالتے ؟ پہلے نماز پھر کچھ اور .....لہٰذا ڈائری اپنے گناہوں کی ندامت سے بھرتے رہے اور مریضوں کی سیوا میں لگے رہے۔ مگر الحمدللہ ہماری قربانی ضائع نہیں گئی۔ اب خاندان کے نظریات بہت مثبت ہیں اور دین کی اہمیت مانتے ہیں۔

(2) کوئی ایک ہو تو بتائیں۔ بے شمار تمام بڑی رائٹرز کی ہر کہانی۔ اس کے علاوہ بھی ہزاروں بلکہ ہر ایک کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا۔ البتہ منظر نامے، تفاصیل کہانی، وہ کاٹ کر پڑھتی ہوں۔ جو کہانیاں مختصر نویسی پر مبنی ہوں۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھتی ہوں۔

ناول جو نام یاد ہیں اب تک ۔ضبط عشق ۔ سرسوں کے پھول ، یارم ۔ جنت کے پتے ، موجودہ جاری ناول، دیمک زدہ محبت وغیرہ۔

افسانوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ بس دو نام یاد ہیں۔ نایاب لفظ اور من شرالوسواس۔ افسانے سارے پڑھتی ہوں۔ مگر رمضان میں کسی رسالے کی کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ فقط مستقل سلسلے پڑھے۔

(3) بلکہ یوں کہیں، ہر کہانی میں میرے کردار کا ایک رخ ضرور ہوتا ہے۔ یعنی ہر مثبت کردار میرا ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک بات ہے مجھے کسی کردار جیسا بننے کی تمنا ہے۔ جناب وہ تو ولی اللہ ہی ہیں یا میرے ابا اور دادا۔ مگر اپنے یہ نصیب کہاں ؟ کہ ہم ہر وقت عبادت اور اعتکاف میں رہیں۔

(4) سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں دانستہ ایسا کام کروں کہ ڈانٹ کھانی پڑے۔ لہٰذا ہم صرف کام ختم کر کے یا رات کو رسالہ پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے یہ آیت خواب میں دکھائی ''وجعلنا نومکم سباتا'' مگر وہ اللہ ہے ناں۔ اس سے معافی مانگ کر کبھی کبھی رات کو جاگتے ہیں، روزانہ نہیں۔ رہی بات سالن کے جلنے کی۔ تو اکثر ہی جلا دیتے ہیں۔ وجہ ہر وقت سوچوں کی دنیا کا وجود۔ مگر ہر بار عزت رہ جاتی ہے۔ اللہ کے وِرد کی بدولت بچت ہو جاتی ہے۔ بالفرض ڈانٹ پڑے بھی تو ظاہر ہے کھا ہی لیں گے۔ جلا ہوا سالن خود کو کون سا اچھا لگے گا۔ بندہ بشر ہیں۔ غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ جب کسی کی غلطی پر میں نہ ڈانٹوں گی تو کوئی اور بھی میری غلطی معاف کر دے گا۔ آخر میں آپ کو شعاع کی سالگرہ مبارک ہو۔

شعاع بھی ملا شمع بھی ملی
کلی میرے دل کی سدا ہی کھلی
کتابوں سے آباد ہے میری دنیا
شعاع سے لگاؤ ، مسرت دلی

انیلا طالب.....گوجرانوالہ

سب سے پہلے تو سچائی سے مہکے چاہت کی خوشبو میں بھیگے شعاع کو سالگرہ مبارک ہو۔ اب سوالات کے جوابات۔

(1) میں ویسے تو بچپن میں بھی شعاع پڑھتی تھی کبھی کبھار اپنی آنٹی سے ہاتھ لگ جاتا مگر باقاعدگی سے تقریباً ایک سال سے پڑھ رہی ہوں ماہوار، گھر والے بالکل بھی روک ٹوک نہیں کرتے یہاں مگر ابھی بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو رسالوں کا پڑھنا اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان سے ذرا چھپا لیتی ہوں۔

(2) شعاع میں شائع ہونے والی سمیرا حمید کی کئی کہانیاں ایسی ہیں جنہوں نے دنوں اپنے سحر میں رکھا۔ ''داج'' افسانہ بھی ایک ایسی تحریر تھا۔

(3) مجھے نمرہ احمد کے ناول ''قراقرم کا تاج محل'' کی پریشے بعض موقعوں پہ اتنی پسند آئی کہ میرا دل کرتا ہے کچھ کچھ سین پڑھ کر کاش میں ایسی ہوتی یا عمیرہ احمد کے پیر کامل کی ''امامہ ہاشم'' پہ بھی کبھار اتنا پیار آتا ہے کہ کہتی ہوں کاش میں ایسی ہوتی۔

(4) میں نے کبھی کام کرتے شعاع نہیں پڑھا لیکن ایک بار ایسا ہوا تھا کہ میری دوست انعم میرے لیے شعاع لائی تو میں ساتھ ساتھ بریانی بنا رہی تھی اور

ساتھ شیلف پہ شعاع رکھ کے پڑھ رہی تھی مگر شکر ہے بریانی اچھی بن گئی اور عزت رہ گئی یہ واقعہ پچھلے سال کی سردیوں کا ہے۔

طلعت ثناء.....سیال شریف

(1) میں شعاع کی بہت پرانی قاری ہوں تقریباً میٹرک سے شعاع پڑھ رہی ہوں اور اب تو میری شادی کو بھی ماشاءاللہ اکیس سال ہو گئے ہیں۔ گزرے برسوں میں — تو آج تک کبھی گھر والوں نے شعاع پڑھنے پر روک ٹوک کی اور نہ ہی کبھی گھر والے نے۔ اس لحاظ سے میں بہت خوش قسمت ہوں کہ پہلے امی خود رسالے لا کر دیتی تھیں اور اب میاں صاحب لا کر دیتے ہیں۔

(2) شعاع کی ویسے تو بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جو پڑھنے کے بعد بندہ دنوں ان کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔ ہماری پیاری رائٹرز ماشاءاللہ بہت ذہین ہیں اور کہانی ایسے لکھتی ہیں جیسے سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہو لیکن سائرہ رضا کی ''خالی آسمان'' ایسی کہانی ہے جس نے بالکل ساکت کر دیا۔ ان کی منظر نگاری۔ مکالمہ بازی ایسی جیسے ہم وہاں موجود ہوں۔ اس منظر کا حصہ ہوں ویل ڈن سائرہ جی۔ بالکل حقیقت سے قریب تر۔ ہمارے ماحول کی صحیح عکاسی کرتی کہانی جو مدتوں یاد رہے گی شروع سے اینڈ تک مسلسل سائرہ جی نے ہمیں کہانی کے حصار میں جکڑے رکھا۔ بہت ہی خوب صورت تحریر جو ہم اپنے بچوں کو بھی پڑھنے کے لیے دے سکتے ہیں۔

(3) کسی ایک کہانی کا کردار تو کیا بہت سے کردار جنہیں پڑھ کر میں نے سوچا کاش میں ایسی ہوتی اور پھر ایسا بننے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔ شعاع کے بہت سے کرداروں نے ہمیں سلیقہ مند۔ سگھڑ۔ خوش اخلاق۔ مذہبی غرض ہر رول میں ہماری رہنمائی کی۔ دنیا کے رنگ ڈھنگ سب کچھ ہمیں سکھایا۔ ہمارا شعاع ہمارے لیے ایک ایسا انسٹی ٹیوٹ ہے جس نے گھر بیٹھے ہمیں ہر فن مولا بنایا۔

(4) نہیں آج تک ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کہانی پڑھتے سالن جلایا ہو یا نمک زیادہ ڈال دیا ہو۔ البتہ

کھانا پکانا بھول گئی تھی۔

اسی دن شعاع آیا تھا اور میں نے ابھی تک اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ سوچا تھا فارغ ہو کر اطمینان سے پڑھنے بیٹھوں گی۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر شعاع لے کر بیٹھی کہ ابھی کھانا پکانے میں دیر ہے ٹھہر کر پکاؤں گی تب تک کوئی کہانی پڑھ لیتی ہوں۔ کہانی پڑھتے پڑھتے میں اتنی محو ہوئی کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ ہوش تو تب آیا جب میاں صاحب کی بائیک کا ہارن سنائی دیا۔

پہلے تو مجھے وہم لگا کہ ابھی کہاں ابھی تو بہت ٹائم ہے اتنی جلدی یہ کہاں سے آ گئے لیکن مسلسل بجتے ہارن نے میرے ہاتھوں کے سب توتے کبوتر اڑا دیے۔ میں نے بھاگ کر گیٹ کھولا اور ساتھ ہی دماغ کو بھی دوڑایا کیونکہ میرے میاں صاحب ٹائم پر کھانا کھانے کے عادی ہیں اور بھوک کے بہت کچے ہیں اور میں نے تو ابھی آٹا بھی نہیں گوندھا تھا۔ لیکن شعاع پڑھنے والے اتنے بھی بدسلیقہ نہیں ہیں۔ شعاع نے ہمیں سلیقہ مند اور ذہین بنا دیا ہے۔ پھر کیا میں نے میاں صاحب سے کہا آپ فریش ہو جائیں تو کھانا لگاتی ہوں۔ بچے تھوڑا لیٹ آتے ہیں۔ اور میں نے جلدی جلدی چاول ابالنے کے لیے رکھ دیے رات کا سالن اور کباب پڑے تھے۔ دوسرے چولہے پر کباب فرائی کرنے شروع کر دیے (پوری ڈش نہیں صرف چار، پانچ کباب فرائی کیے تھے)

کباب فرائی کرنے کے بعد سلاد کاٹا اور چٹنی بنائی تو میاں صاحب فریش ہو کے آ گئے۔ میں نے سالن گرم کرنے رکھا اور ساتھ ہی پلیٹیں۔ چمچ۔ پانی وغیرہ رکھتے تک ادھر سالن گرم ہوا ادھر چاول ابل گئے۔ رات کے آلو گوشت۔ کباب۔ سلاد۔ چٹنی اور اچار کے ساتھ پیش کیے اور میاں صاحب سے کہا کہ آج میرا ہلکا پھلکا پکانے کا موڈ تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ پندرہ بیس منٹوں کے اندر اندر ہوا۔ تو جناب یہ سب سلیقہ طریقہ یہ چستی پھرتی ہمیں شعاع نے تو سکھائی ہے جس کی بدولت اس دن ہم متوقع ڈانٹ سے بال بال بچ گئے۔

طٰہٰ مصطفیٰ.....فاروق آباد

(1) ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ ہم نے شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا؟ چلو خیر.....! بتائے دیتے ہیں مابدولت جون 2015ء سے شعاع کے ساتھ منسلک ہیں ایسا گہرا اٹوٹ بندھن بندھا ہے کہ جب تک سانس باقی، ان شاء اللہ تعلق برقرار رہے گا۔

(2) تو جناب! امی جان نے کبھی روک ٹوک نہیں کی۔ وہ ماشاء اللہ خود پڑھی لکھی باسلیقہ باپردہ

خاتون ہیں (الحمد للہ)۔ ہم لوگوں کا گھرانہ ماشاء اللہ سے مذہبی ہے جس کا سارا کریڈٹ امی کو جاتا ہے۔ پہلے مجھے جہاں کہیں سے کوئی بھی ڈائجسٹ ملتا۔ میں پڑھ لیتی "رومانس سے بھرپور اور زندگی سے دور" ڈائجسٹ امی سے چوری کافی عرصہ اردگرد سے لے کر پڑھتی رہی۔ مگر ایک دن ہمسائیوں کی لڑکی کے ہاتھ میں شعاع دیکھا تو پہلی دفعہ خریدا اور جب پڑھا تو شاک ہی لگا کہ زندگی کی حقیقتیں اتنی روانی سبھاؤ اور خوب صورت الفاظ میں بھی لکھی جا سکتی ہیں اور پھر خود بھی پڑھا امی جان کو سنایا (امی کی نظر ہے نا!) اور اب میں اور دعا بی بی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔

(3) کہانی تو نہیں خیر ناول "جنت کے پتے" کی "حیا سلیمان" ہوتی اس ناول کو 2014ء میں پڑھا مگر اس کا فسوں ابھی تک موجود ہے۔

میری امی جان بہت اصول پسند ہیں اور ہم بہنیں ان سے بہت زیادہ ڈرتی ہیں۔ خیر وہ پیار بھی کافی سے بھی زیادہ کرتی ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ میں نے سنا تھا کہ "سمیرا حمید" کا ناول "یارم" انتہائی زبردست ہے تو مجھے شعاع کے سارے رسالے اس لڑکی نے دے دیے کہ سلسلہ وار ناول ہے۔ پڑھو گی تو یاد کرو گی۔

خیر اس کو جوں جوں میں نے پڑھنا شروع کیا، توں توں گھر کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹی وی دیکھتے "یارم" اٹھتے بیٹھتے "یارم" اور کھانا پکاتے "یارم"۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں پلاؤ چولہے پر "عالیان اور امرحہ کا ہوا جھگڑا" عالیان کے باپ سے امرحہ نے رابطہ کیا.....اور انتہائی اچھی خوشبو کے ساتھ تھوڑی دیر بعد عجیب سی خوشبو آئی مگر سین سیریس تھا امی جان کی آواز پر بلکہ پاٹ دار آواز پر ہوش آیا اور اوران کی غصہ بھری نظریں۔ میں خود کو عالیان اور امرحہ کے ساتھ ہوا میں تصور کر رہی تھی۔ مانچسٹر کی فضاؤں میں اڑتی پھر رہی تھی کہ امی جان کی آواز پر معلوم پڑا میں تو فاروق آباد میں اپنے گھر میں امی کے سامنے موجود ہوں، پھر میری وہ کلاس ہوئی کہ الامان دم پر پڑا پلاؤ، اف نہ پوچھو کیا بن گیا۔ توبہ توبہ۔

مسرت الطاف احمد.....کراچی

(1) شعاع سے وابستگی کو تقریباً سات سال ہو گئے اور یہ تعلق وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ آج جب میں اپنے اس محبت بھرے سفر کے آغاز کو یاد کرنے بیٹھی تو میں ان حسین یادوں میں مکمل طور پر کھو گئی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کل ہی اس محبت کے سفر کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا پھر تو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ شعاع کی کامیابی کا سہرا آپ کے ادارے کو — جاتا

ہے۔

شعاع پڑھنے پر گھر والوں نے کبھی روک ٹوک نہیں کی بلکہ ہمیشہ میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میرے ابو نہ صرف میری تحریریں خود پوسٹ کرتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً میرے لیے درجن بھر لفافے بھی لاتے ہیں آج اگر میں اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں تو اس کا کریڈٹ بھی اپنے پاپا کو دینا چاہوں گی۔

(2) ایسی بہت سی تحریریں جس نے دنوں نہیں بلکہ مہینوں اپنے سحر میں گرفتار رکھا میمونہ صدف کا ناول ''نربل'' جو دل کو چھو لینے والا اور سبق آموز تحریر تھی ''جنت کے پتے'' اور ''مکمل'' آؤٹ اسٹینڈنگ اور برسوں ہمارے ذہنوں پر نقش رہیں گے۔ سمیرا حمید کا ناول ''خیال یار'' ایسی تحریر جسے میں اب تک نہیں بھولی اور ابھی ''خواب شیشے کا'' اور ''بن پاکھی'' فنٹاسٹک اور ہمیشہ یاد رہ جانے والی تحریریں ہیں۔

(3) ''رقص بسمل'' میں عزت کا کردار بہت پسند آیا۔ بہت ہی اٹریکٹو کردار تھا۔ اس میں خود کو دیکھنا چاہوں گی۔ ''جنت کے پتے'' میں حیا کا کردار امپریسو لگا۔ اس کردار میں بھی خود کو محسوس کرنا چاہتی ہوں سحر ساجد کا ناول ''پہلا اور آخری داؤ'' میں عنایا کا کردار بھی بہت دل کو بھایا۔

(4) ڈیر آپی اگر میں شعاع پڑھتے ہوئے اتنی لاپروائی کا مظاہرہ کروں تو اسی دن شعاع سے میرا تعلق ختم کر دیا جائے گا۔ جب بھی کوئی تحریر پڑھتی ہوں کچن ہو یا گھر، اپنا ہر کام دل جمعی سے کرتی ہوں اور پھر تحمل اور سکون سے پڑھتی ہوں۔

عاصمہ زبیر خان.....میانوالی

(1) آہ! کیا یاد دلا دیا۔ 99-98ء کا زمانہ بالی عمریا۔ کالج کے دن اداسی کی کیفیت میں پھرتے ہوئے کسی لڑکی کے بیگ سے (لازماً پرانا ہوتا) شمارہ کی جھلک نظر آتی تو وہ پرایا بیگ اپنا اپنا اور لڑکی خوش قسمت محسوس ہوتی۔ مگر کہیں سے اس انوکھی دنیا کی سیر کا موقع نہ ملا۔ پھر ایک دوست آسیہ فردوس جو اپنی بڑی بہن کے پرانے رسالے لے آتی تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیتی جو سردیوں میں تو مزادے جاتے کہ پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ ابو کی جانب سے ڈائجسٹ پڑھنے پر شدید پابندی تھی لیکن اخبار میرے لیے ہی اسپیشل آتا تھا۔ ایک نشہ، سرشاری کی کیفیت ہوتی تھی کہانی ختم ہونے پہ، اپنی دنیا ویران بے زار دکھتی۔ اب بھی یہی حال ہے۔ مگر شکر کہ اس وقت کبھی پکڑے نہیں گئے۔

2002ء میں شادی کے بعد شوہر سے پہلی فرمائش رسالہ شعاع کی کی۔ دلہن کی فرمائش پہ آج تک رسالہ کا ناغہ نہیں ہوا۔ الحمدللہ۔ مگر طعنے بے شمار سننے پڑتے ہیں شوہر کے۔ نظر بے حد خراب ہو چکی ہے۔ مگر رسالہ اپنی تاریخ سے لیٹ ملے تو میرا جسم ٹوٹنے ذہن و دل کھویا کھویا۔ بالکل تشنہ کر دیا۔

(2) بے شمار کہانیاں۔ مگر وائے افسوس! غم دوران بہت سخت رہا یادداشت بے حد متاثر، پرانا رسالہ ایک گھر میں موجود نہیں۔ وجہ میری بہنیں اقصیٰ، مریم، ذونیرا، تمام رسالے ان کے پیٹ میں گم، میرے پیسے ضائع۔ کچھ پرانی یاد تازہ کرنی ہوں تو رسالہ پاس موجود نہیں۔ میں ان بہنوں سے بہت تنگ ہوں۔ بہرحال ''بن روئے آنسو۔'' ''پیر کامل، جنت کے پتے'' اور بے شمار۔ زندگی کی امید دلاتی سبق سکھاتی۔ حوصلہ دلاتی، حالات بدلیں گے کا یقین بے شمار کہانیاں..... ختم ہوئیں تو دوبارہ رسالہ پڑھنے کو دل نہیں چاہا۔

(3) کہانی سے زیادہ میں مصنفین سے متاثر ہوں ان جیسا بننے کی خواہش ہے۔ ہاں یہ کہ میں کبھی کسی کردار کی طرح حسین، سلیقہ شعار نازک یا بہادر نہیں ہونا چاہتی البتہ مضبوط ہونا چاہتی ہوں۔ یہ ضرور چاہتی تھی۔ اب تو حسرت..... کہ میرا بلما خوب صورت ہائے مخمور آنکھوں والا، دھرتی کے سینے پر قدم رکھے تو دھرتی ہل جائے آنسو گرنے سے پہلے چننے والا مگر ہائے، افسوس صد افسوس کہ کیسے آئیڈیل کیسے نازک اچھوتے دل و خیال ٹوٹے ان رسالہ پڑھنے والیوں کے۔ یہ ہیروان مصنفین کو اللہ ہزاروں دفعہ نصیب کرے۔ قارئین بہنیں یقیناً اتفاق کریں گی۔

(4) آپ خود سوچ لیں کہ بڑی بہو۔ گھر میں پہلی اکیلی عورت۔ بوڑھے ساس سسر، دیوران کے تمام کام و ذمہ داری۔ پھر اوپر تلے تین بچے۔ کہیں آنا جانا۔ ایک صرف پندرہ، سولہ سالوں میں آپ کو خط لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ گھر میں آج تک کھانا پکانے اور کھانے کی ٹائمنگ کی شدید پابندی ہے۔ ہمیشہ سے رسالہ تین چار دن میں ختم کر کے اگلے ماہ کا انتظار۔ کچن میں رسالہ ساتھ روٹی توے پر ڈال کر رسالہ اٹھا لیا۔ رات بچوں کو سلا کر رسالہ۔ موبائل لائٹ میں رسالہ ہمیشہ بیڈ پر، چارپائی پر اوندھا پڑا رسالہ۔ کبھی بند بھی نہ کیا کہ ابھی آ کے پڑھوں گی رسالہ۔ ایک صفحہ پڑھ کر ضروری کام نمٹا کر پھر رسالہ شوہر کا سنبھال کر رکھنا میرا رسالہ کہ بچے پھاڑ نہ دیں۔ مجھے ڈانٹنا کبھی اثر خاک نہیں ہوا (آج کل کے شوہر) کہ جان چھوڑو رسالے کی۔ میری آنکھیں بے حد خراب ہو چکی ہیں اب دن میں بھی پڑھنا مشکل ہے شوہر رسالہ لانا بند نہیں کرتے مگر پڑھنے پر دھمکاتے ہیں۔ ہائے میرا پتی۔

میرے بچے سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں صرف ٹائٹل والی آنٹی پھاڑ دیتے تھے۔ امی کے مسالے۔ یقین کریں جب میرے بچے ایک دو سال

کے تھے تب بھی میرا رسالہ میرے ہاتھ میں دیتے تھے۔ رسالہ کو موسالہ بھی کہتے تھے۔ لیکن رسالہ کی وجہ سے کبھی کچھ خراب نہیں ہوا۔ ہاں ہمیشہ فیڈر بچوں کے منہ کے بجائے گردن یا کان میں رکھا ہوتا تھا پینے کے لیے بچہ کے چیخنے پر پتا چلتا۔

رابعہ تحسین.....ممتاز آباد ملتان

(1) میں شعاع غالباً 2003ء سے پڑھ رہی ہوں جب میں شاید چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھی۔ اور گھر والے ٹوکتے بھی تھے۔

اس لیے نہیں کہ انہیں اس میں کوئی غلط مواد کا ڈر تھا۔ بلکہ گھر والوں کے خیال میں میں ابھی کم عمر تھی۔ وہ چاہتے تھے میں نونہال۔ تعلیم و تربیت پھول وغیرہ ہی پڑھوں۔ یعنی بچوں کے میگزین۔ لیکن جب میں میٹرک میں آ گئی تو پھر پابندی بالکل ختم ہوگئی۔ اب تو جب جیسے مرضی پڑھوں اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں ٹرین سے لاہور جا رہے تھے۔ میں نے ٹائم پاس کے لیے میگزین ساتھ رکھ لیا۔ اب ٹرین چلی، میں میگزین میں گم۔ امی بار بار ٹوکیں کہ چھوڑو رسالہ۔ سب دیکھ رہے ہیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ آخر امی کو غصہ آیا اور انہوں نے میگزین چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد ..... چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

(2) ..... ساتھ ایک مسئلہ ہے اچھی کہانی مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ لیکن یہ بھول جاتی ہوں کہ یہ فریحہ نسیم پڑھنے میں شائع ہوئی تھی۔ یعنی شعاع میں یا خواتین ڈائجسٹ میں۔ راحت جبیں کی ایک کہانی پڑھی تھی ''اک البیلی سی پگڈنڈی ہے'' جس میں ایمن اور طارق کے دو جڑواں بیٹے زین العابدین اور حمزہ ہوتے ہیں اور انہیں ایک نرس انجم ملتی ہے۔ وہ کہانی آج بھی مجھے یاد ہے۔ شاید اور لوگوں کو عام سی لگی ہو۔ لیکن مجھے بہت خاص لگی تھی۔ اور سائرہ رضا کی ''خالی آسمان'' یقین کریں آخری پیرا گراف پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ سائرہ! آپ گریٹ ہو۔

(3) نہیں شکر ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہاں البتہ اس سے ملتا جلتا واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار فائزہ افتخار کے ناول ''داسی ڈھولن یار دی'' کی چند قسطیں رہ گئی تھیں۔ وہ جمع کر کے پڑھ رہی تھی کہ امی نے کھانا لا کر قریب رکھ دیا۔ میں اتنی گم کہ پتا بھی نہیں چلا۔ جب قسطیں پڑھ کر فارغ ہوئی۔ اٹھی کچن میں جا کر کھانا نکالا اور کمرے میں آئی دیکھا کہ ٹرے پہلے سے موجود۔ میں پریشان، یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟ گھر میں جنوں نے بسیرا تو نہیں کر لیا۔ امی سے جا کر پوچھا تو پہلے تو شاباش ملی۔ پھر اس کے بعد جو ریکارڈ لگا توبہ۔ اب بھی یاد کروں تو ہنسی آ جاتی ہے۔

ہاں نا..... میں سوچتی ہوں کہ کاش میں ''قراقرم کا تاج محل'' کی پریشے جتنی خوب صورت ہوتی یا ''نمل'' کی حنین جیسی ذہین لیکن کاش۔

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

جی۔ میں شعاع کافی پہلے سے پڑھ رہی ہوں۔ تب جب سمجھ نہیں آتا تھا لیکن پڑھتی ضرور تھی جب لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی، میں پرانے شعاع پڑھتی۔ جہاں تک روک ٹوک کا معاملہ ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا ہمارا گھرانہ بہت سویٹ ہے، کسی بات پہ روک ٹوک نہیں جو چیز اتنی پیاری ہو اس سے کون روکے گا۔

(2) مجھے شعاع کی ہر کہانی پسند ہے ایمل رضا کی ''تعویذ حب اور رقصم'' مجھے بے حد بھائی تھی اس کے علاوہ مریم عزیز کا ناول تھا اس میں لڑکی کا نام سنبل اور لڑکا انس تھا۔ کہانی کا نام یاد نہیں مجھے بہت پسند آئی تھی۔

(3) سمیرا حمید کے افسانے ''دل سے بھی دفا کی مائینڈ ریڈر'' کاش میں وہ ہوتی تو جان پاتی کہ لوگ کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں اس کے علاوہ نمل کا ہاشم کاش میں ہوتی۔ یا آیو شمتی (میری دہشت ہی بڑی ہوتی نا)

(4) میں ''خواب شیشے کا'' پڑھتے ہوئے اکثر ..... لی روٹی جلا دیتی ہوں اس کے علاوہ مصباح علی ..... تے ہوئے اکثر کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

زیب النساء.....لاہور

(1) مجھے فوراً تھ یا فقط سے ہی کلاس میں شاعری سے دلچسپی تھی بیت بازی بازی کا مقابلہ ہوا۔ ..... یہ مقابلہ دسویں جماعت کی لڑکیوں کو ہرا کر جیت ..... ان دنوں شعاع سے میں اپنی پسند کے اشعار جمع ..... کے ڈائریاں بھرا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ کہانیوں کی طرف آتی گئی۔

امی پڑھنے کے بہت خلاف تھیں، ایف ایس سی تک بہت چھپ چھپا کے رسالے پڑھتی تھی۔ ہمارے محلے میں ایک آنٹی تھیں جن کے گھرانے سے میرے گھر والوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ ماہانہ شعاع لیتی تھیں اور مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ کہ (نیا نکور صاف ستھرا) شعاع ہر ماہ پڑھتی ہیں۔ (میں تو کباڑیوں اور پرانے رسالوں کی دکان سے رسالے لاتی تھی)

بس جی یہ حسرت دل میں ایسی بیٹھی کہ مابدولت نے شادی کے بعد شوہر صاحب سے پہلی فرمائش ہی یہ کی کہ مجھے ہر ماہ شعاع لا کے دینا۔'' وہ دن اور آج کا دن سولہ سال سے باقاعدگی سے شعاع آتا ہے۔

(2) شعاع کی وہ کہانی جس نے دنوں اپنے سحر میں مبتلا رکھا؟ تقریباً تمام سلسلے وار کہانیاں موجودہ قسط پڑھ لینے کے بعد ذہن و دل پر مہینے کے باقی دنوں میں چھائی ہی رہتی ہیں۔ پیر کامل، قراقرم کا تاج محل، آب حیات، نمل، مصحف، جنت کے پتے ایسی ہی چند کہانیوں کے نام ہیں اور بھی بہت سی ہیں جن کے کردار ذہن سے گویا چپک سے گئے ہیں۔

(3) میں کم سنی کے دور سے شعاع پڑھ رہی ہوں تقریباً گیارہ بارہ سال کی عمر سے تو شعاع واحد ایسا انسٹیٹیوٹ تھا کہ جس سے میں نے اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کہانی کے جس کردار نے متاثر کیا اس کی سب سے پسندیدہ بات کو اپنا لیا۔ سسرال میں جا کر بس اطاعت اور خدمت گزاری۔ کہانیوں میں اپنا آپ مارنے اور قربانیاں دیتے رہنے کا ہی درس دیتی ہیں کہ آپ کو اپنی قربانیوں کا صلہ ملے گا مگر میں نے سسرالیوں کی خدمت گزاری اور حد سے بڑھ کر اطاعت گزاری میں اپنا بہت نقصان کر لیا۔ میرے دو بیٹے ذہنی معذور ہیں۔ بڑا بیٹا پندرہ سال کا اور چھوٹا بیٹا آٹھ سال کا ہے۔ ہر ظلم برداشت کیا تو بھی نہ قسمت نے ساتھ دیا نہ میکے والوں نے ہی ان مظالم کو روکنے کے لیے کوئی حکمت عملی اختیار کی۔ آخر کار بہت مشکلوں سے سسر کی وفات کے بعد ایسے حالات بنے کہ اپنا ذاتی گھر لیا۔ مگر سوچتی ہوں کہ اتنی دیر بعد جرأت کی بھی تو کیا حاصل ہوا؟

میں سارا کریڈٹ شعاع کو دوں گی جس کی سحر انگیز کہانیوں نے مجھے حرام موت مرنے نہیں دیا۔ جب جب بھی بہت زیادہ ڈپریشن ہوا، کسی نہ کسی کردار نے زخموں پر پھائے رکھے۔ جینے کی امید بندھائی آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ میں نے شادی کے بعد اوپن یونیورسٹی سے پہلے بی اے اور پھر ایم اے اردو کیا اور تین سال پہلے قرآن حرف بہ حرف اردو ترجمہ اور تفسیر سے پڑھنا شروع کیا۔ اب تو دو بار مکمل کر چکی ہوں۔ ''نمل''، ''مصحف'' میں اور شعاع کی کئی اور رائٹرز جب جب بھی کسی کہانی میں یوں کسی کہانی کے کردار کی زندگی کو قرآن اور حدیث کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں بہت اچھا لگتا ہے۔

(4) شادی سے پہلے سب کے سونے کے بعد پڑھتی تھی اور تب کچن کا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ 2002ء میں شادی ہوئی۔ شعاع آنا شروع تو ہوا پر ٹکڑوں میں پڑھنا نصیب ہوتا تھا۔ رات کو ہی موقع ملتا تھا۔ اب بھی رات کو ہی پڑھتی ہوں۔ کام کاج کرنا بہت مشکل لگتا ہے جب شعاع نیا نکور گھر میں پڑا ہو۔ پر شوہر کٹھور اور ظالم مزاج کے ہیں تو اس ڈر سے کہ شعاع دیکھنا ہی نہ نصیب ہو، پہلے سارے کام کاج اور پھر بعد میں شعاع۔

☆

پی بی سی کی ٹاپ کرکٹر

ربیعہ اکرم ہمراہ ڈاکٹر اکرم

شاہین رشید

عموماً ورکنگ خواتین کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ نہ اچھی خاتون خانہ ہوتی ہیں نہ اچھی بیوی اور نہ ہی اچھی ماں، کیونکہ انہیں اپنی جاب سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ مگر میری سوچ اس سے بہت مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ ورکنگ وومن زیادہ ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ربیعہ اکرم ایک ورکنگ خاتون ہیں۔ گھر اور جاب دونوں کو کیسے لے کر چلیں اور اپنے ''بندھن'' کو کس طرح مضبوط کیا، آیئے ملاقات میں جانتے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

''الحمدللہ..... ٹھیک ٹھاک۔''

''کچھ بتایئے اپنے بارے میں، اپنے میاں صاحب کے بارے میں؟''

''جی میرا تعلق ریاست لوہالا کے خاندان سے ہے۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں، جبکہ میرے شوہر کی چار بہنیں تھیں۔ ان میں دو حیات ہیں۔ ان کے ایک بڑے بھائی ہیں، میں نے ہوم اکنامکس میں ''ایم ایس سی'' کیا ہے۔ ہماری شادی کو ماشاءاللہ 25 سال ہوگئے ہیں۔ میرے ماشاءاللہ دو بچے ہیں۔ وفا اکرم اور فیض خان ''وفا'' ایم بی بی ایس کے فائنل ایر میں ہے جبکہ فیض خان انجینئرنگ کے تھرڈ ایر میں ہے۔ دعا ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے بچے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پہ کھڑے ہوجائیں۔ میرے شوہر اکرم صاحب ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے ایم بی بی ایس لیاقت میڈیکل کالج جام شورو سے کیا۔ ان کا اپنا کلینک ہے اور یہ فیملی فزیشن ہیں۔''

''شادی پسند سے ہوئی؟ اور رشتے کے لحاظ سے یہ آپ کے کیا تھے؟''

''ڈاکٹر اکرم حسین خان اور ہم آپس میں بچپن کے دوست تھے..... ساتھ پلے بڑھے، کیونکہ ہم ایک ہی سرے کے پڑوسی تھے، ہم دونوں میں دوستی بڑھی، ایک انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہوئی، پھر ان کی طرف سے پروپوزل آیا اور بس..... پھر شادی ہوگئی۔''

''ان کی کیا بات آپ کو بہت پسند آئی تھی؟''

''بس بچپن کی محبت سب سے بڑی خوبی تھی۔ ان سے پہلی ملاقات بھی بچپن میں پڑوسی اور بھائی کے دوست کی حیثیت سے ہوئی تھی..... چونکہ پڑوسی تھے اس لیے آنا جانا لگا رہتا تھا۔''

''کیا شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ اور کوئی خاص واقعہ جو پیش آیا؟''

''ہماری شادی 23 دسمبر 1993ء میں حیدر آباد میں ہوئی اور دلچسپ بات یہ کہ دن کے وقت شادی ہوئی تھی۔ اور ورکنگ ڈے بھی تھا..... لیکن چونکہ اکرم کراچی میں رہائش پذیر تھے اور بارات حیدر آباد جانی تھی تو پلان یہ تھا کہ آج کے آج ہی رخصت کر کے کراچی بھی آجائیں گے..... شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ دلچسپ بات یہ کہ اس وقت میں حیدر آباد ریڈیو پہ کام کرتی تھی تو جس دن شادی تھی اس دن صبح کے وقت ریڈیو پہ یہ اناؤنسمنٹ بھی ہوگئی کہ ''آج ہماری ادی ربیعہ سعید کی شادی ہے اور جناب انہوں نے ''ہال'' کا نام بھی بتا دیا..... بس جی پھر تو وہ لوگ بھی آگئے جن کو بلایا ہی نہیں تھا، اتنے مہمانوں کو دیکھ کر میرا بھائی تو پریشان ہوگیا کہ تم نے کن کن لوگوں کو بلا لیا۔ ہم نے تو اتنا ہی کھانا پکوایا ہے جتنے دعوت نامہ دیے تھے..... لیکن اللہ نے عزت رکھ لی اور سارے کام خیر خیریت کے ساتھ ہوگئے۔''

''نکاح کے وقت آپ کی کیا کیفیت تھی، نارمل تھیں یا بہت رونا آیا تھا؟''

''نکاح ہمارا 22 دسمبر کو ہوا تھا اور رخصتی 23 دسمبر کو ہوئی تھی اور یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ بے شک لو میرج بھی ہو، مگر رونا تو آتا ہے ہے۔ والدین سے اور بھائیوں سے جدا ہونے کا دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ ..... 21 سال کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ الدین، بھائیوں اور بھابیوں کو چھوڑ کر جانا آسان کام نہیں ہوتا..... تو خیر بہت جذباتی کیفیت تھی..... پھر اگلے دن رخصتی ہوگئی ..... رسمیں ہوئیں نہ کھانا ہوا اور ..... یوں ہم نے وقت کی بچت کی، ایک دن پہلے نکاح کر کے۔''

''شہر بدر ہوئیں، کیسا لگا تھا؟''

بہت اچھا..... کیونکہ شہر بدری بھی بہت پیاری تھی کہ۔

''میں تو بھول چکی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے !!''

تو پیا چونکہ کراچی میں قیام پذیر تھے تو رخصت ہو کر کراچی آئی۔

''ساری رسمیں ہوئیں اور کیا سب رسمیں حیدر آباد میں ہوئی تھیں؟''

''جی..... جی بالکل حیدر آباد میں ساری رسمیں ہوئی تھیں۔ مایوں مہندی سب، سب سے پہلے تو محفل میلاد ہوئی، ہاں اس زمانے میں لڑکا لڑکی کو ساتھ بٹھا کر رسمیں کرنے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی دلہن دولہا کا ایک ساتھ ڈانس کا کوئی رواج تھا بہت شرم وحیا ہوتی تھی۔ اکرم صاحب کی رسمیں ان کے گھر میں ہوئی تھیں اور ہماری رسمیں ہمارے گھر میں ہوئی تھیں..... ہمارے یہاں زیادہ رونق اور شور شرابا تھا کیونکہ ایک اکلوتی بیٹی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تو ساری کزنز نے ٹیک اوور کر لیا تھا تو ہم سب نے بہت انجوائے کیا تھا۔''

''سسرال والوں کے ساتھ شادی کی تیاری کی تھی؟ مطلب عروسی جوڑا (بارات کا) ولیمہ اور دیگر شاپنگ؟''

''ولیمے کے جوڑے کے لیے میری نندیں مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھیں کہ آپ اپنی پسند کا لے

لیں..... باقی بری کی تیاری انہوں نے اپنے طور پر کی اور جہیز کی تیاری ہم نے اپنے طور پر کی، یعنی میری امی اور میری بڑی بھابھی (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) دنوں نے مل کر کی تھی۔"

"شادی کے موقع پر جو خواہشات ہوتی ہیں لڑکی کی، وہ آپ کی پوری ہوئیں؟"

"بالکل الحمدللہ..... انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم ساتھ ہو تو وہ پھر سب چیزوں سے بھی نوازتا ہے۔ ہم نے جس انداز میں بچوں کے فیوچر کے لیے پلاننگ کی، اللہ تعالیٰ نے ہمارا ساتھ دیا اور آج ہم اپنے بچوں کے مستقبل سے مطمئن ہیں۔"

"جوائنٹ فیملی میں آئیں، سسرال والوں خصوصاً ساس سسر کا سلوک کیسا تھا؟"

"ساس سسر کا تو ہماری شادی سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ البتہ تین نندیں تھیں اور تینوں غیر شادی شدہ تھیں۔ دو بہنیں اکرم سے بڑی تھیں۔ ایک میری دوست تھی جس سے میری بچپن سے بہت دوستی تھی اور ایک بہن شادی شدہ تھیں..... چونکہ ان نندوں سے میری اچھی خاصی دوستی تھی تو میرے لیے ماحول اجنبی نہیں تھا۔ دیورانی اور جٹھانی کا کوئی قصہ نہیں تھا اور جوائنٹ فیملی میں اس لیے نہیں رہی کہ شادی کے بعد اکرم کے ساتھ کراچی آنا تھا تو کراچی آ کر خود ہی اپنا گھر سنبھالا اور دوسرے دن خود ہی کھڑے ہو کر انڈا بھی فرائی کیا اور چائے بھی بنائی۔"

"اس سفر میں مشکلات پیش آئیں۔ اپنے گھر کے لیے قربانیاں دینا پڑیں..... یا سب کچھ اچھا ہی ہوتا چلا گیا؟"

"اللہ کے کرم سے تمام سفر اچھا گزرا ہے۔ اتار چڑھاؤ تو آتے ہی ہیں۔ دشواریاں بھی آتی ہیں۔ اللہ سب مشکلیں آسان بھی کر دیتا ہے..... جب بچوں کی پیدائش کا مرحلہ آیا تو میرے دونوں بچے آپریشن سے ہوئے۔ اس وقت میں خاصی تکلیف میں تھی..... شوگر کا پرابلم بھی شروع ہو گیا تھا۔ تو اس وقت میں ڈپریشن میں آ گئی تھی..... لیکن کرم یہ رہا کہ میاں صاحب ڈاکٹر تھے، وہ میری مشکلات کو سمجھتے تھے۔ میری نفسیات کو سمجھتے ہوئے مجھے بہت سمجھایا اور اللہ کا شکر کہ وہ مشکل وقت گزر گیا۔ آزمائشیں بہت آتی ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب والدین دنیا سے رخصت ہوئے، بھابھی ہنستے کھیلتے اچانک موت کی وادی میں چلی گئیں تو اس وقت میں بہت زیادہ صدمے میں آ گئی تھی..... مگر یہ سب چیزیں تو منجانب اللہ ہیں۔ ہر بشر کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، ہمیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے۔"

"شادی سے پہلے آپ ریڈیو پہ کام کرتی تھیں۔ آپ کے اس شوق میں میاں صاحب نے یا کسی نے کوئی رکاوٹ تو نہیں ڈالی؟"

"نہیں بالکل نہیں، کسی نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ اگر میں ایمان داری سے بات کروں تو اگر میں اپنی جاب کو جاری رکھ پائی ہوں، شادی کے بعد اور پھر بچوں کے بعد تو اس کا تمام تر سہرا میرے میاں صاحب کو جاتا ہے..... شادی کے پانچ سال بعد مجھے "وائس آف امریکہ" کی اردو سروس کے لیے منتخب کر لیا گیا..... اور میں نے وہاں تین سال کام کیا، حالانکہ اس وقت میرے بچے کافی چھوٹے تھے۔ بیٹی چار سال کی تھی اور بیٹا ڈیڑھ سال کا تھا چونکہ وہ فیملی کے بغیر نہیں بلاتے تو ہماری پوری فیملی کو جانا تھا تو اکرم صاحب نے اپنے کلینک کی قربانی دی۔ اسے فروخت کیا اور اپنی تمام پیشہ ورانہ سروسز کو خیرباد کہہ کر میری پروفیشنل لائف کی وجہ سے اکرم وہاں تین سال رہے۔ یقین جانو کہ ان کے تعاون کے بغیر کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔"

"یہ بندھن جتنا مضبوط ہے اتنا ہی کمزور بھی، ٹوٹنے پہ قصوروار کون ہوتا ہے؟"

"سچ کہا کہ جتنا مضبوط ہوتا ہے، اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے اور میرا یہ کہنا ہے کہ اسے کمزور بنانے میں

اور مضبوط بنانے میں دونوں فریقین کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر مجھے تھوڑا کمپرومائز کرنا پڑا تو بہت سا میرے شوہر نے بھی کمپرومائز کیا ہے۔"

"اپنے دور کی شادی اور آج کے دور کی شادی میں کیا فرق پاتی ہیں؟"

"اب تو زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے..... ہماری شادی تو سیدھے سادے دور کی شادی تھی..... آج کل کی شادیوں کی لائیو اپ ڈیٹس ایف بی پہ آ رہی ہوتی ہیں۔ دولہا، دلہن ساتھ ڈانس کر رہے ہوتے ہیں۔ مخلوط شادیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے دور میں ایسا نہیں تھا..... خاص طور پر عروسی ملبوسات جو لاکھ، ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوتے اور ڈیزائنر کے بنائے جاتے ہیں۔ کم سے کم ہمارے وقت میں ایسا نہیں تھا۔"

"جہیز کا مسئلہ آج کل کے دور میں ہے یا گزرے دور میں بھی تھا؟"

"میرے خیال میں آج کل کے دور میں زیادہ ہے۔ اب تو جہیز نمود و نمائش کا دوسرا نام ہے۔ اب تو ایسی ایسی چیزیں دی جا رہی ہوتی ہیں۔ جن کا نچلی بات ہے ہمارے دور میں رواج نہیں تھا..... اب تو اے سی بھی دیا جاتا ہے۔ ایل ای ڈی ٹی وی بھی دیا جاتا ہے اور اب تو سنا ہے کہ جنریٹر بھی دیے جاتے ہیں..... ہمارے دور میں یہ سب کچھ نہیں تھا..... بہت سادگی تھی..... چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جاتے تھے۔"

"سگھڑ تھیں یا سسرال میں ہی سب کچھ سیکھا؟"

"بالکل بھی سگھڑ نہیں تھی حالانکہ میں نے ہوم اکنامکس میں ماسٹرز کیا ہے، لیکن چونکہ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی تو بھابیاں بھی بہت ناز نخرے اٹھاتی تھیں اور امی کی بھی بہت لاڈلی تھی..... میکے میں مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میں خود اپنی مرضی سے جو کروں کوئی روک ٹوک نہیں تھی..... جب میں ایم ایس سی کر رہی تھی تو "رعنا لیاقت علی خان کالج" میں تھی اور کراچی میں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ جب چھٹیوں میں حیدرآباد جاتی تھی تو خوب آؤ بھگت ہوتی تھی..... تو جو کچھ بھی کیا، شادی کے بعد ہی کیا اور رفتہ رفتہ سیکھتی گئی..... امی آتی تھیں تو میں کہتی امی اپنے ہاتھ کے پکے کوفتے کھلا دیں۔ بگھارے بیگن بنا دیں..... بس پھر رفتہ رفتہ وہ دور بھی گزر گیا۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے یا کمی..... اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے یا کمی؟"

"اگر محبت کا لفظ انڈر اسٹینڈنگ کا متبادل ہو تو بہتر ہے..... محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں کیئر کا پہلو سب سے نمایاں ہوتا ہے اور اکرم میں، میں نے دیکھا کہ وہ بہت کیئرنگ ہیں۔ وہ ایکسپریسو نہیں ہیں کہ اپنا اظہار آئی لو یو کہہ کر کر دیں..... لیکن ان کے عمل سے۔ ان کی کیئرنگ سے ان کی حرکات و سکنات سے یہ بات بہت نمایاں ہو جاتی ہے کہ انہیں ہم سب کا بہت خیال ہے..... اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ میری بھی یہی کوشش ہے کہ جتنا میں خیال رکھ سکوں رکھوں..... وقت کے ساتھ ساتھ انڈر

اسٹینڈنگ بڑھتی ہے اور ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔"

"مزاج کا کون تیز ہے اور گھر کا ماحول کیسا ہے؟" "اللہ کا بہت کرم ہے کہ اکرم بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں..... بہت سمجھ دار انسان ہیں..... میں بعض موقعوں پر غصے میں جلدی آجاتی ہوں۔ بہت جلدی ٹمپرلوز کرلیتی ہوں۔ مگر اکرم میں بہت صبر و تحمل کا مادہ ہے..... گھر کا ماحول ہمارا بہت فرینڈلی ہے، بچے تھوڑا بہت اپنے بابا سے ڈرتے ہیں..... مگر فرمائشیں بھی بابا سے ہی کرتی ہوتی ہیں۔ اکرم ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میں اپنے بچوں کا بہت خیال رکھوں گا۔ جب میں امریکہ میں تھی تو میں تو صبح پروگرام کے لیے نکل جاتی تھی۔ فجر کے وقت..... تو سارا دن اکرم ہی بچوں کو سنبھالتے تھے اور پیمپر بھی تبدیل کردیتے تھے۔"

"اب گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"ہاں..... بہت ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ تم عورت ہو تو تمہارا ہی فرض ہے..... وہ آج بھی اپنا ناشتہ خود ہی بناتے ہیں۔ میں فجر کے بعد تھوڑا سو جاتی ہوں..... اور اکرم مجھے نہیں اٹھاتے۔ انہیں اپنی پسند سے جو ناشتہ کرنا ہوتا ہے وہ کرلیتے ہیں..... وہ زیادہ تر "جو کا دلیہ" کھاتے ہیں تو خود ہی بنا بھی لیتے ہیں..... پانی کی بوتلیں خالی پڑی ہیں تو بھر کر فریج میں رکھ دیتے ہیں۔"

"میاں صاحب چٹورے ہیں؟"

"نہیں وہ تو بالکل بھی چٹورے نہیں ہیں بلکہ میں اور بچے چٹورے ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ باہر کی چیزیں کھائیں مگر اکرم سادہ کھانا پسند کرتے ہیں..... انہیں مرچ مسالے والی چیزیں یا کھانے پسند نہیں۔"

"کیا شادی کے بعد عورت کو بھی کمانا چاہیے؟"

"عورت کی جاب کا تمام تر دارومدار اس کے گھر کے معاشی حالات پہ ہوتا ہے..... میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورت کو جاب نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا گھر متاثر ہوتا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو گھر کو بھی سنبھال لیتے ہیں اور جاب کو بھی، وہ انصاف نہیں کر پاتے اکرم نے مجھے بارہا کہا کہ جاب چھوڑ دو..... مگر میں نے نہیں چھوڑی اور کہا کہ میں جب تک نباہ کر سکتی ہوں کروں گی اگر معاشی طور پر شوہر کو ضرورت ہے تو ضرور ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ورنہ نہیں۔"

"فضول خرچ کون ہے؟ اور گھر کا بجٹ کون بناتا ہے۔ سسرال والے فخر کرتے ہیں؟"

"فضول خرچ تو ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔ الحمدللہ۔ بہت کفایت شعاری سے چلتے ہیں۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں..... فضول خرچی یا اسراف بے جا ویسے بھی گناہ ہے..... اور بجٹ ہم دونوں مل کر ہی بناتے ہیں اور مل کر ہی کرتے ہیں۔ اب سسرال میں صرف دو نندیں ہی ہیں اور ان کے بچے اس بات پہ فخر کرتے ہیں کہ ہماری ممانی ریڈیو پہ کام کرتی ہیں۔ کبھی ٹی وی پہ میرا انٹرویو دیکھ لیتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں یا کسی میگزین میں میرا انٹرویو دیکھ لیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ نندیں بھی بہت خوش ہوتی ہیں۔"

"آپ نے لو میرج کی، کیا اپنے بچوں کو ایسا کرنے کی اجازت دیں گی؟"

"جی بالکل دوں گی، بچوں کو اجازت ہے۔ بس اتنا ضرور کہوں گی کہ اپنی پسند سے آگاہ کردیجیے گا اور یہ بھی خیال ضرور رکھیں کہ فیملی بیک گراؤنڈ اچھا ہو اور "فرقہ" مختلف نہ ہو۔"

"ہوں..... اور اب آخری سوال کہ اکرم صاحب نے کمرے میں آکر کیا کہا تھا.....؟ یاد ہو تو بتایئے۔"

"اس وقت گھونگھٹ میں تو میں نہیں تھی کیونکہ سب ہمارے ہی کمرے میں تھے، نندیں اور دیگر..... لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ جب یہ کمرے میں آئے تھے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ "کچھ کھانا ہے" تو میں نے کہا تھا کہ "نہیں جی نہیں چاہ رہا" اور تو مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ربیعہ اکرم سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

مایا علی

"کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے..... کرم ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"فنکاروں سے کیا پوچھنا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ہمارا کام ہے، ہم تو وہ ہی کریں گے۔ بس آج کل ایک فلم کے ریلیز ہونے کا انتظار ہے۔"

"اچھا گڈ..... کون سی فلم؟"

"طیفا ان ٹربل" جو 20 جولائی کو ریلیز ہوگی۔ بڑی امیدیں ہیں اس فلم سے۔"

"کون ہیرو ہے آپ کے ساتھ؟"

"علی ظفر ہیرو ہیں میرے مقابل..... اور یوں تو علی ظفر بالی ووڈ کی کئی فلموں میں کام کرچکے ہیں مگر ان کی بھی یہ پہلی پاکستانی فلم ہے..... دیکھیں کہ کیا رزلٹ آتا ہے..... اور اس فلم میں جاوید شیخ صاحب، محمود اسلم اور نیر اعجاز بھی شامل ہیں۔"

"گزشتہ دنوں آپ انڈیا گئی تھیں..... کیا ہوا کچھ بات بنی؟"

"جی..... جی گزشتہ دنوں میں بالی ووڈ کے کئی ڈائریکٹرز سے مل کر آئی ہوں۔ ہماری بات چیت اچھی رہی ہے..... اور ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان مشترکہ فلم سازی ہو..... تاکہ فلم انڈسٹری کو مزید فروغ ملے۔"

"آج کل چینلز بہت ہیں اور ڈرامے بھی بہت بن رہے ہیں، کیا یہ اچھا سائن ہے؟"

"جی، سائن تو برا نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے حساب سے کما رہے ہیں۔ لیکن اگر کہا جائے کہ سب ہی ڈرامے ریٹنگ دے رہے ہیں تو غلط ہوگا..... کامیاب وہی ڈرامہ ہوتا ہے جس کی کہانی جان دار ہوتی ہے۔ جس کی ٹیم اچھی ہوتی ہے اور فنکاروں کی پرفارمنس بہترین ہوتی ہے..... فلم بھی وہی کامیاب ہوتی ہے جس میں تفریح بھی ہو اور پیغام بھی ہو۔"

"سوپ زیادہ دیکھا جاتا ہے یا سیریل یا پھر ٹیلی فلم؟"

"میں آپ کو بتاؤں کہ سوپ کو پسند کرنے والے الگ لوگ ہیں۔ سیریلز پسند کرنے والے الگ اور فلم والے الگ..... اکثریت کو لمبے لمبے سوپ اور سیریلز پسند نہیں ہوتے۔ وہ ٹیلی فلم سے دل بہلاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں ہر مزاج کے لوگ پائے جاتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ سپرہٹ فلمیں بنانے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے..... بہترین لوکیشن ہو تو کمزور کہانی والی فلم بھی کامیاب ہو جاتی

BooksPK Books & Magazines

مریم علی ہے اور میں 27 جولائی 1989ء کو پید
ہوئی.....اور بس.....''

''تعلیم؟.....اور مشاغل کیا رہے؟''

''ماس کمیونیکشن میں ماسٹرز کیا، کھیلوں سے
ہمیشہ سے لگاؤ رہا اور یہی مشاغل بھی رہے.....
باسکٹ بال کی بہترین کھلاڑی تھی میں اپنے اسکول
کے زمانے میں۔''

''بچپن سے شوق تھا؟.....سوال پرانا ہے مگر
پوچھنا ضروری ہے؟''

''ظاہر ہے پرانا ہے مگر ضروری بھی بہت ہے۔
ہم نہیں بتائیں گے تو پتا کیسے چلے گا۔ ماس کمیونیکشن
میں ماسٹرز کیا تو آفرز تو خود بخود ہی آنے
لگیں.....شروع شروع میں بہ حیثیت وی جے مختلف
چینلز پہ کام کیا، پھر ماڈلنگ کی آفرز آ گئیں تو ماڈلنگ
شروع کر دی اور پھر اداکاری.....تو آہستہ آہستہ
راستے کھلتے چلے گئے.....اللہ کا کرم ہوتا گیا۔''

''شہرت کے عروج پہ کس ڈرامے نے
پہنچایا؟''

''سب کو معلوم ہے، آپ کو بھی یاد ہوگا کہ
2012ء میں ایک ڈرامہ سیریل بہت مقبول ہوا تھا
''ایک نئی سنڈریلا'' اس نے مجھے بہت شہرت دی اور
پھر تو آفرز کی لائن لگ گئی۔ ایک نئی سنڈریلا'' کے بعد
مجھے ڈرامہ سیریل ''من مائل'' نے بہت شہرت
دی.....''

''لاہور سے کراچی بدر کب ہوئیں؟''

''بس جب زیادہ آفرز آئیں اور کام بڑھتا گیا
تو پھر لاہور سے کراچی بدر ہونا پڑا۔''

گڈ.....چلو ٹھیک ہے۔ ان شاء اللہ پھر بات
کریں گے۔

☆☆☆

صنم سعید

''ہیلو.....کیسی ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے.....آپ ٹھیک ہیں؟''

''جی.....جی، الحمد للہ.....اور سناؤ کہ کیا ہو رہا
ہے آج کل؟''

''بس جی.....کام.....کام اور کام.....''

''اور ازدواجی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟''

''جی.....اللہ کا شکر ہے.....کرم ہے۔''

''پسند سے کی شادی؟''

''نہیں.....ارینج میرج ہے۔ والدین کی پسند
ہے.....والدین نے پوچھا۔ کوئی پسند ہے تو ظاہر ہے
کہ میری اس معاملے میں کوئی پسند نہیں تھی.....تو میں
نے ساری ذمہ داری والدین پہ ڈالی اور ارینج میرج کو
ترجیح دی اور اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ سیٹ ہے۔
زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔''

''آپ دبئی میں رہتی ہیں پاکستان آنا جانا
لگا رہتا ہوگا؟''

''جی.....کام کے سلسلے میں پاکستان میں آنا
جانا لگا رہتا ہے۔ جب کوئی اچھا پروجیکٹ ملتا ہے تو
پھر کراچی آ جاتی ہوں یا کسی دوسرے شہر جانا ہو تو چلی
جاتی ہوں.....ٹریولنگ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''کسی پروجیکٹ کو سائن کرتے وقت کن
چیزوں کو یا کن باتوں کو مدنظر رکھتی ہیں؟''

''تین چار باتوں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔
ایک تو یہ کہ کہانی بہت اسٹرانگ ہونی چاہیے، دوسری
یہ کہ پروڈیوسر یا پروڈکشن ہاؤس اچھا ہو اور ڈائریکٹر
بہترین ہونا چاہیے.....اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ
اگر پتا چل جائے کہ یہ کس چینل سے آن ایئر ہوگا تو
پھر سائن کرنے یا نہ کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی
ہے۔''

''فلم میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟''

''بہت اچھا.....چار فلمیں میں نے کی ہیں۔
''بچانا''۔ ''ماہ میر''۔ ''دوبارہ پھر سے'' اور ''آزاد'' یہ
تو ریلیز ہو چکی ہیں۔ لوگوں نے دیکھی بھی ہیں اور
بزنس بھی دیا ہے۔ ''کیک'' بھی کامیاب رہی۔''

''آپ کی کسی فلم کو ایشین فیسٹول میں بھی دکھایا

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اگست 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

- ''الف'' عمیرہ احمد کا نیا سلسلے وار مکمل ناول،
- ''نسخہ ہائے وفا'' نعیمہ ناز کے ناول کی آخری قسط،
- ''یہ قرینے اہل محبت کے'' فاخرہ جبین کا مکمل ناول،
- ثمینہ فرحان اور حمیرا شعیب کے مکمل ناول،
- نفیسہ سعید، لائبہ اعوان، شازیہ الطاف ہاشمی، ماریہ یاسر اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- آمنہ ریاض اور نمرہ احمد کے ناول،
- نیوز اینکر عمران خان سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار ارسلان فیصل سے باتیں،
- قارئین سے عید کا خصوصی سروے،
- کرن کرن روشنی احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اگست 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

گیا وہ کون سی فلم ہے اور کیا کیا ایوارڈز آپ کو مل چکے ہیں؟''

''فلم ''آزاد'' کو بھارت، نیپال، برطانیہ، امریکہ، ایران بنگلہ دیش میں بھی ایشین فیسٹول 2017ء میں دکھایا گیا۔ اس طرح ''دل میرا دھڑکن تیری'' کو ترنگ ہاؤس فلم ایوارڈ مل چکا ہے اور میں بھی ——— تین بار لکس ایوارڈز — حاصل کر چکی ہوں اور پرائیویٹ چینلز کے ایوارڈز بھی حاصل کر چکی ہوں۔''

''گویا فلم آپ کے لیے بہترین میڈیا ثابت ہوا؟''

''بالکل .....اللہ کا شکر ہے کہ جہاں کام کیا کامیابیاں مقدر بنیں۔ اردو تھیٹر میں کام کیا، پسند کیا میرے کرداروں کو، انگریزی تھیٹر میں کام کیا تو بھی میری پرفارمنس کو بہت پسند کیا گیا۔ ڈراموں میں آئی تو پہلے ہی ڈرامے ''دام'' نے شہرت دی .....اور ''زندگی گلزار ہے'' کے تو کیا ہی کہنے.....اس فیلڈ کا ہر شعبہ میرے لیے کامیابی کا زینہ ثابت ہوا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ فلم کی کامیابی میں ٹی وی فنکاروں اور ڈائریکٹرز کا زیادہ حصہ ہے؟''

''بالکل ہے .....سو فیصد ہے۔ کیونکہ ٹی وی کے اسٹارز فلم میں بہت کامیاب ہوئے ہیں .....اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے ٹی وی کے فنکاروں نے فلم انڈسٹری کو اٹھایا ہے اور معروف ڈائریکٹرز یاسر نواز۔ مہرین جبار۔ حسن ضیاء۔ بلال لاشاری.....اور پروڈیوکشن ہاؤسز ''سکس سگما'' اور سیونتھ اسکائی کے ثمینہ ہمایوں سعید اور ہمایوں سعید اور عبداللہ کادوانی کا بہت حصہ ہے۔''

''آپ نے میڈیا کی جس فیلڈ میں قدم رکھ کامیابیوں نے آپ کو ویلکم کیا.....اگر پڑوسی ملک میں کام کریں گی تو وہاں بھی کامیابی ہو گی.....پھر کیا وجہ ہے نہ جانے کی؟''

''بھارت کے لوگ ہمیں بہت پسند کرتے ہیں.....وہاں ہمارے ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں.....میرے کافی ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں تو جہاں ہم اتنے پسند کیے جاتے ہوں وہاں اگر ہمیں کام کے لیے بلایا جائے تو ہم کیوں انکار کریں.....مجھے اگر اچھی آفر آئی تو میں ضرور کام کروں گی۔''

''ہم نے اکثر فنکاروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم بننا تو کچھ اور چاہتے تھے مگر بن کچھ اور گئے ہیں..... آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا؟''

''تقریباً ایسا ہی ہوا ہے.....میں گلوکارہ بننا چاہتی تھی مگر بن نہ سکی۔ مگر اپنے اس شوق کو ایک نہ ایک دن حتمی شکل ضرور — دوں گی اور پھر سے ''ریاض'' کروں گی۔''

''گھر میں آپ ہی اس فیلڈ میں ہیں؟''

''جی .....بالکل میں ہی ہوں اس فیلڈ میں — دور دور تک خاندان میں کوئی نہیں ..... جب اس فیلڈ میں آئی تو اپنے گھر کی بڑی اور معتبر خواتین کے ساتھ بیٹھ کر اپنا ڈرامہ نہیں دیکھتی تھی جبکہ میری نانی میرے ڈراموں کو بہت پسند کرتی تھیں.....اور میری امی کوئی رائے نہیں دیتی تھیں ..... زیادہ پوچھو تو کہہ دیتی تھیں کہ ہاں ٹھیک ہے۔''

سروق کی شخصیت

ماڈل ——— ایشاء نور
میک اپ — روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوگئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھا

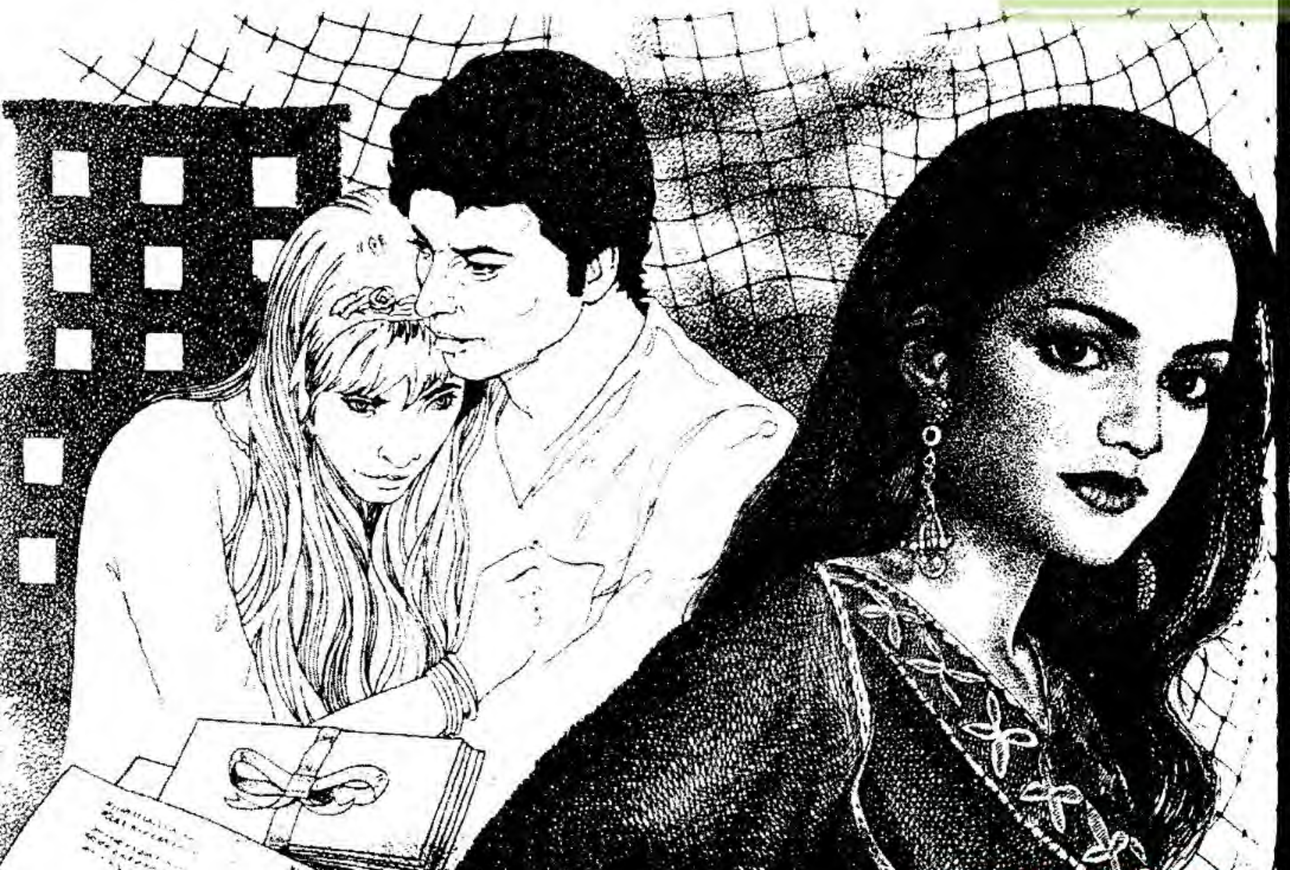

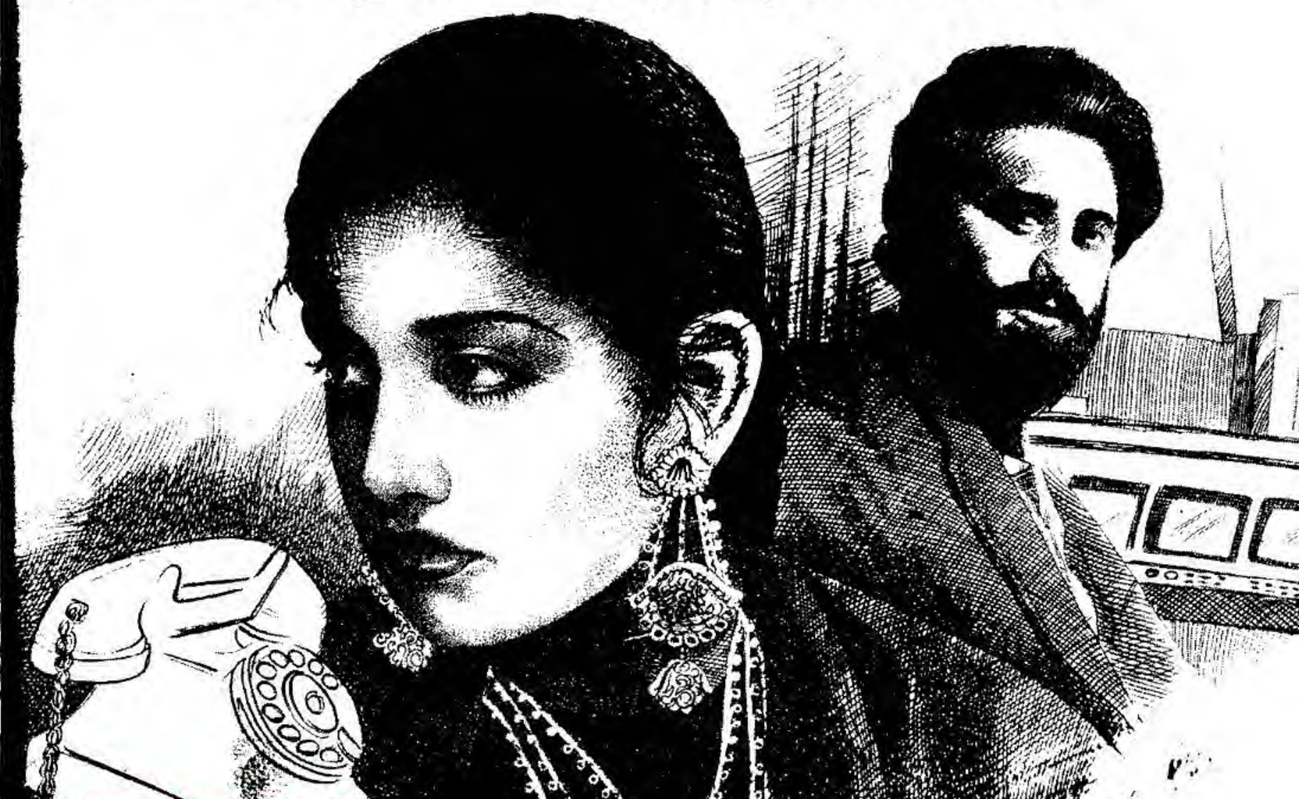

[illegible] رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر [illegible] والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے [illegible] چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ [illegible] پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل [illegible] میں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعدیہ کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے [illegible] آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہرزاد کے پاس سمجھتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہرزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات

سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہرزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، درشہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہرزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے، شہرزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہرزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہرزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت برا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانا لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔

برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیر سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔

مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد، شہرزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہو جاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، درشہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔

برہان، مناہل کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور مناہل کو بھی پتا ہے۔

سعد کو اچانک مناہل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔

شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔

درشہوار، ارسل کے کمرے میں جا کر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاج دار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ درشہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شیری، ارتضیٰ کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور ارتضیٰ ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے کہ.....

ہم زاد شہریار کو فون کرتا ہے کہ ارتضیٰ کی گاڑی سے اتر کر وہ ان کی گاڑی میں آ جائے۔ اسی دوران ان کے پیچھے پڑے لوگ فائر کھول دیتے ہیں اور ارتضیٰ زخمی ہو جاتا ہے۔ شہرزاد کے پاؤں پر بھی چوٹ لگتی ہے۔

ہم زاد اسے ہسپتال لے کر آتا ہے جہاں اسے علم ہوتا ہے کہ ہم زاد اس کے ساتھ اسکول میں تھا، وہ ضد کر کے ارتضیٰ کو دیکھنے جاتی ہے۔

درشہوار اپنی شادی سے بھاگ کر ہادی کے گھر میں جا کر چھپ جاتی ہے کہ وہ اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ درشہوار کے بھاگنے کی خبر سن کر میر حاکم حکم دیتے ہیں کہ وہ جہاں ملے اسے گولی مار دی جائے۔ یہ حکم سب کے ہوش و حواس اڑا دیتا ہے۔

۱۷
سترہویں قسط

میر ہاؤس میں اس وقت موت کا سکوت طاری تھا۔

ایسی خاموشی جو طوفان کے گزر جانے کے بعد گھر کے در و بام سے لپٹ جاتی ہے۔

درشہوار اس گھر کے مکینوں کو ایسا گھاؤ لگا گئی تھی، جس کو بھرنے کے لیے بہت وقت درکار تھا، وہ اس گھر کی سب سے ضدی اور باغی لڑکی تھی اور اس نے قدم بھی ایسا اٹھایا تھا جو اس گھر کی باقی لڑکیوں میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ندرت بیگم اور گھر کے بڑوں نے برہان اور انابیہ کا ولیمہ تو جیسے تیسے نمٹا دیا تھا لیکن ان کے چہروں سے جھلکتی پریشانی ان کے رشتے داروں کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر ہی دیا تھا۔ اوپر سے میر حاکم علی کے جھوٹے انجائنا اٹیک کی خبر نے بہت سے لوگوں کے منہ وقتی طور پر بند کر دیے تھے اور سچ بات تو یہ تھی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس خاندان کی کوئی لڑکی ایسی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ اس لیے اس طرف تو کسی کا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا۔

حاکم علی صاحب، تاجدار بیگم، وہاج اور ارسل کے ساتھ اسلام آباد کے لیے نکل گئے تھے جبکہ شاہ میر اور برہان دونوں پاگلوں کی طرح درشہوار کو تلاش کر رہے تھے۔ ایک ایک جگہ چھان ماری تھی لیکن درشہوار کی کہیں سے بھی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ فی الحال گھر کے صرف خاص ملازمین کو ہی اس بات کی خبر تھی۔

باقی ملازمین سے اس خبر کو حتی الامکان چھپایا جا رہا تھا۔

میر محتشم کے چند ہی گھنٹوں میں کندھے جھک گئے تھے، انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ اب ساری زندگی اپنے باپ اور بھائی کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکیں گے۔ انہیں دل ہی دل میں درشہوار سے سخت نفرت اور بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔

دوسری طرف انابیہ حجلۂ عروسی میں ساری رات برہان کا انتظار کرتی رہی، اس کے کمرے کو تاجدار بیگم نے تازہ پھولوں سے سجایا تھا جو اس وقت مرجھا چکے تھے اور ان پھولوں سے زیادہ اس وقت انابیہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ جانتی

تھی کہ اس وقت ایک ایک پل میر ہاؤس کے مکینوں پر قیامت کی طرح گزر رہا ہوگا، خود اس کا اپنا دل وہم اور اندیشوں سے لبریز تھا، آنے والے وقت کا خوف اس کے سارے وجود پر آکاس بیل کی طرح چھایا ہوا تھا۔

درشہوار جاتے جاتے ایک دفعہ تو اس خاندان کی باقی لڑکیوں کو زندہ درگور کر گئی تھی اور انابیہ جانتی تھی کہ اس کی یہ غلطی اس خاندان کی تاریخ میں کبھی بھی معاف نہیں کی جائے گی اور اس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔

صبح کے کوئی چار بجے تھے جب برہان بیزار انداز میں کمرے میں داخل ہوئے، اس وقت بھی انابیہ اسی دلہن والے روپ میں بیٹھی تھی اور اسے دیکھ کر برہان کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اس کی خرابیٔ دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

''تم کیا پاگلوں کی طرح ابھی تک اسی حلیے میں بیٹھی ہو؟''

انہوں نے بے زاری سے جوتا اتار کر پاؤں سے ایک سائیڈ پر کیا، انابیہ کا چہرہ خفت اور شرمندگی سے سرخ ہو گیا اسے لگا جیسے اس کی اوقات اس جوتے سے بھی گئی گزری ہو۔

''بس چینج کرنے ہی والی تھی۔'' وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو برہان نے اس کا گھبرایا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔

''سچ سچ بتاؤ، تمہیں پتا تھا درشہوار کی اس حرکت کا؟'' انہوں نے ایک دم ہی اس سے پوچھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا۔

''خدا کی قسم برہان! میرے تو فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی، بلکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔۔'' انابیہ نے بوکھلا کر صفائی پیش کی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ درشہوار نے اس بات کی بھاپ تک نہ نکالی تھی۔

''اس منحوس نے جو پورے خاندان کے سر میں خاک ڈالی ہے اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔'' انابیہ نے الجھ کر اس گھر کے فارن کوآلفائیڈ شخص کا چہرہ دیکھا اور اسے برہان اور میر حاکم کے چہرے پر موجود کرختگی میں پہلی دفعہ کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

ان دونوں کے درمیان کوئی اچھا اور خوش گوار تعلق تو کبھی بھی نہیں رہا تھا لیکن درشہوار کی اس باغیانہ حرکت نے اس کی شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح کا آغاز بھی بدصورت کر دیا تھا۔

میر ہاؤس میں درشہوار کی گمشدگی کی خبر کو حتی الامکان چھپایا جا رہا تھا جو مہمان یہاں موجود تھے، وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ درشہوار اس وقت اپنی ماں اور دادا کے ساتھ اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ اسلام آباد والے گھر میں بھی کسی کو میر حاکم سے ملنے نہیں دیا گیا تھا، لیکن اندرون خانہ وہ سب لوگ درشہوار کی تلاش میں کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میر محتشم کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کو پاتال میں سے بھی نکال کر لے آئیں اور اسے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیں۔

دوسری طرف طوبیٰ اور نمیرہ دونوں پچھلے برآمدے میں رکھے ہوئے لکڑی کے بڑے جھولے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ان دونوں کے چہروں پر بھی گہری اداسی تھی۔ لگتا تھا درشہوار جاتے جاتے سب کے چہروں کی رونق بھی چھین کر لے گئی ہو۔

''درشہوار نے اچھا نہیں کیا، ماموں لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' نمیرہ نے مضطرب انداز میں اپنی سب سے چھوٹی انگلی کا ناخن چبایا۔ اس سے پہلے کہ طوبیٰ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شاہ میر دروازہ کھول کر باہر نکلا، اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں متورم تھیں، اس کے وجود پر چھائی پژمردگی اور جھنجھلاہٹ دُور ہی

سے دکھائی دے رہی تھی۔

''تم جاؤ نمیرہ! مجھے بات کرنی ہے طوبیٰ سے۔'' شاہ میر کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ نمیرہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور برآمدے سے نکل گئی۔

شاہ میر آہستگی سے چلتا ہوا نمیرہ والی جگہ پر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت ضبط کی انتہا پر تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود کو بمشکل سمیٹے ہوئے ہے۔ طوبیٰ نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کیے ٹانگیں پھیلائے ہوئے ایسے بیٹھا تھا جیسے اپنے دامن میں صدیوں کی تھکن سمیٹ کر لے آیا ہو۔ طوبیٰ نے ہلکا سا جھک کر اپنا نرم ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھا، شاہ میر نے اپنی لہو رنگ آنکھیں کھولیں، ان میں تیرتے پانی کو دیکھ کر طوبیٰ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

''تمہارے خیال میں وہ کس کے ساتھ گئی ہوگی؟'' شاہ میر نے نظریں چرا کر رنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی، سچ پوچھیں تو اس کا ایسا کسی کے ساتھ بھی تعلق نہیں تھا۔'' طوبیٰ نے ہلکا سا جھک کر جواب دیا۔

''کوئی لڑکی اتنا بڑا قدم بغیر کسی سہارے کے نہیں اٹھا سکتی، تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا وہ ہادی!'' شاہ میر ضبط کی انتہا پر تھا، اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، لیکن اس سے پہلے ہی طوبیٰ فوراً نفی میں سر ہلانے لگی۔

''میں نے پہلے بھی بتایا تھا میر و! اس کی طرف سے ایسا کوئی رسپانس نہیں تھا۔''

''میں مان ہی نہیں سکتا۔'' وہ ایک دم چلا کر بولا تو طوبیٰ سہم گئی اور خوف زدہ نگاہوں سے شاہ میر کی طرف دیکھنے لگی، جس کی آنکھوں سے بس لہو ٹپکنے کی کسر رہ گئی تھی اور اسے بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے جھنجھلا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پاؤں جھلانے لگا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ طوبیٰ کو پہلی دفعہ اس پر ترس آیا، وہ سمجھ سکتی تھی کہ درشہوار کی اس حرکت نے اس گھر کے مردوں کو کتنی بُری طرح سے ہلا کر رکھ دیا تھا، اور شاہ میر کو تو اس پر سب سے زیادہ مان تھا۔

☆☆☆

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔۔۔

صبح کے اولین سحر آفرین لمحات میں اذان کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

ہادی کا ملازم گل خان، وضو کرنے کے لیے کمرے سے نکلا تو اسے سٹنگ روم کی سیڑھیوں پر کیچڑ کے کچھ نشان نظر آئے۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے ان قدموں کے تعاقب میں دیکھا، جوتے کے نشان پہلی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ فکرمند انداز میں اوپر کی طرف بڑھا۔

قدموں کے نشانات ہادی کے کمرے کے باہر آ کر ختم ہو گئے تھے، گل خان نے چند لمحے ان پر غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ کسی مرد کے جوتے کے نشانات نہیں تھے۔ وہ دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔

جیسے ہی اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا، کمرہ اندر سے لاک تھا، گل خان پریشان ہوا، وہ عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا اور اپنے پاس رکھی ایکسٹرا چابیاں اٹھا کر لے آیا، اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر کمرے میں کوئی موجود ہے اور ہادی یا سعد اگر واپس آتے تو اسے سب سے پہلے پتا چلتا اور ویسے بھی پورچ میں دونوں کی گاڑیاں موجود نہیں تھیں۔

گل خان نے بہت آہستگی کے ساتھ ہینڈل میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر ہلکا سا اندر جھانکا، سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کیونکہ درشہوار کمبل اوڑھے ہادی کے بیڈ پر بڑے مزے سے سو رہی تھی اور کمرے

کا اے سی چل رہا تھا۔ وہ اس طرح سے مطمئن ہو کر لیٹی ہوئی تھی جیسے کسی گھر میں خصوصی مہمان بن کر آئی ہو۔۔۔

گل خان کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا، وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ پڑوس میں میر خاندان کے گھر میں اسی لڑکی کی شادی کا فنکشن تھا کیونکہ اس کی شرارتوں کا سب سے زیادہ نشانہ ان ہی کا گھر بنتا تھا اس وجہ سے وہ کم از کم درشہوار کے نام سے تو اچھی طرح سے واقف تھا اور دوسری طرف اس گھر کے چوکیدار سے اس کی اچھی علیک سلیک بھی اور اس سے گپ شپ کے دوران اسے میر ہاؤس کی کئی خبریں مل جاتی تھیں۔ درشہوار کا رات کے اس پہر ان کے گھر میں موجود ہونا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔

گل خان نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے سٹنگ روم میں آ گیا، اس نے اپنے سیل فون سے جلدی سے ہادی کا نمبر ملایا جو خلاف توقع بند جا رہا تھا، اس نے گھبرا کر سعد کا نمبر ملایا تو وہ بھی اسے بدقسمتی سے بند ہی ملا، اب اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا اس لیے اس نے مجبوراً مسز عالیہ قریشی کا نمبر ملایا، جو اس وقت فجر کی نماز پڑھ کر اپنے کمرے میں آئی تھیں، ہادی کے ملازم کی کال اتنی صبح دیکھ کر ان کا پریشان ہونا ایک فطری امر تھا اور آگے سے گل خان نے جو خبر انہیں سنائی تھی اسے سن کر مسز عالیہ قریشی بری طرح حواس باختہ ہو گئی تھیں۔

وہ میر حاکم کے خاندان سے اچھی طرح واقف تھیں اور مناہل کے حوالے سے وہ برہان اور درشہوار سے بھی دو دفعہ مل چکی تھیں، انہوں نے فوری فیصلہ کیا اور ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ عبداللہ قریشی کے ساتھ مری میں ہادی کے گھر پہنچ چکی تھیں۔

ان کی گاڑی ہادی ہاؤس میں داخل ہوئی تو اس وقت مری میں ساون کے بادلوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں کو جوش آیا اور اس کے ساتھ ہی رم جھم کا سماں ہو گیا۔

مسز عالیہ قریشی نے ہی درشہوار کو آ کر اٹھایا تھا اور وہ انہیں دیکھ کر ہلکا سا بوکھلائی لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا، عالیہ قریشی زمانہ شناس عورت تھیں اور ساری زندگی ان کی کورٹ کچہریوں میں گزری تھی لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اپنی زندگی کا سب سے مشکل کیس اپنے گلے میں ڈالنے جا رہی ہیں۔

درشہوار جیسے جیسے بول رہی تھی، مسز عالیہ قریشی کے ہاتھوں سے حقیقتاً توتے اڑتے جا رہے تھے، وہ انتہائی پریشان نظروں کے ساتھ اس لڑکی کی داستان سن رہی تھیں، انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کو جانتی ہی نہ تھیں یا پھر وہ جس کے بارے میں بتا رہی ہے وہ کم از کم ہادی نہیں ہے۔

''تمہارا کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ہادی نے تم سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور اس کے بعد مکر گیا۔'' عالیہ قریشی کو یقین نہیں آیا۔

''جی آنٹی! وہ میری فیملی سے ڈر گیا تھا، اسے لگا کہ داجی کبھی نہیں مانیں گے۔۔۔'' درشہوار نے اپنی اداکاری میں رنگ بھرنے کے لیے آنسو بھی نکال لیے۔

''میں نے مہندی والے دن تک اس کی منتیں کیں لیکن وہ اب ہر چیز سے انکاری ہو چکا ہے اور ان سارے محبت کے وعدوں کو بھلا چکا ہے جو اس نے کبھی مجھ سے کیے تھے۔۔'' درشہوار نے بھی آج انتہا کر دی، مسز قریشی نے بے یقین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب وہ کہتا ہے کہ میں اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اسے تو مجھ میں کوئی انٹرسٹ ہی نہیں، حالانکہ اس دن آپ کی ویڈنگ اینورسری پر اس نے خود مجھے بلوایا تھا برہان بھائی کے ساتھ۔۔۔'' درشہوار اپنے پاس موجود سارے ہی پتے کھل کر کھیل رہی تھی۔

درشہوار کی باتوں نے مسز عالیہ قریشی کو ہلا کر رکھ دیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کا بیٹا اتنی گھٹیا حرکت بھی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عبداللہ قریشی صاحب کے سامنے رو پڑیں اور پریشان تو قریشی صاحب بھی کافی ہوئے لیکن وہ مرد تھے اس لیے خود کو سنبھال لیا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہادی ایسا کر سکتا ہے۔۔'' قریشی صاحب کا لہجہ بے یقین تھا۔

''کردی ناں وہی مردوں والی روایتی بات۔'' وہ اپنے شوہر پر برس پڑیں تو انہوں نے بوکھلا کر اپنی صفائی دی۔

''میرا یہ مطلب تھا، ہادی کی تربیت ہم دونوں نے کی ہے اور ہم نے ہمیشہ اسے عورت کا احترام کرنا سکھایا ہے، اس لیے مجھے اس بات کا یقین نہیں آ رہا۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن۔''

''لیکن کیا؟'' وہ بے تاب ہوئے۔

''کوئی لڑکی اپنی شادی والے دن اپنا گھر ایسے ہی چھوڑ کر نہیں آتی قریشی صاحب! اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مضبوط وجہ ضرور ہوتی ہے۔'' عالیہ قریشی اس وقت صرف اور صرف ایک جذباتی عورت تھیں۔ وہ بھول چکی تھیں کہ وہ ایک ماہر قانون دان ہیں اور ان کے کریڈٹ پر انتہائی مشکل اور پیچیدہ کیس ہیں۔ وہ اس وقت اپنے بیٹے کو اپنی ہی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر چکی تھیں۔

''آپ کی بات میں دم تو ہے لیکن.....'' انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

''یاد رکھیے گا عبداللہ صاحب! اگر اس نے واقعی ایسا کیا تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔۔'' مسز عالیہ قریشی جذباتی ہوئیں۔

''چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں اسے، لیکن اس سے پہلے ہر چیز کی تصدیق ضرور کروں گا۔۔'' قریشی صاحب اٹھ کر ٹہلنے لگے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

دونوں میاں بیوی کو اتنا تو پتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ پی سی بھوربن میں ہے اور قریشی صاحب نے ہوٹل کی ریسپشن پر کال کر کے اس کے کمرے کی ایکسٹینشن تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ دوسری طرف ہادی اتنی صبح اپنے والد کی کال سن کر گھبرا گیا۔

''بابا! خیریت تو ہے ناں۔؟''

''تم ہماری خیریت کو چھوڑو اور فوراً گھر پہنچو۔'' ان کے لہجے کی سنجیدگی ہادی کو پریشان کر گئی۔

''کہاں؟ اسلام آباد.....؟'' وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس لیے اسے بات سمجھنے میں دقت کا سامنا تھا۔

''نہیں، ہم لوگ مری میں ہیں اور پندرہ منٹ کے اندر اندر تم واپس آؤ اپنے گھر میں۔'' عبداللہ قریشی صاحب نے حکم صادر کر کے فون بند کر دیا۔

دوسری طرف گل خان، میر ہاؤس کے چوکیدار سے جو خبر لے کر آیا تھا۔ اسے سن کر دونوں میاں بیوی نے اپنا سر تھام لیا کیونکہ، درشہوار کے گھر چھوڑنے کی خبر میر ہاؤس کے تمام ملازمین تک پھیل چکی تھی اور انہیں اس بات کا بھی علم ہو چکا تھا کہ میر ہاؤس کے مرد اس وقت درشہوار کے خون کے پیاسے تھے اور اس کی تلاش پورے زور و شور سے جاری تھی۔

ہادی کی گاڑی جس وقت اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر پہنچی اس وقت شاہ میر اپنی گاڑی لے کر باہر نکل رہا تھا، ہادی کو دیکھ کر اس کا چہرا سرخ ہوا اور اس نے بہت جانچتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جو اپنی گاڑی اس کی گاڑی کے برابر میں لا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر رہا تھا۔ شاہ میر نے بہت مشکل ضبط کے مراحل طے کیے تھے۔

''کیسے ہو شاہ میر؟ ارسل کو شادی کی مبارک باد دینا، آئی ایم سوری۔ میں آ نہیں سکا۔'' اس کا لہجہ اتنا سادہ تھا کہ شاہ میر چاہ کر بھی اس کے اندر سے طنز کی آمیزش تلاش نہیں کر پایا۔

''تم اور سعد کیوں نہیں آئے شادی پر۔ ارسل کافی ویٹ کرتا رہا۔'' شاہ میر نے کھوجتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرے کچھ فرینڈز ابراڈ سے آئے ہوئے تھے، میں رات ان ہی کے ساتھ پی سی میں تھا۔ سعد کی والدہ آئی ہوئی ہیں آج کل پاکستان اور وہ ان سے ملنے گیا ہوا ہے اسلام آباد۔'' ہادی نے سرسری انداز میں بتایا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ شاہ میر کی اس بات کا پس منظر کیا ہے۔

''ہوں، ٹھیک ہے، اپنی ہاؤ، پھر ملاقات ہوگی۔۔۔'' ہادی کو وہ کچھ الجھا الجھا سا لگا۔

محمد ہادی جس وقت گھر پہنچا۔ اس وقت تک بازی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ درشہوار رو رو کر عالیہ قریشی کے ساتھ ساتھ عبداللہ صاحب کو بھی اس بات کا یقین دلا چکی تھی کہ ہادی اس سے شادی کا وعدہ کر کے مکر گیا ہے۔ اس نے جیسے ہی سٹنگ روم میں قدم رکھا، مسز قریشی کے ساتھ بیٹھی ہوئی درشہوار کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے مری میں اچانک زلزلہ آ گیا ہو۔

اس نے تیزی سے آنکھوں کو مل کے دیکھا، جیسے اسے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ مر کر بھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا کہ درشہوار اس وقت اس کے گھر میں اس کے والدین کے پاس یوں موجود ہوگی۔ اسے دیکھ کر وہ صوفے سے ٹیک لگا کر بڑے آرام سے بیٹھ گئی۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے درشہوار۔؟ تم اس وقت کیا کر رہی ہو میرے گھر میں۔؟'' وہ اسے دیکھ کر بے ساختہ انداز میں گویا ہوا اور اس کی یہی بے ساختگی اسے اپنے والدین کی نظروں میں اچھا خاصا مشکوک کر گئی۔

''تم جانتے ہو اس لڑکی کو؟'' عبداللہ قریشی کے سپاٹ لہجے پر وہ چونکا۔

''ہاں، بہت اچھی طرح۔'' اس کی اس بات پر درشہوار نے طنزیہ نگاہوں سے عالیہ بیگم کی طرف دیکھا جیسے یہ بتا رہی ہو کہ دیکھا۔ میں نے ٹھیک کہا تھا ناں اور مسز قریشی اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکیں۔

''لیکن یہ یہاں پر کیا کر رہی ہے؟'' ہادی کی فراخ پیشانی پر پڑے بل گہرے ہوئے۔

''اچھا تو یہ بات اب تم اس سے پوچھو گے؟'' مسز عالیہ قریشی نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''شادی کا وعدہ کیا تھا تم نے اس کے ساتھ؟'' قریشی صاحب کی بات پر وہ ششدر ہوا اور بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا۔

''اور اس کے بعد تم ان سارے وعدوں سے مکر گئے، ہے ناں؟''

''میں ایسا کیوں کروں گا ممی!'' اپنی ماں کی شعلہ بار نگاہوں سے گھبرا کر اس نے بمشکل کہا اور کھا جانے والی نظروں سے درشہوار کو دیکھا جو اس وقت دنیا جہاں کی معصومیت اپنے چہرے پر سجائے بیٹھی تھی۔

''جھوٹ بول رہی ہے یہ، دیکھو درشہوار! بہت ہو گیا تمہارا تماشا، اٹھو اور نکلو یہاں سے۔'' ہادی ایک دم غصے میں آیا۔

''شٹ اپ، تمیز سے بات کرو۔'' عبداللہ قریشی صاحب ایک دم بھڑکے تو اس نے بے یقین نظروں سے اپنے والدین کی طرف دیکھا، ان کے چہروں پر موجود بدگمانی اور شک دیکھ کر اسے شدید دھچکا لگا۔

''دیکھو ہادی! مجھ سے جھوٹ مت بولنا، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ سچ سچ بتا دو، تم دونوں کے درمیان کیا معاملہ تھا۔'' مسز قریشی کا لہجہ کاٹ دار تھا اور ہادی تو ویسے ہی ان کی آنکھوں میں اپنے لیے موجود بدگمانی کو دیکھ کر اندر سے ڈھے چکا تھا۔

''خدا کی قسم ممی! ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔'' چند لمحوں بعد نا قابل برداشت ضبط کے عالم میں اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔

''آنٹی! یہ جھوٹ بول رہے ہیں، آپ ان کے ملازم سے پوچھ لیں، کتنی بار تو میں اس گھر میں آ چکی ہوں۔'' اس کے بے باک انداز پر ہادی کا چہرہ سرخ ہوا۔

''ان کی وجہ سے میں نے اپنا گھر چھوڑا اور اب میں بالکل واپس نہیں جاؤں گی، وہ لوگ مجھے گولی مار دیں گے۔'' درشہوار نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ہی تو انڈیلا تھا، اس نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا اور اسی وقت اس کے ذہن کے پردے پر شاہ میر کی سرخ آنکھیں نمودار ہوئیں، اسے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ بُری طرح درشہوار کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکا ہے۔

☆☆☆

شہرزاد اپنے زخمی پاؤں کے ساتھ دوسرے ہی دن آفس میں تھی۔

آفس پہنچ کر اسے پتا چلا کہ آج مسز قریشی چھٹی پر ہیں اور اس نے ارتضیٰ حیدر کے کیس پر ورکنگ اسٹارٹ کر دی تھی، اس پر فائرنگ کرنے والے مجرموں کی شناخت ہو چکی تھی اور ان کے ڈانڈے ایک مشہور و معروف سیاسی تنظیم کے سربراہ احمد عباسی کی طرف جا رہے تھے۔ جس کی کرپشن کے قصے کھولنے میں سب سے نمایاں ہاتھ ارتضیٰ کا تھا۔

شہرزاد جیسے جیسے احمد عباسی کیس پر کام کر رہی تھی۔ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ کام کے دوران اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور جیسے ہی اس کی نظر وال کلاک پر پڑی اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔

اس نے تھک کر اپنی کمر کرسی سے ٹکائی اور خود کو پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں بند کیں۔ اسے یہاں سے فارغ ہو کر ارتضیٰ کے پاس ہاسپٹل میں جانا تھا اور اس کی عیادت کے بعد اس کا ارادہ مسز قریشی کے گھر جا کر اس کیس کی باقی تفصیلات ڈسکس کرنے کا تھا۔ اس نے مسز قریشی کو کال کرنے کے لیے اپنا سیل فون اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ آج صبح سے حمزہ کا کوئی ٹیکسٹ میسج نہیں آیا تھا، ورنہ وہ کچھ عرصے سے اسے باقاعدگی کے ساتھ ''گڈ مارننگ اوور گڈ نائیٹ میسجز کرنے کا عادی تھا، جس کا کبھی کبھار شہرزاد جواب دے دیتی تھی اور کبھی پڑھ کر مسکرا دیتی۔

اس نے کچھ سوچ کر مسز قریشی کو کال کرنے کے بجائے حمزہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی، شہرزاد نے دو منٹ کے توقف کے بعد پھر اس کا نمبر ڈائل کیا اور اس بار بھی حسب سابق کال پک نہیں کی گئی۔

اس نے چند لمحوں کے سوچ و بچار کے بعد ایک چھوٹا سا ٹیکسٹ میسج کیا، اور جب میسج کا بھی ریپلائی نہیں آیا تو اس بار اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے کڑیاں ملائیں اور ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے۔ اس سوچ نے ہی جیسے سارا سکون برباد کر دیا اور اس نے ارتضیٰ حیدر کیس کی فائل ایک سائیڈ پر کی اور کچھ سوچ کر دوبارہ حمزہ کا نمبر ملایا لیکن اب بھی دوسری طرف نو لفٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔

شہرزاد نے ملازم سے کہہ کر اپنی فائلیں گاڑی میں رکھوائیں اور باہر نکلی، اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی میجر توصیف کا نمبر ملایا اور رسمی سی گفتگو و شنید کے بعد اس نے ڈائریکٹ حمزہ خالد کے گھر کا ایڈریس مانگا تو اس نے بلا جھجک اسے ٹیکسٹ کر دیا۔

☆☆☆

وہ شفاء انٹرنیشنل ہاسپٹل سے ارتضیٰ سے مل کر گھر پہنچی تو خاصی تھک چکی تھی اس کی گاڑی اندر داخل ہوئی، اس نے سندس کو وہاں ٹہلتے ہوئے دیکھا، اسے دیکھ کر وہ لپک کر اس کے پاس آئی، اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔

''کیا ہوا سندس! سب خیریت تو ہے ناں۔'' اس نے گاڑی سے اترتے ہی پوچھا۔

''شیری باجی! ایک اہم خبر ہے میرے پاس۔'' سندس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے رازدانہ انداز میں کہا۔

''کیسی خبر؟'' وہ چونکی۔

''مری والوں کے بارے میں۔'' سندس کی بات پر اس کے کان کھڑے ہوئے کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ اشارہ میر فیملی کی طرف ہے، اس نے سوالیہ نگاہوں سے سندس کی طرف دیکھا۔

''وہاج صاحب کی بہن درشہوار اپنی شادی والے دن گھر سے بھاگ گئی۔'' سندس کی بات پر شہرزاد کو ہلکا سا جھٹکا لگا، اس نے میر حاکم کے پوتے پوتی کے ولیمے کی تصاویر آج صبح کے خبارات میں دیکھی تھیں اور وہیں نیوز پیپرز نے ان کے انجائنا اٹیک کی خبر کو بھی بڑے نمایاں انداز سے شائع کیا تھا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' شہرزاد کو یہ خبر سن کر حقیقتاً افسوس ہوا۔

''وہاں کی ایک ملازمہ میری دوست ہے۔ اس سے فون پر خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اسی نے بتایا ہے کہ بڑے صاحب کی بیماری کی خبر بھی جھوٹی ہے اور وہ لوگ اس بات کو چھپا رہے ہیں۔''

سندس کو شہرزاد کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مایوسی ہوئی، اس کا خیال تھا کہ وہ یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے گی یا پھر کم از کم تھوڑی بہت خوشی کا اظہار تو ضرور کرے گی لیکن دوسری طرف شہرزاد کے چہرے پر تاسف کا رنگ کم از کم اسے اچھا نہیں لگا۔

''اچھا باجی! میں اپنے کوارٹر میں چلتی ہوں۔'' سندس اس سے مایوس ہو کر اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گئی۔

شہرزاد نے ایک لمبا سانس لیا اور بمشکل چلتے ہوئے سٹنگ روم تک پہنچی تو اسے دیکھتے ہی ثینا بیگم ناراضی سے گویا ہوئیں۔

''اگر دو دن آفس نہیں جاؤ گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی، انسان کو کم از کم اپنی حالت کا خود احساس ہونا چاہیے۔''

وہ ان کے محبت بھرے انداز پر مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی، اور ملازمہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی، جبکہ ثینا بیگم ہنوز ناراض انداز میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ شہرزاد سمجھ گئی کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہ رہی ہیں۔

''سیفی سے جسٹس محمود نے خود رابطہ کیا ہے۔''

''کس سلسلے میں؟'' شہرزاد نے انجان بن کر پوچھا۔

''وہ رومیصہ کیس کو ختم کرنا چاہتے ہیں، اور اس سلسلے میں تم سے اور مجھ سے ایک میٹنگ کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''ممی! وہ رومیصہ والے کیس کو ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے سگے بھتیجے سلمان کو بچانا چاہتے ہیں جس نے آپ کی بیٹی کے کیس کے اہم گواہ صارم خان کا مرڈر کیا ہے، اب چونکہ آگ ان کے اپنے گھر تک پہنچ چکی ہے اس لیے وہ ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔''

''ہماری بلا سے، وہ جتنے بھی ہاتھ پیر ماریں، لیکن کم از کم یہ بات تو رومیصہ کے حق میں جاتی ہے۔'' ثینا بیگم نے ضرورت سے زیادہ صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہر قیمت پر رومیصہ کی اس کیس سے جان چھڑانا چاہ رہی تھیں۔

''صارم خان کی فیملی ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' شہرزاد کو ایک نئی پریشانی نے گھیرا۔

''بھاڑ میں جائے ساری دنیا، مجھے صرف اور صرف اپنی بیٹی کے بارے میں سوچنا ہے۔'' ثینا بیگم کے لہجے میں کوئی لچک نہ پا کر شہرزاد نے بھی ہتھیار پھینک دیے اور اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، آپ سیفی انکل سے کہہ دیں کہ وہ میٹنگ ارینج کروا دیں۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ثینا بیگم نے سکون کا سانس لیا کیونکہ انہیں پچھلے دو گھنٹے سے صرف شہرزاد کی ٹینشن تھی اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گی، تب ہی انہوں نے اپنا انداز شروع سے ہی جارحانہ رکھا اور اس میں ان کو کافی کامیابی ہوئی تھی۔

☆☆☆

حمزہ خالد کی خدمات کافی عرصے سے فوج کے ایک خفیہ ادارے کے سپرد کر دی گئی تھیں۔

وہ دوپہر میں لنچ کے لیے گھر آیا تو اس کے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر للی کے پھولوں کا خوب صورت گلدستہ چھوٹے سے ''سوری'' کے کارڈ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ایک خوب صورت اور نفیس سی پیکنگ میں اس کا فیورٹ پرفیوم چینل (Coco Noir) بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ کارڈ دیکھے بغیر بھی جان سکتا تھا کہ یہ شہرزاد نے بھجوایا ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے کارڈ کھولا۔ اس پر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔ صرف ایک کونے میں شہرزاد کے دستخط تھے اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور ریپر احتیاط سے اتار کر اسے بڑی محبت سے سونگھا اور پھر مسکرا دیا۔ کم سے کم اتنا تو ہوا تھا کہ شہرزاد کو اس کی پرواہ تھی؟

وہ جو کل رات سے جل رہا تھا یک لخت جیسے کسی ٹھنڈے جھرنے کے نیچے آن کھڑا ہوا۔ ایک عجیب قسم کا سکون

اس کی رگ وپے میں سرایت کر گیا تھا۔ایک رات اور ایک دن کی اذیت کے بعد وہ دل سے مسکرایا اور پھر وہ پرفیوم اور للی کے پھولوں کا بوکے اٹھائے اپنے بیڈ پر چلا آیا۔للی کے نازک خوب صورت پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شہرزاد کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ للی کے پھول اسے پسند ہیں، ہاں پرفیوم تو ہمیشہ وہ یہی لگایا کرتا تھا اور اس کے حلقہ احباب میں موجود تقریباً سب ہی لوگ اس بات کو جانتے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا خاص ملازم اندر آیا جس کے ہاتھ میں کافی تھی، حمزہ ہمیشہ لنچ کے فوراً بعد کافی لینے کا عادی تھا، ملازم کے ہاتھ سے کافی پکڑتے ہوئے وہ ایک لمحے کو کسی عجیب سے خیال سے چونکا تھا۔

''کیا شہرزاد یہ بات جانتی ہوگی کہ مجھے لنچ کے فوراً بعد بلیک کافی پینے کی عادت ہے؟ پھر وہ اپنی اس بے وقوفانہ سوچ پر خود ہی ہنس دیا، بھلا شہرزاد کیسے جانتی ہوگی؟

یہ تو وہ تھا جو اس کے پل پل کی خبر رکھا کرتا تھا، بھیڑ میں جب کبھی اس پر نگاہ پڑتی کسی بھی شاپنگ مال یا پکنک اسپاٹ پر جہاں پر وہ اپنی فیملی کے ساتھ یا کبھی اکیلی ہوا کرتی۔ وہ ہجوم میں اسے فون کال ملا کر اکثر ہی اس کی تعریف کر دیا کرتا تھا اور جس بے تابی سے شہرزاد کی نگاہیں اسے پورے مال میں ڈھونڈا کرتی تھیں، وہ ان آنکھوں میں بسی حیرت پر جی جان سے قربان ہو جاتا، اس کا دل چاہتا کہ وہ اس کے سامنے جا کر اسے مزید حیران کر دے لیکن کچھ تھا جو ہمیشہ اسے روک دیا کرتا تھا۔

اور اب للی کے پھولوں پر ہاتھ پھیرتے نجانے کتنی یادیں تھیں جو اس کے چہرے کو سنہرا پن عطا کر رہی تھیں۔محبت عطا ہی ایسی ہے جس دل پر ہو جائے اسے بہت خوب صورت بنا دیتی ہے۔

اور اگر اس سے شہرزاد حمزہ خالد کی آنکھوں میں جگمگ کرتے اپنے نام کے جگنو اور اس کے چہرے پر پھیلی خوشی ومحبت کا سنہرا پن دیکھ لیتی تو پاگل ہو جاتی، قافلے اپنی راہ بھول جاتے، داسی اپنی دیوتا کے قدموں میں تاعمر کے لیے بیٹھ جاتی۔

بلیک کافی کا آدھا مگ شہرزاد کی یادوں میں ختم ہو چکا تھا تب ہی حمزہ کو احساس ہوا کہ اسے شہرزاد کو اس ''سرپرائز سوری'' کے لیے کھینکس کی کال کرنی چاہیے۔اگلے ہی لمحے وہ اسے کال ملا رہا تھا۔

دوسری جانب شہرزاد اپنے کمرے میں بیٹھی احمد عباسی کے کیس کو ایک بار پھر سے پڑھ کر مختلف قسم کے پوائنٹس بنا رہی تھی کیونکہ مسز عالیہ قریشی سے اس کا رابطہ ہو گیا تھا، وہ اسلام آباد میں نہیں تھیں لیکن انہوں نے فون پر ہی اسے کچھ انسٹرکشنز دے دی تھیں جنہیں اب شہرزاد فالو کر رہی تھی۔

وہ مگن انداز میں اپنے سامنے اپیل کا لیپ ٹاپ کھولے پنسل میں منہ دبائے لیپ ٹاپ کے آگے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔پاس ہی کافی کا مگ رکھا ہوا تھا جو کہ اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔شہرزاد کام کے دوران یوں ہی کھو جایا کرتی تھی۔

لیکن فون کی پہلی ہی بیل پر وہ متوجہ ہوئی تھی۔یوں جیسے وہ خود بھی اس فون کال کی منتظر تھی۔نمبر پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دی، لیکن اس نے اگلے ہی لمحے ہی کال اٹینڈ کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ کا گلا بڑی صفائی سے گھونٹا۔

وہ شہرزاد تھی جو کہ بالکل بھی عام لڑکی نہیں تھی اور عام تو حمزہ خالد بھی نہیں تھا، وہ محبت میں لپٹے سنہرے دل کا مالک ایک باہمت ذمہ دار فوجی افسر ہونے کے ساتھ ایک قابل اور محبت کرنے والا انسان تھا۔

جس کا بخت بہت بلند اور ماتھا بہت روشن تھا۔وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے بظاہر شہرزاد کو ستانے کے موڈ میں تھا۔اب اتنی زیادہ اہمیت ملی تھی۔فوراً رام ہونے کی خواہش کے باوجود وہ شہرزاد کو مطمئن ہونے کا موقع کبھی بھی نہیں دیتا۔

''زخم دے کر مرہم لگانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی حمزہ نروٹھے پن سے کہہ رہا تھا

شہرزاد دوسری جانب ہلکا سا مسکائی لیکن گھبرائی بالکل بھی نہیں یوں جیسے وہ ایسی ہی کسی بات کی توقع کر رہی تھی۔

''وجہ تو میری بھی سمجھ میں نہیں آئی..... آپ کی بزدلی کی۔'' شہرزاد نے جو پنسل منہ میں دبا کر رکھی تھی وہی کانوں کے پیچھے اڑس لی تھی اور اب اطمینان سے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''مجھے بھی اپنے دل سے اسی بات کا گلہ ہے مگر وہ بے چارہ بھی کیا کرے، برسوں جس لڑکی سے محبت کی اگر وہ اس کے بجائے کسی اور بندے کی پرواہ کرے گی تو برا تو لگے گا۔''

حمزہ خالد نے بالکل بھی برا نہیں مانا تھا اور اگلے ہی لمحے جیسے ہتھیار پھینک دیے تھے، اسے اپنی ہار کا اقرار کرنا اچھا لگا تھا، جس سے آپ کو محبت ہو، اس کے سامنے جھکنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے، ایک الگ سا سرور جو کسی بھی قسم کی شرمندگی کے بجائے ایک تفاخر عطا کرتا ہے۔

''چہ چہ چہ..... پھر تو آپ کا دل بڑا ہی دھوکے باز نکلا میجر حمزہ! مجھے اس سے ایسی کم ہمتی کی امید نہیں تھی۔'' وہ بھی شرارت کے فل موڈ میں تھی۔

''مجھے دل کے اس دھوکے پر فخر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں، اس نے میرے ساتھ بے وفائی کے لیے کسی عام لڑکی کو نہیں چنا اور اب وہ ایسی ہزار بھی بے وفائیاں کرے مجھے پروا نہیں کیونکہ میری پسند عام نہیں۔'' اگلے ہی لمحے شہرزاد بری طرح گھبرائی، وہ میجر حمزہ سے ایسی کھلی بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اسے خاموش پا کر وہ اچانک ہی بے تابی سے بولا تھا، شہرزاد فوراً اپنے حواسوں میں آئی۔

''کچھ نہیں۔یہیں ہوں، آپ کی بات سن رہی تھی۔'' اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

''اچھا۔مجھے لگا جیسے میرا محبت نامہ سن کر گھبرا گئی ہو۔'' وہ جیسے دوسری جانب مسکرایا تھا لیکن شہرزاد کا دماغ بھک کر کے اڑا تھا۔اس قدر صحیح اندازہ لگانے پر، کیا تھا وہ شخص جو سوچیں تک پڑھ لیتا تھا۔

''زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، ٹیلی پیتھی نہیں جانتا میں، لیکن میں خود بھی نہیں جانتا کیسے تمہارے بارے میں میرا دل مجھے ہر خبر دے دیتا ہے۔''

اگر اس نے سوچا تھا تو حمزہ نے اگلے ہی لمحے اس کی پریشانی دور کرنے کی اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی لیکن شہرزاد بری طرح ہل گئی تھی۔

''جی نہیں۔میں حیران نہیں ہو رہی تھی بلکہ یہ سوچ رہی تھی کہ کتنا فالتو ٹائم ہے آپ کے پاس، جو ایسی بے کار سی باتوں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔'' شہرزاد نے اگلے ہی لمحے اپنی خفت مٹانے کے لیے خفگی سے بولا تھا، تو حمزہ کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

''بھئی یہ فضول اور بے کار کام تو میں ساری عمر بغیر کسی صلے اور تمنا کے کر سکتا ہوں بس موقع چاہیے۔'' وہ اور بھی زیادہ بے باک ہوا تھا آج تو اسے میجر حمزہ خالد حیران کرنے پر تلا ہوا تھا، اس نے کبھی اس سے ایسی گفتگو نہیں کی تھی جب بھی ہوئی تھی ہمیشہ سنجیدہ سے انداز میں وہ اسے اپنی فکر کرتا دکھائی دیا تھا، مگر وہ یہ بھول رہی تھی کہ وہ حمزہ خالد اب اس کے سامنے اپنے تمام تر جذبوں کی سچائی سمیت آن کھڑا ہوا تھا، اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔

''تم نے بتایا نہیں میری سروسز کیسی ہیں اور تمہیں کیسی لگتی ہیں؟'' وہ ابھی بھی مائل بہ شرارت تھا۔

''میں نے ایسی باتیں سننے کے لیے کال ریسیو نہیں کی۔'' وہ خفگی سے بولی تو حمزہ ہنس دیا کیونکہ وہ جانتا تھا شہرزاد لاجواب ہو رہی ہے اور اسی لیے خفت زدہ بھی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں آدھے گھنٹہ میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔ریڈی ہو جاؤ، ڈنر ساتھ کریں گے۔ اس نے اگلے ہی لمحے پلان ترتیب دیتے ہوئے جیسے آرڈر کیا تھا، شہرزاد سن کر اور بھی خائف ہو گئی۔

''ہرگز نہیں۔ میں بہت اہم کیس پر نوٹس بنا رہی ہوں، مجھے ہر حال میں کل مسز قریشی سے ڈسکس کرنا ہے اور.....'' لیکن اس نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔ کیس کی فائلز ساتھ لے آؤ۔ نوٹس میں بنا دوں گا۔'' اس نے جیسے اس کے انکار کو چٹکی میں اڑایا تھا۔ شہزاد کو ہنسی آ گئی۔

''اب آپ اوور اسمارٹ ہو رہے ہیں میجر صاحب! یہ آپ کا پروفیشن نہیں ہے۔'' اس نے جان بوجھ کر اس کا نام نہیں لیا، وہ مسکرا دیا۔

''تو کیا ہوا، تم میں اور مجھ میں کوئی فرق تھوڑی ہے، میں تو تمہیں خود سے الگ نہیں سمجھتا، کیا تم سمجھتی ہو؟'' حمزہ خالد نے اگلے ہی لمحے گمبھیر لہجے میں اپنے لہجے کو سوالیہ کیا تھا۔

لیکن شہزاد کے کان کی لوئیں اس سوال پر سرخ ہو گئی تھیں۔ اسی لیے اس نے بغیر کچھ کہے اگلے ہی لمحے فون کال کاٹ دی تھی اور وہ اپنی اس حرکت پر خود ہی ششدر تھی، اس جیسی با اعتماد لڑکی سے ایسی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی پھر وہ کیا چیز تھی جو شہزاد کو سٹپٹانے پر مجبور کر گئی تھی۔ کیا وہ اپنے جذبات سے خائف ہو گئی تھی وہ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن میجر حمزہ خالد جانتا تھا اس کی محبت کی شدت سے شہزاد ابھی واقف نہیں ہے اس لیے اسے قبول کرنے میں اسے کافی وقت لگے گا۔

اسی لیے اس نے فون بند ہونے کا برا مانے بنا ایک میسج کر دیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ ابھی کچھ ہی دیر میں اسے پک کرے گا اور اس کی خواہش ہے کہ وہ آج پنک کلر کا لباس پہنے اور اس یقین کے ساتھ سینڈ کیا تھا کہ وہ اسی رنگ میں اس کے سامنے آئے گی، اس کا موڈ یک لخت ہی بڑا خوش گوار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ہادی کا دماغ سوچ سوچ کر اب پھٹنے کے قریب تھا۔ غصہ حد سے سوا تھا۔ اسے درشہوار کی ڈھٹائی تاؤ دلا رہی تھی۔ کس بے شرمی سے وہ اس کے منہ پر جھوٹ بول رہی تھی اور اس کے اسی جھوٹ نے آج اس کے والدین کی نگاہوں میں اس کے کردار کو مشکوک بنا دیا تھا۔

وہ مٹھیاں بھینچے کافی دیر سے لاونج میں بیٹھا ہوا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ درشہوار کہاں ہے، لیکن جیسے عبداللہ قریشی اور عالیہ قریشی نے بھی اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ اچھی طرح سے سوچ لے کہ اب اسے اگلا کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے آیا وہ خود اپنے اور اس کے تعلق کو مانے گا یا یہ کام اس کے والدین کو کرنا ہو گا۔

دوسری جانب درشہوار الگ اندر سے ڈری ہوئی تھی، اتنی بڑی بازی کھیل چکی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب اس کا نتیجہ اس کے حسب منشاء نکلتا ہے یا نہیں۔ اس نے ضد اور ہٹ دھرمی میں اتنا بڑا اقدم تو اٹھا لیا تھا لیکن اس کی نیا ڈوبے لگی یا پار لگے گی اس سے وہ بالکل بھی واقف نہیں تھی؟

مسز عالیہ قریشی اسے سعد کے کمرے میں بٹھا کر گئی تھیں اور وہ کافی دیر سے وہیں پر بیٹھی ہوئی تھی، یہ الگ بات کہ بار بار اس کا ذہن میر ہاؤس کی جانب جا رہا تھا۔ اس وقت تو جذبات میں آ کر اتنا بڑا اقدم اٹھا لیا تھا لیکن اب اسے رہ رہ کر اس خاندان کی لڑکیوں کی فکر ہو رہی تھی اور سب سے زیادہ انابیہ کی، جانے گھر کے مرد اس سے کیسے کیسے سوال کر رہے ہوں گے اور وہ بے چاری تو کچھ جانتی بھی نہیں تھی، لیکن بھلا کون ان کی اس بات کا یقین کرے گا؟

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ کمرے کا دروازہ کھول کر عالیہ قریشی اندر داخل ہوئی تھیں اور جو بات انہوں نے درشہوار سے کہی تھی، اسے سن کر ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

''دیکھو بیٹا! اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی حل نہیں ہے۔ ہم بھی خاندانی لوگ ہیں ہمیں احساس ہے

اس وقت تمہارے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم تمہیں گھر چھوڑ آئیں۔''

''مجھے جان سے مار دیں آنٹی! لیکن مجھے میر ہاؤس واپس مت بھیجیں۔ وہ لوگ مجھے تو جان سے ماریں گے ہی لیکن ساتھ میں ہادی کی بھی جان لے لیں گے۔''

درشہوار ہاتھ جوڑتے ہوئے رو دی تو مسز قریشی کے دل پر بھی جیسے پاؤں پڑا۔ یہ بات انہوں نے کیوں نہیں سوچی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس قماش کے وہ لوگ تھے۔ ان سے تو کوئی بعید بھی نہیں تھا کہ گھر کی عزت بچانے کو وہ ہادی کو مروا کر اس کا نشان مٹا سکتے ہیں۔ مسز قریشی کے لیے آگے کنواں پیچھے کھائی والی سچویشن تھی، ایک جانب ہادی تھا جو یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس نے درشہوار سے کوئی وعدے کر رکھے ہیں اور دوسری جانب اس لڑکی کے آنسو اور ہادی کی محبت میں اٹھایا گیا اتنا بڑا اقدم تھا۔ وہ بری طرح سے تھک چکی تھیں۔

''تو تم ہی بتاؤ، اس کا کوئی حل ہے؟'' انہوں نے تھک ہار کر درشہوار سے پوچھا اور جواباً جو بات اس نے عالیہ قریشی سے کہی تھی اس بات نے تو ایک لمحے کے لیے انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ لڑکی جب سے آئی تھی انہیں جھٹکے پر جھٹکے دے رہی تھی۔

☆☆☆

''تو پھر کیا سوچا تم نے؟'' عبداللہ قریشی نے کب سے خاموش اور الگ تھلگ بیٹھے ہادی سے پوچھا جواب ان دونوں سے بات نہیں کر رہا تھا۔

''میں اپنا سچ آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں، اب آپ پر ڈیپنڈ کرتا ہے کہ سگے بیٹے کی بات کا یقین کرنا ہے یا اس جھوٹی مکار لڑکی کا جو گھر کی عزت مٹی میں رول کر یہاں سکون سے بیٹھی ہوئی ہے۔''

ہادی کے لہجے سے پھوٹتی نفرت کی چنگاریاں ایک لمحے کو عبداللہ قریشی کو چونکا گئی تھیں لیکن بہر حال اس لڑکی کے زندہ سلامت وجود کی اہمیت زیادہ تھی۔ اسی لیے انہوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ، پھر کیا کیا جائے کیونکہ اس نے تو واپس جانے سے انکار کر دیا ہے؟'' عبداللہ قریشی کی بات سن کر ہادی کے چہرے کے عضلات تن گئے اور وہ پھنکارا۔

''کیا مطلب، وہ کون ہوتی ہے فیصلہ کرنے والی۔ میں ابھی خود اسے اس کے گھر چھوڑ کر آؤں گا، بلکہ اس کے کالے کرتوت اس کے خاندان والوں کو بتا کر آؤں گا، جو سیاست اور کرسی کے نشے میں اپنی گھر کی لڑکیوں کی تربیت کرنا بھول گئے ہیں۔''

ہادی کے لہجے کی کاٹ غیر معمولی تھی اور اس سے بھی زیادہ حیران کن اس کا اگلا عمل۔ وہ بہت تیزی سے اٹھا تھا اور سعد کے کمرے میں پہنچا تھا جہاں پر وہ بے شرم لڑکی بیٹھی تھی۔

''رک جاؤ ہادی! میں نے کہا، رک جاؤ؟'' عبداللہ قریشی فوراً ہی اس کی جانب لپکے تھے لیکن ہادی پر تو کوئی جنون سوار تھا، اسی لیے تو وہ کسی کی بھی نہیں سن رہا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا۔ عالیہ قریشی اور درشہوار اسے یوں اچانک دیکھ کر سہم سی گئی تھیں۔

''اٹھو۔ بہت ہو گیا درشہوار بی بی! بہت کھیل کیا تم نے یہ گھناؤنا کھیل۔ اب اس کا کلائمکس کا ٹائم ہوا چاہتا ہے۔'' ہادی کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور زبان زہر اگل رہی تھی۔ درشہوار اندر سے بری طرح ڈر گئی تھی لیکن وہ اپنا ڈر اس وقت ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

''مم..... میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو اپنے ساری کشتیاں تمہاری خاطر جلا آئی ہوں۔'' درشہوار نے منمنا کر کہا تھا۔ اسی وقت عبداللہ قریشی بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ کچھ بھی تھا یہ درشہوار کی زندگی کی سب سے

بڑی بازی تھی جسے اسے ہر حال میں جیتنا تھا اسی لیے اس کا حواسوں میں رہنا لازمی تھا۔

''تم نے اپنی کشتیاں ہی نہیں جلائیں بلکہ مجھے بھی جیتے جی مارنے کا پلان بنایا ہے اور اس کی معافی تمہیں ہرگز نہیں ملے گی۔ تمہیں جرأت بھی کیسے ہوئی میری زندگی کے ساتھ کھیلنے کی۔''

وہ غصے میں اتنا بپھرا ہوا تھا کہ اسے مارنے کے لیے لپکا لیکن بیچ میں عالیہ قریشی نے آکر اسے روکا تھا ورنہ وہ درشہوار کی طبیعت ایک بار پھر سیٹ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''میں ابھی شاہ میر کو فون کر کے اسے یہاں بلاتا ہوں۔ وہ خود ہی تمہارے بڑوں کو تمہارا کارنامہ بتا دے گا۔ اپنی بات پر عمل کرنے کے لیے وہ اگلے ہی لمحے اپنی جیب سے سیل فون نکالنے لگا تھا کہ عالیہ بیگم نے ہادی کے ہاتھ سے فون تقریباً چھیننے والے انداز میں لیا تھا، وہ خود بھی ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھیں۔

''کیا کر رہے ہو ہادی! جانتے بھی ہو، اپنی موت کو خود آواز دے رہے ہو تم۔'' عالیہ قریشی نے غصے سے کہہ کر اس سے فون چھینا۔

''اس لڑکی کو سبق سکھانے کے لیے مجھے جان سے بھی جانا پڑا تو مجھے پروا نہیں ہے ماما! میں اسے یوں اپنی زندگی سے کھیلنے نہیں دوں گا۔'' وہ ایک بار پھر آگے بڑھا لیکن اس بار عالیہ قریشی نے اسے نہیں روکا بلکہ عبداللہ قریشی بیچ میں آگئے تھے۔

''بس بہت ہو گیا ہادی! تمہیں لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' ہادی اگلے ہی لمحے ساکت ہوا یوں جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی اس پر انڈیل دی ہو۔ اس کے بابا ابھی بھی اس لڑکی کو سپورٹ کر رہے تھے انہیں اپنے بیٹے کی پروا تھی نہ اس کا یقین اور یہی بات اسے زیادہ اذیت دے رہی تھی۔

''آپ جانتے ہیں، یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔'' ہادی بولا تو اس کے گلے میں نمکین سا پھندا لگ گیا۔

''لیکن یہ تم سے ملنے گھر آتی رہی ہے، یہ جھوٹ نہیں ہے۔ اکثر تمہارا اور اس کا سامنا ہوتا رہا ہے اور وہ بلا وجہ نہیں تھا نہ ہی کوئی لڑکی اپنی جان خطرے میں ڈال کر یوں آسکتی ہے۔'' عبداللہ قریشی بولے تو ہادی نے تنفر سے ایک بار پھر درشہوار کو دیکھا جو سر جھکائے بس اپنے ناخن چبائے جا رہی تھی۔

''اس جیسی آوارہ لڑکیاں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔'' ہادی کو باپ کی بدگمانی اور درشہوار کی سپورٹ اتنی بری لگی کہ فوراً کہہ گیا۔

''ہادی..... مائنڈ یور لینگویج۔ میں نے تمہاری ایسی تربیت نہیں کی کہ تم خواتین کی عزت کرنا بھول جاؤ۔'' وہ دھاڑے۔ عالیہ قریشی آگے بڑھی تھیں اور عبداللہ قریشی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے، یہ کوئی وقت ہے یوں جھگڑا کرنے کا۔ صرف یہ سوچیں کہ اس مصیبت سے نجات کیسے مل سکتی ہے۔''

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... ابھی کچھ ہی دیر میں ہم اسلام آباد کے لیے نکل رہے ہیں اور وہاں پہنچتے ہیں ہم ہادی اور درشہوار کا نکاح کروا دیں گے۔''

عبداللہ قریشی کے اس جملے نے جہاں درشہوار کو خوش گوار حیرانی میں مبتلا کیا تھا، وہیں پر ہادی کے وجود کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے تھے۔ وہ بے یقین سا اپنے باپ کی جانب دیکھ رہا تھا، اس کا وجود ایسے ساکت ہو گیا تھا جیسے ہاتھ لگے گا تو ابھی گر جائے گا۔

''باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ''

BOOKSPK
Books & Magazines

عاصمہ فرحین

زید اور ہیرے کی انگوٹھی

کلاس آف ہونے کے بعد وہ بھی اسٹوڈنٹس کے ہمراہ باہر نکلا تھا۔

''زید!'' اسے اپنے عقب سے کشمالہ کی آواز سنائی دی تھی مگر پھر بھی وہ ڈھیٹ بن کر تیمور کے ہمراہ چلتا رہا اور ساتھ ہی اپنے قدموں کی رفتار بڑھالی تھی۔

مگر ادھر کشمالہ نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی، تقریباً بھاگتے ہوئے وہ زید کے پیچھے آئی اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''زید! تم میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتے۔ تمہیں میری بات سننا ہوگی۔'' کشمالہ غصے سے تنتنائی ہوئی تھی۔

تیمور نے ایک نظر کشمالہ پر ڈالی پھر زید سے کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے اکیلے ہی لائبریری چلے جانا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا زید! او کے بائے۔'' اور لائبریری کی طرف رخ کر لیا۔

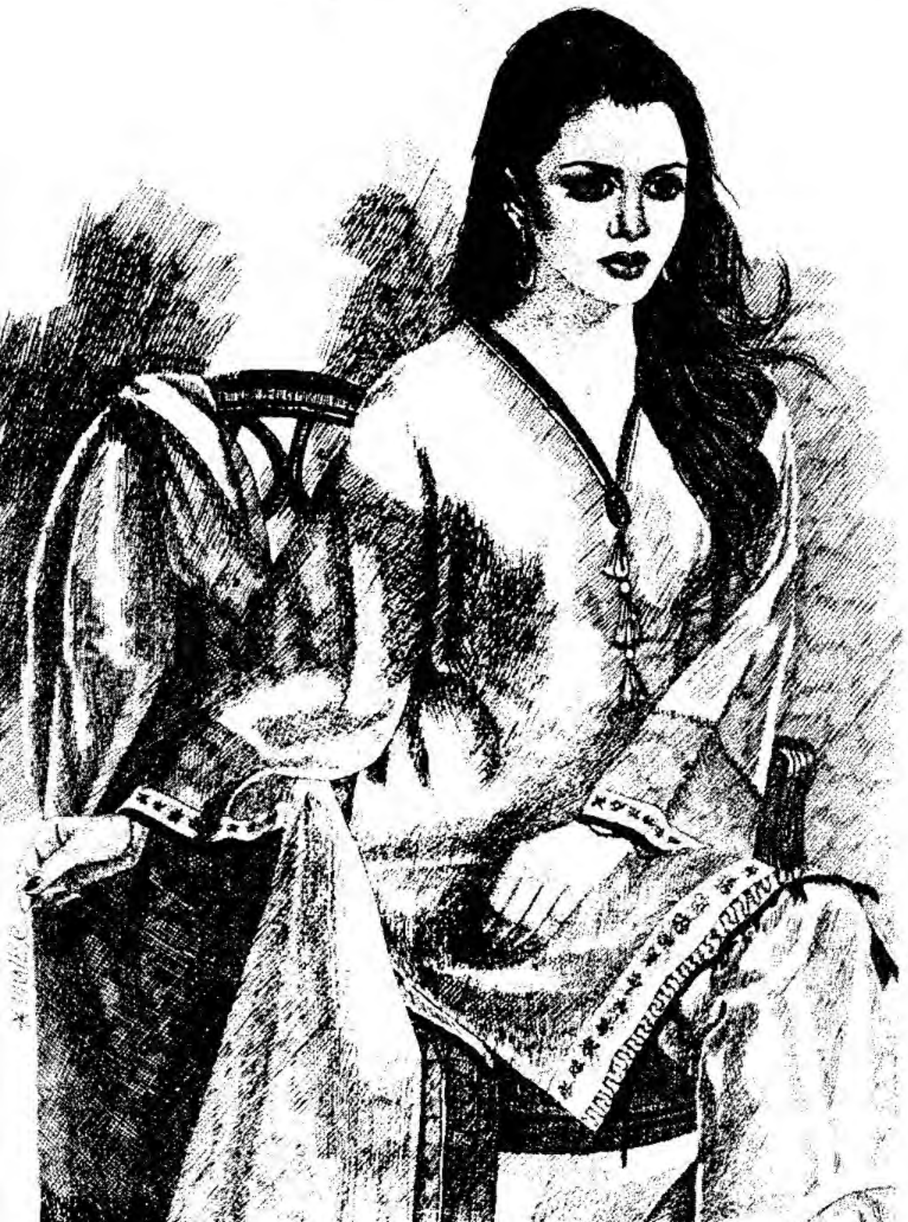

''تیمور! رکو یار..... میں بھی چلوں گا، تم بھی نہ کشمالہ حد کرتی ہو۔ سر حبیب نے اسائنمنٹ دیا ہے، وہ مکمل کرنا ہے اور تم میرے سر پر آ کھڑی ہوئی ہو۔ اگر تمہیں کوئی کام تھا تو مجھے میسج کر دیتیں، ویسے بھی میں آج کل بہت مصروف ہوں۔''

''ایک ہزار ایک سو ایک میسجز..... دو سو دو مس کالز، ان دو دنوں میں تمہارے سیل فون پر آ چکی ہوں گی۔ اب یہ نہیں معلوم ہے کہ تمہارا اتنا پرانا ماڈل انہیں سہہ پایا یا نہیں۔'' کشمالہ نے طنز کے تیز چلائے تھے۔

''یاد رکھو! اس وقت تم مجھ سے بات کر رہی ہو، میرے سیل فون کو کچھ مت کہنا۔'' زید نے خفگی اختیار کی۔

''یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے بابا نے مجھے دلوایا تھا جب میں نے ایف کام میں ٹاپ کیا تھا۔''

اس کی بات کاٹ کر کشمالہ نے اس کا جملہ پورا کیا تھا اب ان کا رخ کیفے ٹیریا کی طرف تھا۔

آرڈر دینے کے بعد زید کشمالہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے جس کے لیے تم اتنی بے چین ہو رہی ہو۔''

''ابا میاں نے میرے رشتے ڈھونڈنے شروع کر دیے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ تمہاری قسمت پھوٹ جائے۔'' کشمالہ نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

''یار کشمالہ! جب تک نوشین آپی کی منگنی نہیں ہو جاتی، بابا اور مما میرے لیے کچھ بھی نہیں سوچیں گے۔ ویسے بھی وہ چاہتے ہیں کہ پہلے میں سیٹل ہو جاؤں۔''

وہ سنجیدگی سے گویا تھا۔ مگر اس کی بات سن کر کشمالہ جھنجلاتی ہوئی کرسی سے اٹھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم.....'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کیفے ٹیریا سے باہر نکل گئی جبکہ وہ آوازیں دیتا ہی رہ گیا۔

زید اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، ذاکر بھیا، ارم آپی، نوشین آپی پھر زید تھا۔

ذاکر بھیا شادی کے دو سال بعد ہی علیحدہ ہو گئے تھے۔ ارم آپی کی شادی بھی ہو چکی تھی مگر اب اس کے ماما اور بابا نوشین کے رشتے کے لیے پریشان تھے۔

وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے بابا ایک پرائیوٹ فرم میں ملازمت کرتے تھے اور ماما گورنمنٹ ٹیچر تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب وہ ایک اسکول میں پرنسپل تھیں۔ نوشین آپی بھی ماسٹرز کرنے کے بعد ٹیچنگ کر رہی تھیں اور زید ایم۔ بی۔ اے کر رہا تھا، یہ اس کا لاسٹ ایئر تھا۔

یونیورسٹی سے واپسی پر وہ مختلف ٹیوشنز پڑھاتا تھا، مگر پھر بھی اس کے اخراجات ماما اور بابا کی مدد کے بغیر پورے نہیں ہوتے تھے۔

وہ اور کشمالہ ایک دوسرے کو دو سالوں سے جانتے تھے، جب وہ اس کے پاس اپنے اسائنمنٹ کے لیے مدد مانگنے آئی تھی اور پھر وہ اس سے اتنا متاثر ہوئی کہ اب اس کا کوئی بھی کام زید کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ یہ ملاقاتیں، پسندیدگی سے محبت میں بدل چکی تھی۔ زید اسے پرپوز کر چکا تھا، مگر ابھی تک وہ کسی بھی کمٹ منٹ سے بچنا چاہ رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ نوشین بھی تھی، جبکہ کشمالہ مسلسل دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اپنے پیرنٹس کو اس کے گھر لے آئے۔

''کیا ہوا زید؟'' جب وہ — منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوا، تو نوشین پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔

''کچھ نہیں۔'' اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

''بتاؤ..... نا.....''

''کیا بتاؤں؟ وہ کشمالہ تنگ کر رہی ہے، کہہ رہی ہے کہ ماما اور بابا کو اس کے گھر بھیجوں۔''

''آخر اسے اتنی جلدی کیا ہے، اس کی اسٹڈیز تو ابھی باقی ہے۔'' نوشین الجھی۔

''یہ ہی تو مسئلہ ہے، بس وہ کہہ رہی ہے کہ اس

لے ابا میاں، اب اس کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔'' اس نے کشمالہ کی نقل اتاری۔

''اگر اسے شادی ہی کرنا تھی تو بی۔ بی۔ اے کیوں کر رہی ہے؟'' وہ حیران تھی۔

''آپ کو ان امیروں کے چونچلے نہیں معلوم۔'' وہ بھی جھنجلایا۔

''لیکن زید! جو کچھ تم اس کے بارے میں بتاتے ہو، کیا وہ ہمارے گھر میں ایڈجسٹ کر سکے گی! ماما، بابا ابھی تک ذاکر بھیا کی خود غرضی نہیں بھولے۔''

''آپی! ایک بات بتاؤں، مجھ سے زیادہ وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ جیے یا مرے، میں اس گھر میں ہی رہوں گا۔ اگر وہ گزارہ کر سکتی ہے تو ٹھیک، ورنہ گڈ بائے۔'' وہ — جوش میں آ گیا۔

''اس نے کیا کہا؟'' نوشین نے مزے لیتے ہوئے پوچھا۔

''کہنے لگی ''اب اگر جیوں گی تو تمہارے ساتھ اور مروں گی تو تمہارے ساتھ۔'' اس نے اس طرح منہ بنایا کہ نوشین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اور پھر نوشین نے کس طرح ماما سے بات کی کہ اگلے ہی دن اس کا بلاوا ماما اور بابا کے کمرے میں تھا۔

''تم نے بتایا تھا کہ تم لانڈھی میں رہتے ہو۔'' بابا نے پوچھا۔

''جی!''

''اور یہ بھی کہ تمہارے والد کے ساتھ ساتھ تمہاری والدہ نے بھی پوری عمر نوکری بھگتائی ہے۔'' یہ ماما تھیں۔

''جی۔'' وہ مکمل تابعدار بیٹا لگ رہا تھا۔

''تمہاری ایک بڑی بہن بھی ہے، جس کی شادی کی عمر نکل رہی ہے۔'' یہ بابا کا نمبر تھا۔

''جی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ تم ریجیکٹ بھی ہو سکتے ہو۔''

''جی۔''

''کیا مطلب؟'' بابا نے گھورا۔

''نہیں..... نہیں..... میرا مطلب یہ نہیں تھا، اسے میرے حالات کے بارے میں سب معلوم ہے۔ بس اس کے ابا میاں اس کے لیے رشتے ڈھونڈ رہے ہیں، اسی لیے وہ گھبرا رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''ماما! آپ میرا یقین کریں، میں آپ کا مان کبھی بھی ختم نہیں ہونے دوں گا۔ بس ایک دفعہ..... کم از کم آپ کے بیٹے سے کسی کو کوئی شکایت تو نہیں رہے گی۔''

اس نے اب کی دفعہ کچھ اس اعتماد سے کہا تھا کہ ماما کو ماننا پڑا۔ ماما نے بابا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور انہوں نے سر ہلایا تھا۔

''ٹھیک ہے، پھر اس سے دن اور وقت معلوم کر لو۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''تھینک یو ماما! تھینک یو بابا!''

☆☆☆

زید کی فیملی کشمالہ کو دیکھنے اس کے گھر گئی تھی، زید کو نہیں بلایا تھا۔ ماما اور بابا کو جتنے خدشات اس کے گھر جانے سے پہلے تھے، واپسی پر نہ جانے کہاں رہ گئے تھے۔ نوشین آپی کو بھی کشمالہ بہت پسند آئی تھی۔

ماما اور بابا کشمالہ کے ابا میاں کو کہہ چکے تھے کہ وہ زید کی شادی نوشین کی شادی کے بعد ہی کریں گے۔ جب تک بچوں کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی، جس پر وہ ہنس دیے تھے۔

زید کو دیکھنے کے لیے ابا میاں کے ساتھ ان کی والدہ یعنی کشمالہ کی دادی بھی آئی تھیں۔ اسی سال کی عشرے میں ہونے کے باوجود وہ کافی چاق و چوبند تھیں۔ ابا میاں کی باتوں سے زید کو یہ ہی لگا کہ وہ بھی انہیں پسند آ چکا ہے مگر وہ باقاعدہ ہاں کرنے سے پہلے اپنے ایک چچازاد بھائی سے مشورہ کرنا چاہتے تھے جو کہ ان دنوں دبئی گئے ہوئے تھے۔

BOOKSPK Books & Magazines

زید تو ہواؤں میں اُڑ رہا تھا، نہ جانے کتنے دنوں تک اس نے چیلوں اور عقابوں کے ساتھ رہنا تھا اگر کیفے ٹیریا میں جوس پیتے ہوئے کشمالہ اس سے سوال نہ کر بیٹھتی۔

"تم نے رنگ بنوالی..... نا؟"

"کون سی؟"

"انگیجمنٹ رنگ۔"

"وہ تو ماما، بابا کا کام ہے نا۔ وہ اپنی پسند کی لائیں گے۔" وہ بادلوں پر لیٹا ہوا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے، ہمارے خاندان میں لڑکی کی انگلی میں کیا چیز دیکھی جاتی ہے؟"

"صاف ناخن؟" اس نے جوس میں سڑ سڑ کی۔

"ایڈیٹ..... رنگ۔" وہ بدکی۔

"تو پہن لو۔" وہ ابھی تک لاپروا تھا۔

وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی تھی، جوس کا گلاس اس کے سامنے سے ہٹایا تھا۔

"ہمارے خاندان میں لڑکی کو منگنی پر ہیرے کی انگوٹھی یعنی ڈائمنڈ رنگ پہنائی جاتی ہے، اس لیے تم بھی میرے لیے ڈائمنڈ رنگ لاؤ گے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔

"دیکھو! میں ایک غریب لڑکا اور اسٹوڈنٹ ہوں، تمہارے کار ساز والے نخرے نہیں اٹھا سکتا۔" اس نے ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

"ہاتھ نیچے کرو، سب دیکھ رہے ہیں۔" وہ گھبرائی۔

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ابا میاں کسی قسم کی کوئی فرمائش نہیں کریں گے۔ انہیں تو بس ایک اچھا لڑکا چاہیے مگر میری کزنز اور رشتے دار خواتین میرے ہاتھ میں رنگ ضرور تلاش کریں گی۔"

"یہ میری عزت کا سوال ہے۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"اگر تمہیں رقم چاہیے تو مجھ سے لے لینا۔ میں نے اپنی پاکٹ منی سے سیو کی ہے۔"

"یہ میری غیرت کا سوال ہے۔" وہ بھی سنجیدہ ہوگیا تھا اور آدھے گھنٹے سے بچا ہوا آدھا گلاس جوس، وہ آدھے منٹ میں ختم کر چکا تھا۔

☆☆☆

"یہ لو زید..... اور گوشت ویسا ہی لانا، جیسا میں نے بتایا تھا۔" ماما نے رقم اس کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"ماما! کل ہی تو سپر اسٹور گیا تھا، گوشت بھی وہیں سے منگوانا تھا..... نا۔"

"جب سے شادی ہو کر آئی ہوں، اسی دکان سے گوشت آتا ہے۔ صاف اور صحت مند جانور کا۔"

"آپ سے کون جیتے؟" وہ بڑبڑایا۔

"کچھ کہا؟"

"نہیں۔"

"کیا بات ہے زید بھائی! کچھ اداس سے دکھ رہے ہو۔" شاہ رخ نے گوشت کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے ناک پر سے مکھی اُڑائی۔

"کوئی لڑکی وڑکی کا چکر تو نہیں ہے نا؟" آگے کی طرف منہ کر کے سرگوشی کی۔

زید نے لب بھینچ لیے۔

"اللہ کی قسم! مجھے معلوم تھا۔"

"نہیں یار! ایسی بات نہیں ہے، بس ایک مسئلہ ہوگیا ہے، کچھ پیسے چاہیے تھے۔ کوئی سائڈ بزنس بتاؤ، جس میں مجھے اچھی رقم مل جائے۔"

"زید بھائی! تم نے تو پوری عمر پڑھائی کی ہے، کیسے..... کوئی بھی کام کرلو گے؟" وہ حیران تھا۔

"تم اس کی فکر چھوڑو، بس حلال رقم ہو۔ میں کچھ بھی کرلوں گا۔"

"ایک کام ہے۔"

اور وہ اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگا،

BOOKSPK Books & Magazines

...ے، وہ بولتا گیا، زید کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔

☆☆☆

کراچی سپر ہائی وے پر ایشیا کی سب سے بڑی ...ی منڈی کیا سجی، گلی محلے بھی بیل اور بکروں سے ...نے لگے۔ کہیں دنبوں کا مقابلہ ہوا اور کسی کا بکرا چوری ...ا۔

زید آج کل بہت مصروف تھا، اس کے شب و روز کہاں گزر رہے تھے، کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ صبح جاتا، رات کو لوٹ کر آتا۔ نوشین کو بھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

بقر عید کی چاند رات تھی، اس نے زید کو آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے دیکھا تھا۔

"زید! یہ تم ہو؟" وہ چیخی۔

"کیوں، کیا ہوا؟ یہ میں ہی ہینڈسم سا لڑکا ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دائیں بائیں رخ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لمبے بال..... لبوں کے اوپر آئی مونچھیں..... بڑھی ہوئی شیو۔

"اپنا حلیہ درست کرواؤ، ابھی تمہاری سسرالی پریڈ باقی ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

بقر عید کی صبح بکرا کٹوانے میں وہ پیش پیش تھا، بابا کو الجھن ہوئی تھی۔ عموماً وہ ایسے کاموں سے دور بھاگتا تھا، آخر وہ آئی۔ بی۔ اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ پھر اس نے ماما سے جانے کے لیے اجازت لی تھی۔

"ارے کچھ کھا تو لیتے۔"

"میرے لیے رکھ دیجیے گا۔"

"گوشت کون بانٹے گا؟"

"ذاکر بھیا! میں نے ان سے بات کرلی ہے۔" اور ماما نے سر پیٹ لیا۔

"زید..... زید....." بابا اسے پکارتے ہوئے آئے تھے۔

"وہ تو گیا۔"

"کہاں؟"

"بابا! اسے عید کے چوتھے دن اسائنمنٹ جمع کرانا تھا تو اس لیے اسے اپنے گروپ کے ساتھ کچھ کام کرنا تھا۔" نوشین نے جلدی جلدی بتایا۔

"بقر عید والے دن۔" بابا دھاڑے تھے یا نوشین کو محسوس ہوا تھا۔ "یا تو تم سب پاگل ہو، یا مجھے پاگل بنا رہے ہو۔ آنے دو..... آج اسے بتانا ہی پڑے گا کہ آخر چکر کیا ہے۔"

"بابا! وہ عید کے تیسرے دن آئے گا، بیگ پیک کر کے لے گیا ہے۔" نوشین اٹکی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" بابا نے اب ماما کو گھورا تھا۔

"میں آپ کو کیا بتاتی اور کب بتاتی..... آپ کے تو صبح و شام اس بکرے کی ناز برداری میں گزر رہے تھے۔" ماما نے منہ بنایا تھا اور کچن کا رخ کرلیا تھا کیونکہ اب وہاں سے خوشبوئیں آرہی تھیں۔

☆☆☆

آج عید کا تیسرا دن تھا، کشمالہ بہت بور ہو رہی تھی، اس کا چھوٹا بھائی بلال بھی چچا میاں کے ساتھ مصروف تھا۔ آخر پانچ بکروں کی قربانی تھی، وہ، دادی اور بلال اس وقت چچا میاں کے گھر ڈیفنس آئے ہوئے تھے۔ ابا میاں دبئی گئے ہوئے تھے۔ زید اس کی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ بہت بار دل چاہا کہ نوشین آپی سے اس کے بارے میں پوچھ لے مگر شرم کے مارے نہیں پوچھ سکی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ڈیمانڈ بہت بڑی ہے۔ اسی لیے سوچ رہی تھی کہ اسے زید کو منع کر دینا چاہیے، کیا فائدہ ایسی انگوٹھی کا۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں بات بھی نہ کرسکیں۔

"کشمالہ! ذرا کچن میں بوا کے ساتھ ہاتھ بٹواؤ۔ کل کو تمہاری شادی ہوگی تو ساس صاحبہ کہیں گی کہ دادی نے پوتی کو کچھ نہیں سکھایا۔"

"جی دادی اماں! جاتی ہوں۔"

"کشمالہ! ذرا قصائیوں کو پانی پلوا دو، کب سے کہا ہوا ہے، ان بے چاروں نے اور چائے بھی بنوا دینا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" موبائل فون کانوں سے لگائے کشمالہ کو ہدایات دے کر چچا الٹے قدموں

واپس پلٹے۔

چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی تھی، گلاس اٹھا کر بلال کو ڈھونڈنے لگی۔

"بوا! آپ لے جائے، پانی کی بوتل اور چائے۔" وہ بوا کو آوازیں دینے لگی۔

"کہاں چلے گئے یہ سب؟ چلو میں لے جاتی ہوں۔ اللہ میرا بھلا کرے گا، چوکیدار کو آواز دے کر دے دوں گی۔"

سر پر سلیقے سے دوپٹا جمایا، ٹرے میں کیتلی اور کپ سیٹ کیے۔ پانی کی بوتل اور گلاس رکھا اور گھر کے عقبی حصے کی طرف رخ کیا۔

"شاہ رخ! پانی منگواؤ تا، کیسے لوگ ہیں یہ؟ نہ چائے کا پوچھا نہ پانی کا۔ ان سے تو غریب ہی اچھے ہیں۔" زید نے منہ بنایا تھا۔

"زید بھائی صبر، بس یہاں ڈیفنس میں لوگوں کے گھر جتنے بڑے ہوتے ہیں نا، دل اتنے ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔" یہ شاہ کا رخ چھوٹا بھائی دلاور تھا۔

دفعتاً زید کی نظر اپنے سیل فون پر گئی، کشمالہ کے میسجز اور فون کالز کی بھرمار تھی۔

"کاش کشمالہ میرے لیے پانی لاتی۔ جس طرح دیہاتوں میں دیہاتی عورتیں اپنے کسان شوہروں کے لیے سر پر کھانا رکھ کر لے جاتی ہیں۔" پھر وہ اپنی سوچ پر خود ہی مسکرایا بھی تھا۔

اچانک اسے سامنے سے کشمالہ آتی ہوئی نظر آئی۔

"تمہارے عشق نے مجھے اتنا بے کار کر دیا ہے کہ تم مجھے ہر جگہ نظر آنے لگی ہو۔"

اس نے آنکھیں مسلی تھیں، شاید یہ میرا وہم ہے۔ اس نے بغدا اٹھایا تھا مگر نگاہیں سامنے تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ کشمالہ کی شبیہہ اس سے نزدیک تر ہوتے ہوئے اس کے سر پر آ پہنچی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں قصائیوں کے لیے چائے اور پانی کی بوتل تھی۔ جب اسے چوکیدار نظر نہیں آیا تو خود ہی آ گئی تھی۔

"زید..... یہ تم ہو؟" اس کی آواز کپکپائی تھی۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بغدا گوشت پر چلاتے ہوئے، کشمالہ سے نظریں چراتے ہوئے اپنی انگلی کو بھی زخمی کر لیا تھا۔

خون کا فوارہ دیکھ کر کشمالہ چیخی تھی۔

"زید!" اور اس کی آواز سن کر باہر سے آتے ہوئے چچا میاں اور بلال دوڑے چلے آئے تھے۔ کشمالہ کے ہاتھ سے شاہ رخ نے ٹرے لے لی تھی، مبادا وہ اسے گرا نہ دے اور خود اس نے زید کی انگلی اپنے دوپٹے سے ڈھک لی تھی۔

"تم تو کارساز میں رہتی ہو نا؟" زید کی آواز میں لرزش تھی۔ "پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"آج چچا میاں کے گھر قربانی تھی۔" وہ معصومیت سے بولی تھی اور ایسے ینگ سے چچا میاں کو دیکھ کر اسے غش آ گیا تھا۔

☆☆☆

بستر پر لیٹے لیٹے اس کے زخم اُدھڑ رہے تھے۔ انگلی کا زخم تو ایک طرف پورے جسم کی ہڈیاں چوں چوں بول رہی تھیں۔

آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ رات سے اپنے بستر پر دراز تھا۔ اسے تیز بخار تھا، اس لیے بابا اس کی کلاس نہیں لے پائے تھے۔

وہ اس وقت کو کوس رہا تھا، جب وہ شاہ رخ کی باتوں میں آیا تھا جب اس نے شاہ رخ سے سائڈ بزنس کا پوچھا تھا۔

"میرے مامے کے فارم ہاؤس پر یہ لمبی لائن ہے بیل، بکروں کی۔ انہیں کوئی پڑھا لکھا بندہ چاہیے، جو اُن کی ڈیلنگ کر سکے، تنخواہ کے ساتھ کمیشن بھی ہوگا۔"

"ایک مہینے کی تنخواہ اور کمیشن سے کیا ہوگا؟ مجھے بائیک بھی خریدنی ہے۔"

"لو..... یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ میرے ساتھ چلنا، بیل، بکرے کٹوانے۔ اللہ کی قسم! جب ہاتھ میں پیسے آئیں گے نا، دل خوش ہو جائے گا، میں

BOOKSPK Books & Magazines

[illegible] ہی ڈیفنس والوں کے لیتا ہوں۔"

"لیکن یار! میں نے تو کبھی گھر پر بھی قربانی [illegible] نہیں دیکھی ہے۔"

"زید بھائی! پیسے چاہئیں؟"

"چاہئیں۔"

"بس تم تیار ہو جاؤ، باقی میرا کام ہے۔ بس [illegible] حلیہ بگاڑ لو تاکہ کوئی پہچانے نہ....."

"کشمالہ کی بچی نے پہچان لیا..... آہ۔" اس [illegible] دل کے ساتھ ساتھ گھٹنوں سے بھی آوازیں نکلی [illegible]۔

کشمالہ تو چچا میاں کو دیکھ کر اندر بھاگ گئی تھی [illegible] چچا میاں اتنا بول کر گئے تھے۔

"اب آپ اگر آ ہی گئے ہیں تو کام بھی پورا [illegible] کر کے جائیے گا۔" اور اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

سیل فون دیکھا۔ کشمالہ کا نہ تو کوئی میسج تھا اور نہ ہی کوئی کال.....

"لگتا ہے، بالکل بے کار ہو گیا ہے۔ اسے الماری میں رکھ کر نیا لینا پڑے گا۔"

"زید! اٹھو۔ یہ لو پائے کی یخنی پی لو۔ آج عید کا چوتھا دن ہے اور تم نے کچھ بھی نہیں کھایا اور آج تو تمہیں اسائنمنٹ جمع کروانا تھا نا۔" نوشین کمرے میں آئی تھی، اس کی آواز میں تشویش تھی۔

"آپ بھی نا، آپی! پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ نہیں [illegible] کر رہا، میرا کچھ بھی کھانے کو۔" اس نے کروٹ لی۔

"مرضی ہے، ویسے میں تمہیں یہ خبر دینے آئی تھی کہ کشمالہ کے ابا میاں کا فون آیا تھا۔ بابا بتا رہے تھے کہ وہ بہت غصے میں لگ رہے تھے کہ آپ نے ہمیں اپنے بیٹے کی سرگرمیوں کی مکمل تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا۔ جس پر ہمیں بہت افسوس ہے، باقی باتیں گھر آ کر کرنا چاہ رہے تھے مگر بابا نے کہا کہ زید کی طبیعت خراب ہے۔ مشکل ہے کہ وہ آپ سے مل [illegible] تو کہنے لگے۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے، زید سے نہیں۔ شام کو وہ آ رہے ہیں، ذرا طبیعت ٹھیک کر لو پیارے بھائی!" نوشین چہکی۔

"مجھے نہیں ضرورت کچھ کرنے کی۔" وہ نروٹھے انداز میں دوبارہ کروٹ بدل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رشتے سے انکار کرنے کے لیے آ رہے ہوں گے۔

"اچھا۔ وہ شاہ رخ قصائی بار بار تمہارا پوچھنے آ رہا ہے، کیا جواب دوں۔"

"کہہ دیجیے کہ سو رہا ہوں۔"

ابا میاں، چچا میاں کے ساتھ زید کے گھر تشریف لائے تھے۔ کھانے کے وقت زید کی کمی کو دونوں نے محسوس کیا تھا۔

"اب ذرا زید کو بلا دیجیے۔"

بابا نے ذاکر بھیا کو دیکھا تھا۔

"انکل! زید کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، وہ یہاں کیسے آئے گا؟ دراصل وہ اپنے گروپ کے ساتھ کوئی کام کر رہا تھا۔ وہیں اس کی طبیعت خراب ہوئی۔" ذاکر بھیا نے تفصیل بتائی۔

"کیا ہم اس کے کمرے میں جا سکتے ہیں؟"

"میں ایک نظر اسے دیکھ لیتا ہوں، اگر وہ یہاں نہیں آیا تو میں آپ کو اس کے کمرے میں لے چلوں گا۔" ذاکر بھیا دوڑے دوڑے زید کے کمرے میں گئے۔ "چل یار! ورنہ تیرا سسر تو گھر کی رکاوٹیں دور کر کے کمرے میں آ جائے گا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں بھیا!" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

جب وہ ذاکر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا تو ابا میاں نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ صاف رنگت کملا گئی تھی، وزن پہلے سے کم تھا۔ الجھے ہوئے بال، بے ترتیب شیو..... اس کے گزرے ہوئے دنوں کا راز افشا کر گئی تھی۔

"آؤ! ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔" انہوں نے محبت سے اپنے برابر میں بٹھایا تھا۔

چچا میاں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"ہاں تو برخوردار! انگوٹھی کے پیسے پورے ہو گئے؟"

اوراس کے سر پر بم پھوٹا تھا۔

''ہمیں کشمالہ نے سب کچھ بتادیا ہے۔'' ابا میاں کے لہجے میں اطمینان تھا۔

''چلو، اب تم بھی سب کو بتادو۔''

اور سر جھکائے اس نے کشمالہ کے مطالبے سے لے کر کل تک کا واقعہ سنادیا تھا۔

بابا اور ذاکر بھیا ہونق بنے سن رہے تھے۔

''جہانزیب صاحب! ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی اتنی اچھی تربیت کی ہے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ ہماری بیٹی آپ کے گھر میں بھوکی نہیں سوئے گی۔ ہماری طرف سے یہ رشتہ پکا سمجھیے'' ان کے الفاظ تھے یا جادوئی اثر۔ بابا کا کملایا چہرہ کھل گیا تھا۔ ''جولڑکا محنت کرنے کو برا نہیں سمجھتا، وہ آئندہ ضرور کامیاب ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا داماد ہم سے بھی بڑا آدمی بنے گا اور اگر آئندہ کشمالہ ایسی فرمائش کرے تو سب سے پہلے ہمیں آگاہ کیجیے گا۔'' انہوں نے اسے گلے لگالیا۔

''آپ سے ایک درخواست تھی۔'' ابا میاں جھجکے تھے۔

''کشمالہ کے چچا میاں یعنی مرزا ظاہر بیگ کے والد، والدہ، ان کے دو بہن بھائی۔ میری زوجہ محترمہ اور میرے والد محترم ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ مرزا ظاہر بیگ ہمارے چچا زاد بھائی ہیں۔ ان کی پرورش ہماری والدہ محترمہ نے کی ہے۔ پینتیس سال کے ہیں اگر آپ برا نہ مانیں تو نوشین بیٹی کے لیے انہیں اپنی فرزندی میں لے لیجیے، یقین مانیے آپ کو تاعمر پریشانی نہیں ہوگی۔''

''اور جہانزیب صاحب کی تو ساری پریشانی دور ہوچکی ہے۔'' گلوگیر لہجے میں بولے۔

''میں نے آج تک آپ جیسا رئیس زادہ اتنا عاجز و انکسار نہیں دیکھا۔'' ابا میاں مسکرائے اور دونوں سمدھی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

ڈور بیل بجی، نقاہت کے باوجود دروازہ زید نے کھولا تھا۔

''زید بھائی! کیسے ہو؟ انگلی کا زخم کیسا ہے؟'' شاہ رخ نے تشویش سے پوچھا۔

''اندر آجاؤ۔''

''نہیں، ابھی وقت نہیں ہے۔ میں سسرال جاؤں گا ورنہ تمہاری بھابھی میرا قیمہ بنادے گی۔''

اور وہ تکلیف میں بھی ہنس دیا۔

''یہ اپنی امانت پکڑو، میرے ماما نے تمہاری پے منٹ بھجوائی ہے۔ قربانی کی رقم بھی اکٹھی کرکے لایا ہوں۔ تم آ ہی نہیں رہے تھے، اس لیے تمہاری ناراضی دیکھ کر اس میں مزید پانچ ہزار روپے رکھے ہیں۔ سنبھالو۔'' اس نے ایک لفافہ اسے پکڑایا تھا۔

''ویسے ہماری بھابھی اچھی ہیں۔ اللہ کی قسم! میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی کا چکر ہے۔'' جاتے ہوئے وہ اس کے کانوں میں سرگوشی کرنا نہیں بھولا تھا۔

شہر کے خوب صورت سے لان میں منگنی کی تقریب عروج پر تھی۔ دو اسٹیج بنے ہوئے تھے، ایک پر مرزا بیگ اور نوشین تھے، دوسرے پر کشمالہ اور زید۔

''ویسے زید! یہ رنگ بہت پیاری ہے۔ تمہیں معلوم ہے سب کو پسند آئی ہے۔''

''آخر کو اتنی محنت بھی تو کی ہے نا۔'' اس نے فخر سے کالر اٹھائے۔

''تمہارے ابا میاں شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔'' اس نے کشمالہ کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''ایسے کیسے شادی؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہاں شادی پر ڈائمنڈ کا سیٹ و دبینگلز دیا جاتا ہے۔'' کشمالہ نے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔

''کشمالہ!'' اس نے غصے سے دیکھا۔

''زید!'' وہ پیار سے مسکرائی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم میرے لیے اونٹوں کی قربانی بھی کرسکتے ہو، بس اس دفعہ ہمارے گھر نہ آنا۔''

زید نے سر پکڑلیا اور اس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

☆

تسنیم بیگم نے کوفتوں کو دم دے کر فریج کا بالائی حصہ سنبھال لیا۔ قیمہ بھرے کریلے، پالک گوشت اور سبزی کا پرانا سالن رکھا تھا۔

تسنیم بیگم نے سبزی والا پیالہ باہر نکالا، مکس سبزی کا یہ سالن کوئی ہفتہ بھر پہلے بنا تھا اور اب ختم ہونے کے قریب تھا۔ سبزی کبھی کبھار ہی پکتی تھی اور

توبیہ عمران

سوتن

BOOKSPK
Books & Magazines

وہ بھی زیادہ تر یوں ہی پڑی رہتی۔ گھر بھر میں سب ہی چٹورے تھے' سوائے ایک فرد کے جس لیے یہ سالن گرم کیا جارہا تھا۔

تسنیم بیگم نے سالن گرم کر کے رکابی میں نکالا تو کچھ کم محسوس ہوا۔ ایک پل کے لیے رکابی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوفتوں کے سالن میں سے ایک کوفتہ نکال کر سبزی کے اوپر رکھ دیا۔

دوپہر پالک گوشت کے ساتھ روٹیاں بنی تھیں۔ ہاٹ پاٹ کھول کر دیکھا تو ایک روٹی اور ایک چوتھائی ٹکڑا بچا ہوا تھا۔ ٹرے میں سالن والی رکابی اور روٹی رکھ کر سیما کو آواز دی۔

''سیما! کتیا کو روٹی دے آؤ۔''

تسنیم بیگم نے اپنی آواز دانستہ اتنی بلند رکھی کہ اوپر کمرے میں موجود نفس نے اسے بخوبی سنا۔

تھوڑی دیر بعد اوپر کے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور سیما اندر داخل ہوئی۔

''بھابھی کھانا!''

سیما نے دو لفظی جملہ ادا کرتے ہوئے ٹرے جویریہ کی طرف بڑھادی۔ ٹرے پکڑتے ہوئے جویریہ کو اس کی آنکھوں میں تمسخر اور تحقیر کا عکس نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید غور کرتی' سیما اسے ٹرے پکڑا کر واپس جا چکی تھی۔

جویریہ کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے اور گھر والوں کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اسے ابھی تک اس کے کمرے تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔ صبح سب کے ناشتے کے بعد چائے کے ساتھ ایک دو بچے ہوئے توس اور کبھی کبھار انڈا، آملیٹ وغیرہ بھی مل جاتا تھا۔ دوپہر کے کھانے میں رات کا بچا ہوا رائتہ اور سلاد ایک روٹی کے ساتھ دیے جاتے تھے۔ رات میں روٹی کے ساتھ کبھی تازہ اور کبھی باسی سالن۔

چھ ماہ سے یہ ہی روٹین چلی آرہی تھی۔ کھانا اس کی ساس ہی بناتی تھی۔ سیما کالج جاتی تھی اور جویریہ نے اسے کبھی کوئی کام کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔

اس کا شوہر نبیل اور دیور شکیل، سسر کے ساتھ ہی دکان پر جاتے تھے۔ جوہری بازار میں ان کی سنار کی دکان تھی۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے جز وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی جبکہ کچن مکمل طور پر تسنیم بیگم کے کنٹرول میں تھا۔

وہ تین دن سے یہ ہی سالن کھا رہی تھی، آج دیکھ کر دل اوب سا گیا۔ کوفتہ اٹھا کر روٹی پر رکھ لیا اور تھوڑا تھوڑا توڑ کر روٹی کے ساتھ کھانے لگی۔

''ارے سیما! بے بو رانی کو کھانا دو، اسے بھوک لگی ہوگی۔ تمہیں پتا تو ہے کہ بھوک کی کتنی کچی ہے میری بے بو۔''

تسنیم بیگم شاید اپنے کمرے میں تھیں۔

سیما اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دھات کی پلیٹ تھی جس میں دو کوفتے رکھے ہوئے تھے۔ گیراج میں بیٹھی ہوئی بے بو رانی جیسے سیما ہی کی منتظر تھی۔ سیما کے پلیٹ رکھتے ہی اس نے چڑ چڑ کوفتوں پر منہ مارنا شروع کر دیا۔

جویریہ نے کھڑکی سے بے بو کو کوفتوں کے ساتھ انصاف کرتے دیکھا تو بے اختیار ہی اس کا ہاتھ پیٹ پر چلا گیا۔ ایک کوفتہ اور آدھی روٹی کھانے سے پیٹ کہاں بھرنا تھا؟ باقی کی روٹی سوکھی ہی کھا کر دو گلاس بھر بھر کے پانی پی لیا کہ شاید اسی طرح سے پیٹ بھر جائے۔

''اماں! تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس کتیا کو گھر میں نہ گھسایا کر، کتنا سر پر چڑھا رکھا ہے اسے تم نے۔''

شکیل، نبیل اور ابا کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو اس بھوری کتیا کو گیراج میں بیٹھا دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔

''نہ دعا، نہ سلام..... آتے ہی میری بے بو کے لتے لینے لگ گیا ہے تُو۔ اے بیٹا! یہ تو بے زبان جانور ہے، اللہ پاک بہت خوش ہوتا ہے اس کی مخلوق کو کھانا کھلانے سے۔ بے چاری بھوکی اگر آ کر کھا لیتی ہے تو ہمارے رزق میں کون سا کمی ہو جاتی ہے۔'' تسنیم بیگم نبیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر آئی تھیں۔

''میں نے کب منع کیا ہے اسے کھلانے سے، بس اسے دیکھ کر مجھے کراہیت سی ہوتی ہے۔'' نبیل نے جواب دیا۔

''نہ بیٹا! اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہے' اس سے کراہیت کیسی؟ چل دفع کر اس بات کو، جلدی سے منہ ہاتھ دھو لے۔ آج تیری پسند کے کوفتے بنائے ہیں۔''

''اماں! جویریہ کہاں ہے؟'' نبیل کے کہنے پر سب نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ابھی زن مرید نامی تیر ان کی نگاہوں سے نکل کر نبیل کے آر پار پیوست ہو جائے گا۔

''نا ماں نظر نہیں آتی تم کو — اسے آتے ہی کتیا نظر آ گئی اور تجھے بیوی کی فکر لگ گئی۔ کہاں ہونا ہے اسے، اپنے حجرے میں پڑی آرام کر رہی ہوگی۔ ارے ایک میں ہوں، میری قسمت میں آرام کہاں۔ اس بڑھاپے میں بھی سارا دن ہڈیاں رگڑتی ہوں۔ مجال ہے اس نواب زادی نے ایک دن بھی کسی کام کو ہاتھ لگایا ہو۔ میں سارا دن کپڑے دھوتی ہوں، پکاتی ہوں، خود آ کر روٹی ڈالتی ہوں اور وہ کھا کر یہ جا اور وہ جا۔

نہ سب کے ساتھ مل بیٹھ کر کھاتی ہے، نہ سارا دن کسی سے بات کرتی ہے۔ خدا جانے کس بات کا اتنا غرور ہے، ساتویں آسمان پر دماغ پہنچا ہوا ہے شہزادی کا۔'' تسنیم بیگم نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چنگی بھلی کمر پر یوں ہاتھ رکھا جیسے درد اور تھکاوٹ سے دہری ہو۔

''اس کی تو میں ابھی خبر لیتا ہوں، میری بوڑھی ماں کو نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔ اس کاہل اور بد دماغ عورت کا تو میں ابھی علاج کرتا ہوں۔'' نبیل اماں کی باتیں سن کر غصے سے بھر چکا تھا۔

''اے دفع کر اسے، جیسے رہتی ہے رہنے دے۔ میری خاطر اپنا گھر خراب نہ کر۔ چل شاباش، منہ دھو اور کھانا کھا۔ مجھ بوڑھی کے ہاتھ، پیروں میں جب تک جان ہے تب تک تو میں اپنی بچوں کا خیال رکھوں، میرے بعد پھر اللہ وارث ہے۔'' تسنیم بیگم نے آواز کو زبردستی رقت آمیز بنایا۔

''اماں! رب تجھے میری بھی عمر لگا دے، ایسی باتیں نہ کیا کر۔'' نبیل نے جذباتی ہو کر اماں کے دونوں ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے۔

''جگ جگ جیے میرا بیٹا! رب ایسی اولاد سب کو دے۔'' تسنیم بیگم نے فاتحانہ نظروں سے سر اٹھا کر کھڑکی کو دیکھا، جہاں سے ایک سایہ ابھی ابھی پلٹا تھا۔

☆☆☆

''ہائے میں مرگئی، یہ کیا گند اٹھا لائی ہے۔ کم بخت بے بو! اس گند کے لیے اسے ہمارا ہی گھر ملا تھا۔'' تسنیم بیگم نے صبح صبح اٹھ کر دیکھا تو گیراج میں بے بو کے ساتھ پانچ چھوٹے چھوٹے کالے بھورے بچے بھی تھے۔

اماں کی گونج دار آواز سن کر سیما بھی آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئی۔

''کون سا گند اماں؟'' سیما نے جب بے بو کے ساتھ بچوں کو دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اماں تُو انہیں گند کہہ رہی ہے؟ یہ تو اتنے پیارے لگ رہے ہیں۔''

سیما نے آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے نرم و ملائم، گول مٹول بچوں کو دیکھا جو کبھی کبھار کروٹ بدلنے کے ساتھ چیاؤں چیاؤں کی آواز نکالتے تو اور بھی پیارے لگتے۔

''اے دفع کر، ہمارے گھر میں پہلے کیا کمی تھی، اب کتوں کے بچے پالنے پڑیں گے کیا؟ ہائے قسمت، انسان کا بچہ کھلانا تو ہمارے نصیب میں ہے ہی نہیں۔ دس ماہ ہوگئے اس سوکھی بنجر شکل کو دیکھتے ہوئے، ارے اس سے اچھی تو بے بو ہے۔'' تسنیم بیگم نے ترچھی نگاہ سے کھڑکی کی اوٹ میں کھڑی جویریہ کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''چل سیما! باہر نکال اسے۔'' تسنیم بیگم نے بے بو کی طرف اشارہ کیا۔

''شی..... شش.....'' سیما نے منہ سے آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے بے بو کو باہر کی طرف ہانکا۔

''بھوں بھوں... بھوں بھوں...'' بے بو نے غصیلی نظروں سے بھونکتے ہوئے سیما اور تسنیم بیگم کی طرف دیکھا۔

''یہ صبح صبح اتنا شور کیوں ڈالا ہوا ہے؟'' نبیل نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ صحن میں آیا۔

''بیٹا! نبیل ذرا اسے باہر تو نکال، دیکھ پورا کنبہ لے کر آ گئی ہے، سارے گھر میں گند ڈالتے پھریں گے۔'' تسنیم بیگم نے بے بو کی طرف اشارہ کیا جو اپنے بچوں کو لے کر دبک کر بیٹھی ہوئی تھی۔

نبیل اس کی طرف بڑھا تو اس نے زیادہ زور وشور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

''یہ کتیا یوں نہیں جائے گی، تُو نے ہی اسے اتنا سر پر چڑھایا ہوا تھا۔ دیکھ لے، اب کیسے رعب سے بیٹھی ہے۔ صبح صبح نیند خراب کر دی اس منحوس نے۔ اب یوں کر، اسے کھانا نہ دے اور نہ اس کا دھیان رکھنا۔ جیسے ہی ادھر اُدھر ہو، اس کے بچے اٹھا کر باہر رکھ دینا، خود ہی نکل جائے گی اور دروازے کا خاص خیال رکھنا، کنڈی لگا کر رکھنا ورنہ پھر سے آن گھسے گی۔''

نبیل اماں کو ہدایات دیتا ہوا واپس کمرے میں چلا گیا۔

ناشتے کے بعد گھر کے مرد دکان پر چلے گئے۔ بے بو منتظر نظروں سے تسنیم بیگم کو دیکھتی رہی لیکن خلاف معمول تسنیم بیگم نے بے بو کو کھانے کے لیے کچھ نہ دیا۔ بے بو نے صحن میں آتے جاتے دیکھ کر کئی بار ''بھوں بھوں'' کر کے تسنیم بیگم کو متوجہ کرنا چاہا لیکن تسنیم بیگم نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ صبح سے شام اور پھر رات کا وقت ہو گیا۔

''جا، کتیا کو روٹی دے آ۔''

تسنیم بیگم نے حسب معمول سیما کو آواز دی۔ بھنڈی گوشت کے ساتھ ایک روٹی رکھ کر جویریہ کو پہنچا دی گئی۔ آج سبزی کے ساتھ ایک بوٹی بھی تھی۔

سیما کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تو بے بو نے ایک بار پھر بھوں بھوں کر کے اسے مخاطب کرنا چاہا لیکن سیما اسے نظر انداز کر کے کمرے میں چلی گئی۔

بے بو اور اس کے پانچوں بچے بھوک سے بے قرار ہو کر مسلسل چیاؤں چیاؤں کر رہے تھے۔ بے بو نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا جس کے باعث دودھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

جویریہ نے کھڑکی سے دیکھا تو اسے بے بو اور اس کے بچوں کی حالت پر بہت ترس آیا لیکن وہ تو خود اپنی مرضی سے کچھ کھا نہیں سکتی تھی، وہ بے بو کو کھانا کہاں سے دیتی۔

اس نے بھنڈی کے ساتھ روٹی کھا کر بوٹی پلیٹ میں یوں ہی چھوڑ دی کہ شاید سیما بچی ہوئی بوٹی بے بو کو دے دے لیکن سیما نے برتن اٹھا کر یوں ہی سنک میں رکھ دیے اور بے بو بھوک سے بے قرار ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھتی رہی۔

☆☆☆

صبح کو تسنیم بیگم جاگیں تو انہوں نے دیکھا کہ بے بو اپنے بچوں سمیت جا چکی تھی۔ حسب معمول باہر کا دروازہ کھول کر آگے پردہ گرانے لگیں تو دیکھا کہ بے بو سامنے والے رضوی صاحب کے گھر کے آگے

جامن کے پیڑ کے نیچے بسیرا کیے ہوئے

''شکر جان چھوٹی اس مصیبت سے۔'' تسنیم نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

بے بو کی نظر تسنیم بیگم پر پڑی تو اس نے منہ موڑ لیا۔ اچانک تسنیم بیگم کے دل میں بے بو کی محبت جاگی۔ برسوں کا معمول تھا، تسنیم بیگم بے بو کو کھانا لازمی دیتی تھیں۔ تسنیم بیگم پلٹ کر کچن میں گئیں اور دھات کی پلیٹ میں دو بوٹیاں رکھ کر بے بو کے پاس آ گئیں۔ پلیٹ اس کے آگے رکھی لیکن بے بو نے بالکل توجہ نہ دی، جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ تسنیم بیگم بوٹیاں وہیں اس کے سامنے رکھ کر واپس آ گئیں۔

سارا دن محلے کے بچے شوق سے بچوں کو دیکھتے رہے۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا لے کر آتا تو کوئی ٹافی چاکلیٹ کا ٹکڑا ان کی طرف پھینک دیتا۔ رضوی صاحب نے صبح جاتے ہوئے بے بو اور اس کے بچوں کو دیکھا تھا، شام میں آتے ہوئے وہ اس کے لیے مرغی کی آلائشیں لیتے آئے۔ بے بو نے خوب سیر ہو کر کھایا، البتہ تسنیم بیگم کی پھینکی ہوئی دونوں بوٹیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔

☆☆☆

''سیما! کتیا کو روٹی دے آؤ۔''

کھڑکی میں کھڑی جویریہ نے تسنیم بیگم کی آواز سنی، اس کی نظر جامن کے درخت کے نیچے سکون سے سوئی ہوئی کتیا اور اس کے بچوں پر پڑی جس کے سامنے تسنیم بیگم کی پھینکی ہوئی بوٹیاں یوں ہی پڑی تھیں۔

جویریہ کتنی دیر ان پھینکی ہوئی بوٹیوں پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی۔ جنہیں اس جانور نے منہ تک نہ لگایا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچتی گہری سانس بھرتی کھڑکی سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح جب تسنیم بیگم باورچی خانے میں آئیں تو وہاں جویریہ کو موجود پایا۔

وہ پراٹھا بنا چکی تھی، چولہے پر چائے ابل رہی تھی۔ اس نے دو کپوں میں چائے چھانی اور کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔

''امی! میں نے اپنا اور نبیل کا ناشتا بنا لیا ہے۔ آپ مجھے ناشتا نہ بھجوایئے گا۔ آپ کہیں تو میں آپ کے لیے بھی ناشتا بنا دوں۔''

تسنیم بیگم کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ نبیل کی آواز سن کر چونک کر مڑیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''امی! کل سے سارے گھر کا ناشتا جویریہ بنائے گی۔ مجھے جلدی ناشتا چاہیے ہوتا ہے کیونکہ جم سے واپسی پر مجھے شدید بھوک لگی ہوتی ہے۔ ہم دونوں ساتھ ناشتا کر لیں گے۔ آپ کو یہ بعد میں ناشتا بنا دے گی۔''

تسنیم بیگم ہکا بکا کھڑی تھیں۔ جویریہ نے ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ نبیل سے یہ بات منوانے کے لیے اسے کتنا سر کھپانا پڑا تھا لیکن بالآخر وہ مان گیا تھا، کم از کم اب اسے اتنی آزادی تو مل گئی تھی کہ وہ ناشتا اپنی مرضی کا کر سکے۔ باقی کے لیے ابھی اسے سوچنا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کوشش تو کرنا پڑتی ہے۔

☆

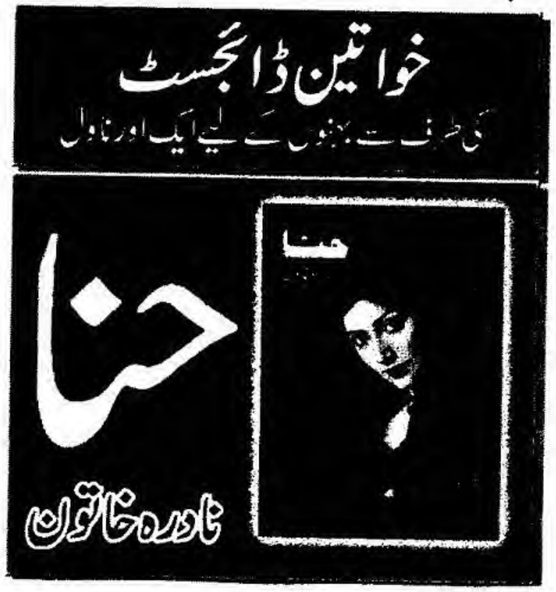

افشین نعیم

سب کچھ تمہارا ہے

اس نے تسلی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ جہازی سائز کمرہ، برسوں کا ارمان پورا ہوا۔ ٹھنڈک سی اُتری دل میں۔

کمرے کے فرش پر بچھا دبیز قالین، میچنگ پردے، ڈبل بیڈ کے عین سامنے بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل، جس میں اس کا عکس جھلملا رہا تھا۔

وہ اِس قدر حسین لگے گی دلہن بن کر، یہ بات تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھی۔

وہ خود کو خود ہی اتنی پیاری لگی کہ خود پر پیار آ گیا۔

''اُف اللہ! اگر میرا یہ حال ہو رہا ہے تو ''اُن'' کا کیا حال ہوگا۔'' سوچتے ہی ڈھیروں شرم نے آ گھیرا۔

شرم کے مارے، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ مہندی سے سجے ہاتھ، نیل پالش سے رنگے ناخن، انگوٹھیوں سے سجی انگلیاں۔ ہاتھوں کا پیالہ چہرے کے قریب لے جاتے چوڑیوں کے آپس میں ٹکرانے سے ایک دل فریب سی جلترنگ کمرے کی فضا میں گونج کر خاموش ہوگئی۔

بڑا ارمان تھا بڑے سے بیڈ روم کا۔ وہ جیسے ڈراموں میں دکھاتے ہیں نا خوب صورت سجے سجائے بیڈ روم۔ بالکل ویسا ہی ہے، بالکل ویسا.....

دل کے ایک کونے سے آواز آئی۔

''بھلا کون سے ڈرامے میں تھا؟'' یاد

BOOKS Books & Magazines

مکمل ناول

آسکا۔ تھوڑی دیر ذہن پر زور ڈالا۔ کردار یاد آ گئے، ڈرامے کا ٹائٹل سونگ بھی یاد آ گیا، پر نام.....؟ نام، نمودار نہ ہو سکا دماغ کی اسکرین پر۔

''چھوڑ پرے..... نہیں یاد آ رہا نام، نہ آئے۔'' اس نے ذہن پر مزید زور دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ سی گئی تھی۔

''کیا کروں.....؟ لیٹ جاؤں تھوڑی دیر کے لیے؟'' تکیہ سیدھا کیا، ابھی لیٹنے نہ پائی تھی کہ اچانک کسی ڈرامے کا ایک سین یاد آ گیا، جس میں دلہن حجلہ عروسی میں سو گئی۔ دولہا آیا، دلہن کو سوتے دیکھا۔ پورے رات سوتے دیکھتا رہا، صبح جب دلہن جاگی تو ناراض ہو کر کمرے سے چلا گیا پھر جو ناراضی چلی تو تین..... نہیں چار اقساط تک ناراضی ہی چلتی رہی۔

''نہ بابا نہ، لیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نیند آ گئی تو پھر.....؟'' نظر بھٹکتے بھٹکتے دیوار گیر گھڑی سے جا ٹکرائی۔

بارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے، یعنی پورے پندرہ منٹ سے اکیلی بیٹھی تھی وہ۔

ذہنی رو، پھر ماضی کی جانب سفر کرنے لگی۔ اس سے پہلے چار بہنیں بیاہی گئی تھیں۔

ایک، ایک کی شادی کا منظر ذہن میں آتا گیا۔ بس، اسے اپنی شادی پر سب کچھ بہترین درکار تھا۔

اچانک ہی ایک اور یاد نے انگڑائی لی۔ کسی ڈرامے میں دلہن کا لہنگا دیکھا تھا، ایک خواہش سی دل میں جاگی تھی، کاش ایسا ممکن ہو، میری شادی کا لہنگا بھی ایسا ہی ہو۔

اور ٹھیک ویسا ہی لہنگا وہ اس وقت پہنے بیٹھی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آیا۔ اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر دونوں بازو پھیلا کر گول گول گھومنا شروع کر دے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ڈراموں میں ہیروئن کرتی ہے، جب وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ بھی تو ہیروئن ہے، ویسے ہی ڈرامائی انداز میں اس کی بھی تو ساری خواہشات پوری ہوئی ہیں۔

بس اسی سوچ نے اس کے جسم میں بجلی بھر دی۔ جلدی سے لہنگا سنبھالتی اٹھی۔

کمرے کے عین وسط میں خاصی جگہ تھی یہاں وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی۔

بس پھیلائے دونوں بازو اور گول گول گھو شروع کر دیا۔ یہ ہی وہ وقت تھا جب عمر اپنے دھیا میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

اندر کا منظر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس حساب سے تو اس کی نئی نویلی دلہن کو گٹھڑی کی صورت شرماتے لجاتے ہوئے اس کا منتظر ہونا چاہیے تھا۔

''یا اللہ! (دل نے دہائی دی)۔ کہیں دھوکا نہیں ہو گیا میرے ساتھ۔ کہیں بعد میں پتا چلے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا شادی کر دو ٹھیک ہو جائے گی۔''

دوسری طرف فارحہ کا چوتھا چکر مکمل ہوا۔ ساتھ ہی ہر چیز نے گول گول گھومنا شروع کر دیا۔ پنکھا دیواریں، چھت ہر چیز گردش میں آ گئی اور ان چیزوں کے گردش میں آتے ہی فارحہ کی گردش تھم گئی۔ تیورا کر ایک طرف گری۔ گرتے گرتے دونوں ہاتھوں سے کوئی چیز تھامنے کی سعی کی۔ پر افسوس، گھومنے کے لیے جس جگہ کا انتخاب اس نے کیا تھا وہاں کوئی چیز میسر نہیں تھی، اس کے گرتے ہی عمر کو ہوش آیا۔

''اوہ..... ارے..... آں.....'' وہ بھاگ کر پہنچا۔ ''کیا ہوا.....؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' فارحہ نے دُکھتے سر کے ساتھ آواز کی سمت دیکھا۔

دو منہ..... ان پر چار، چار آنکھیں..... دو سر بھی گول گول گھومتے نظر آئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما۔ تھوڑا قرار سا آیا۔

''خدایا! ہیروئنیں تو کبھی ایسے چکرا کر نہیں گرتیں۔'' سخت شکوے نے دل میں سر ابھارا۔

دوبارہ سے آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ''چوٹ تو نہیں آئی زیادہ.....؟''

''کوئی انسان اتنی زور سے گرے تو چوٹ آتی ہی ہے۔'' سخت خفا لہجے میں بتایا۔

(میں نے تھوڑا ہی گرایا تھا) بس دل ہی میں رہ گئی بات۔

''اب مزید کیا بات کرنی چاہیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا عمر کو۔'' عجیب صورت حال تھی۔

اس کی مشکل فارحہ نے آسان کر دی۔ دونوں ہاتھوں سے قالین پر زور ڈالا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہو کر لہنگا سنبھالا اور سہج سہج چلتی بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

عمر نے ایک زوردار سانس اندر کھینچ کر باہر نکالی۔ بیڈ پر بیٹھ کر فارحہ نے اپنا لہنگا ٹھیک طریقے سے پھیلایا (ویسے ہی جیسے ہیروئنیں کرتی ہیں)۔ عمر بس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے، تب ہی اپنی دلہن کی آواز سنائی دی۔

''آئیں، بیٹھ جائیں۔ تھک جائیں گے کھڑے کھڑے۔''

''ہاں، ہاں۔ ضرور.....''

وہ چلتا چلتا بیڈ کے قریب آیا اور بیڈ سے کچھ فاصلے پر سامنے ٹو سیٹر صوفے پر آرام دہ انداز میں بیٹھ گیا۔

''(عمر بیٹا! اس لڑکی کے انداز کچھ نارمل نہیں لگ رہے)۔'' دل ہی دل میں خود کو مخاطب کیا۔

''(لو بھلا..... اتنی دور جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ ڈراموں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ اب مجھے انگوٹھی کیسے پہنائیں گے اتنی دور سے)۔'' فارحہ سخت کوفت کا شکار ہوئی۔

''(میرا خیال ہے بات شروع کر ہی دینی چاہیے۔ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے)۔'' عمر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

اس کے کھنکھارنے پر فارحہ کا پورا جسم مانو کان بن گیا۔ اب یہ میری تعریف کریں گے، اس نے فخر سے ذرا سی گردن اٹھائی۔

''دیکھو فارحہ!'' عمر نے بات شروع کی۔

''اوں، اوں.....'' فارحہ نے ایک ادا سے اپنے شریک سفر کو دیکھا۔ ''دیکھو فارحہ! نہیں..... سنو فارحہ! آپ مجھے کچھ دکھا نہیں رہے، سنا رہے ہیں۔'' اپنی بات کے اختتام پر خود ہی مسکرائی۔

عمر کا اعتماد تھوڑا متزلزل ہوا۔ لیکن بات تو کرنی ہی تھی، کتنی ہی دیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس تقریر کی ریہرسل کی تھی۔ اب عین وقت پر میدان چھوڑ کر بھاگا تو نہیں جا سکتا تھا۔

''ہوں' ٹھیک ہے۔ سنو فارحہ! میری ایک بات اپنے پلو سے باندھ لو، اچھے طریقے سے۔'' جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ''میری فیملی، میرے لیے بہت اہم ہے۔'' صوفے سے اٹھ کر عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ (آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی)۔

''میرے ماں، باپ کی عزّت اور خدمت دونوں اپنے اوپر لازم کرنا پڑے گی تمہیں، تب ہی میری نظر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
ایک تھی مثال
رخسانہ نگار خان
مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
قیمت -/500 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

میں تم وہ مقام حاصل کر پاؤ گی جو ہر بیوی.....“

اس کے بعد عمر کو بریک لگانا پڑی۔ دلہن خاصے جارحانہ انداز میں بیڈ سے اتر کر اس کے مقابل آ کر کھڑی ہوگئی تھی (یہ بیڈ روم ہے یا کوئی جلسہ گاہ؟)

”کیا کہا.....؟ آپ نے.....؟“ فارحہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ وہ دو قدم پیچھے ہوا، تقریر بھی ذہن سے نکل گئی۔

”کیا کہہ رہے تھے آپ کہ آپ کے والدین کی خدمت اور عزت میں لازم کرلوں خود پر..... ہیں.....؟“

”ہاں، تب ہی تمہیں یہاں پر مقام ملے گا۔“ بہ مشکل جملہ مکمل کیا۔

”میں کسی گرے پڑے خاندان کی گھر سے بھاگی نظر آتی ہوں جو شادی کی رات حقوق والدین پر درس دینا شروع کردیا۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے، عزت کرنا بھی اور عزت کروانا بھی، ربش.....“ وہ پاؤں پٹختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

عمر بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ سب کچھ اس کی توقعات کے برعکس ہو رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس کی دلہن سمٹی، سمٹائی بیڈ کے کنارے پر ٹکی ہوئی ہوگی۔

پر دروازہ کھلا تو دلہن صاحبہ بھرپور طریقے سے جھومتی نظر آئیں۔ جب چکرا کر گریں تو اسی کو باتیں سنا کر بغیر کسی مدد کے اٹھیں اور جا کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ نہ صرف بیٹھیں بلکہ اس کو بھی بیٹھنے کی آفر کی اور اب، جب کہ اس نے اتنی پُرزور تقریر شروع کرنا چاہی اپنے ماں باپ کے مقام اور مرتبے پر تو دلہن بیگم غصے سے تن فن کرتی باہر جا رہی تھیں (تقریر تو ابھی باقی تھی.....) خدا جانے اب باہر جا کر کیا کرے گی؟

وہ اس کی طرف لپکا اور ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔

☆☆☆

”آیئے، آیئے آپا جان! بیٹھیے۔“ فیروزہ بیگم پان بنا رہی تھیں جب ناظمہ کی معیت میں بہن کو اندر آتے دیکھا۔ فوراً کھسک کر بڑی بہن کے لیے جگہ بنائی۔

”ناظمہ! جا بیٹا! جلدی سے پانی لے آ، آپا جان کے لیے۔“ فیروزہ بیگم نے پوتی کو اشارہ کیا۔

صرف دو گلیوں کا فاصلہ تھا، پھر بھی صنوبر خاتون کا سانس بری طرح پھول چکا تھا (اب جوانی والی بات کہاں رہی)۔ ایک تو بڑھاپا، پھر موٹاپا، کچھ بولیں نہیں، ناظمہ نے پانی لا کر دیا انہوں نے تین سانسوں میں ختم کیا۔

پانی پی کر کچھ حواس بحال ہوئے۔

”سعیدہ نظر نہیں آ رہی؟“ صنوبر خاتون نے ادھر اُدھر دیکھتے استفسار کیا۔

”جی، آپا جان! وہ ذرا فرحی کو لے کر بازار گئی ہے۔ آپ کے لیے پان بناؤں؟“

پتے پر کتھے، چونے کا لیپ کرتے انہوں نے بہن سے پوچھا۔ ان کے مثبت جواب پر دو پان تیار کیے۔ ایک اپنے لیے، ایک بہن کے لیے۔

”بڑی ضروری بات کرنے آئی ہوں فیروزہ!“ انہوں نے کچھ رازداری سے بہن کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”جی، جی، آپا جان! کہیے۔“ وہ جی جان سے متوجہ ہوئیں۔

تب ہی بڑے سے صحن کے کونے پر بنے کچن سے ناظمہ برآمد ہوئی۔ صنوبر بیگم خاموش ہوگئیں کہ ناظمہ واپس جائے تو بات شروع کریں۔

”بی جان! میں نے رول سموسے بنائے ہیں تل کر لاؤں چائے کے ساتھ؟“ وہ صنوبر خاتون سے مخاطب تھیں۔

”ارے پوچھنے والی کون سی بات ہے، لے آ۔“ جواب فیروزہ کی طرف سے آیا۔ ناظمہ سر ہلاتی واپس پلٹ گئی۔

”ویسے فیروزہ! وجاہت نے بھلے وقتوں میں یہ گھر بنوالیا، بہت اچھا کیا۔ آج کل تو اتنی مہنگائی ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا جان! بس وجاہت کے [illegible] حصے میں جو رقم آئی، ان کے تو نصیب میں نہ تھی [illegible]۔ موت نے مہلت ہی نہ دی۔ میں ہی پیچھے لگ [illegible] کے کہ گھر بنوانا ہی بنوانا ہے ورنہ بڑے ہاتھ [illegible] مارنے کی کوشش کی اس نے بھی کاروبار کے لیے [illegible] نہ مانی۔ لو بھلا بتاؤ، چھ بیٹیوں کا ساتھ، کاروبار [illegible] لگا پیسہ ڈوب جائے تو انسان کہاں جائے۔“

صنوبر خاتون نے سر ہلایا، ان کے سامنے ہی [illegible] تو بات تھی ساری۔

”اچھا، آپ کچھ ضروری بات کر رہی تھیں۔“ فیروزہ خاتون کو خیال آیا۔

”ہوں.....“ انہوں نے سیدھے ہو کر بیٹھتے بات شروع کی۔

”آج وہ روبی کی ماں آئی تھی ہماری طرف۔“

”روبی کی ماں.....؟“ حیرت سے ان کا منہ کھل گیا۔ ”اتنے برس بعد، اسے کیوں یاد آ گئی آپ کی؟“ فیروزہ خاتون کے چہرے اور الفاظ دونوں ہی میں حیرت تھی۔

”میں بھی ایسے حیران ہوئی تھی۔“ انہوں نے پاؤں سمیٹتے ہوئے بتایا۔ ”بلکہ میں نے تو سب سے پہلا سوال ہی یہ ہی کیا۔

”بی بی! کیوں تمہیں بائیس برسوں بعد ہماری یاد ستائی۔ کہنے لگی۔ باجی! خون کے رشتے یوں تھوڑا ہی جدا ہوتے ہیں۔“ لو بھلا، میں نے تو بغیر لگی لپٹی رکھے کہہ دیا، بی بی! تمہارا میرا کون سا خون کا رشتہ ہے؟

اب ذرا دیکھو، اس بڑھاپے میں بال رنگ کر، اونچی سی قمیص کے ساتھ پتلون (جینز) چڑھا کر وہ خود کو مجھ سے چھوٹا ثابت کرنے کے لیے باجی کہنے لگی تو میں کاہے کو برداشت کروں؟“

فیروزہ منہ کھول کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

”پتلون پہن کر آئی تھی؟“

”تو اور کیا، وہی نہیں جو آج کل کی فیشنی لڑکیاں بالیاں پہن کر پھرتی ہیں۔“ صنوبر خاتون نے تفصیل سے بتایا۔

”ارے آپا جان! عمر گزر گئی، پر اس عورت کو عقل نہ آئی، خیر آگے کہیے اب۔“

”خدا جانے کون سا خون کا رشتہ جوڑ رہی تھی، میں نے تو صاف کہہ دیا۔ بی بی! ہمارے خاندان کا تمہارے خاندان سے دور دور کا بھی کوئی خون کا رشتہ نہیں نکلتا۔ تمہاری لڑکی نے میرا لڑکا پھنسا کر اس سے بیاہ رچایا۔ چار ماہ بعد لڑ جھگڑ کر وہ تمہارے دوارے جا کر بیٹھ گئی۔ کورٹ کو درمیان میں ڈال کر معاملہ ختم کرایا اور بس۔ ختم ہوگئی بات۔ بعد میں ادھر اُدھر سے اڑتی سنی کہ اس نے دوسرا بیاہ رچالیا، پھر کچھ عرصے بعد اس کی موت کی اطلاع ملی۔“

بی جان نے یوں تفصیل سنائی جیسے نیوز بلیٹن پڑھ رہی ہوں۔

”پھر کیا بولی وہ؟“ فیروزہ خاتون کو اس کا جواب سننے کی جلدی تھی۔

”کہنے لگی، ہم سے نہ ہو بھلے خون کا رشتہ، اپنی پوتی سے تو ہے نا۔“

”لو بتاؤ، بھلا۔ بیس بائیس برس بعد اس کو یاد آیا کہ پوتی کا دادی سے بھی کوئی رشتہ ہے خون کا۔“ فیروزہ خاتون حیران سی حیران تھیں۔

”مجھے تو خود یہ بات بہت کھٹکی۔ میں نے صاف کہہ دیا، جو بات ہے صاف صاف کہو ورنہ اٹھو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ میرے ساتھ یہ ڈھکو سلے بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر پھوٹی اصل بات، اتنی دیر سے ڈرامے بازیاں کر رہی تھی۔ دونوں بڈھا بڈھی بیٹے کے ساتھ امریکہ جا رہے ہیں، نواسی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اس کے رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے، تب ہی برسوں بعد خون کے رشتے یاد آئے۔ میں نے تو صاف منع کردیا، نہ بی بی! باپ اس بچی کا کسی جوگا نہیں ہے۔ تمہاری لڑکی کے بعد بھی ایک شادی کروائی، تین بچے ہیں، پر وہ بچے ماں ہی پال رہی ہے نوکریاں کر کر کے۔ آٹھ سال سے باپ، بھائیوں کے سر پر باہر ہے۔ پر کماتا دھماتا کچھ نہیں، اتنی بڑی ذمہ داری میں نہیں اٹھا سکتی۔ رونے لگی، میرے پاؤں پکڑ لیے کہ ملازمہ سمجھ کر

جگہ دے دو گھر میں۔ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی ورنہ پھر یتیم خانے چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاہ۔" فیروزہ کا منہ کھل گیا مارے حیرت کے۔ "یتیم خانے؟"

"اب بتاؤ کیا کروں؟" صنوبر خاتون نے مشورہ طلب نظروں سے بہن کو دیکھا۔

☆☆☆

شہر کے پوش علاقے میں بنا خوب صورت سا یہ گھر اپنے رہنے والوں کے ذوق کی عکاسی کرتا تھا۔

بڑا سا سفید رنگ کا لوہے کا گیٹ جس کے دونوں کناروں پر دو سفید رنگ کے سنگ مرمر سے بنے شیر ایستادہ تھے۔ گیٹ کے ساتھ ساتھ جہاں تک دیوار جاتی تھی، دیوار کے اوپر لوہے کے تیر کی سی شکل والے راڈ اور اس کے اوپر خاردار تار۔ یعنی حفاظت کا پورا پورا انتظام یہاں کے مکینوں نے کر رکھا تھا۔

اندر آؤ تو ایک سمت مخملیں گھاس کا وسیع قالین بچھا نظر آتا تھا۔ دوسری سمت بیک وقت کم سے کم تین گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ تھی۔ ایک طویل راہ داری عبور کر کے آپ لاؤنج میں داخل ہوتے ہیں جہاں دو ماڈرن بزرگ بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

"مرزا صاحب!" انیسہ بیگم نے انگلیوں سے اپنے باب کٹ بال ٹھیک کرتے ہوئے میاں کو مخاطب کیا۔

"جی۔" بغیر اخبار سے نظر اٹھائے انہوں نے جواب دیا۔

"بات ذرا توجہ طلب ہے اگر اخبار کا مطالعہ بند کر دیں گے تو مجھے تسلی ہو جائے گی۔"

"جی، فرمائیے۔" اخبار ایک طرف رکھا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ ڈولی کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دینا چاہیے۔"

"ہوں....." مرزا صاحب نے ایک پُرسوچ "ہوں" کی۔

"ویسے بیگم! یہ جو مستقل سکونت والی بات ہے نا، یہ کچھ دل کو بھا نہیں رہی۔" انہوں نے کہہ کر دھیان سے انیسہ بیگم کے تاثرات ملاحظہ کیے۔ جو صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھیں۔ شارٹ شرٹ کے ساتھ سگریٹ پینٹ پہنے، برائے نام دوپٹا، کندھے پر ایک طرف کو جھول رہا تھا۔ ہونٹوں پر تیز میرون لپ اسٹک لگائے وہ کہیں سے بھی ساٹھ برس کی نہیں دکھتی تھیں۔

حسب توقع لمحوں میں ان کے چہرے کے زاویے بگڑے۔

"دیکھیے مرزا صاحب! اس بات پر پہلے ہی بہت بحث ہو چکی ہے۔ سالوں انتظار کیا ہے اس وقت کا، اب جب کہ سبب بنا ہی چاہتا ہے، آپ کوئی نئی پنچ نہ ہی نکالیں تو بہتر ہے۔"

مرزا صاحب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ ٹھیک کہہ رہی تھیں بیگم! بہت بار بحث ہو چکی تھی اس موضوع کو لے کر۔

"ویسے اگر روحان ڈولی کے لیے بھی تھوڑی بھاگ دوڑ کر لیتا تو کم از کم اس فکر سے تو آزاد ہوتے ہم۔"

"کی ہی ہوگی ڈولی کے لیے بھی کوشش۔ اب نہیں بنی ہوگی کوئی صورت تو کیا کرے بے چارہ! آج کل ان کے روحان سے تمام گلے شکوے ختم ہو گئے تھے۔

"دل بات بات پر اس کی طرف داری کو مچلتا تھا۔

مرزا صاحب ان کی دلی کیفیات سمجھتے تھے سو جواباً کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔"

ڈولی آ کر انیسہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ بلیو جینز پر بے بی پنک ٹی شرٹ پہنے وہ جمائیاں روک رہی تھی۔

"ہو گئی نیند پوری میری بچی کی۔" انیسہ بیگم نے پیار سے نواسی کو دیکھا۔ ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے میاں کو اشارہ کیا، بات شروع کرنے کا۔

"کہاں بڑی ماما..... ابھی بھی آنکھیں نہیں

کھل رہیں۔" سستی سے بولی۔

"ڈولی بیٹا!" مرزا صاحب نے نواسی کو مخاطب کیا۔

"جی بابا جان!" ڈولی نے نانا کو دیکھا۔

"آپ کے روحان ماموں اس ماہ کی 26 تاریخ کو آ رہے ہیں۔"

"گریٹ۔" ڈولی تاثرات سے عاری لہجے میں بولی۔ ہر تین چار سال کے بعد ایک ماہ کے لیے پاکستان آنے والے ماموں سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

عدم دلچسپی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ہر بار نانا، نانی کو باہر اپنے ساتھ لے جانے کا جھانسہ دیتے اور ہر بار ہی کوئی نہ کوئی رکاوٹ درپیش ہو جاتی۔ بے چاری نانی، لگتا تھا امریکہ جانے کی حسرت دل میں لیے دار فانی سے کوچ کر جائیں گی۔

دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہ ہر بار ہی نانا، نانی کو خوب خوب پٹیاں پڑھا کر جاتے کہ وہ خواہ مخواہ ہی پرائی اولاد (یعنی کہ ڈولی) پر وقت اور پیسہ برباد کر رہی ہیں۔ انہیں ڈولی کی ذمہ داری اس کے باپ کے سپرد کرنا چاہیے۔

اب چونکہ پیسہ وہی بھیجا کرتے تھے باہر سے سو نانا، نانی نے کبھی اختلاف رائے کی جرأت نہیں کی۔ یہ اور بات کہ کبھی اسے اس کے باپ کے حوالے کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ باپ بھی وہ جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا، نہ ہی باپ نے کبھی اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

ڈولی خیالوں کی دنیا سے باہر آئی تو بابا جان کے ہلتے لب دیکھے، چند لمحے لگے ان کی بات سمجھنے میں اور جب بات سمجھ میں آئی تو حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

"بڑی ماما، یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا جان!" فق ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے نانی کو دیکھا۔ اس وقت اسے ان کا جذباتی سہارا درکار تھا۔ پر نانی کی بات نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔

"بیٹا! صورت حال آپ کے سامنے ہی ہے، اس بار تو کام سمجھو پکا ہی ہے۔"

"مگر بڑی ماما! میں کیسے پرائی جگہ پر پرائے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کر پاؤں گی۔"

مرزا صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ایسے ڈولی کو ان لوگوں کے سپرد کر کے جانے کے حق میں نہیں تھے پر جب ساری زندگی ان کی نہیں چلی تھی تو اب کیا چلنی تھی۔

"پرائے کی کیا بات ہے، آپ کا اپنا گھر ہے وہ۔ آپ کے باپ کی کمائی پر سارا گھرانہ عیش کر رہا ہے، بس بہت لوٹ لیے ان لوگوں نے مزے۔ اب حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔"

"آپ کو ان لوگوں کے بارے میں ایسی اور اتنی معلومات کہاں سے ملیں؟" ڈولی حیران تھی۔ نانی نے اس کے ددھیال والوں سے کب رابطہ کیا۔

"ایک ہفتے سے ان لوگوں کی چھان بین کروا رہی ہوں۔ آپ کے فادر ابوظہبی میں ہیں، پچھلے آٹھ سال سے ان ہی کی کمائی پر یہاں پاکستان میں سب پل رہے ہیں۔" انیسہ بیگم نے ایک تفاخر سے کہتے ہوئے اپنے باب کٹ بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

"سب.....؟" ڈولی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "مطلب پورا پاکستان۔"

"ارے نہیں بھئی۔" نانی سخت بے مزہ ہوئیں۔ "قدوس میاں کے گھر والے۔" ان کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ مرحوم بیٹی کے شوہر کا نام لیتے ہوئے۔

"پرسوں گئی تھی میں، بتا دیا ہے قدوس میاں کی ماں کو کہ بہت عیاشی کر لی تم لوگوں نے، اب حق دار کی باری ہے۔"

انہوں نے ادا سے سر جھٹکا۔

پھر بہت دیر مکالمہ ہوا۔ ڈولی تھک ہار کر چپ ہو گئی، کوئی فائدہ نہیں تھا بحث، مباحثے کا۔

نانی نے اگر ٹھان لی تھی کہ انہیں امریکہ جانا ہے تو انہیں جانا ہی تھا۔ انہوں نے اگر کہہ دیا تھا کہ اسے اس کے ددھیال جانا ہے تو اسے جانا ہی تھا۔

"روحان ماموں کے تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔" یہ بھی وہ آخری بات جو اس نے سوچی تھی۔

☆☆☆

"اپنی مرضی کے آگے..... نو کمپرومائز۔" یہ تھا وہ سبق جو ساری زندگی اس نے نانی سے پڑھا تھا۔

"آپ کی ماما کو قدوس میاں پسند آ گئے تو شادی کر کے ہی دم لیا۔" یہ بات اس نے بچپن سے جوانی تک کئی بار سنی۔

"قدوس میاں" صرف ایک نام تھا اس کے لیے، نہ کوئی شبیہہ، نہ جذبہ۔

"حالانکہ سوائے اچھی شکل کے تھا ہی کیا ان کے پاس۔" (بالکل ٹھیک، اگر کچھ ہوتا تو ماما انہیں چھوڑتیں ہی کیوں)۔

"پھر نہیں بنی تو چار ماہ میں ہی چھوڑ دیا۔" نانی فکر سے گردن اکڑاتیں۔

"دوسری بار گھر بسایا، پر زندگی نے مہلت ہی نہ دی میری بچی کو ہنسنے کھیلنے کی۔"

یہاں پر نانی کے الفاظ میں جو دکھ بولتا تھا لہجہ اور تاثرات اس سے عاری ہی دکھتے۔

ڈولی کو اس قصہ پارینہ میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کی زندگی بس نانا، نانی کے گرد گھومتی تھی یا پھر کبھی کبھار روحان ماموں کا تڑکا درمیان میں لگ جاتا۔

تو اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے سو اس کو خوب جی لینا چاہیے۔ اپنی مرضی اور خواہش کے راستے میں آنے والی ہر شے کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑا دینا چاہیے۔

تو اب شروع ہوا چاہتا ہے زندگی کا ایک اور باب.....

☆☆☆

ڈولی نے کوفت زدہ انداز میں یہ سارا منظر دیکھا۔ اس کی عمر کی ہی لڑکی تھی وہ، نازک سا سراپا، خوب گورا رنگ، سیاہ سلکی لمبے بال جو پشت پر چوٹی کی صورت جھول رہے تھے۔ ڈھیلا ڈھالا چوغہ نما کرتا، شلوار کے پائنچے چڑھائے وہ بالٹی میں پانی بھر بھر کر صحن میں بہا رہی تھی۔

ایک کونے میں تخت پر بیٹھی اس کی دادی جو سروتے سے چھالیہ کتر کتر کر پاندان میں ہی ایک طرف رکھتی جا رہی تھیں۔ دادی سے بھٹکتی ہوئی اس کی نظر دیوار سے لپٹی بیل سے الجھی۔ وہ محویت سے اس کے ایک ایک پتے کو دیکھ رہی تھی جب شڑاپ شڑاپ کی آوازوں نے اس کا ارتکاز توڑا۔

اب وہ لڑکی جھاڑو سے پانی کو ایک طرف لے جا رہی تھی۔ یہ کرنے کے بعد اس نے وائپر اٹھا لیا۔

سخت الجھن ہو رہی تھی اسے، آخر یہ لوگ مجھے میرا کمرا کیوں نہیں دکھا رہے۔ میں کیوں بے کار میں یہاں بیٹھی رہوں۔

پر روم میں جا کر میں کیا کروں گی؟ یہ سوال اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔

اپنا ایزل، برش سب کچھ تو میں وہیں چھوڑ آئی بلکہ میں تو کبھی نہ چھوڑتی۔ نانی نے رکھنے ہی نہیں دیا، بس ضروری ضروری چیزیں رکھو، باقی سب بعد میں لیتی رہنا۔ انہوں نے تو کپڑوں اور چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں لانے دیا۔

ڈولی کو ایک، ایک کر کے اپنی بہت سی چیزیں یاد آتی گئیں۔ کینٹی اس کی پیاری بلی، پتا نہیں اب اس کا خیال کون رکھے گا۔ میری اور گاگا اس کا آسٹریلین طوطوں کا جوڑا۔ فائنی اور راہ اس کی مچھلیاں، وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بی جان نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر دیکھا۔ عجیب سی بے چینی تھی اس کے چہرے پر۔

تب تک ثناء دھلائی سے فارغ ہو چکی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے اسے کھڑے دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"مجھے میرا کمرا دکھا دیں پلیز۔" ڈولی اضطراب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"کمرا.....؟" ثناء کی سوالیہ نظریں بی جان کی جانب اٹھیں۔ وہ ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر پھر سے مصروف ہو چکی تھیں۔

"بی جان!" ثناء نے متوجہ کیا "ان کو" انگلی سے ڈولی کی طرف اشارہ کیا۔ "کون سا کمرہ دینا ہے؟"

"وہ جو پائیں باغ کے ساتھ والی راہ داری کے برابر میں بیس بائیس کمرے ہیں نا۔ ان میں سے کوئی پیش کر دے۔" بی جان کے جواب پر جہاں ثناء کی بتیسی باہر آئی، وہیں ڈولی کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"توبہ، یہ کس طرح کی زبان میں بات کر رہی ہیں۔ پائیں باغ، راہ داری۔" ڈولی کا ذہن ان کے الفاظ میں الجھ گیا۔

کچھ دیر لگی، ثناء کی ہنسی رکنے میں۔ تب ہی ڈولی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کہاں ہے یہ؟"

"کیا؟" ثناء نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی پائیں باغ اور راہ....." بات ابھی اس کے منہ ہی میں تھی کہ ثناء کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا، پیٹ پکڑ کر وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔

ڈولی ناسمجھی سے ان دونوں کی صورت تک رہی تھی۔ اس کی دادی انتہائی سنجیدگی سے پان پر چونا اور کتھا لیپ رہی تھیں۔ ثناء بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ کس بات پر اتنا ہنس رہی ہے اور اگر واقعی ہنسنے والی کوئی بات ہے تو پھر دادی اس قدر سنجیدہ کیوں ہیں۔ اللہ اللہ کر کے ثناء کی ہنسی رکی۔

اب ڈر کے مارے ڈولی نے کچھ بھی پوچھنے سے احتراز برتا۔

"چل اٹھ جا اب، گھر کی سیر کرا دے اسے۔" بی جان کہتے ہوئے خود بھی اٹھ گئیں۔ "میں ذرا فیروزہ کی طرف ہو کر آتی ہوں۔"

☆☆☆

"یہ دیکھو، یہ ڈرائنگ روم ہے۔" ثناء نے پردہ ہٹا کر لائٹ آن کی۔ ڈولی حیران رہ گئی، اتنا سادہ ڈرائنگ روم۔ ایک صوفہ سیٹ، چار کرسیاں درمیان میں ایک لکڑی کی میز اور بس۔

"آؤ۔" وہ باہر نکل آئی۔ "سنو تمہارا نام کیا ہے؟" باہر نکلتے نکلتے پوچھا۔

"ڈولی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اوں ہوں۔ وہ تو نک نیم ہے نا، نام بتاؤ۔"

"مدیحہ..... مدیحہ کنول۔"

"ارے کتنا پیارا نام ہے، مدیحہ کنول۔" اس نے دہرایا۔

بہت اجنبی سا لگا اپنا نام اسے۔

"یہ ہمارا بیڈ روم ہے۔" ڈرائنگ روم کی نسبت ایک بڑے اور کشادہ کمرے میں ثناء اسے لے آئی۔ جہاں دروازے کے بالکل سامنے ایک بڑا لوہے کا پلنگ رکھا تھا۔

"یہ بی جان کی مسہری ہے۔" اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے اس نے بتایا۔ اس کے دائیں طرف ایک سنگل بیڈ بچھا تھا، دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔ دیواروں پر دو ایک فریم آویزاں تھے اور بس۔

"کون کون شیئر کرتا ہے یہ روم؟" ڈولی نے سوال کیا۔

"بی جان، میں اور امی۔ پہلے سارہ بھی ہوتی تھی۔ میں اور وہ ایک ہی بیڈ پر سوتی تھیں۔ اب اس کی شادی ہو گئی ہے، کچھ دن سے طبیعت خراب ہے اس کی، اس لیے امی اس کی طرف رہنے گئی ہیں۔" ثناء نے تفصیل سے جواب دیا۔

"آ جاؤ۔" اس کی تقلید میں ڈولی باہر آ گئی۔

اب وہ دونوں اوپر جا رہی تھیں۔ ایک بڑا کمرا اور ایک چھوٹا کمرا یہاں پر بھی نیچے والے کمروں کی طرز پر بنے ہوئے تھے۔ چھوٹے کمرے میں جستی

بیٹی اور پتا نہیں کیا کیا الم غلم پڑا ہوا تھا۔
بڑے کمرے میں دو سنگل بیڈ ایک رائٹنگ ٹیبل، کرسی اور ایک بک ریک رکھا ہوا تھا۔
''یہ جواد اور تائی کا کمرا ہے۔'' ثناء نے تعارف کروایا۔
''جواد کون؟'' ڈولی نے بغیر کسی تجسس کے یوں ہی پوچھ لیا۔
''میرے تایا کا بیٹا بلکہ ہمارے تایا کا بیٹا۔ تمہارے بھی تو تایا ہی لگے نا۔'' اس نے خوشی سے ڈولی کو دیکھا جس کے چہرے پر حد درجہ بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ثناء نے ناگواری سی محسوس کی۔ پھر ماحول کی تلخی کو کم کرنے کے لیے خود ہی بات شروع کی۔
''چھ ماہ ہوئے ہیں تائی کے انتقال کو۔ بے چاری تائی، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، بہت لمبی بیماری کاٹی ہے۔''
ابھی ثناء کچھ اور بھی کہتی مگر ڈولی نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔
''میں ریسٹ کرنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے میرا روم دکھادو۔''
ثناء نے حیرت سے اس کی بات سنی۔ ''میں تمہیں سارا گھر دکھا چکی ہوں۔''
''اور وہ جو دادی کہہ رہی تھیں' راہ داری اور بائیں باغ اور کمرے؟'' سوالیہ نظریں ثناء کی جانب اٹھیں۔
ثناء نے بڑی مشکل سے اپنے تاثرات نارمل رکھے (ہنسی دبائی)۔
''وہ مذاق کررہی تھیں۔ یہ کُل چار ہی کمرے ہیں ہمارے گھر میں۔''
''تو میں کہاں رہوں گی؟'' پہلی بار بے زاری کی جگہ پریشانی نے لی۔
''ہمارے کمرے میں۔ میرے، بی جان اور امی کے ساتھ بلکہ میں اور تم ایک ہی بیڈ شیئر کریں گے۔''
حقیقتاً یہ پہلا صدمہ تھا جس نے مدیحہ عرف ڈولی کا دماغ ماؤف کیا۔

☆☆☆

''بی جان! کیسی اداسی سی ہوگئی ہے نا سارہ کی شادی کے بعد سے۔'' جواد نے مطلب کی بات کرنے سے پہلے تمہید باندھی۔
بی جان تخت پر بیٹھی، پان کے پتوں کو ترتیب سے پاندان میں سیٹ کر کے رکھ رہی تھیں۔ اس کی بات پر ہاتھ ساکت ہوئے، ایسے جواد کی طرف دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔
''کون سی اداسی دکھ رہی ہے تجھے؟''
جواد کچھ گڑبڑا گیا۔
''میرے کہنے کا مطلب تھا کہ سارہ کی شادی کے دنوں میں کتنا اچھا لگتا تھا نا۔ رونق سی ہوجاتی تھی گھر میں۔'' جلدی سے بات سنبھالی۔
''خاک اچھا لگتا تھا، یہ.....'' ہاتھ سے صحن کی طرف اشارہ کیا۔ ''اتنا سا صحن، ایک فیروزہ کے گھر سے بچیاں ہی آتی تھیں نا اپنے بچوں کو لے کر۔ اس پر بھی چھٹی بازار بن جاتا تھا، بچے ایک طرف شور مچا رہے ہیں۔ مائیں دوسری طرف اپنی مستیوں میں مگن ہیں، توبہ۔ تب ہی سے جو درد بیٹھا ہے سر میں، اب تک اس نے جان نہیں چھوڑی۔''
''(اف کیا کروں؟)'' جواد نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بی جان! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ایک دم ہی بڑی خاموشی اور ویرانی سی ہوگئی ہے۔''
''تو، پورا دن کسی روز گھر بیٹھ، پھر تجھے پتا چلے گا۔ فجر کے وقت سے جو رکشے باہر گلی سے گزرنا شروع ہوتے ہیں نا، سر میں درد کردیتے ہیں۔ صبح ہی صبح، یہ دائیں ہاتھ والی رشیدہ بچوں کو گالیاں دینا شروع کردیتی ہے۔'' (کم بخت، زیر لب کہا)۔
''یہ بائیں ہاتھ والا صادق، صبح سے شام تک، شام سے رات تک شاید ہی کوئی وقت ہوتا ہو جب ان کی لڑنے کی آوازیں نہ پورا محلہ سنتا ہو۔ سکون اور خاموشی کو ترس گئی ہے زندگی۔'' بی جان کے اپنے غم

تھے۔
''مطلب، آپ کو اس گھر میں مزید کسی رونق کی ضرورت نہیں ہے۔''
''بالکل بھی نہیں۔'' انہوں نے اطمینان سے کام مکمل کر کے پاندان بند کیا۔
جواد نے کچھ مایوسی سے سر جھٹکا۔ آخر صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔
''آپ کو میرے سر پر سہرا سجانے کا بھی کوئی ارمان نہیں ہے۔''
''یہ سہرا کیا ہوتا ہے؟'' بی جان نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔
''ایں.....'' عجیب غیر متوقع سی بات کی تھی بی جان نے۔
''سہرا..... وہی جس کے پھول کھلتے ہیں۔'' اپنی دانست میں انتہائی معقول جواب دیا۔
''ہمارے زمانے میں ہوتے تھے سہرے اور گھونگھٹ۔ دولہا کا چہرا سہرے سے ڈھانپا جاتا تھا۔ دلہن کا گھونگھٹ سے۔ اب نہ سہرے رہے نہ گھونگھٹ۔ شرم و حیا کے رخصت ہوتے ہی یہ چیزیں بھی ناپید ہوگئی ہیں۔''
''بس فلسفہ بولتی رہیں گی، مطلب کی بات پر نہیں آئیں گی۔'' جواد بس سوچ کر رہ گیا۔
''تو کیا میں کنوارا ہی مرجاؤں گا۔'' ترپ کا آخری پتہ پھینکا۔
''تُو کیا مرنے والا ہے؟'' جذبات سے عاری لہجے میں بی جان نے سوال کیا۔
''زندگی، موت کا کیا بھروسا ہے بی جان! کیا خبر کس گھڑی عزائیل پروانہ لے کر آجائے۔'' اپنی دانست میں انتہائی معقول بات کی۔
''بالکل ٹھیک۔'' بی جان نے تائید کی۔
''انسان کو ہر وقت اپنی موت کو یاد رکھنا چاہیے۔ شکر ہے، تجھے جوانی میں ہی عقل آگئی۔ اب اپنی زندگی کو بے کار کے مشغلوں میں ضائع کرنے کے بجائے عبادت میں دل لگا۔''
''ہیں..... یہ تو سارا کچھ الٹا ہوگیا۔'' سر کھجایا۔
بی جان تخت سے پاؤں اتار کر چپل دیکھ رہی تھیں۔ جواد نے جلدی سے آگے کی۔ بی جان نے چپل پاؤں میں اُڑسی، اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''میں ذرا نماز پڑھ لوں۔''
تب ہی جواد کو ایک اور بات سوجھ گئی۔ ''بی جان! شادی کرنا سنّت ہے۔''
''ہاں بیٹا! مگر آگے جا کر پہلے فرائض کا حساب دینا ہوگا، ان کی پابندی کی عادت ڈال لے۔''
''بی جان! سنیں تو.....'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بی جان نے ہاتھ اٹھا کر اس کو بولنے سے روک دیا۔ ''تیری شادی ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوگی پہلے کچھ بن جا۔ میں ایک دفعہ پھر عبد القدوس کی کہانی دہرانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''
''اگر تب تک اس کی شادی کہیں اور ہوگئی۔''
جواد آزردہ ہوا۔
''جو چیز تیرے نصیب کی ہے، وہ تجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو نصیب میں نہیں ہے اس پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''
بی جان چلی گئیں، جواد پر سوچ کے کئی در وا کر گئیں۔

☆☆☆

''امی جان! مجھے عشق ہوگیا ہے۔''
امی کے سویٹر بنتے ہاتھ رکے۔ ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اپنے سب سے چھوٹے نمونے کی جانب نگاہ کی، جسے ہر چند ماہ بعد شدّت سے کسی نہ کسی چیز کا بخار چڑھتا اور چند ہی دن بعد اسی شدت سے اتر بھی جاتا۔
گھر میں نئے مہمان کی آمد آمد تھی۔ امی جان حد سے زیادہ مصروف۔ کبھی ٹرنک کھولے پرانے کپڑے نکال کر ادھیڑ رہی ہیں۔ کبھی پرانے سویٹروں کی اون کھول کر نئے سویٹر بُن رہی ہیں۔

کبھی بازار میں گھوم گھوم سیلوں سے سستے کپڑے لاکر چھوٹے چھوٹے نہالچے اور کلوٹ تیار ہو رہے ہیں۔
غرض جوں جوں عابدہ کے دن نزدیک آتے جارہے تھے، امی جان کی مصروفیت حد سے سوا ہوتی جارہی تھی۔
ایسے میں عبدالقدوس کے چڑھتے اُترتے نئے نئے تماشوں کی جانب دھیان دینے کا ان کے پاس قطعی وقت نہ تھا۔
بس، ایک لمحے کو کام سے نظر ہٹا کر انہوں نے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔
عبدالقدوس سخت بے مزا ہوا، اس بے توجہی پر۔ اب کے ذرا آواز میں شدّت پیدا کر کے ماں کو مخاطب کیا۔
''امی جان! مجھے ایک لڑکی سے شدید محبت ہوگئی ہے۔'' بس نہ چلتا تھا کہ شدت کا کوئی پیمانہ لے آتا یقین دلانے کے لیے۔ انہوں نے کسی بھی تاثر کا اظہار کیے بغیر کام جاری رکھا۔ اوپر سیڑھیوں سے رقیہ، جواد کو گود میں لیے اترتی نظر آئیں۔ آخری سیڑھی پر پہنچتے ہی انہوں نے جواد کو نیچے اتارا۔
تین سالہ جواد بھاگتا ہوا دادی کی طرف لپکا۔
''بی جان!'' اس سے پہلے کہ بی جان ہاتھ بڑھا کر اسے گود میں لیتیں، بچہ ٹھوکر کھا کر گرا اور بھاں بھاں فل والیوم گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔
رقیہ بھاگتی اس تک پہنچیں، عبدالقدوس نے بڑھ کر اسے گود میں اٹھایا۔ بی جان نے آگے بڑھ کر عبدالقدوس کی گود سے اس کو لیا اور بہلانے لگیں۔
سو اس سارے قصے میں عبدالقدوس کو اپنے اس نئے نویلے کارنامے پر مزید روشنی ڈالنے کا موقع مل سکا نہ محل، سو چپ چاپ کھسک لیا۔
جواد کے چپ ہوتے ہی رقیہ باورچی خانے کی جانب بڑھیں۔
''رقیہ!'' بی جان نے پیچھے سے آواز دی، جواد بدستور ان کی گود میں چڑھا بیٹھا تھا اور اون سلائیوں سے تھوڑا بہل گیا تھا۔
''جی، امی جان؟'' رقیہ پلٹیں۔
''چائے بنانے جارہی ہو؟''
''جی۔'' کہہ کر سوالیہ نظروں سے ساس کو دیکھا۔
''اچھا، ادھر آ ذرا۔'' انہوں نے تخت پر آگے پیچھے ہاتھ مارتے بہو کو پاس بلایا۔ رقیہ پلٹ کر واپس آگئیں۔
آخر تکیے کے نیچے سے مطلوبہ چیز برآمد کی۔
''یہ لے۔'' ہاتھ بڑھا کر ایک شاپر بہو کو دیا۔
''یہ پاپڑ تل لے چائے کے ساتھ اور ذرا عابدہ کو آواز دے لے، نماز نہ قضا ہو جائے عصر کی۔''
''جی، امی جان!'' وہ لفافہ پکڑ کر پلٹیں۔
عابدہ آج کل پورے دنوں سے تھیں، سو بہو کا احساس کر کے وہ جب بازار جاتیں کچھ نہ کچھ لے آتیں۔ کبھی کوئی شاپر چھپا کر چپکے سے اس کے کمرے میں چھوڑ آتیں کہ اس حال میں وقت بے وقت بھوک لگتی ہے۔
رقیہ کبھی دیکھ لیتیں تو مسکرا دیتیں۔ ایسی ہی تھیں اس کی ساس۔ جواد کی مرتبہ ان کو بھی خوب ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ اب عابدہ کی باری تھی، پہلی پہلی بار تھی، سو خوب اس کے بھی ناز نخرے اٹھاتیں۔
بیٹوں کے لیے سختی سے تاکید تھی کہ جب بیویاں اس حال میں ہوں تو چاہے خود ایک وقت فاقہ کر لو پر بیوی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آؤ۔
رقیہ چائے کے ساتھ پاپڑ تل کر لے آئیں، اتنی دیر میں عابدہ بھی کمرے سے آگئیں، ہاتھ میں رسک کا شاپر تھا۔
''امی جان! یہ لیجیے۔ کل ''یہ'' لے کر آئے تھے، زیادہ دیر پڑے رہے تو باسی ہو جائیں گے۔ چائے کے ساتھ سب کھا لیتے ہیں۔'' انہوں نے گردن ہلائی اور تخت پر اپنے برابر میں اس کے لیے جگہ بنائی، تکیہ اٹھا کر دیا۔
''یہ لے، ٹیک لگا کر بیٹھ جا۔''

عابدہ ٹیک لگا کر سہولت سے بیٹھ گئیں۔ رقیہ انہیں تھوڑا سنبھال کر بیٹھ گئیں۔
''تم دونوں نے نیا شوشا سنا اپنے دیور کا۔'' انہوں نے بات شروع کی۔ ساتھ ہی چائے کا سڑکا گھونٹ بھرا۔
''اوں، ہوں.....'' منہ بنایا۔ ''رقیہ! تو مجھے ٹرکا مریض بنا کر چھوڑے گی۔''
''مطلب، پھر چینی تیز ہوگئی۔'' رقیہ نے سر پر ہاتھ مارا۔
ساتھ ہی ایک گھونٹ لیا اپنی پیالی سے، چائے بالکل پھیکی تھی۔ (اُف ایک تو امی جان کی حس مزاح) بھاگیں بورچی خانے کی طرف چینی لینے۔
''کس شوشے کی بات کر رہی تھیں امی جان آپ؟'' عابدہ نے استفسار کیا۔
رقیہ نے ایک چمچہ چینی بھر کر امی جان کی پیالی میں ڈالی۔ چمچہ پیالی ہی میں چھوڑ دیا۔ صنوبر بیگم نے چینی ہلا کر کپ دوبارہ لبوں سے لگا لیا۔
''کہہ رہا تھا، مجھے عشق ہوگیا ہے۔'' امی جان نے اب پاپڑ اٹھا کر ایک اپنے منہ میں ڈالا، ایک جواد کے ہاتھ میں دیا۔ عابدہ ہنسنے لگیں۔ رقیہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رینگی۔
''عشق ہوگیا ہے کم بخت، سارے زمانے کے وہلے نکمے کو.....'' چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی۔ ''وہ بھی ایک لڑکی سے۔'' گھونٹ بھر کر جملہ مکمل کیا۔ عابدہ کو بڑے زور کی ہنسی آئی۔
''امی جان! اصولاً تو عشق ہونا بھی لڑکی سے ہی چاہیے۔ اگر کسی لڑکے سے کر بیٹھتا تو..... پھر تو اور بھی زیادہ غلط ہو جاتا۔'' عابدہ کی ہنسی ہی تھمنے میں نہیں آرہی تھی۔
بی جان البتہ کڑوے بادام سا منہ بنائے اپنے چھوٹے صاحبزادے ہی کے بارے میں سوچے جارہی تھیں۔ ناکوں ناک عاجز کر کے رکھ دیا تھا اس لڑکے نے انہیں۔
سرور حسین سے صنوبر خاتون کا نکاح ان دونوں کے نانا نے انتہائی ہنگامی حالات میں کروایا تھا۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ ہسپتال میں اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے اور دل کی شدید خواہش یا آخری خواہش کے طور پر دونوں بیٹیوں سے بچوں کے فوری نکاح کی درخواست کر دی بلکہ وہ تو قابل رشک صحت کے حامل انسان تھے اور ان کی شادی کے کئی سال بعد تک جیے۔
بس بات صرف اتنی سی تھی..... کہ بیوہ بیٹی جس کے سر پر ہمیشہ چھتنار کی مانند سایہ فگن رہے، بالکل اچانک ہی انہیں داغ مفارقت دے گئی۔ سو دل کچھ یوں بے چین ہوا کہ بیٹی کا چالیسواں کرتے ہی سرور حسین کے سر پر سہرا سجا دیا کہ ماں باپ بچے کے سر پر ہیں نہیں۔ میں بھی نہ رہا تو اس کا گھر کون آباد کرے گا یوں صنوبر، سرور کی زندگی میں بہار بن کر آئیں۔
شادی کے پہلے سال عبدالمہیمن گود میں آیا۔
تیسرے سال عبدالجبار اور اس سے اگلے برس عبدالقدوس۔
میاں پلمبری کرتے تھے۔ کبھی سخت، کبھی نرم دن گزر ہی گئے۔ نانا جان اپنی وفات سے قبل یہ مکان جو اُن کی ذاتی ملکیت تھا۔ سرور حسین کے نام کر گئے۔ بساط بھر بچوں کو پڑھایا، اچھی تربیت کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔
عبدالمہیمن انٹر میں تھا جب سرور حسین کو دل کا دورہ پڑا، مزدور آدمی بیمار پڑ جائے تو اس کے ساتھ ساتھ سارا گھر بیماری کاٹتا ہے۔
سو یہاں پر بھی یہی ہوا۔ صنوبر خاتون نے سلائی مشین سنبھالی۔ عبدالمہیمن نے ایک دکان پر بطور سیلز مین کام شروع کیا۔ پڑھائی کا سلسلہ جو ٹوٹا تو سرور حسین کی ٹھیک ہونے اور کام پر جانے کے بعد بھی جڑ نہ سکا۔
عبدالجبار یوں کچھ بہتر رہ گیا کہ انٹر اچھے

نمبروں سے پاس کرنے کے بعد گریجویشن بھی کرلیا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ حالات کچھ بہتر ہوئے، مہینہ کاٹنا آسان ہونے لگا۔

سب سے زیادہ تنگ عبدالقدوس نے کیا۔ ہمیشہ، ہر معاملے میں۔ کبھی پڑھ کر نہ دیا۔ زبردستی، دھکّے سے میٹرک تک پہنچا دیا مگر تین سال برابر فیل ہوا۔ ماں، باپ نے ہاتھ جوڑ دیے تو کوئی کام سیکھ لے۔ کام کی بھی عجب کہانی رہی۔

پندرہ دن ٹِک کر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی ایک کام، کبھی دوسرا۔ سال میں کوئی نہ نہ کرکے بھی دس بارہ جگہوں پر کام کرکر کے چھوڑا۔ آخر تنگ آکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران سرور حسین کا باہر کا چانس لگ گیا۔

ابوظہبی میں پلمبروں کی ضرورت تھی، جانے والے بے شمار۔ پر قسمت نے یاوری کی اور سرور حسین کے جانے کا سبب بن گیا۔

سرور حسین کے باہر جانے سے گھر کے حالات میں مزید بہتری آئی۔ گھر کو رنگ وروغن، مرمّت غرض ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک کروایا گیا۔

دو سال کے وقفے سے صنوبر خاتون نے عبد المھیمن اور عبدالجبار کی شادیاں کیں۔

گھر کے خرچ کو سرور حسین کی بھیجی رقم کافی ہوتی، صنوبر خاتون لڑکوں سے آمدنی کی ایک پائی نہ لیتیں کہ اپنی ضروریات پوری کرلو، یہ بھی ہماری ہی بچت ہے۔

اس سارے معاملے میں عبدالقدوس دن بدن مزید آوارہ ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبوتر پالنے کا شوق چراتا، کبھی ملک کا عظیم مصور بننے کی کوشش شروع ہوتی اور تو اور ایک مرتبہ سیاست کا دورہ پڑا، پھر ایک مرتبہ خرگوش پالنے کا شوق چرایا۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ کوئی شوق دو ہفتے پورے نہیں کرپاتا تھا۔ صنوبر خاتون تنگ آجاتیں تو خرچا بند کردیتیں کہ تیری عمر میں بڑے دونوں کمائی کرنے لگے تھے۔

ماں سے مایوس ہوکر بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔ ہاں خود سے چار پیسے کمانے کی کوشش کبھی نہ کی۔

اور اب..... صنوبر خاتون حال میں واپس آئیں۔ اب بھلا نیا کیا ہوا تھا؟

''عشق..... وہی چار دن کا شوق۔ اُتر جائے گا یہ بخار بھی۔ ہفتہ، دو ہفتہ میں۔'' انہوں نے سر جھٹکا۔

بات کتنی سنجیدہ تھی۔ اس کا انہیں اندازہ ہی نہ ہوسکا۔

☆☆☆

سات سال کی عمر سے وہ بہترین مقررہ کا ٹائٹل جیت رہی تھی۔ اسکول سے لے کر کالج تک کوئی تقریری مقابلہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی شعلہ بیانی سے مدِمقابل کو چت کردیا کرتی۔ یہ تو تقریری مقابلوں کی بات تھی، عام زندگی میں بھی، وہ بہترین مقررہ تھی۔

ایک سنانے والے کو دس سناتی تھی۔ اگلے کا انداز دیکھ کر وہ جان جاتی تھی کہ اس کا جملہ کیا ہوگا۔

ایک جملہ سن کر وہ بات کی تہ تک پہنچ جایا کرتی۔ اس کے اندر مقابل کے اندر تک اتر کر جان لینے کی خداداد صلاحیت تھی۔

اور اس صلاحیت یعنی کہ اتنے عظیم ٹیلنٹ سے اس کے گھر والے ازحد بے زار۔ کوئی اسے اپنے ساتھ بازار لے جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی اس کے ساتھ بازار جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وجہ.....؟ صرف اور صرف اس کا ٹیلنٹ۔

کوئی رکشے والا ہوتا یا ٹیکسی والا، سیلز مین یا کوئی راہ گیر، فارحہ راہ چلتے اپنے ٹیلنٹ کا مظاہرہ نہ کرے؟

ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

وہ فی البدیہہ تقریر کرتی، مجمع اکٹھا ہوجاتا۔ دنیا اس کو دیکھ رہی ہوتی۔ وہ ——— ہاتھ لہرا لہرا کر دلائل دیتی۔ ساتھ والے اس کو کھینچ رہے ہیں۔

''چلو فارحہ! لوگ اکٹھے ہوگئے ہیں۔'' فارحہ،

اختتام سے پہلے منظر سے ہٹ جائیں، ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

''میں آئندہ اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ساتھ جانے والی ہر بہن واپسی پر اعلان کرتی۔

''تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میری وجہ سے.....''

''تمہاری وجہ سے دنیا ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوگئی۔''

''اس رکشے والے کو سبق مل گیا آئندہ کبھی.....''

''اس رکشے والے نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔''

''وہ بار بار ہمیں دیکھ رہا تھا مررسے۔''

''وہ پیچھے آنے والی گاڑیاں دیکھ رہا ہوگا۔''

''وہ ہمیں سیٹی مارنے والا تھا۔''

''اس نے کوئی سیٹی نہیں ماری تھی۔ تم نے.....''

''میں نے مارنے ہی نہیں دی۔ جب میں نے باتیں سنانا شروع کیں تب اس نے ارادہ ترک کیا۔''

''تم اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی شرمندہ کرواتی ہو۔''

''اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے' آئندہ یہ مرد محتاط رہیں گے۔ اکیلی لڑکیاں دیکھ کر کچھ ایسا ویسا سوچیں گے بھی نہیں۔'' اس کی ایک اور تقریر شروع ہوجاتی۔

بہن پاؤں پٹختی اندر چلی جاتی۔ دادی سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں (اف کیا بنے گا اس لڑکی کا)۔ امی، جوابی تقریر شروع کردیتیں۔ فارحہ نے ہارنا نہیں سیکھا تھا اس کا منہ بند کروانے کے لیے امی کے اوزار و ہتھیار کام نہ آتے۔ جوتا وہ آرام سے کیچ کرلیتی۔ برتنوں پر جھکائی دے جاتی۔ چپل اس کا کچھ بگاڑ نہ پاتی۔

آخری چارے کے طور پر امی جس چیز کا انتخاب کرتیں، اس سے اس کی ـــ جان جاتی تھی۔

جی ہاں..... وائپر۔ دور کھڑے ہوکر بھی انسان آرام سے پٹ جاتا ہے۔ سو، آخر میں فیصلہ وائپر کرتا تھا۔

فارحہ غائب ہوجاتی، ایسے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ ہر بار ہوتا۔

ہر بار یہ ہی ہوتا.....

اس سے بڑی چار بہنیں آرام سے نمٹ گئیں۔

جب باری فارحہ کے رشتے کی آئی تب آیا گھر والوں کو دانتوں تلے پسینہ۔ اسے ہر رشتے پر اعتراض ہوتا۔

لاکھ منع کرنے کے باوجود، سب کے درمیان جا کر بیٹھ جاتی۔ ابو، امی کو اشارے کررہے ہیں۔ امی اسے گھوریاں لگا رہی ہیں۔ دادی، مہمانوں کا دھیان بٹانے کی کوشش کررہی ہیں اور فارحہ بیگم..... وہ تقریر کے لیے میدان میں اتر آتیں اور ایسا میدان میں اترتیں کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھاگتے۔ توبہ، اتنی تیز لڑکی..... نہ بابا نہ.....

عمر کا رشتہ اس کے لیے آنے والا پانچواں رشتہ تھا۔ یہی وہ رشتہ تھا جس کی وہ منتظر تھی۔ کھاتے پیتے لوگ، لڑکے کی بہترین تعلیم، اچھی جاب، اپنا گھر، غرض وہ مطمئن تھی۔ گھر والے غیر مطمئن۔

وہ طریقے سے اندر آئی، سلام کرکے چائے پیش کی۔ ایک طرف کو بیٹھ گئی۔

لڑکے کی بھابھی نے چند ایک سوال پوچھے، اس نے سر جھکا کر طریقے سے جواب دیے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر کمرے سے اٹھ گئی۔ ابو حیران، امی پریشان، دادی شاداں وفرحاں۔

بات تیزی سے آگے بڑھی، شادی کی تیاریاں..... اس کا بازار جانا ناگزیر ٹھہرا۔ شادی شدہ بہنوں کو بلایا جاتا جو ایک بار اس کے ساتھ جاتی، دوبارہ کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔

ساس نے فرمائش کی، فارحہ کو ساتھ لے جاکر

لہنگا اور سینڈل پسند کروانی ہے۔ فارحہ اور ساس..... اور بازار..... نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں طریقے سے منع کردیا گیا، ناپ بھجوادیا۔ اپنی مرضی سے لے لیں جو لینا ہے۔

فارحہ کو بھنک بھی پڑنے نہیں دی گئی۔ وہ انتظار ہی کرتی رہ گئی کہ سسرال سے کوئی آئے گا۔ کچھ تھوڑی بہت شاپنگ تو اس کی مرضی سے ہوگی بری کی۔ اس کا انتظار، انتظار ہی رہ گیا۔

شادی کا دن آپہنچا۔

ابو بار بار امی سے کہتے۔ ''اس کو سمجھادو کہ.....''

امی ہر تھوڑی دیر بعد اس کے پاس آکر بیٹھ جاتیں۔ اس کے کان میں جانے کیا کیا انڈیلتی رہتیں۔

وہ امی کے جانے کے بعد موبائل سامنے کرتی جس کا ایک تار اس کے دونوں کانوں سے لگا ہوتا اور آرام سے گانا چینج کرتی۔ دادی الگ سمجھاتیں۔ شادی شدہ بہنیں الگ الگ اس کو تحمل، برداشت، زباں بندی کا درس دیتیں۔ وہ ایک کان سے سنتی دوسرے سے نکال دیتی۔ وہ دلکش تھی، یہ اس کو پتا تھا۔ میک اپ کرکے پیاری لگتی تھی، یہ بھی اس کو پتا تھا۔ پر دلہن بن کر اس قدر قیامت ڈھائے گی (یہ اس کا اپنا خیال تھا) یہ اس کو نہیں پتا تھا۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی، خیالوں میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ ابھی وہ آئیں گے اور میری تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے، اسے گدگدی سی ہوئی سوچ کر۔ وہ آئے.....

ان کے آنے کا احساس اسے تب ہوا جب وہ چکرا کر گری۔ احمق دولہا..... (دل میں اس لقب سے نوازا) بجائے سہارا دے کر اٹھانے کے ٹکر ٹکر دیکھے جارہا ہے اور اوپر سے اس جملے کی تکرار۔

''کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

ایک فی البدیہہ تقریر زبان کی نوک سے واپس کی۔ دادی کی تقاریر، امی کی نصیحتیں عین وقت پر یاد آئیں۔

''کوئی گرے تو چوٹ لگتی ہی ہے۔''

بس اتنا ہی کہہ کر بمشکل کچھ اور کہنے سے خود کو باز رکھا۔ دونوں ہاتھوں سے زمین کا سہارا لیا اور اٹھ گئی۔

بیڈ پر بیٹھ کر دیکھا۔ اس کا دولہا ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ''ڈفر.....'' زیر لب کہا۔

''آجائیں، بیٹھ جائیں..... کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔'' وہ آکر سامنے دھرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کھنکھارنے پر فارحہ متوجہ ہوئی۔ اب یہ میری تعریف کریں گے۔ اس نے فخر سے ذرا سی گردن اٹھائی۔

نظر، یوں ہی ایک لمحے کو شریک سفر کے چہرے کا طواف کرکے پلٹی۔

دماغ نے ریڈ الرٹ جاری کیا۔ یہ تعریف، تو ہرگز نہیں کرنے لگا۔ وہی خداداد صلاحیت۔

''دیکھو فارحہ!'' اس نے بات شروع کی۔

''اس نے کچھ یاد کیا ہوا ہے، یاد کیا ہوا پڑھ کر سنانے لگا ہے۔'' اس کی باڈی لینگویج نے فارحہ کو بتایا۔ ''اس کا توڑ کرنا پڑے گا۔'' فارحہ کے پاس توڑ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔

''دیکھو فارحہ نہیں..... سنو فارحہ! آپ مجھے کچھ دکھا نہیں رہے، سنا رہے ہیں۔'' اپنی بات کے اختتام پر خود ہی مسکرائی۔

''میری ایک بات اپنے پلو سے باندھ لو، اچھے طریقے سے۔'' جلدی جلدی اس نے کہنا شروع کیا۔

(تقریر دو منٹ کی ہوگی۔ فارحہ کو فوراً پتا چل گیا۔ ہوں)۔

''اور عنوان کیا ہوگا۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''میری فیملی میرے لیے بہت اہم ہے۔''

(فیملی کی ایسی کی تیسی، جوابی تقریر کم سے کم چار منٹ کی ہوگی)۔ وہ گھبرا رہا تھا، ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''میرے ماں باپ کی عزّت اور خدمت دونوں اپنے اوپر لازم کرنا پڑے گی تمہیں۔''

(تقریر کے الفاظ بمع تاثرات اس نے ذہن میں ترتیب دے لیے تھے)

''تب ہی میری نظر میں تم وہ مقام حاصل کرپاؤ گی، جو ہر بیوی.....''

اس نے اپنے شریک سفر کا اعتماد متزلزل ہوتے محسوس کیا۔

''کیا کہا..... آپ نے.....؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّائی۔

اس کے شریک سفر کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں، اندر تک ٹھنڈ ڈال گئیں۔

''کیا کہہ رہے تھے آپ؟ آپ کے والدین کی خدمت اور عزّت لازم کرلوں خود پر؟ ہیں.....؟''

(ہائے، کہیں رو ہی نہ پڑے، فارحہ کو ترس آیا۔

''ہاں، تب ہی تمہیں یہاں پر وہ مقام.....'' آگے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

(آجاؤ نیچے، میں تمہیں بتاتی ہوں تقریر کرتے کیسے ہیں۔ وہ بھی فی البدیہہ)

وہ پاؤں پٹختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی تھی، اس نے ہاتھ پکڑ کر روکا تھا لیکن وہ اب کہاں تھا؟ اس نے سر اٹھا کر ارد گرد نظر دوڑائی۔

(یہ سب الٹا پلٹا آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ کتنا معصوم سا شکوہ تھا)۔

بیڈ روم کے پرلے سرے پر موجود چھوٹی سے بالکنی میں اسے عمر کی جھلک نظر آئی۔

وہ اٹھ کر دبے قدموں تھوڑا قریب ہوئی بالکنی کے۔ (شاید سگریٹ پی رہے ہوں گے، ایسے مواقع پر ڈراموں میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے)۔

اس نے جھانک کر دیکھا، اس کی طرف عمر کی پیٹھ تھی۔ منہ دوسری طرف تھا۔

وہ سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔

تو پھر کیا کر رہا تھا؟

☆☆☆

عابدہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش نے بی جان کو پھر سے جوان کردیا تھا۔ بیٹی کا بہت ارمان تھا ان کو، پر رب نے مقدر میں تین بیٹے رکھے۔

رقیہ کی مرتبہ بھی انہوں نے ڈھیروں ڈھیر دعائیں کیں، پوتی کے لیے پر اللہ کی مہربانی جواد کی صورت ظاہر ہوئی۔

اور اب..... اب تو وہ جتنا شکر ادا کرتیں رب کا، وہ کم تھا۔ بچی کا نام بڑے چاؤ سے انہوں نے سارہ رکھا۔

سارہ چھ دن کی تھی جب دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔

ایک تو سرور حسین بغیر پیشگی اطلاع کے دو ماہ کی چھٹی پر پاکستان آگئے۔ دو سال بعد یوں اچانک، بیوی، بچے سب بچھ بچھ گئے۔ خود سرور حسین بھی سب کے درمیان اس قدر نہال کہ لگتا تھا نئے سرے سے جوان ہوگئے ہوں۔

دوسری بات.....؟ دوسری بات نے تو سب کو حیرت کی زیادتی سے مانو پتھر کا بُت ہی بنادیا۔ ہوا کچھ یوں کہ عبدالقدوس روز ماں کے سر ہو جاتا۔

''امی جان! آپ ایک مرتبہ ان لوگوں سے مل لیں، روبی بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

صنوبر خاتون اس کی بات کو ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑاتیں۔

''ہاں، میں بہت خوش ہوں گی۔'' وہ اسے گھورتیں۔ ''جتنا تُو نے خوش کیا ہوا ہے نا مجھے۔ وہ ہی کافی ہے میرے لیے۔ اس سے زیادہ خوشی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔''

''امی جان! اس کے لیے بہت رشتے آرہے ہیں، اس کے گھر والے کہیں اور اس کا رشتہ نہ طے کردیں۔'' وہ ماں کی منّت کرتا۔

''ارے، ایسی قطاریں لگی ہیں اس کے لیے

رشتوں کی تو وہ تجھ جیسے کنگلے کو کاہے کو بیٹی دینے لگے۔"

"وہ بھی مجھ سے سچا پیار کرتی ہے۔" عبد القدوس اترایا۔

"اور اس کے ماں باپ بھی تجھ سے سچا پیار کرتے ہیں؟" طنزیہ پوچھتیں۔

"امی جان!" وہ زچ ہو کر چلاتا۔

"کیا امی جان؟ جواب دے نا، میری بات کا۔ اگر تو اس کے ماں باپ بھی تجھ سے سچا پیار کرتے ہیں تو پھر تو، تجھ سارے زمانے کے وبیلے، نکمے کو بنا لیں گے اپنا داماد ورنہ پھر....." اور اس ورنہ کے بعد وہ مکالمہ ختم کر دیتیں۔

اب عبد القدوس لاکھ سر پٹختا، وہ اس سے آگے سننے کو تیار ہی نہ ہوتیں۔ کم و بیش ایک ہفتے تک روز یہی مکالمہ تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ دہرایا جاتا رہا۔

اُدھر روبی کا اصرار بڑھتا جاتا، "تم اپنے گھر والوں کو بھیجو ورنہ میرے ماں باپ میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیں گے۔ اُدھر امی جان ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھیں۔ ایسے ہی پریشان کن حالات میں ایک دن تیسری منزل پر پانی کی ٹنکی کے برابر کھڑے ہو کر عبد القدوس نے ماں کو پکارا۔

"امی جان!" صنوبر خاتون نے سر اٹھا کر جو دیکھا تو پانی کی ٹنکی کے بالکل ساتھ عبد القدوس کھڑا نظر آیا۔ (حیرت کے مارے ان کا منہ کھل گیا۔)

"امی جان! میں آپ سے آخری بار پوچھ رہا ہوں، آپ میرا رشتہ لے کر روبی کے گھر جا رہی ہیں یا نہیں؟"

"یہ بات تو تو نیچے بھی پوچھ سکتا تھا، اتنا اوپر کس لیے چڑھ گیا۔" صنوبر نے سر اٹھائے جواب دیا۔

"آپ میری بات کا جواب دیں ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔" شور شرابا سن کر سرور حسین باہر آ گئے۔

"ارے..... یہ کیا؟ عبد القدوس نیچے آ جا بیٹا! یہ اتنی خطرناک جگہ کیوں کھڑا ہوئے ہو؟"

"بس ابو جان! میری زندگی اور موت اب امی جان کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہیں.....؟" سرور حسین حیران پریشان کھڑے اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"کیا کفر بک رہا ہے عبد القدوس! نیچے آ۔" صنوبر خاتون پاٹ دار آواز میں بولیں۔

"امی جان! آپ کو میرے سوال کا جواب دینا ہوگا ورنہ میں ابھی اور اسی وقت کود کر اپنی جان دے دوں گا۔"

"ارے نہیں بھئی۔ صنوبر خاتون! روکو اسے۔" سرور حسین بوکھلا گئے۔

"آپ چھوڑیں، مجھے بات کرنے دیں۔ دیکھ عبد القدوس! یہ فرش....." ہاتھ سے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ "پچھلے سال بنوایا ہے اور اس پر ٹھیک ٹھاک پیسہ لگا ہے۔ تُو نے کودنا ہے بے شک کود جا پر....." سانس لینے کو رکیں۔ "پرلی طرف..... گلی میں کود جا۔" ہاتھ سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ فرش میں روز روز ٹھیک نہیں کروا سکتی اور بات سُن! ذرا دیکھ بھال کر چھلانگ لگانا، یہ نہ ہو نیچے گزرتا کوئی راہ گیر تیری زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"کتنی ظالم ہیں آپ امی جان! بیٹے سے زیادہ آپ کو فرش پیارا ہے۔" عبد القدوس صدمے سے چُور آواز میں چلایا۔ (صدمہ، اپنا حربہ ناکام ہوتے دیکھنے کا تھا۔ خیال تھا، ان جذباتی حربوں سے ماں کو رام کر لے گا، ورنہ خودکشی کس پاگل نے کرنی تھی)۔

"نہ میرا بیٹا نہ..... بدگمان نہ ہو۔ پیارا تو مجھے تو ہے ہی، پر ذرا میں بھی تو دیکھوں نا، تیرے جذبے میں کتنی صداقت ہے۔"

"ارے کیا کر رہی ہو صنوبر! روکو اسے، پاگل جان سے جائے گا۔" سرور حسین تو سچ میں خوف زدہ ہو گئے تھے۔

"یہ....." ہاتھ سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ "اتنی سی بلندی سے گر کر مرتا، ورتا کوئی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ، بازو، ٹانگ وانگ تڑوا لے گا۔ اچھا ہی ہے، چار دن ٹک کر گھر میں بیٹھے گا۔ ساری عاشقی نالک کے راستے نکل جائے گی۔"

"ہاں۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے متوجہ کیا۔ "اگر چھلانگ لگانے کی ہمت نہ ہو تو یہ برابر میں ٹنکی سے چلّو بھر پانی لینا اور اس میں ڈوب کر مر جانا۔" کہہ کر میاں کا ہاتھ تھاما اور چلتی بنیں۔ عبد القدوس بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

کبھی فرش کو دیکھتا، کبھی پانی کی ٹنکی کو..... یعنی کہ چلّو بھر پانی..... واقعی؟

سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اندر کمرے میں سرور حسین بے چینی سے یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہے تھے۔

"ارے بھئی، روکو اسے۔" وہ سچ مچ میں سخت پریشان ہو گئے تھے۔ "اور کوئی نئی مصیبت کھڑے ہو جائے۔"

"دیکھیے سرور صاحب! اولاد کی ہر جائز، ناجائز خواہش پوری نہیں کی جا سکتی۔ کام، وام ٹک کر اس نے نہیں کرنا، ہم کس برتے پر اس کی شادی کریں۔ بیوی آئے گی، سو خرچے ہوں گے اس کے، کون پورے کرے گا آپ؟ عشق، محبت کرنا بہت آسان ہے، شادی کرنا، اسے نباہنا یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ چار پیسے کمانے لگے، کر دیں گے شادی بھی۔"

پر سرور حسین کی پریشانی کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"بیٹھ جائیں سرور صاحب! میں خوب جانتی ہوں اپنی اولاد کو۔ چھلانگ ولانگ لگانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ جو کرنے والے ہوتے ہیں نا، کر گزرتے ہیں۔ ایسے دھمکاتے نہیں رہتے۔"

"ٹھیک ہی کہتی تھیں صنوبر خاتون! جو کرنے والے ہوتے ہیں کر گزرتے ہیں۔"

پھر جو عبد القدوس نے کرنا تھا، وہ بھی کر گزرا۔

☆☆☆

یہ رات مدیحہ کی زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی۔ یہ اس کا خیال تھا (جو آئندہ آنے والے وقتوں میں اسے تبدیل کرنا پڑا)۔

وہ شاور لے کر سونے کی عادی تھی۔

اسے ہمیشہ سے شاور کموڈ استعمال کرنے کی عادت تھی۔ یہاں کا باتھ روم وہ دیکھ کر حیران رہ گئی، باتھ روم ایسے بھی ہو سکتے ہیں؟

ایک طرف فلش کی سیٹ، اس کے ساتھ لوٹا، یہ تھوڑا اونچا کر کے بنایا گیا تھا۔ نسبتاً ایک قدم نیچے تھوڑی سی زیادہ جگہ، جہاں نہانے کی بالٹی اور اس پر پلاسٹک کا مگ ٹنگا ہوا تھا۔

"مائی گاڈ!" اس نے پہلی دفعہ ایسا باتھ روم دیکھا تھا، اسے چکر سے آ گئے۔

یہ چکر کئی دن تک اس کو بات بات پر آتے رہے۔

"رات اتنی طویل اور بھیانک بھی ہو سکتی ہے؟ اف بڑی ماما، پاپا کہاں پھنسا گئے آپ لوگ مجھے۔" شکوے نے دل میں سر ابھارا۔

ہر تھوڑی دیر بعد چوں، چی، چوں کی آواز آتی اور اس کا دل دہل جاتا۔

پہلی دفعہ یہ آواز سن کر اسے لگا کہ شاید کوئی چور ہے جو باہر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ آواز پیدا ہو رہی ہے۔

پھر اپنے خیال کی خود ہی نفی کر دی، آواز کمرے کے اندر سے آ رہی تھی۔

"چوں، چی، چوں۔"

اب کے اس کو لگا شاید کوئی چوہا ہے جو کسی بیڈ کے نیچے چھپا ہوا ہے۔

دل نے بڑے زور و شور سے اس خیال کی تائید کی۔ دل جتنا اس خیال کی تائید کرتا، اتنا ہی اس کا خوف کے مارے برا حال ہو جاتا۔

اگر جو چوہا باہر نکل آیا تو میں، ضرور چیخ چیخ کر

آسمان سر پر اٹھالوں گی، اس نے مصمم ارادہ کرلیا۔
آواز پر پھر غور کیا تو چوں، چی، چوں سے پہلے ہلکی سی چک چک کی آواز بھی آتی تھی۔
''نہیں، چوہا اتنے ردھم میں آواز نہیں نکال سکتا۔ یہ کچھ اور ہے۔''
ایک نظر اپنے ساتھ لیٹی ثناء پر ڈالی، جو ہوش و خرد سے بے گانہ ہوکر سو رہی تھی۔ سخت الجھن ہوئی، اس نے زندگی بھر اپنا بیڈروم کسی سے شیئر نہیں کیا تھا' کجا بیڈ شیئر کرنا۔ تب ہی ثناء نے کروٹ بدلی اور اس کے کروٹ بدلتے ہی ویسی ہی آواز سنائی دی جیسی آواز نے اس کی نیند اڑائی ہوئی تھی۔
''یس.....'' بے ساختہ آواز نکلی۔ فوراً ہی زبان دانتوں تلے داب لی۔
اس کی اس معصوم سی آواز سے ان گھوڑے گدھے بیچ کر سوئی ہستیوں پر ذرہ برابر فرق نہ پڑا۔
اس نے تجرباتی طور پر ایک کرمٹ لی۔ وہی آواز یعنی چوں، چی، چوں پیدا ہوئی مگر ذرا مدھم سروں میں۔
خوشی کے مارے وہ بے حال ہوگئی۔ ایسا خوش تو آرشمیدس بھی طبیعات کا وہ اصول معلوم ہونے پر نہ ہوا ہوگا جس میں وہ نہاتے نہاتے، بغیر کپڑوں کے ہی یوریکا، یوریکا (پالیا، پالیا) پکارتے باہر کو بھاگا تھا۔ اس نے آواز کا ماخذ جان لیا تھا۔
آواز بیڈ ہلنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یعنی وہ جو دوسری اور ذرا بھاری آواز پیدا ہو رہی تھی وہ کسی بھاری بیڈ کے ہلنے کی تھی۔
اس نے نیم اندھیرے کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔
سب سے پہلے نظر برابر کے بیڈ پر پڑی، جس پر کپڑوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔
دل میں دبی دبی خفگی نے سر اٹھایا۔ ''کیا تھا جو اپنی امی کے آنے تک میرے سونے کا انتظام اس بیڈ پر کردیتی۔'' غصے سے ثناء کو دیکھتے ہوئے سوچا۔
ساتھ ہی چک چک اور چوں چی چوں کی آواز نے توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔
آواز بی جان کے پلنگ سے آرہی تھی، آخر معمہ حل ہوگیا۔
جب بی جان کروٹ بدلتیں تو ان کے بھاری بھرکم وجود کے باعث پلنگ کے اوپر سے چک چک اور نیچے والے حصے سے چوں چی چوں کی آواز برآمد ہوتی۔
ایک سکون بھری سانس اس کے حلق سے خارج ہوئی تو یہ آواز نہ چور کی تھی نہ چوہے کی۔
توبہ..... لیکن مسئلہ تو بدستور وہیں کا وہیں تھا۔
ان عجیب و غریب آوازوں نے اس کی نیند اُڑائی ہوئی تھی۔
رات کے جانے کون سے پہر اس کی آنکھ لگی۔ اس کو اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے۔
غنودگی کے عالم میں اس کو احساس ہوا کہ پھر کچھ آوازیں ہی اس کی نیند میں خلل کا باعث بنی ہیں۔ یہ کچھ مختلف آوزیں تھیں۔
یہ ثناء اور بی جان کے خراٹوں کی آوازیں تھیں۔ دونوں مقابلے پر خراٹے لے رہی تھیں۔
پہلے ثناء کے خراٹوں کی آواز گونجتی، یوں لگتا جیسے کوئی بغیر سائلنسر موٹر سائیکل زن کرکے گزری ہو۔ اس کے ختم ہوتے ہی بی جان کے خراٹے گونجتے، یوں جیسے کوئی ٹرک اونچی سی آواز میں پاں پاں کرکے پھر ہوا چھوڑتا گزر گیا ہو۔ بی جان کے خراٹے آخری مراحل میں ہوتے تو ثناء پھر سے اسٹارٹ ہوجاتی۔
ایک بار تو شدت سے دل میں خواہش ابھری کہ تکیہ منہ پر رکھ کر ہمیشہ کے لیے ہی یہ آوازیں بند کردے۔
اف..... اب جو نیند ٹوٹی تو پھر صبح تک وہ جاگتی ہی رہی۔ صبح ثناء کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔ بی جان تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔
وہ صحن میں لگے نلکے سے ہاتھ منہ دھو رہی تھی، جب ایک چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا لڑکا

سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔
''السلام علیکم بی جان!'' وہ سیدھا آکر تخت پر بیٹھا۔ تخت سے چرچر کی آواز برآمد ہوئی۔
''وعلیکم السلام! ذرا آرام سے، تخت کا تیا پانچہ کرکے چھوڑے گا۔''
''بی جان! امی آج واپس آرہی ہیں۔ ساتھ میں سارہ بھی آئے گی۔'' کچن سے ثناء کی آواز آئی۔
مدیحہ منہ دھوکر اب بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کررہی تھی۔
تب ہی جواد کی نظر اس پر پڑی۔ ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں گول کیے۔ وہ بلیو جینز پر گرے ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ ندارد۔
''عبدالقدوس کی بیٹی ہے۔''
بی جان کی نظروں نے جواد کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اس کو مدیحہ کی طرف دیکھتے پایا تو تعارف کرایا۔
مدیحہ منتظر رہی کہ شاید اب اس لڑکے کا بھی مدیحہ سے تعارف کرایا جائے گا، پر بی جان دوبارہ تسبیح پڑھنے میں مصروف ہوگئیں۔ ساتھ ہی ساتھ کڑی تنقیدی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ وہ کچھ خائف ہوگئی ان کے اس طرح دیکھنے سے۔
''بی جان! میں۔ چینج کرکے آتا ہوں۔''
مدیحہ کی نگاہوں نے جواد کا تعاقب کیا آخری سیڑھی تک اور بی جان کی نگاہوں نے مدیحہ کا۔
''تیرے نانا، نانی نے سارا لنڈا اکٹھا کرکے تیرے ساتھ بھیج دیا ہے۔ کوئی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں تیرے پاس۔''
اس نے حیرت سے اپنے لباس پر نظر ڈالی، اس کو تو کوئی برائی نظر نہیں آرہی تھی اپنے کپڑوں میں۔ ساتھ ہی بی جان نے ثناء کو آواز لگائی۔
''ثناء! دوپٹہ دے اس کو اپنا اور ناشتے کے بعد دو چار اپنے سوٹ بھی نکال کر اس کے حوالے کر۔ آئندہ مجھے یہ چلتا پھرتا لنڈے کا اشتہار بنی دکھائی نہ دے۔ غضب خدا کا، جوان جہان لڑکا گھر میں موجود ہے، نہ کوئی شرم، نہ کوئی حیا؟'' وہ کافی دیر بڑبڑاتی رہیں۔
''کتنی عجیب عورت ہے اس کی دادی۔'' وہ فقط اتنا ہی سوچ سکی۔

☆☆☆

وہ عمر تھا۔
گھر کا سب سے چھوٹا، سب سے لاڈلا بچہ۔
ماں کی آنکھوں کا تارا، بھائیوں کا پیارا، باپ کا لاڈلا۔
چار بھائیوں میں چھوٹا، جس کے حصے میں صرف پیار آیا، نہ کوئی ڈانٹ، نہ پھٹکار۔
جب بہت چھوٹا تھا، بہت بیمار رہتا تھا۔ ماں اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتی۔ اسکول جانے کے قابل ہوا تو بڑے تینوں بھائی، بار بار آکر خبر لیتے۔ کچھ چاہیے تو نہیں۔
''کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟'' اور جو کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا تو اس کی یقینی پٹائی۔ کسی نہ کسی بھائی کے ہاتھوں۔
سب ٹھیک تھا۔
سب ہی ٹھیک تھا۔
پر ہوا کچھ یوں کہ اس قدر احتیاط نے اس کی ذات کے اعتماد کو نقصان پہنچایا۔ وہ خود سے کوئی فیصلہ ہی نہ کرپاتا۔
بچپن تک سب ٹھیک رہا۔ لڑکپن میں اسے ''بھائی والا'' کہہ کر چھیڑا جانے لگا۔
''بھائی کو بتاؤں گا'' اس کا تکیہ کلام، اس کی چھیڑ بنتا چلا گیا۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے وہ اردگرد کے دوستوں سے خائف رہنے لگا۔ بھائیوں کے نام سے چھیڑا جانا اسے برا لگتا۔
کالج میں داخل ہوا۔ نئی جگہ، نئے لوگ، یہاں کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔
ہاں یہی وہ جگہ ہے جہاں مجھے اپنی شناخت خود بنانی ہے۔ وہ بھائیوں کی لاٹھی کے بغیر چلنے لگا۔

خود اعتمادی واپس آتی گئی۔

دوسری مہربانی، قدرت کی طرف سے علی کی صورت ہوئی۔ کالج کے اوائل دنوں کی دوستی — بس پھر ہمیشہ کا ساتھ بن گیا۔ دونوں لائق تھے، قابل تھے۔ اساتذہ کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ اپنی ہر بات علی سے شیئر کرنے لگا۔ علی کے مشورے اس کو پسند آتے، وہ ان پر عمل کرتا، کامیاب رہتا۔

عمر نے ایم بی اے کیا، علی نے مکینکل انجینئرنگ۔ عمر خوش قسمت رہا، جاب جلدی مل گئی۔ علی کی قسمت نے یہاں یاوری نہ کی، وہ جاب ڈھونڈتا رہا اور بہت عرصے تک بس ڈھونڈتا ہی رہا۔

''یار علی! گھر میں میرے رشتے کی بات چیت چل رہی ہے۔'' وہ دونوں شام میں تقریباً روز ملتے تھے۔

''تو چلنے دے۔'' علی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''یار! میری شادی ہے۔ میری زندگی کا فیصلہ ہونے جارہا ہے اور مجھ سے کوئی مشورہ تک نہیں لیا جارہا۔''

''تو کہیں انٹرسٹڈ ہے؟'' علی کو شک گزرا۔

''نہیں یار!''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ مجھے گھر میں کبھی نہیں سمجھا جاتا۔ رائے یا مشورہ لینا تو درکنار، کبھی کبھار تو کوئی بات بتانے کی بھی زحمت نہیں کی جاتی۔''

''مثلاً؟'' علی نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ گھر والے خود ہی لڑکی پسند کر آئے۔ واپس آکر مجھے بتارہے ہیں۔ ہم نے تمہارے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔''

''ابھی تو تُو کہہ رہا تھا کہ تجھے کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی جاتی۔''

''مطلب بعد میں بتایا نا۔'' عمر جھنجھلایا۔

''تو یار! ایسا ہی ہوتا ہے۔'' علی کو اس کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''اب یہ تو نہیں ہوسکتا تھا نا کہ وہ لڑکی والوں کے ہاں تجھے بھیج دیتے جا بیٹا! لڑکی پسند کر آ۔ ہم بعد میں آتے رہیں گے۔''

''نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ گھر والوں کو جانے سے پہلے مجھے اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے نا۔'' زور دے کر کہا۔ ''انہیں گھر میں میری اہمیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ میری کوئی وقعت ہی نہیں ہے گھر والوں کی نظر میں۔''

علی واقعی اس کا مسئلہ نہیں سمجھ پارہا تھا۔

وقعت، شقعت کیا ہوتی ہے، اس کو علی کیسے سمجھ پاتا۔ وہ خود چاروں طرف سے الٹے سیدھے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ نوکری جوں کے نہیں دے رہی تھی۔

اور اس مسئلے سے منسلک ڈھیروں چھوٹے بڑے مسائل۔ سو کچھ تو علی سمجھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ خود آج کل خاصا پریشان تھا۔

کچھ عمر کو وضاحت کرنا بھی نہیں آرہی تھی کہ وہ گھر میں اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے۔

وہ چاہتا ہے، اس کے گھر والے اس کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دیں۔ اس کے مشورے کی، اس کی رائے کی کوئی اہمیت ہونی چاہیے، آخر ایسا کیا کرنا چاہیے؟

☆☆☆

''امی جان! یہ آپ کی بہو ہے روبی۔ ہم نے شادی کرلی ہے۔''

امی جان کے سارہ کو تھپکتے ہاتھ تھم سے گئے۔ رقیہ کچن کے دروازے میں آکر کھڑی ہوگئیں۔

عابدہ کمرے سے باہر آرہی تھیں، وہیں ساکت ہوگئیں۔ صنوبر نے ایک نظر اپنے لاڈلے پر ڈالی، تازہ، تازہ شیو سے نکھرا ہوا چہرہ۔

عید والا نیا سوٹ، خوب جما جما کر استری کیا ہوا، پاؤں میں نئی نکور سینڈل۔ لاڈلے سے ہوتی نظر

''بہو'' پر جم گئی۔

دبلی پتلی، سانولی سلونی سی لڑکی۔ ہرے رنگ کے شلوار سوٹ کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ مفلر کی طرح گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ گردن یوں اکڑائے کھڑی تھی، گویا گھر سے بھاگ کر نہیں ملک فتح کرکے آرہی ہو۔

''تو لڑکی بھگا کر لے آیا عبدالقدوس؟'' ان کی آواز صدمے سے چُور تھی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تو اس حد تک گر جائے گا۔''

''کوئی مجھے بھگا کر نہیں لایا، میں خود اپنی مرضی سے آئی ہوں۔'' اس نے یوں تن کر کہا گویا ابھی اسے میڈل پہنایا جائے گا۔

ایک قدم آگے بھی۔ بی جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''آپ کو مجھے اپنی بہو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔''

رقیہ کی آنکھیں حیرت سے آخری حد تک پھیل گئیں۔ عابدہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ہوں.....'' بی جان نے ہنکارا بھر کر اوپر سے نیچے تک اس سوکھی چھپکلی کو دیکھا۔ ''کرلیا تسلیم تجھے بہو، اب آگے بول؟''

''ہیں، یہ کیا.....؟'' روبی حیران پریشان رہ گئی۔

اس نے تو کتنے ہی جملے ذہن میں ترتیب دے رکھے تھے، جن کو استعمال کرکے اس نے خود کو صنوبر کی بہو منوا کر چھوڑنا تھا۔ یہ تو بڑی جلدی مان گئیں۔

روبی خاموش ہوگئی۔ اس سے آگے کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ آگے کا محاذ عبدالقدوس نے سنبھالا۔

''امی جان! معاف کردیجیے۔ آپ کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔''

(کہنا تو کچھ اور تھا کہ آخر آپ ہی اس اسٹیج تک لے کر آئیں کہ ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔ پر صورت حال کچھ مختلف ہوگئی تھی)۔

''کردیا معاف۔'' بی جان نے آرام سے ہاتھ جھاڑے۔ سب ہی حیران رہ گئے۔ کتنے آرام سے انہوں نے معاف کردیا تھا۔ ''چل، اب اپنی دلہن کو لے اور نکل یہاں سے۔''

آرام سے کہتے انہوں نے عبدالقدوس اور اس کی نئی نویلی دلہن کی سٹی گم کی۔ پہلی مرتبہ عبدالقدوس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔

صنوبر خاتون کو خاصا اطمینان ہوا، عبدالقدوس کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے ہم۔'' لہجے سے وہ خود اعتمادی تحلیل ہوگئی تھی جس کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔

روبی بھی کچھ گھبرا گئی (اگر نکال دیا تو کہاں جائیں گے) پر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''اچھا، تو یہیں رہے گا نیا نویلا جوڑا۔'' صنوبر خاتون نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''رہ جاؤ، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ان کا اطمینان قابل دید تھا۔ (روبی کو تسلی ہوئی مطلب دھکے دے کر نکال نہیں رہیں)۔

''یہ.....؟'' انگلی سے عبدالقدوس کی طرف اشارہ کیا۔ مخاطب روبی سے تھیں۔ ''اس کو تو پتا ہے، تجھے بتادوں میں۔'' (روبی متوجہ ہوئی) سب لوگ دھیان سے بی جان کی بات سننے لگے۔

''یہ دو کمرے ہیں نیچے، اس 125 گز کے مکان میں۔ ایک میں یہ چھوٹی بہو ہوتی ہے میری۔'' ہاتھ سے کمرے کے دروازے پر کھڑی عابدہ کی جانب اشارہ کیا۔ ''دوسرے میں، میں، عبدالقدوس کے ابو اور عبدالقدوس ہوتے ہیں۔

اسی کمرے کو مہمانوں کی آمد پر بیٹھک کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں ہم۔ یہ اوپر.....'' ہاتھ سے سیڑھیوں کی سمت اشارہ کیا۔ ''سیڑھیاں جارہی ہیں، اوپر ایک کمرہ ہے جس میں، یہ بڑی بہو ہوتی ہے۔'' رقیہ کی جانب اشارہ کیا۔

روبی نے گردن گھما کر دیکھا۔

''اس کمرے کے ساتھ ہم نے ٹین کی چھت ڈال کر عارضی سا اسٹور بنایا ہوا ہے، جس کا دروازہ نہیں ہے۔ سامنے کی دیوار بھی نہیں ہے۔ دو دیواریں چھت کی اور ایک اس کے کمرے کی (رقیہ کو دیکھا) یہ تین دیواریں ہیں اور دنیا جہاں کا کاٹھ کباڑ اس اسٹور میں بھرا ہوا ہے۔ یہ ہے ہمارا گھر یعنی تیرے اس عاشق عبدالقدوس کا گھر۔ عشق، عاشقی کے علاوہ کرتا، ورتا یہ کچھ بھی نہیں ہے، تجھے تو پتا ہی ہوگا۔'' سوالیہ نظریں روبی کے چہرے پر گاڑیں پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بات جاری رکھی۔

''اندر ہمارے کمرے میں دوسرے، تیسرے کسی پلنگ کی گنجائش نہیں ہے، نہ کوئی فالتو چارپائی یا مسہری ہے ہمارے ہاں۔ مطلب.....'' بات کو مزید واضح کیا۔ ''نہ ہمارے پاس کمرہ ہے نہ کمرے کا سامان۔ اب تو اپنی جگہ خود بنالے اس گھر میں۔''

بات ابھی جاری تھی۔

''میں اگر چاہوں تو جیسے تو اپنے ماں باپ کے سر پر خاک ڈال کر انہیں رسوا کر کے آئی ہے نا، ایسے ہی چیخ چلّا کر، تجھے بھی رسوا کر کے یہاں سے نکال سکتی ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں تجھے اس فیصلے کو بھگتنے کا پورا موقع دوں گی۔ تیرے پاس یہ تیرا عاشق موجود ہے۔'' تنفر اور حقارت سے عبدالقدوس کو دیکھا۔ ''تو ذرا خالی خولی عشق کے بل بوتے پر زندگی گزار کے دکھا مجھے۔ عابدہ پانی پلا مجھے۔''

عبدالقدوس کے کندھے ڈھلک گئے۔

روبی کھڑے قد سے ڈھے گئی۔ حقیقت اتنی تلخ ہوتی ہے؟ اور ابھی تو حقیقت کو برتنا باقی تھا۔

☆☆☆

بظاہر سب ٹھیک ہوگیا تھا، ولیمہ کی تقریب خیر، خیریت سے اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ عمر کی ناراضی چند دن چلی، وہ بھی کمرے کے اندر اندر۔ باہر سب ٹھیک ہے کا تاثر دیتا رہا۔

اور فارحہ تو تھی ہی بہت خوش۔ آتے ہی اپنی فتح کے جھنڈے جو گاڑ دیے تھے۔ وہ عمر کو ناراضی دکھانے کا موقع نہیں دیتی تھی، بہت بولتی، بولے چلی جاتی۔ عمر کو جواب دیتے ہی بنتی۔ تب ہی عمر کے تیسرے نمبر والے بھائی نے انہیں بلا بھیجا۔

فیضان بھائی میجر تھے اور ان کی آج کل کوہاٹ پوسٹنگ تھی۔ لاکھ عمر نے آنا کانی کرنے کی کوشش کی، پر فیضان بھائی اور مہک بھابھی کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

''یہاں پر بھی سب کا اصرار' منی مون پر بھی تم کہیں نہیں گئے، چند دن کوہاٹ گزار آؤ۔''

ادھر سے فارحہ نے پیچھا لے لیا، سو عمر کو چھٹی اپلائی کرتے ہی بنی۔ کوہاٹ..... یہ جگہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔

''عمر!'' فارحہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے، شریک سفر کو متوجہ کیا۔

''ہوں۔'' وہ موبائل پر مصروف تھا۔

''دیکھیں، کتنا خوب صورت لگ رہا ہے نا سب۔''

عمر نے ایک نظر سر اٹھا کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

''ہوں، اچھا ہے۔'' کہہ کر پھر سے موبائل میں گم ہوگیا۔

فارحہ کا شدت سے دل چاہا کہ عمر کا موبائل اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے اور وہ اس سوچ پر عمل بھی کر ڈالتی جو بی بی جی اس کو کھانے کے لیے بلانے نہ آجاتیں۔

''ہاں بھئی، کیسا لگ رہا ہے کوہاٹ؟'' فیضان بھائی ابھی ابھی ڈیوٹی سے واپس آئے تھے۔

''بہت خوب صورت ہے فیضان بھائی۔''

''بس اسی لیے تم لوگوں کو بلوالیا کہ یہاں کی بیوٹی دیکھنے سے محروم نہ رہ جاؤ۔''

عمر ہنوز موبائل پر مصروف تھا۔

''فارحہ! ذرا اپنے اس مجازی خدا کو چار لوگوں میں بیٹھنے کی تمیز سکھادو۔ جب سے آیا ہے موبائل پر

BOOKSPK Books & Magazines

[illegible] ہے۔'' مہک بھابھی نے شرارت سے عمر کو [illegible] تے فارحہ کو کہا۔

''اف بھابھی! نہ پوچھیے، میں خود کس قدر [illegible] ہوں ان کے اس موبائل کے ہاتھوں۔ مجھے تو یہ [illegible] موبائل لم رقیب روسیاہ زیادہ لگتا ہے۔''

''مہک بیٹا! کھانے کے لیے آجائیں۔'' بی [illegible] بی نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

''جی، بی بی جی! آرہے ہیں۔'' مہک نے [illegible] ٹے کو کاٹ میں لٹایا۔

''چلو عمر، فارحہ! پہلے پیٹ پوجا۔ پھر کام [illegible] جا۔'' (عمران دونوں سے پہلے کمرے سے نکلا)۔

''مہک بھابھی! یہ آپ کی ملازمہ کسی اچھے گھر [illegible] لی لگتی ہیں۔''

''ہاں، دونوں میاں بیوی بہت اچھے ہیں۔ فیضان کے دوست نے بندوبست کیا ہے۔''

کھانا بہت اچھا تھا۔ کھانے کے دوران بھی ہلکی پھلکی نوک جھونک جاری رہی۔

''بی بی جی! آپ اپنے اور بابا جی کے لیے کھانا نکال کر لے جائیں۔

کھانے کے بعد مہک نے بی بی جی سے کہا تو وہ سر ہلا کر پلٹ گئیں۔

کھانے کے بعد وہ لوگ چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔ واپس آکر قہوہ پیا، اس کے بعد خواتین نے الگ اپنی محفل جمائی۔ عمر اور فیضان دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے۔

فارحہ یوں ہی تو وہاں نہیں آئی تھی۔ کرید کرید کر مہک سے عمر کے بارے میں سوال کرتی رہی، ایسے کہ اسے محسوس بھی نہ ہو اور مطلب کی بات بھی معلوم ہوجائے۔ کافی کچھ اس کو یہاں سے بھی مل گیا۔

آج ان کی شادی کو اکیسواں دن تھا اور فارحہ کی تفتیش کا بھی اکیسواں ہی دن تھا۔ کہیں پر کچھ گڑبڑ تھی، اس گڑبڑ کا اندازہ اس کو اپنی ویڈنگ نائٹ (شادی کی رات) ہی ہوگیا تھا۔

جب وہ تجسّس کے مارے دبے قدموں بالکنی تک پہنچی تھی تو عمر موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کررہا تھا۔ چند جملے ہوا کے دوش پر اس کے کانوں تک پہنچے۔

''یار! سب الٹ پلٹ ہوگیا۔''

''میں کیا کرتا؟''

''میرے ساتھ تو وہ حساب ہوگیا، چوروں کو پڑ گئے مور۔'' فارحہ دم بخود رہ گئی۔

''یہ اس قدر پرسنل میٹرز رات کے اس پہر کس سے ڈسکس کررہے ہیں، گھر والے تو سب ہی نیچے موجود تھے پھر کون.....؟''

اس کون تک پہنچنے کے لیے تفتیش کا آغاز، اسی رات سے فارحہ نے کردیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی فارحہ نے اسی رات اپنے شریک سفر سے معافی مانگ لی تھی۔

اور عمر..... وہ تو تھا ہی دل کا بہت پیارا انسان۔ اتنی حسین دلہن اور یوں اس کے سامنے بچھ بچھ کر معافیاں مانگ رہی تھی۔ وہ فوراً ہی مان گیا، کچھ دیر پہلے ہونے والی تلخی کا سارا اثر زائل ہوگیا۔ بظاہر سب ٹھیک ہوگیا تھا۔

مگر کچھ غلط تھا، ان دونوں کے بیچ اور اس غلط کا سرا فارحہ نے پکڑ ہی لیا۔ صحیح سمت میں جارہی تھی۔

☆☆☆

''تم بس بہانے ہی بناتے رہنا۔ وہ کاشفہ آپی مجھے اپنی دیورانی بنا کر لے جارہی ہیں۔ میں پیا دیس سدھار جاؤں گی، تم بیٹھے دکھی نغمے سنتے رہا کرنا۔''

ناظمہ سخت طیش میں تھی۔ آج وہ ہر لحاظ بھلائے جواد پر چیخ چلّا رہی تھی۔

''اف اللہ ناظمہ! آہستہ بولو۔ میرے کان کا پردہ بہت نازک ہے۔'' اس نے موبائل تھوڑا سا کان سے پرے کھسکایا۔

''جواد! آج شام کو کاشفہ آپی بمعہ اپنی سسرال کے تشریف لارہی ہیں میرا رشتہ مانگنے۔ ہوسکتا ہے وہ

ان کالم ڈھینگ دیور بھی دانت نکوستا، ساتھ آجائے۔'' آخر میں اس کی آواز میں بے چارگی شامل ہوگئی۔

''میں دانت توڑ دوں گا اس الو کے پ.....''

عین وقت پر زبان دانتوں تلے دبائی۔

''تم کچھ بھی نہیں کرو گے، بس میرے سامنے بیٹھے ڈائیلاگ بولتے رہو گے۔ وہ کرنے والا مجھے بیاہ کر لے جائے گا۔''

''اتنی ظالم مت بنو ناظمہ!'' جواد ملتجی ہوا۔

''تو تم بھی تو کچھ کرو نا۔'' ناظمہ کی آواز میں بے بسی تھی۔

''یار کی ہے بی جان سے بات، وہ نہیں مان رہیں۔ کہتی ہیں جب تک نوکری نہیں مل جاتی تب تک وہ بات نہیں کریں گی تمہاری دادی سے۔ ان کو بس یہ فکر ہے کہ میری وجہ سے کہیں ان کے بہن کے ساتھ تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔ اب نوکری کی تلاش میں دن رات جوتیاں گھس تو رہا ہوں اور کیا کروں؟''

''ٹھیک ہے جواد! پھر میں بھی مجبور ہوں، تم مجھ سے کوئی گلہ نہ کرنا بعد میں۔'' قریب تھا کہ وہ فون بند کر دیتی، جواد کی آواز نے اسے روک لیا۔

''ناظمہ! پہلے بھی تو تم سعیدہ چچی کو ٹالتی ہی رہی ہو نا، پلیز ایک بار اور کوشش کر لو۔ مجھے امید ہے اس ہفتے کہیں نہ کہیں سے کال آجائے گی مجھے۔''

''پہلے کی بات اور تھی جواد! میں امی کو یہ ہی کہہ کر ٹالتی تھی نا کہ جب تک فرحی کی شادی نہیں ہو جاتی آپ میرا معاملہ نہ چھیڑیں۔ اب میرے پاس ایسا کوئی بہانہ نہیں ہے۔''

''ایک آخری بار نا ظمہ! ان کو آنے سے روک لو، بس کچھ کر لو۔'' جواد سچ مچ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ناظمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''اچھا کرتی ہوں کچھ، لیکن یہ آخری بار ہے جواد!'' اس کا انداز دھمکاتا ہوا تھا۔

یہ مہلت بھی جواد کو غنیمت لگی۔

☆☆☆

شام تک عابدہ چچی اور سارہ بھی آ گئیں مدیحہ، سارہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنی پیاری، اتنی حسین بالکل چائنیز گڑیا جیسی دکھتی تھی۔

بنی بنائی عابدہ چچی کی کاپی۔ (چچی جو اصل میں اس کی تائی تھیں لیکن اس کو چچی کہنا زیادہ بھایا) عابدہ چچی اور سارہ دونوں ہی نے اسے دیکھ کر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سلام، دعا اور بس، کسی نے اس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں بی جان کے ساتھ خوب محفل جمی ہوئی تھی۔

سارہ، ثناء، عابدہ چچی اور بی جان۔ آوازیں، شور، قہقہے، باتیں اس کو نظر انداز کیا جا رہا تھا یا اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اصل امتحان تو رات میں شروع ہوا۔ سارہ چونکہ مہمان تھی لہٰذا ثناء اور مدیحہ کا بیڈ جو سارہ کی شادی سے پہلے سارہ اور ثناء کا تھا اس کو دے دیا گیا۔

مدیحہ دھک سے رہ گئی۔ ''اب ہم کہاں سوئیں گے.....؟''

''میں امی کے ساتھ اور تم بی جان کے ساتھ سو جانا۔'' ثناء نے سکون سے کہتے اس کا سکون درہم برہم کر دیا۔

''بی جان کے ساتھ سونا۔ مطلب ساری رات۔ چک چک۔ چوں، چی چوں۔ ٹرک کے ہارن جیسے خراٹے۔''

''اف۔'' وہ رات کے تصوّر سے ہی خوف زدہ ہو گئی۔

رات بالکل ویسی ہی گزری جیسی گزرنی چاہیے تھی۔

چک چک۔ چوں چی چوں۔ پی پاں۔ پھر پھر پھر۔ بس اس سے زیادہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کون سا طریقہ تھا بھلا۔ اس کے باپ کی کمائی پر سارا گھرانہ عیش کر رہا تھا اور اسی کے ساتھ یہ سلوک۔

عیش.....؟ یہ لفظ خود ہی کچھ نامناسب سا لگا۔ بھلا کون سا عیش تھا یہاں پر۔ کتنی مشکل زندگی گزار

رہے تھے وہ لوگ۔ نانی نے بھلا کیوں کہا تھا؟ وہاں ... اس کے باپ کی کمائی پر عیاشی کر رہے ہیں۔

نانی تو یہاں سے ہو کر گئی تھیں پھر اسے کیوں ... دیا یہاں؟ آہستہ آہستہ بہت سی سوچیں اس پر ... آور ہو رہی تھیں۔ دوپہر تک وہ ان سوچوں سے اس قدر پریشان ہوئی کہ ثناء سے پوچھ ہی بیٹھی۔

''سنو ثناء!'' برتن دھوتی ثناء نے سر اٹھا کر ... دیکھا۔ ''ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں بولو۔''

''یہ، اس گھر کے مرد اتنے عرصے سے باہر ہیں تو پھر گھر کی حالت ایسی کیوں ہے.....؟'' (اس کے ذہن میں نانا کا شاندار گھر گھوم گیا۔)

وہ یہ نہ کہہ سکی جب اس کا باپ اتنا کما رہا ہے تو وہ کہاں جا رہا ہے؟

جواب کچھ تفصیل طلب تھا۔ ثناء نے اسے اپنے پاس پڑی پیڑھی پر بٹھا لیا۔

''ہمارے دادا.....'' اپنی اور اس کی جانب اشارہ کیا۔ ''ابو ظہبی میں کئی سال سے ہیں۔ میری پیدائش سے بھی پہلے سے۔ وہ پلمبر ہیں وہاں پر۔ کچھ بہت زیادہ نہیں کماتے پر پاکستان میں کام کرنے کی نسبت بہتر کمائی ہے۔ میرے اور جواد کے ابو وہاں ایک اسٹور پر کام کرتے ہیں۔''

(میرے ابو کا نام کیوں نہیں لے رہی یہ.....؟)

''سب لوگوں کی تنخواہیں ملا جلا کر مناسب سی تنخواہ بن جاتی ہے۔ پر یہاں اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ رقیہ تائی کا ابھی چھ ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔ کینسر تھا ان کو۔ بہت لمبی بیماری کاٹی ہے انہوں نے اٹھارہ سال سے بستر پر تھیں۔ (مدیحہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا) ہزاروں روپے ہر ماہ ان کے علاج کی مد میں خرچ ہوتے تھے۔ پھر، سارہ، جواد اور میری پڑھائیاں۔ جواد انجینئر ہے۔ سارہ ڈاکٹر ہے اور میں نے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی کیا ہے۔''

مدیحہ حیران رہ گئی۔ اتنے قابل تھے اس کے کزنز۔ (وہ خود محض انٹر تک پڑھی تھی، دلچسپی ہی نہیں تھی پڑھنے پڑھانے میں۔)

''اس کے بعد سارہ کی شادی۔ اتنے بڑے بڑے خرچے تو گھر بے چارہ تو ایسا ہی ہو گا نا۔ اوپر سے ان لوگوں نے امینہ چچی کو بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجنا ہوتا ہے حالانکہ وہ خود بھی اسکول میں پڑھاتی ہیں پر چھوٹے چھوٹے تین بچوں کا ساتھ۔ اوپر سے اتنی مہنگائی۔'' ثناء خاموش ہوئی۔

''امینہ چچی کون.....؟'' ثناء نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہاری نانی نے تمہیں نہیں بتایا۔ بی جان نے تو ان کو بتایا تھا۔''

مدیحہ نے کندھے اچکا کا لاعلمی کا اظہار کیا۔

''امینہ چچی! تمہاری سوتیلی امی۔ قدوس چچا کی بیگم۔''

باپ سے کوئی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ ''قدوس میاں میرا مطلب ہے میرے ابو.....؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے پوچھے۔ ''وہ..... وہ کیا کرتے ہیں.....؟''

''کچھ نہیں کرتے کراتے وہ۔ بس بھائیوں اور باپ کی کمائی پر گزارہ کرتے ہیں۔ بی جان نے بتایا تو تھا سب تمہاری نانی کو۔''

وہ کب سے تخت پر بیٹھی دیوار پر لگی بیل کو تکے جا رہی تھی۔ دل پر منوں کے حساب سے بوجھ پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

رات بارہ بجے تک عبدالقدوس اسٹور سے سامان نکال نکال کر چھت کے دوسرے کونے میں ڈھیر کرتا رہا۔

سامنے ایک کرسی پر اس کی نئی نویلی دلہن کوفت سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ باقی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ آخر بارہ بجے وہ جگہ خالی ہوئی۔ عبدالقدوس اپنی چارپائی اور تین چادریں نیچے سے لے آیا۔ چارپائی، اس کمرہ نما اسٹور کے

اندر بچھائی۔ سامنے کی طرف چادریں باندھ کر پردہ کیا۔

یہ تھی ان کی سہاگ رات۔ مچھر، گرمی، کھٹمل.....

عبدالقدوس کا کئی مرتبہ دل کیا نیچے جا کر سنکھے میں ابو، امی کے برابر جا کر سو جائے۔ پرائی نویلی دلہن کا خیال۔ دلہن کو کتنی ہی بار اپنا اے سی والا بیڈ روم یاد آیا۔

پر چلو، محبت تو جیت گئی نا۔

اس سے اگلے دن عبدالقدوس ڈھونڈ ڈھانڈ کر کسی دوست سے پیڈسٹل فین مانگ کر لے آیا۔ عشق، عاشقی، محبت سب دوسرے ہی دن سے ساتھ چھوڑنے لگے۔ رہی سہی کسر بی جان کے فرمان نے پوری کردی۔ ''دیکھ عبدالقدوس تیری بیوی یہاں اس گھر میں رہے گی تو پہلی دو کی طرح برابر کا کام کرے گی۔ نیچے بھیج اس کو فرش کی دھلائی کرے۔''

یہ ان کی شادی کا چوتھا دن تھا اور باقاعدہ جھگڑے کا پہلا دن۔ عبدالقدوس نے ماں کا فرمان جوں کا توں روبی کو سنایا۔ پھر جو روبی اور عبدالقدوس کی لڑائی ہوئی تو سارے محلے نے دیواروں اور چھتوں سے جھانک جھانک کر لائیو ٹرانسمیشن ملاحظہ کی۔

رقیہ اور عابدہ پریشان کہ وہ گھر جہاں ساس بہو، دیورانی، جٹھانی کے درمیان کبھی تکرار نہیں ہوئی۔

وہاں میاں بیوی کے درمیان ایسا زبردست جھگڑا۔

میاں بیوی بھی وہ، لیلیٰ مجنوں ہیر رانجھا، شیریں فرہاد کے جانشین۔ اس سارے معاملے میں صرف ایک بی جان تھیں جو تخت پر بیٹھی سچے پیار سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

پھر یہ انٹرٹینمنٹ (تفریح) روز کا معمول بن گئی۔ عبدالقدوس کی جیب بالکل خالی۔ روبی، نازوں پلی لاڈلی اولاد۔ نہ یہ تکالیف برداشت کرسکی نہ ساتھ جینے مرنے کے وعدے وفا کر پائی۔ سو، روز، روز کے جھگڑے آخر رنگ لے آئے۔

صرف چار مہینے میں ''سچا پیار'' اپنی موت آپ مرگیا۔

زندگی کے تلخ حقائق جیت گئے۔

روبی واپس اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ سو یہ باب تمام ہوا۔ اس کے بعد کی کہانی بڑی سیدھی سادی تھی۔ سرور حسین نے کچھ سال کے وقفے سے دونوں بیٹوں کو باری باری اپنے پاس بلالیا۔

عبدالقدوس کو بارہا کام شروع کروانے کی کوشش کی گئی۔ پر کام کی اور اس کی ساری زندگی بن نہ سکی۔ سات آٹھ سال بعد بی جان نے دوبارہ عبدالقدوس کی شادی کروادی۔

شاید، ذمہ داری پڑنے سے کچھ سدھر جائے۔ مگر افسوس۔ ان تلوں میں نہ کبھی تیل تھا نہ ہوا۔ رقیہ کو کینسر جیسی موذی بیماری نے آلیا۔ زندگی یوں ہی رواں دواں رہی۔

☆☆☆

''بہت ظلم کیا بڑی ماما آپ نے میرے ساتھ۔'' ثناء سے بات کرکے وہ بہت اداس تھی۔ اس سے تو وہ لاعلم ہی رہتی تو بہتر تھا۔

تابوت میں آخری کیل بی جان کی بہن نے آکر ٹھونک دی۔

''یہ فیروزہ دادی ہیں۔ بی جان کی بہن۔'' ثناء نے مدیحہ سے ان کا تعارف کروایا۔

عابدہ چچی بازار گئی ہوئی تھیں سارہ کے ساتھ۔ ثناء نہانے گھس گئی۔ بی جان اور ان کی بہن باہر تخت پر بیٹھ گئیں۔

''آ گئی پھر روبی کی بیٹی۔'' اندر بیٹھی مدیحہ کے کان کھڑے ہوئے۔

''ہاں، آ گئی۔'' بی جان نے پاندان کھولتے جواب دیا۔

''تو کوئی کام شروع کروایا کہ نہیں.....؟''

''ابھی تک تو نہیں پر کہتی ہوں ثناء سے کہ برابر برابر کام تقسیم کردے۔

جو جو کام سارہ کرتی تھی وہ سارے اس کے ا لے لگا دے۔''

''کام تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سارا ام لگاؤ اس کے ذمے یہی کہہ رہی تھی نا اس کی نانی لا ملازمہ سمجھ کر جگہ دے دو گھر میں ورنہ پھر یتیم انے بھجوانا پڑے گا۔'' فیروزہ چمک کر بولیں۔

ایک پہاڑ تھا صدمے کا جو مدیحہ کو کچل گیا تھا۔ ی آنسو ایک ساتھ لڑھک کر اس کے گالوں تک آئے۔

''بڑی ماما۔'' شکوے کی صورت زبان سے ا۔

''ارے فیروزہ! اس کی نانی کو تو چھوڑ ہی ے۔ اس کی تو بات ہی نہ کر۔ میں نے اپنی زندگی یں ایسی خود غرض اور بے حس عورت نہیں دیکھی۔ انسان بلی کا بچہ بھی اتنا عرصہ پالے نا اس سے بھی ت ہو جاتی ہے۔ اس کو جدا کرتے بھی دل پر ہاتھ پڑتا ہے۔ وہ، اس کی نانی۔ ایسے ایک بیگ کے ساتھ اس کو دروازے پر چھوڑ کر یوں واپس ہوئی کہ خدانخواستہ ایک لمحہ اور رک گئی تو ہم اس کو واپس لردیں گے۔ نہ بچی کو گلے لگایا، نہ پیار کیا نہ کوئی فون نمبر چھوڑا اس کے پاس۔ سارے تعلق ہی مانو توڑ گئی۔''

''ملک ہی چھوڑ کر جا رہی تھی نا۔ کوئی دنیا چھوڑ لر تو نہیں جا رہی تھی۔ دوسرا بڑا خود غرض وہ بدالقدوس۔'' مدیحہ کی سانس رکی اس نام پر۔

''میں نے فون کیا کہ تیری بیٹی آ گئی ہے۔ کہتا ہے تو بات کروا دیتی ہوں۔ الٹا میرے گلے پڑ گیا۔ لہتا ہے آپ کو منع کیا تھا نا کہ اس کی نانی کو بولیں، یہاں مرضی چھوڑ دیں یہاں نہ لائیں۔ لو بتاؤ بھلا۔ لوئی حالات ہیں ہمارے ملک کے کہ جوان جہان لڑکی دارالامان اور یتیم خانوں میں رلنے کے لیے چھوڑ دیں۔''

''آپ بھی نا، آپا جان! کمال ہیں۔ آپ کے اور مسائل ہی کیا کم ہیں جو یہ ایک نیا مسئلہ سر پر لے کر بیٹھ گئیں، جس نے پیدا کیا اس کو فکر نہیں، جس نے پالا اس کو پروا نہیں۔ آپ نے پرایا ڈھول گلے میں ڈال لیا۔'' فیروزہ سخت بے زار تھیں۔

''اگر ساری دنیا ہی خود غرض ہو جائے تو بتا پھر، دنیا کا نظام کیسے چلے؟'' وہ رسان سے گویا ہوئیں۔

مدیحہ کے بہتے آنسو تھم گئے۔

ایک بار پھر اس نے وہی بات سوچی۔

''کتنی عجیب عورت ہے نا اس کی دادی۔''

☆☆☆

فارحہ، عمر سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے رہنے آئی تھی۔ اصل میں اسے اپنی تفتیش کو آج فائنل ٹچ دینا تھا۔

علی نامی عمر کا دوست فارحہ کے لیے سرچ کرنا چنداں مشکل ثابت نہ ہوا۔ علی تھا وہ لڑکا جس سے عمر، شادی کی رات راز و نیاز کر رہا تھا۔ اس نے عمر کا موبائل چیک کیا تھا۔ ان باکس میں موجود تمام میسجز اس نے پڑھے تھے۔ یہ علی تھا، جو عمر کو اس کے خلاف بھڑکاتا تھا۔

لیکن کیوں.....؟

اور اس کیوں کا جواب تو علی ہی دے سکتا تھا۔

''فرحی! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' ناظمہ، فارحہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

فارحہ نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ اضطراب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''کیا ہوا.....؟''

''وہ فرحی، تم پلیز امی، ابو کو منع کردو کہ وہ کاشفہ آپی کے دیور والا معاملہ مزید کچھ دن کے لیے ملتوی کردیں۔''

''کیوں؟'' اس نے تیوری چڑھا کر گھورا۔

''اب کیا مسئلہ ہے۔ پہلے تو میری شادی کا مسئلہ تھا۔''

''نہیں، پہلے بھی مسئلہ تمہاری شادی کا نہیں تھا۔ مسئلہ کچھ اور ہے۔'' وہ کھسک کر بہن کے قریب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسے کچھ بتانے لگی۔

"ہیں.....؟" فارحہ اتنی زور سے چلّائی کہ ناظمہ کو کانوں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

"تم نے جواد ہی کہا ہے نا.....؟" اس نے تصدیق ضروری سمجھی۔ ناظمہ نے سر ہلایا۔

"یعنی کہ صنوبر دادی کا پوتا جواد.....؟" ایک بار پھر سے تصدیق کی۔

ناظمہ نے ایک بار پھر زور وشور سے سر ہلایا۔

فارحہ کی آنکھوں کے سامنے آگے، پیچھے، اوپر نیچے جواد نام کے ترمرے ناچنے لگے۔

ویسے ہی ترمرے جیسے کبھی پی ٹی وی پر فرمان الٰہی کے بعد ناچا کرتے تھے۔ جواد، جواد، جواد۔

ہر طرف سے ٹن ٹن ہونے لگی۔

"یہ کب ہوا.....؟ یہ کیوں ہوا.....؟" یہ سوال اب بے معنی تھے۔

ہاں آگے کیا ہونا تھا؟ یہ خاصا ضروری تھا۔

☆☆☆

جواد اور فارحہ کلاس فیلو تھے۔ میٹرک انہوں نے ایک ہی اسکول سے کیا تھا۔ ناظمہ ان دونوں سے ایک سال جونیئر۔

فارحہ اور جواد کی..... جواد اور فارحہ کی..... آپس میں کبھی بھی نہیں بنی تھی۔

ہاں، جواد اور ناظمہ کی آپس میں خوب بنتی تھی۔

"ہم دونوں کزنز ہیں۔" ناظمہ نے اپنے کلاس فیلوز کو بتایا ہوا تھا۔

"یہ ہمارے دور پار کا جاننے والا ہے۔" فارحہ نے اپنی کلاس فیلوز کو بتایا ہوا تھا۔

"یہ میری دادی کی بہن کی پوتی ہے۔" جواد نے سب کو بتایا ہوا تھا۔

جواد..... کلاس کا قابل ترین پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹ۔

فارحہ..... اسکول کی بہترین مقررہ۔

جواد اور فارحہ کے تعلقات اتنے خراب تھے جتنے جتنے..... انڈیا..... پاکستان کے۔

شمالی کوریا..... جنوبی کوریا کے یا شاید امریکہ روس کے۔

کیوں.....؟ اس کے لیے تھوڑا پیچھے جانا ہوگا۔ یہ سیونتھ ——— کلاس تھی۔ ایک طرف لڑکیوں کی سیٹس دوسری طرف لڑکوں کی..... لڑکیوں کی قطار میں دیوار کے ساتھ پانچویں نمبر پر فارحہ بیٹھی تھی۔ لڑکوں کی قطار میں دوسرے نمبر پر جواد بیٹھا تھا۔

تب ہی ایک عجیب سانحہ وقوع پذیر ہوا۔

لڑکوں کی قطار میں چوتھے نمبر والا لڑکا پانی پی کر واپس آیا اور جوں ہی اپنی کرسی پر بیٹھا۔ بیٹھتے ہی چیخنا، چلّانا اور تڑپنا شروع کر دیا۔ پوری کلاس اس کے گرد اکٹھی ہوگئی۔ مس بھاگی بھاگی آئیں۔ کیا ہوا؟

شور اتنا بڑھا کہ ساتھ والی کلاسوں سے ٹیچرز نکل نکل کر آ گئے۔ تو ہوا کچھ یوں تھا کہ جب وہ لڑکا پانی پینے گیا تو کسی نے اس کی کرسی پر نیچے کی طرف سے پین (Pen) پھنسا دیا۔ یوں کے اس کی نب کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ وہ بے چارہ پانی پی کر واپس آیا۔ اپنے دھیان میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی پین کی نب اس کی تشریف میں کھب گئی اور اس بری طرح اس کو زخمی کیا کہ معصوم تین دن تک اسکول ہی نہ آ پایا۔ اب ٹیچرز زور وشور سے مجرم کی تلاش میں تھے۔ روز کلاس کے تمام لڑکوں کو بلوا لیا جاتا ان سے پوچھ گچھ کی جاتی۔

لیکن مجرم کا سراغ لگایا نہ جا سکا۔

جواد، بریک میں گراؤنڈ میں بیٹھ کر سائنس کی کاپی پر فگرز ڈرا کر رہا تھا تب ہی فارحہ آ دھمکی۔ ایک ہاتھ میں سیب پکڑے کچر کچر کھاتی۔ دوسرے ہاتھ میں سائنس کی کاپی تھامے۔

"واؤ، کتنی زبردست ڈرائنگ ہے تمہاری۔ آئی امپریسڈ۔" سیب نگلتے ہوئے کہا۔

"یہ لو، یہ مجھے ذرا فوڈ چین اور واٹر سائیکل بنا دو۔"

جواد نے غصے سے اسے گھورا۔ "میں کس لیے تمہیں ڈرا کر کے دوں۔ اپنا کام خود کرو۔"

"پلیز جواد! بنا دو نا۔ میری ڈرائنگ بالکل اچھی نہیں ہے اور ٹیچر یہاں پر تمہارے منہ کے جتنے بڑے کوئچن مارک لگا دیں گی۔ کتنا برا لگے گا۔" اس نے کاپی کی طرف اشارہ کیا۔

"سوری، میرے پاس اپنا ہی بہت کام ہے۔ اور بالکل بھی برا نہیں لگے گا۔ تم تو عادی ہو نا ان چیزوں کی۔"

جواد نے تسلی سے کہتے ہوئے توجہ اپنے کام کی جانب مبذول کی۔

"ارے نہیں، میں اپنی کاپی کے کوئچن مارک والے لگنے کی بات تھوڑی کر رہی ہوں۔ تم پوری بات تو سنتے ہی نہیں ہو۔ میں تو عادی ہوں اس سب کی۔ برا تو تمہیں لگے گا جب وہ پین والا مجرم ثبوت کے ساتھ پکڑا جائے گا۔"

جواد چوکنا ہوا اس کی بات پر، ساری حسیات بیدار ہوگئیں۔

"مجھے کیوں برا لگے گا.....؟" منہ پوری طرح کاپی پر جھکا لیا۔ بامشکل ہاتھوں کی لرزش پر قابو پایا۔

فارحہ نے سیب ختم کر کے آخر کا حصہ دور اچھال دیا۔

"کیوں کہ وہ پین تم نے پھنسایا تھا اس کی چیئر میں۔ یہ دیکھو، یہ رہا اس کا ڈھکن۔"

فارحہ نے بند مٹھی جواد کے سامنے کھولی۔ ہتھیلی پر اس پین کا ڈھکن رکھا ہوا تھا جو جواد نے اس لڑکے کی چیئر میں پھنسایا تھا۔ جواد، خوف کے فیز سے باہر آ چکا تھا۔

"ہاں، میں نے پھنسایا تھا وہ پین اور بالکل ٹھیک کیا تھا۔" وہ روز چھٹی کے وقت میرا بیگ کرسی سے باندھ دیتا تھا۔

تم نے جس کو بتانا ہے بتاؤ۔ میں مکر جاؤں گا۔ یہ پین میرا ہے اور تم اس پین کو میرا ثابت نہیں کر پاؤ گی۔"

فارحہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔ "اور کچھ.....؟"

"اور یہ کہ تمہیں پتا ہی ہے میں ٹیچرز کا کتنا پسندیدہ اسٹوڈنٹ ہوں۔ کوئی تم جیسی فضول مقررہ کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔"

بات مکمل کر کے اس نے دوبارہ ڈرائنگ شروع کر دی۔

"چہ چہ چہ۔ گندی عادتیں انسان کو کس بری طرح پھنسوا دیتی ہیں نا۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی عادتیں اچھی رکھنی چاہیں ہمیشہ۔ اب یہی دیکھ لو سائنس کی میڈم نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے۔"

تھوڑا توقف کیا..... جواد کے چہرے پر نو لفٹ والے تاثرات تھے۔

"کہ بیٹا پین منہ میں نہ ڈالا کریں۔ بری بات ہوتی ہے۔ پر بری عادتیں کہاں جان چھوڑتی ہیں انسان کی.....؟"

(جواد کی عادت تھی پین کا ڈھکن پین کے پیچھے لگا کر منہ میں ڈال کر دانتوں سے کھرچتا رہتا تھا۔) سائنس کی میڈم، کمپیوٹر کے سر اور اردو کی میڈم نے کتنی ہی بار اس بات پر جواد کو ٹوکا تھا۔

"یہ دیکھو، یہ اس ڈھکن پر جو تمہارے دانتوں کے کارنامے ہیں نا، یہ ثابت کریں گے کہ یہ پین تمہارا ہے اور جب میں یہ ڈھکن میڈم کو دوں گی نا اور وہ اس کو پین پر فٹ کریں گی تو یہ نشان دیکھ کر ان کو فوراً پتا چل جائے گا کہ یہ پین کس کا ہے۔"

اب کے صحیح معنوں میں جواد کی سٹی گم ہوئی۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے کلاس کا ہر بچہ اس کا پین پہچانتا تھا۔

کبھی اس کا پین گم جاتا تو فوراً مل بھی جاتا تھا۔ تب وہ اپنی اس عادت پر بہت خوش ہوتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ فارحہ اگر یہ ڈھکن میڈم کے پاس لے گئی تو.....

"اچھا لاؤ، بنا دیتا ہوں، ڈائی گرامز۔" اس نے کاپی پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، فارحہ کی

طرف دیکھنے سے قصداً اجتناب کیا۔
"یہ لو۔" فارحہ نے جلدی سے کاپی آگے کی۔ "اچھی اچھی تصویریں بنانا۔ گڈ ملنا چاہیے مجھے ان تصویروں پر۔"
(جواد نے زیرلب اسے چند نازیبا کلمات سے نوازا)
"یہ کاپی تمہیں تب واپس ملے گی جب تم ڈھکن واپس کروگی۔"
"اوہ شیور!"
فارحہ نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔
جب جواد نظر بچا کر وہ پین پھنسا رہا تھا تب فارحہ کی نظر جواد ہی پر تھی۔ جواد نے پین پھنسا کر ڈھکن اپنے بیگ کی جیب میں ڈال لیا تھا اور جب پوری کلاس بمعہ ٹیچر کے اس بچے کے گرد اکٹھی تھی تب فارحہ نے ڈھکن جواد کے بیگ سے نکال لیا تھا۔ پین کرسی سے نکال ٹیچر نے قبضے میں لے لیا تھا۔
معاملہ بخیر وخوبی انجام تک پہنچا، جواد نے ڈائی گرام بنادیں۔ فارحہ نے ڈھکن واپس کردیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔
پھر بدلہ لینے کے لیے جواد کو تین ماہ انتظار کرنا پڑا۔
"سُنو ناظمہ! ایک کام کرنا ہے تمہیں۔" جواد، بریک میں ناظمہ کے پاس آیا۔
"بولو.....؟"
"6 ستمبر کا جو فنکشن ہو رہا ہے اس کے لیے فارحہ نے تقریر تو لکھ لی ہوگی نا.....؟"
"ہاں، کل بیٹھی ہوئی تھی تین چار کتابیں لے کر مختلف جگہوں سے مواد اکٹھا کر رہی تھی۔"
"مجھے وہ تقریر چاہیے اور وہ مجھے تم نے لاکر دینی ہے۔" ناظمہ کو تو گویا بچھو نے ڈنک مارا۔
"جینا حرام کردے گی وہ میرا اور تم نے کیا کرنا ہے اس تقریر کا.....؟"
"میں نے بھی نام لکھوایا ہے۔ میں بھی تقریر کروں گا۔"
"کل کمپیٹیشن ہے، اتنی جلدی یاد کیسے کر گے؟"
"یاد تو کرنا ہی نہیں ہے۔ دیکھ کر پڑھنے کی اجازت ہے۔"
"نہ بابا نہ۔ میں اتنا مشکل کام نہیں کرسکتی۔"
"پلیز ناظمہ! نہیں پتا چلے گا اس کو پلیز۔"
"اچھا، دیکھتی ہوں۔" وہ نیم رضامند ہوئی۔
ناظمہ نے رات فارحہ کو تقریر بیگ میں رکھتے دیکھا اور اس کے سونے کے بعد وہ تقریر چپکے سے نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لی۔
صبح سویرے جاتے ہی وہ تقریر نکال کر جواد کے حوالے کردی۔ رازداری کے ساتھ سارا کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ فارحہ کو شک بھی نہیں ہوا۔ ناظمہ مطمئن ہوگئی۔
اصل میں ناظمہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بے وقوف تھی۔ فارحہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چالاک تھی۔ تقریر اس کے بیگ میں نہیں ہے یہ بات اس نے اسکول آکر پتا چلی۔
اسکول آنے کے بعد سے وہ بیگ کے پاس سے لمحہ بھر کو بھی نہیں ہٹی تھی۔ مطلب، یہ کام گھر میں ہی ہوا ہے۔
فارحہ کو کاغذ گم جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ تقریر، اس کو زبانی یاد تھی۔
پر، فرق تب پڑا۔ جب اس سے پہلے جواد کو بلایا گیا اور اس نے من وعن وہی ساری تقریر کی جو فارحہ نے لکھی تھی۔ اب وہی تقریر فارحہ دوبارہ نہیں کرسکتی تھی۔ سو اپنا نام پکارے جانے سے پہلے وہ وہاں سے پیٹ درد کا بہانہ کرکے ہٹ گئی۔
جواد کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فارحہ غم وغصے سے برا حال۔
اس کے بیگ میں رکھی ہوئی تقریر جواد تک کیسے پہنچی، یہ جاننا اس کے لیے بالکل مشکل ثابت نہیں ہوا۔

ناظمہ کی جواد سے خوب گاڑی چھنتی تھی۔ سو [illegible] کے علاوہ کون ہوسکتا تھا بھلا.....؟
"ناظمہ! جواد تمہارا بہت شکریہ ادا کر رہا تھا۔ [illegible]ل میں وہ تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا اسکول میں۔ تم [illegible]یں ملیں تو مجھے پیغام دے دیا کہ تقریر کے لیے [illegible]ظمہ کا شکریہ ادا کردینا۔" فارحہ نے گھر آتے ہی [illegible]ا کا پیغام ناظمہ تک پہنچایا۔
"وہ جھوٹ بول رہا ہے، میں نے کچھ نہیں [illegible]یا۔" ناظمہ گھبرا گئی۔
"کیا جھوٹ بول رہا ہے.....؟"
"میں نے تمہاری تقریر اس کو نہیں دی۔"
(بے چاری بے وقوف بچی)۔
"ارے دے بھی دی تو کیا ہوا۔ میں نے تو [illegible]یسے بھی تقریر نہیں کرنی تھی۔ اس تقریر پر کون سا کوئی [illegible]نعام ملنا تھا۔"
کہہ کر دھیان سے ناظمہ کا چہرہ دیکھا۔ جس پر [illegible]ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا۔
"اچھا، وہ ایسا ہے کہ اب سے میرا اسکول [illegible]یک بھی تم اٹھا کر لایا کروگی واپسی میں۔" (اتنی سزا تو [illegible]تی ہے۔)
"فرحی!" وہ زور سے چیخی۔ "میرا اپنا اسکول [illegible]یک بھی اتنا بھاری ہوتا ہے۔"
"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ فارحہ [illegible]داروں کو معاف نہیں کیا کرتی اور جواد..... تمہیں تو [illegible]وہ سبق سکھاؤں گی یاد کروگے۔"
جواد، نائنتھ کلاس میں اسکول کی فٹ بال ٹیم کا [illegible]یپٹن بنا۔ ایک مرتبہ میچ ہی کے سلسلے میں وہ کلاس [illegible]ے باہر تھا۔ ٹیچر نے کل کے لیے ٹیسٹ دیا۔ جواد [illegible]اس میں نہیں تھا سو اس کو علم نہ ہوسکا۔
نتیجہ وہی رہا جو ہونا چاہیے تھا۔ جواد صاحب [illegible]ی طرح فیل ہوگئے۔ ٹیچر سے خوب ڈانٹ پڑی، [illegible]اس کا سب سے لائق بچہ اور اس بری کارکردگی کا [illegible]ظاہرہ۔
فارحہ کو بہت عرصے بعد موقع ملا تھا سو ضائع کردیتی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
بی جان کے اپنے بچے، بہت اچھی تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے۔ لہٰذا بچوں کے بچوں کی پڑھائی پر بی جان بہت توجہ دیتی تھیں۔
خاص طور پر جواد کی تعلیم کے لیے وہ خاصی جذباتی واقع ہوئی تھیں۔ فارحہ فوراً ان کے گھر پہنچی (چھٹی کے بعد) اور ٹیچر کی ڈانٹ جمع جواد کی کارکردگی، دس سے ضرب دے کر بی جان کے گوش گزار کی۔
اپنی فی البدیہہ تقریر کا جادو آزماتے ہوئے ایسا بھیانک نقشہ کھینچا کی بی جان کو لگا..... بس اب جواد کو اسکول سے نکالا گیا تو تب نکالا گیا۔
پھر جو جواد کے ساتھ بی جان نے کی فارحہ کا اگلا پچھلا سب حساب برابر ہوگیا۔ اس کے اسکول کے بعد گھر سے نکلنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ ٹیچر سے مل کر بی جان نے اس کے اسکول میں بھی تمام کھیل بند کروادیے۔ بے چارہ کپتان، کپتانی سے گیا۔
تلملا تلملا کر فارحہ سے بدلہ لینے کی تراکیب سوچتا مگر موقع نہ مل سکا۔ میٹرک کے بعد دونوں کے کالج الگ ہوگئے۔ فارحہ کی طرف کا حساب کلیئر تھا۔ جواد کا حساب کتاب باقی تھا۔ پر یہ حسرت، حسرت ہی رہی۔
اور بدلہ لینے کا موقع، اتنے برس بعد ملے گا، یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

"تو تم اس سلسلے میں مجھ سے کیوں مدد مانگ رہی ہو۔"
فارحہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا تھا جواد..... اور اس کا متوقع بہنوئی.....؟ اف.....؟ تخ.....
"تمہارے علاوہ کوئی امی، ابو کو قائل نہیں کرسکتا۔ صرف تم ہی ہو جو ان کو راضی کرسکتی ہو۔" (اس کے لیے تو میرا اپنا قائل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔)

"خیر..... پہلے تم میرا ایک کام کرو، پھر دیکھتے ہیں اس مسئلے کو بھی۔ مجھے ایک نمبر پر کال کرنی ہے، ابو کا سیل مجھے لا کر دو۔"

"تو تم میرے سیل سے کرلو، ابو ابھی ابھی لیٹے ہیں ان کی نیند خراب ہوگی۔" کہتے ہوئے ناظمہ نے اپنا فون پیش کیا۔

"تمہارے سیل سے....." وہ کچھ کنفیوز ہوئی۔

"ابو کے نمبر سے کرتی تو بہتر تھا۔ چلو، خیر..... دیکھتی ہوں کیا بنتا ہے۔"

اپنے پرس کی پاکٹ سے عمر کے دوست علی کا نمبر نکالا اور ناظمہ کے فون سے نمبر ملا دیا۔

نمبر ملاتے ہی اسے اس زور کا جھٹکا لگا جیسے بجلی کی ننگی تاروں کو ہاتھ لگا لیا ہو۔ وہ نمبر نام کے ساتھ، ناظمہ کے فون میں محفوظ تھا۔

پہلی بیل جاتے ہی اس نے کال کاٹ دی۔ ساتھ ہی میسج آ گیا۔

"کیا ہوا..... خیریت.....؟"

"مجھے تم سے، ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔" فارحہ نے جوابی میسج سینڈ کیا۔

"میں آتا ہوں....."

"نہیں، میں آ رہی ہوں۔"

صرف دس منٹ بعد وہ اس کے روبرو تھی۔

"تو، تم ہو۔ عمر کے دوست۔ علی جواد صدیقی۔" چبا چبا کر اس نے اس کا نام لیا۔

جواد نے تھوک نگلا۔

"ہاں تو.....؟"

"تو یہ کہ تم عمر کو میرے خلاف بھڑکاتے رہے ہو۔"

"تم مجھ سے پوچھ رہی ہو یا مجھے بتا رہی ہو؟"

"میں پوچھ رہی ہوں یا بتا رہی ہوں اس بات کو رہنے دو..... اور جو میں کہہ رہی ہوں وہ غور سے سنو۔ تم صرف ایک ہفتے کے اندر اندر میرے اور عمر کے تعلقات بحال کرواؤ گے۔ سمجھے تم۔" فارحہ نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"اور میں ایسا کیوں کروں گا؟" انداز [illegible] اُڑانے والا تھا۔

"کیوں کہ میں....." شہادت کی انگلی [illegible] سینے پر رکھی۔

"اسی ایک ہفتے میں تمہاری اور ناظمہ کی [illegible] ارینج کرواؤں گی۔"

اب کے صحیح معنوں میں جواد کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"یہ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے فرحی!" جواد تڑ [illegible]

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے..... معاملہ تم نے خراب کیا ہے۔ تم ہی ٹھیک کرو گے۔ میں اپنے پروجیکٹ کا کام شروع کر رہی ہوں، تم اپنے پروجیکٹ پر کرو۔" فرحی جا چکی تھی۔ جواد سر پکڑے بیٹھا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا۔ نمبر دبائے۔

"یار عمر..... ہم مل سکتے ہیں ابھی.....؟"

☆☆☆

سب گھر والے، فارحہ کی بارات میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ جواد ان میں شامل نہیں تھا۔ اس کے دوست عمر کی شادی تھی۔ وہ وہاں چلا گیا۔ جب بارات ہال میں پہنچی تو لڑکی والے اس کے اپنا خاندان تھے۔

یعنی اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔

عمر کی شادی فارحہ سے ہو رہی تھی۔ یہ بات اس کو ابھی ابھی پتا چلی تھی۔ عمر برائیڈل روم سے فوٹو شوٹ کروا کر آیا تھا، خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

جواد کچھ زیادہ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

ایک طرف فارحہ تھی اس کی ازلی دشمن جو اس پر بیٹھی چہک رہی تھی۔

دوسری طرف ناظمہ تھی۔ اس کی محبت، جو خدا جانے اس کے نصیب میں تھی یا نہیں پھر فارحہ کی طرف تو پچھلا حساب کتاب بھی نکلتا تھا۔

"یار عمر؟ ذرا بات سننا۔" وہ عمر کو ایک کونے میں لے گیا۔ "یہ جو تمہاری دلہن ہے نا فارحہ۔

[illegible] ہے میری۔ توبہ یار، بڑا ظلم کیا ہے تمہارے گھر والوں نے....."

اس کے بعد اس کے منہ میں جو جو آتا گیا وہ، وہ بولتا گیا۔ عمر کبھی حیران کبھی پریشان ہو کر اس کی بات سنتا۔

"تو اب میں کیا کروں.....؟" عمر سخت پریشان ہو چکا تھا۔

"دیکھو یار، ان بیویوں کو پہلے دن سے ہی لگام ڈال کر رکھنی چاہیے۔ تم کمرے میں جاتے ہی اس کو اس کی اوقات یاد دلا دینا۔ ٹھہرو، میں لکھ دیتا ہوں تمہیں کیا بولنا ہے۔ کہیں بھول ہی نہ جاؤ نا۔"

اس کے بعد سے علی جواد صدیقی نے کوئی کسر چھوڑی نہیں تھی ان کے معاملات خراب کرنے میں۔

پر وہ بھول گیا تھا اس کے مدمقابل فارحہ تھی جو [illegible] مقابل کو پچھاڑ کر رکھ دیا کرتی۔ سو اب اس کو [illegible] معاملات ٹھیک کرنے تھے۔ معلوم ہوتا کہ معاملات [illegible] ٹھیک کرنے پڑ جائیں گے تو کبھی اتنے خراب ہی [illegible] ہونے دیتا۔ یعنی اب یہ چکر ساری عمر یونہی چلے گا۔

فارحہ عمر کی بیوی۔

عمر، میرا دوست۔

ناظمہ میری بیوی (ان شاء اللہ)

فارحہ اس کی بہن۔

مطلب شکوہ، جواب شکوہ۔

نہیں۔

حملہ۔ جوابی حملہ۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔

☆☆☆

امی کچن میں تیاریوں میں مصروف تھیں۔ تب [illegible] فارحہ آ دھمکی۔

"ہوں..... مزے دار۔" ایک کباب اٹھا کر [illegible] میں رکھا۔ "کاشفہ آپی کے سسرال والوں کے [illegible] تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"ہاں۔" وہ مسکرائیں۔ "اور اب تو ناظمہ کا بھی سسرال ہو جائے گا۔" فارحہ نے سر ہلایا۔

"اچھا ہے چلیں، گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے گی۔"

اس کی بات سے زیادہ اس کے انداز پر سعیدہ چونکیں۔

"کیا مطلب.....؟"

"مطلب، لڑکے والوں کا بھی پردہ رہ جائے گا اور ناظمہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔"

"سیدھی طرح بات کرو پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔" امی پریشان ہوئیں۔

"او ہو سیدھی سی بات ہے۔ لڑکا نشہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہیں باہر وہ لوگ رشتہ ڈالیں گے تو اگلے مکمل چھان بین کروائیں گے۔ اب یہاں تو آپ کی ایک بیٹی پہلے سے موجود ہے تو آپ لڑکے کی ایسے تو تفتیش نہیں کروا سکتیں نا۔"

پھر اس کے بعد پانچ منٹ کی مزید تقریر نے امی کو ٹھیک ٹھاک پریشان کر دیا تھا۔

آدھا گھنٹہ وہ ابو کے ساتھ کھسر پھسر کرتی رہیں۔ اس نشست میں دادی بھی موجود تھیں۔

آخر کار کاشفہ کے سسرال والوں کو ضروری کام کا بہانہ کر کے فی الحال آنے سے منع کر دیا گیا۔

اگلا ہدف تھیں صنوبر دادی یعنی بی جان۔

"بس دادی، اب ہر ایک کے نصیب تو میرے جیسے نہیں ہو سکتے نا۔" وہ اطمینان سے ان کے تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ "بے چاری کے لیے جیسا رشتہ آئے گا ویسا ہی قبول کرنا پڑے گا۔ کیا، کیا جا سکتا ہے؟"

یہاں پر صرف ڈھائی منٹ کی تقریر اتنی زود اثر رہی کہ صنوبر خاتون کھڑی ہو گئیں۔

"چل ذرا میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ، مجھے کچھ ضروری کام ہے فیروزہ سے۔"

فارحہ ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوئی۔ اس کا کام تو ہو ہی گیا تھا تقریباً۔

☆☆☆

''عمر یار، نئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بیویوں کو جس قدر نرمی سے ہینڈل کرو۔ اتنے ہی تعلقات پائیدار ہوتے ہیں۔''

عمر نے ایسے علی کی طرف دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ یہ اتنی اچانک، نئی تحقیق کہاں سے آ گئی.....؟

ابھی پرسوں تک تو تم کچھ اور کہتے تھے۔'' عمر کچھ مشکوک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''نہیں، تحقیق نئی نہیں ہے۔ مجھے پتا ابھی چلی ہے۔'' وہ جواد تھا، بس بونگیاں ہی مار سکتا تھا۔ سو مار لیں جتنی مارنی تھیں۔

''بس اب تم نے ایک ہفتے کے اندر اندر بھابھی (دانت پیسے) کے ساتھ اپنے تعلقات ٹھیک کرنے ہیں۔''

''ایک ہفتے کے اندر اندر.....؟ کیوں.....؟''

عمر کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہوا۔

''وہ..... (کیا کہوں.....؟) جو کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے نا۔ پھر ایک ہفتے میں کام ہو جائے تو دونوں کا فائدہ ہے۔ آخری جملہ بلا ارادہ ہی زبان سے پھسل گیا۔

''علی یار! پھر بات کریں گے۔ مجھے تمہاری طبیعت کچھ زیادہ بہتر نہیں لگ رہی۔''

''پھر..... بات کریں گے۔'' جواد نے کچھ دیر سوچا۔

''چلو ٹھیک ہے۔

ابھی تو ہے۔ ایک ہفتہ۔''

عمر مشکوک نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

''شاید، جاب (نوکری) نہ ملنے کا صدمہ دماغ پر لے لیا ہے بے چارے نے۔'' بس یہی سوچ پایا۔

☆☆☆

دو سال بعد.....

مہک اور فیضان اپنی پیکنگ کو فائنل ٹچ دے رہے تھے۔ جب ہی بی بی جی اور بابا جی اندر داخل ہوئے۔

''آیئے آیئے بی بی جی! بیٹھیے۔'' فیضان نے دونوں کو اپنے سامنے صوفے پر بٹھایا۔

''پھر کیا فیصلہ کیا آپ دونوں نے.....؟''

''فیضان بیٹا! ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیں جہاں آپ لوگ خود جا رہے ہیں.....؟'' بات بابا جی نے شروع کی۔

''اگر ایسا ممکن ہوتا تو بابا جی یہ آپ سے زیادہ ہمارے لیے اطمینان کی بات ہوتی۔'' فیضان نے آرام سے بات شروع کی۔ ''لیکن، جہاں میری اس بار پوسٹنگ آئی ہے، وہاں فیملی کو ساتھ نہیں رکھا سکتا۔ میں اکیلا وہاں رہوں گا۔ یہ لوگ.....'' ہاتھ سے مہک اور بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میری والدہ کے ہاں رہیں گے اور وہاں آپ لوگوں کی رہائش گنجائش نکلنا ممکن نہیں ہے۔''

بی بی جان اور بابا جان نے مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ میجر خرم بہت اچھے انسان ہیں اور ان کے ہاں کام بھی زیادہ نہیں ہوگا۔'' فیضان ان کے فیصلے کا منتظر تھا۔ وہ لوگ یہاں سے جا رہے تھے اور فیضان کے ایک دوست میجر خرم کو ملازم کی ضرورت تھی سو فیضان نے ان کے سامنے یہ آپشن رکھ دیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! آپ کر لیں اپنے دوست سے بات۔'' وہ دونوں بات کر کے چلے گئے۔

اب وہ دونوں اپنے سرونٹ کوارٹر میں بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

''ہائے، ہائے مرزا صاحب! یہاں پر بھی اس ہی رزق لکھا تھا۔ اب اس عمر میں یوں در در رلیں گے۔'' انیسہ بیگم آزردگی سے میاں سے مخاطب تھیں۔

''توبہ، مرزا صاحب! بھلا ایسا بھی کبھی کہیں سنا۔ کیسے ہمیں تن تنہا۔ ایئر پورٹ پر چھوڑ کر بھاگ لیا۔ (کیسا دھوکہ دیا اکلوتے بیٹے نے۔)''

''پانچ کروڑ معمولی رقم نہیں ہوتی انیسہ بیگم! ...ی نظر شروع سے ہی بنگلے پر تھی۔'' مرزا صاحب ...قیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

''اور ہم بھی کیسے بے وقوف بن گئے نا.....؟''

...ی رقم، زیور سب کچھ لے کر چلا گیا کہ آپ لوگ ...یں میں آتا ہوں۔ اور ہم کچھ سمجھ ہی نہ پائے۔''

...یم بہت دکھی تھیں۔

''کیا تھا۔ جو امریکہ لے ہی جاتا، وہاں جا کر ...ے ہی ایئر پورٹ پر چھوڑ دیتا۔ کم سے کم زندگی میں ...یہ تو دیکھ ہی لیتے۔''

''اف!'' مرزا صاحب نے سر جھٹکا۔ ''ابھی ...ی دکھا امریکا کا ہی ہے آپ کو۔''

''ہاں تو اور کیا.....؟ ساری زندگی، صرف ...یک ہی تو خواہش کی..... وہ بھی پوری نہ ہوئی۔'' ان ...لہجے میں دکھ نہیں امریکہ بول رہا تھا۔

''شکر کیجیے انیسہ بیگم! امریکہ لے جا کر وہ ...پورٹ پر چھوڑ کر نہیں بھاگ گیا ورنہ ساری زندگی ...وں کی جیل میں سڑتے رہتے۔''

''جیل بھی تو امریکہ کی ہی ہوتی نا۔ مجھے تو یہ ...ی منظور تھا۔''

مرزا صاحب تو ان کی بات پر بس ان کو دیکھتے ...ہ گئے۔ ''پتا نہیں ہماری ڈولی کس طرح گزارا کر ...ی ہوگی وہاں۔ بے چاری۔'' مرزا صاحب کو گاہے ...ہے ڈولی یاد آتی تھی۔

''ہم سے بہتر ہی حال میں ہوگی۔ ہمیں دیکھو، ...ں اخیر عمر میں لوگوں کی چاکریاں کرتے پھر رہے ...یں۔''

مرزا صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

☆☆☆

''بی جان!'' ناظمہ کچن ہی سے چلّائی۔

''یہ دیکھیں، یہ بیسن کا حلوہ بنا رہی ہے۔ ...ھائی نہیں کر رہی۔'' ناظمہ نے مدیحہ کے نہ نہ کے اشاروں کو یکسر نظر انداز کر کے فوراً بی جان کو شکایت لگائی۔

''باہر آ تو، جلدی۔'' بی جان کی غیض و غضب سے بھری آواز سنائی دی۔

مدیحہ فوراً سے باہر آ گئی۔

''تو حلوہ بنا رہی ہے.....؟'' غصے سے پوچھا۔

''نہیں بی جان۔ بنا چکی ہوں۔'' معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''مدیحہ! بری بات۔ یاد رکھ اگر تو فیل ہوئی نا، میں بلواؤں گی محلے کے جمعدار کو اور نکاح پڑھوا کر تجھے اس کے ساتھ ہی رخصت کر دوں گی۔'' بی جان نے وارننگ جاری کی۔

''بی جان! یہ جمعدار کو کس بات کی سزا دیں گی آپ، میں تو چلو فیل ہونے کی سزا بھگتوں گی.....''

ناظمہ نے کچن ہی سے کھی کھی شروع کر دی۔

بات ابھی ادھوری تھی کہ بی جان نے کسی چیز کی تلاش میں ہاتھ تخت پر آگے پیچھے مارنا شروع کیا۔

ناظمہ کی کھی کھی جاری تھی.....

''بی جان! تکیے کے نیچے ہے۔'' مدیحہ نے مدد کی۔

''کیا؟'' بی جان نے تلاش چھوڑ کر مدیحہ کو گھورا۔

''سروتا۔ وہی ڈھونڈ رہی تھیں نا مجھے مارنے کے لیے۔''

''دیکھ مدیحہ! تو بی اے کے پرچوں کو مذاق سمجھ رہی ہے نا۔ ایسا بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ۔'' غصہ ترک کر کے آرام سے بولیں۔

''اچھا، یہ بتائیں پاس ہو گئی تو کیا دیں گی؟''

''یہ.....'' اپنی چھوٹی انگلی سامنے کی، اس میں پڑی سونے کی انگوٹھیاں دکھائیں۔

''یہ، اپنے میاں کی نشانی، اپنے پاس رکھیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔ میں تو آپ کا پاندان لوں گی۔'' پاندان آگے کو ہو کر اپنی طرف کھسکایا۔

''پیچھے کر ہاتھ۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''یہ میں کسی کو نہیں دوں گی۔'' پاندان اپنی

طرف کیا۔
مدیحہ نے منہ بنایا۔ ''پھر کیا فائدہ اتنی محنت کا۔'' (مدیحہ کی جان جاتی تھی پڑھنے سے۔ بی جان کی زبردستی کی وجہ سے بی اے کر رہی تھی ورنہ.....)
''نہ.....تو.....تو نے یہ پچھلی صدی کا پاندان کیا کرنا ہے؟''
''بی جان! یہ بی اے کر کے اپنا میوزیم بنائے گی، وہیں پر سجائے گی آپ کا پاندان۔ خوب کمائی ہوگی۔'' ناظمہ کی بتیسی باہر آ گئی۔
''ناظمہ! یہ، دو دو آنے کے لطیفے تُو اپنے میاں کے لیے سنبھال کر رکھ۔''
بی جان کی بات پر مدیحہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔
''ناظمہ! شامی کباب کا مسالہ چڑھا، پھر وہ آ کر منہ بنائے گا ماش کی دال دیکھ کر۔''
''اچھی بات ہے، پوتے کے لیے بڑا دل نکالتی ہیں۔ پوتی کا کوئی خیال نہیں ہے۔'' مدیحہ پھر سے بی جان کو مقابلے پر لے آئی۔
''تجھے جو چاہیے وہ سیدھی طرح بول۔''
''بول دوں.....؟ اجازت ہے۔''
''ہاں.....'' انہوں نے اجازت دی۔
مدیحہ اٹھ کر بی جان کے پیچھے گئی اور پیچھے سے ہی انہیں جھپی ڈالی۔
''ارے سانس رک جائے گا میرا۔ پیچھے ہٹ۔''
بی جان نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حلقے سے چھڑانے کی کوشش کی۔
''نہیں چھوڑوں گی۔
پہلے آپ وعدہ کریں کہ اگر میں بی اے میں پاس ہوگئی تو آپ سوتے میں خراٹے لینا چھوڑ دیں گی۔''
کچن سے ناظمہ کی کھی کھی پھر سنائی دی۔
''دفع دور.....اب اتنی بھی پیاری نہیں ہے تُو مجھے۔'' بی جان نے گویا صاف انکار کیا۔
ان دو سالوں میں کافی کچھ بدل گیا۔ عابدہ چچی کی وفات، ثناء کی شادی جواد اور ناظمہ کی شادی۔
اس کی اپنی تعلیم کا سلسلہ بی جان نے دوبارہ سے شروع کروایا لیکن اگر کچھ نہ بدلا تو وہی رات میں جان کے خراٹے.....
چک چک۔ چوں چی چوں۔ پھر پھر پھر۔
''اف یعنی کہ ''نہ'' ہی سمجھوں۔'' مدیحہ ٹھنڈی سانس بھری۔

☆☆☆

''فارحہ! یار کتنے دن ہو گئے نا، علی کی طرف گئے۔ شام میں چلیں.....؟'' عمر اپنے دھیان میں پوچھ رہا تھا۔
(اف اف اف۔ اس علی سے پیچھا نہیں چھوٹے گا میرا۔)
''یہ دیکھیں، اس کو کتنی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' فارحہ نے چھ ماہ کے رافع کی طرف اشارہ کیا۔
''تو.....؟'' عمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''بھئی، اس کو مزید ٹھنڈ لگ جائے گی نا۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔''
''ہوں..... یہ تو ہے۔'' عمر نے پُرسوچ ہنکارا بھرا۔
''چلو رہنے دو جانے کو۔''
فارحہ نے سکون کا سانس لیا۔
''ایسا ہے، شام میں ان کو بلوا لیتے ہیں۔ تم کھانے میں کچھ اچھا سا بنا لو۔''
(اف اف اف، یعنی کہ میرا پیچھا واقعی نہیں چھوٹے گا۔)
تو زندگی نے یوں ہی گزرنا ہے۔ مطلب زندگی یوں ہی گزرتی ہے۔
کچھ چیزیں آپ کی مرضی کے عین مطابق
کچھ چیزیں آپ کی مرضی کے بالکل برعکس۔
سو، جو ہے۔ جیسا ہے۔ مان لیجیے کہ سب اچھا ہے۔

BOOKSPK
Books & Magazines

عندلیب زہرا

دو قدم پر جنت

گرم دوپہر اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔
کالونی میں سناٹے کے بجائے سبک سی پر رونق چہل پہل کا آغاز ہو گیا تھا۔ پرجوش، پراعتماد بچے جو اپنے ہاتھ میں قربانی کے جانوروں کی رسیاں تھامے فخریہ چہل قدمی کر رہے تھے۔
موٹے تازے، مہندی سے سجے جانور جب

زمین پر پیر مار کر چلتے تو گھنگھروؤں سے دھمک سی پیدا ہوتی۔

''میں نے اُپنے دنبے کا نام لاڈلا رکھا ہے۔''

''اور میں اپنے شہزادے کو کنگ خان کہتا ہوں۔'' خرم اور فیضان اپنے سفید اور سنہرے دنبوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فخریہ کہہ رہے تھے۔ شفی اور ارسلان چپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے، ان کا بھی جی چاہتا کہ وہ بھی بکروں کی رسّی پکڑ کر ان کو چہل قدمی کروائیں۔ مہندی سے عید مبارک لکھیں اور پھر قربانی کا گوشت تقسیم کرنے آس پاس کے گھروں میں جائیں۔ باربی کیو اور تکہ پارٹی کا اہتمام کریں لیکن اب تک ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔

''ہم کب قربانی کریں گے؟'' وہ ہر سال مطالبہ پیش کرتے، امی ہر سال تسلی دیتیں لیکن بکرا پھر بھی نہ آتا۔

اسی رونق میلے کو دیکھتے دیکھتے عید آ گئی۔

شفی اور ارسلان عید کے دن منتظر ہی رہے کہ آس پڑوس سے ان کے گھر بھی گوشت آئے گا لیکن عید سے پہلے نظر آنے والے دنبے، بیل، بکرے وغیرہ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ فریزر میں یا پھر.....؟

نہ غریب رشتے داروں کو حصہ ملتا نہ آس پڑوس کو، ہاں رسمی طور پر چند ہڈیوں بھرا گوشت مل جاتا تو غنیمت لگتا۔ البتہ جن سے کاروباری مراسم بڑھانا مقصود ہوتا۔ پی آر کی بات ہوتی تو پھر رانیں بھیجی جاتیں یا باربی کیو، جیسے لوازمات کا اہتمام ہوتا اور کیا خوب ہوتا۔

ایسے میں شفی کو ابا کی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا۔ جب سارے رشتے دار اکٹھے ہوتے تو اپنی امارت کی خوب دھاک بٹھاتے۔ ایسے میں ابا ان سب کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی سب سے تنہا اور الگ ہوتے۔

امی کہتی تھیں کہ پہلے وہ بھی بہت خوش حال تھے، تب شفی ڈھائی تین برس کی تھی لیکن پے در پے مالی مشکلات اور پریشانیوں نے انہیں اپنوں میں ہی اجنبی بنا دیا تھا۔

تایا کے بڑے سے لان میں باربی کیو کا اہتمام ہوتا۔ پھوپھو، چچا، تایا کی محفلوں میں خوشی خوشی شامل ہوتے۔ ان کے کاروباری دوست احباب بھی ہوتے۔ ابا ایک دو بار کے بعد دوبارہ کبھی نہیں گئے تھے۔ اب تو چار سال ہونے والے تھے، شفی نے انگلیوں پر گنا۔

''ایسی جگہ جہاں آپ کی عزت نہ ہو، آپ کی موجودگی کوئی محسوس نہ کرے۔ بہتر ہے اپنے گھر میں ہی رہا جائے۔''

ارسلان کے استفسار پر ابا نے بڑے رسان سے اسے سمجھایا۔ ارسلان نے کبھی دوبارہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ ابا کی طرح تھا، خوددار اور خاموش طبیعت، شفی البتہ کچھ جلد باز اور جذباتی تھی۔ لوگ ابا کے سامنے ان کے بھائیوں کی امارت کا ذکر کرتے اور افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ کیسے خون سفید ہو گیا ہے۔ تایا بڑے حاجی نمازی پرہیز گار انسان تھے، کاروباری شخصیت تھے۔ شہر میں ان کا بڑا نام تھا، پھوپھو کی مضبوط حیثیت تھی اور وہ این جی او کی سرگرم رکن تھیں۔ چچا بھی افسر تھے لیکن چراغ تلے اندھیرا تھا۔

شفی اور ارسلان کا واحد ہتھیار پڑھائی تھی، اس نے ارسلان سے وعدہ لیا تھا۔

''بھائی! تم جاب ملتے ہی پہلی تنخواہ سے قربانی کرو گے۔''

شفی اور ارسلان بچپن اور لڑکپن سے نکل کر کالج یونیورسٹی میں قدم رکھ چکے تھے۔ تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ حکومت سے وظیفہ ملتا تھا، بچپن کی تشنہ خواہشات کے برعکس اب ان خوابوں نے رستے بدل لیے تھے۔ اچھی جاب، تعلیم، گھر کی تعمیر، امی ابو کو حج، شفی کی شادی..... اب ان کی باتوں میں ان ہی خواہشات کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔

برسوں بعد پھر ایک ایسی بڑی عید آئی جب وہ لوگ قربانی کرنے کے قابل ہو چکے تھے اور بچپن کی

عیدوں اور خواہشات پر ہنستے تھے۔

''اسے تو خواب میں بکرے نظر آتے تھے۔'' ارسلان اسے چھیڑتا۔

''اور تم باربی کیو، باربی کیو کہتے تھے نیند میں۔'' وہ بھی جل کر جواب دیتی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھائی صاحب کو سلام کرنے جاؤں عید پر۔''

ابا نے عید پر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تایا سے ملنا تو اب برسوں پرانی بات ہو چکی تھی۔ نجانے کیسے ابا کو بھی اتنے برس بعد خود ملنے کا خیال آیا تھا۔

وہ عید پر ان سے ملنے گئے، ساتھ مٹھائی اور گوشت بھی لے کر گئے۔ اس بار شفی اور ارسلان بھی ساتھ تھے۔ معلوم نہیں کیوں تایا ان سے سرد مہری سے ملے۔ نہ گرم جوشی اور نہ التفات، نہ سوال کہ اتنے برسوں میں کیا کیا تھا اور تو اور شفی اور ارسلان کو بھی نہ لفٹ کروائی۔ گھر والے بھی مصروف اور مگن سے تھے۔ وہ لوگ خاموشی سے لوٹ آئے، بعد میں پتا چلا کہ تایا تائی کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید وہ تایا کے گھر بچوں کے رشتے کے لالچ میں آئے تھے۔

حالانکہ ابا کو تو شاید اجل کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اسی لیے تایا سے ملنے ان کے گھر چلے گئے تھے ورنہ وہ تو بہت غیرت مند تھے۔ اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ بہن بھائی رسمی طور پر آئے اور چلے گئے، شاید رشتے بھی اب دولت کے مرہون منت ہیں۔

تایا نے اپنے بچوں کی شادیاں طے کر دی تھیں۔ رسمی طور پر انہیں کارڈ ملا۔

''فرائض سے ادائیگی کے بعد حج کے لیے جائیں گے۔'' تائی فخریہ کہتیں۔

''آپ کو تو بار بار بلاوا آتا ہے بیگم صاحب!''

کوئی خوشامدانہ انداز میں کہتا۔ ''جنت کمار ہے ہیں آپ لوگ۔'' کوئی ابن الوقت کہتا۔

''ہاں بھئی کتنے لوگوں کے گھر کے چولہے آپ کے دم سے روشن ہیں۔'' کوئی دوسرا ہاں میں ہاں ملاتا، تایا رعونت بھری عاجزی کے ساتھ سر ہلاتے۔ حالانکہ جنت تو دو قدم کے فاصلے پر تھی لیکن وہ بے خبر تھے۔

☆☆☆

وقت کے سنہری تھال میں عمر کے سکے ایک ایک کر کے گرتے گئے، بنا آواز پیدا کیے۔

وقت اور حالات نے کروٹ بدلی تھی۔ ماضی کی شفی اب کشف مرتضیٰ تھی جو کامیاب بینکر تھی اور ارسلان ایک پروڈکشن ہاؤس کا مالک تھا۔ دونوں سیلف میڈ تھے اور ذہین بھی۔

قسمت ان پر مہربان تھی، جس چیز میں ہاتھ ڈالتے وہ سونا بن جاتی تھی، وقت اب ان کا تھا۔

زندگی اب ان پر مہربان تھی۔ کشف ایک نامور کاروباری گھرانے کی بہو تھی۔ عیدیں اب بھی آتی تھیں، بچپن کے برعکس، آسودہ حال اور خوشی سے بھرپور۔ امی ابا کی وفات کے بعد وہ دنیا کا ہر رشتہ تھے ایک دوسرے کے لیے۔ جب بھی بڑی عید آتی تو اپنے قربانی کے جانوروں کے علاوہ دونوں بہن بھائی ایک دنبہ یا بکرا خرید کر اس فیملی کو اپنی طرف سے گفٹ کرتے جو قربانی کرنے کی متحمل نہ ہوتی۔ وہ فیملی ان کے رشتے دار بھی ہو سکتے تھے، ملازمین بھی یا احباب میں سے کوئی بھی۔ یہ ان دونوں کا آپس میں خاموش معاہدہ تھا۔

شاید کشف کے اندر اب بھی وہ بچی زندہ تھی جو بکرے کی رسّی پکڑ کر چلنا چاہتی تھی۔ اسے مہندی لگا کر، گھنگھرو باندھ کر، محلے کے بچوں میں فخریہ گھومنا چاہتی تھی۔ جسے قربانی کا گوشت تقسیم کرنے میں مزا آتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے ناں کہ ماضی کا کوئی لمحہ ہمیشہ کے لیے ہمارے اندر زندہ رہ جاتا ہے۔ موسم، وقت، حالات کے بدلاؤ کا اثر نہیں ہوتا اور ہم اس لمحے میں سانس لیتے رہتے ہیں۔

کشف بھی ابھی تک اسی ایک لمحے میں زندہ تھی۔

☆☆☆

ذوالحج کے چاند کی نوید کے ساتھ ہی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ باربی کیو، تکے، کباب، انواع و اقسام کے دیسی بدیسی کھانے، کس کس کو مدعو کرنا ہے۔ آج کل کون اِن ہے، کس سے تعلقات بڑھانے ہیں یہ سارے گر کشف نے سیکھ لیے تھے۔

لیکن عید کے دن گہما گہمی میں بھی اسے یاد تھا کہ کن کن غریب رشتے داروں کے یہاں عید کا سلام کرنے جانا تھا۔ ان کی مالی اعانت بھی ہوجاتی۔ وہ اپنے اندر کی ''شفی'' کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ میکے میں بس ارسلان کی فیملی تھی، سو انہیں جوش وخروش سے مدعو کرتی۔

''تایا جان! آج کل بہت کسمپرسی میں زندگی گزار رہے ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

''لیکن ان کی دولت اور بینک بیلنس تو بہت ہائی فائی ہے اب بھی۔'' کشف نے طنزاً کہا۔ وہ بہت مصروف تھی، دعوت کل تھی لیکن انتظامات اسے پہلے سے مکمل کرنے تھے۔

''وہ رشتوں کے حوالے سے تہی دامن ہوگئے ہیں، اس سے بڑھ کر مفلسی کیا ہوگی شفی.....'' ارسلان کی آواز میں اداسی گھل گئی تھی۔

''اب میں چاہتا ہوں کہ ان کو عید کا سلام کرنے جاؤں، وہ ہمیں یاد کرتے ہیں، ابا کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے انہیں اولڈ ہوم میں داخل کروا رہے ہیں۔ تائی بھی بیٹیوں کی بے حسی کے ہاتھوں فوت ہوگئیں۔ جائیداد بھی آپس میں تقسیم کرلی ہے۔''

''شاید میں ان سے کبھی نہ مل سکوں، ان کا ماضی کا تلخ رویہ، وہ اب بھی میرے اندر زہر گھولتا ہے۔ کیا تھا جو وہ ہم سے دو میٹھے بول بول دیتے، سر پر ہاتھ پھیر دیتے شاید.....''

کشف کی آواز بھیگ چکی تھی۔ ان کے درمیان ایک بھیگی خاموشی کا پردہ حائل ہوگیا تھا۔

''مگر میں انہیں عید کا سلام کرنے جاؤں گا۔ ان کی اولاد نے انہیں تنہا کردیا ہے، وہ مجھے یاد کرتے ہیں۔'' ارسلان نے اس کی بات ان سنی کردی تھی۔

''تمہیں یاد ہے بچپن میں ابو کہا کرتے تھے، جنت تو دو قدم کے فاصلے پر ہوتی ہے۔ پہلا قدم اپنے نفس پر رکھنا ہوتا ہے، اگلے قدم پر جنت کا دروازہ وا ہوجاتا ہے۔'' ارسلان اکثر ماضی کی یادوں میں کھو جاتا تھا۔

''جنت کے حصول کے لیے بڑے بڑے کاموں کی ضرورت نہیں ہے کشف! بس نفس اور انا کی قربانی دینی ہوتی ہے۔''

ارسلان نے ایک نظر اس کے گھر اور ملازموں کی فوج پر ڈالی۔ کھانوں کی مہک، چہل پہل، رونق، ایک میلہ سا لگا تھا۔

''بس دو قدم کے فاصلے پر جنت ہوتی ہے اور شاید تمہاری، میری جنت یہی ہو۔'' ارسلان دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

کشف خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ تائی کے طعنے، تایا کا ترش رویہ، بے حسی، سب کچھ ایک فلم کی طرح ذہن میں رواں تھا اور وہ ابو کی آخری عید کی تلخ یادیں..... اچانک ابو کی میٹھی آواز کانوں میں گونجی۔

''جنت تو دو قدم پر ہوتی ہے بیٹا!''

''کیا میں بھی خود کو اس مقام پر لا رہی ہوں، وہ نہیں ملتے تو میں کیوں جاؤں۔ انہوں نے یہ کیا میں وہ کروں گی.....'' الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

ارسلان کی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی، منظر دھندلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی پورچ کی طرف آئی۔

''رکو ارسلان!'' ارسلان ٹھہر گیا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی تایا سے ملنے۔ شاید میری جنت میری آزمائش، میرے اسی قدم میں ہو۔'' اس نے نم آنکھوں سے کہا اور گاڑی رواں ہوگئی تھی۔

عید قربان کا سچا فلسفہ اور درس اسے سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆

English
سر نہ کُھجائیں..
Healthy ہوجائیں!

HOLOGRAPHIC PRINT اصل کی پہچان
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
A Quality Product of
Sarwana & Sohzsihm
antilice
@SnScare

ناولٹ

اسے دیکھ کر گھر کی تینوں خواتین چپ ہو گئی تھیں۔ صفا خوامخواہ کی خفت میں گھر گئی۔

''وہ ..... دادی ..... میری سمسٹر کی فیس دینی ہے ..... امی کے پاس پورے پیسے نہیں ہیں جبکہ آج آخری تاریخ ہے .....'' اس کے الفاظ سادہ مگر لہجہ حق جتاتا ہوا تھا جو کہ ہمیشہ کی طرح تینوں خواتین کو بے حد برا لگا تھا۔

''دیکھا آپ نے اس کا انداز۔ نہ درخواست نہ عاجزی، پیسے بھی ایسے مانگتی ہے جیسے ہم نے اس کا قرض دینا ہو .....'' تائی کی بات پر دادی نے چشمگین نظروں سے اسے گھورا تھا۔

ہیں یا نہیں ..... میں لیٹ ہو رہی ہوں۔''

''جاؤ بی بی! نہیں ہیں ہمارے پاس تمہارے لیے پیسے۔ خدا جانے واقعی فیس کے لیے چاہئیں یا کسی اور کام کے لیے ..... گھر کے مرد پردیس کاٹ کر کتنی مشکل سے پیسہ کما رہے ہیں، تمہیں کیا معلوم ..... بتاؤ بھلا جب پیسے ہی نہیں تو یہ پڑھائی کے چونچلے کرنے کی تک ہی کیا بنتی ہے۔ گھر بیٹھو اور ماں کے ساتھ گھر کے کام کاج کرو۔''

''کام کاج کرو نہیں، ماں کے ساتھ اس گھر کی بے دام غلام بن جاؤ۔'' صفا نے ان کی بات کاٹی۔

''پڑھائی کے چونچلے آپ کی اولاد کے لیے

اُمِ ریمان قاضی

اُٹھا لے جا

''سدھر جاؤ صفا! لڑکی ہو تم اور لڑکیوں کو ہمیشہ ایک حد میں رہنا چاہیے۔ اپنے انداز اور رویے میں لچک رکھنی چاہیے۔ کل تمہاری چچی بھی شکایت کر رہی تھیں کہ مہمانوں کی آمد پر تمہیں کوئی کام کہا تم نے منع کر دیا۔''

''میرا ضروری ٹیسٹ تھا دادی! میں اس کی تیاری کر رہی تھی جب کہ امی تھیں کچن میں اس وقت، چچی کی صاحبزادی اس وقت ٹی وی دیکھ رہی تھیں، وہ غالباً انہیں اس وقت نظر نہیں آئیں یا وہ اسے کچن میں جانے میں جیسا مشکل ٹاسک دینا ہی نہیں چاہتی تھیں، غالباً اصول میرے لیے ہیں۔ گھر کی باقی لڑکیوں کو کہا جاتا ہے کہ خبردار جو غلط بات برداشت کی تو، نہ ہی کسی سے دب کر رہنے کی ضرورت ہے، بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ پیسے

ہیں، جن کے باپ دوبئی سے کما کما کر بھیج رہے ہیں اور میں بھول جاتی ہوں کہ میرا باپ اس دنیا میں نہیں رہا، مگر میں یہ نہیں بھولی تائی جان کہ میرے ابا کا بھی کاروبار میں اتنا حصہ اور محنت شامل تھی جتنی باقی دو بھائیوں کی ..... اور میں نہیں بھولی کہ میری ماں کولہو کے بیل کی طرح اس گھر کے کاموں میں جتی رہتی ہے

سو اگر میں اپنے حصے کا کچھ مانگ ہی رہی تھی تو یہ سوچ کر نہیں کہ میرے ابا بھی کاروبار میں برابر کے شریک تھے بلکہ یہ سوچ کر کہ میری ماں اس گھر میں چار نوکرانیوں کا کام اکیلے نپٹاتی ہے اور میری چھ ماہ بعد جانے والی سمسٹر کی فیس اس کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر بھی نہیں ہے جبکہ وہ یہ بیگار پچھلے چار سال سے بھگت رہی ہے۔ اس لیے یہ مجھ پر آپ کا احسان

BOOKSPK
Books & Magazines

نہیں، ہمارا حق ہے.....''

''اور دادی آپ.....''

وہ تائی کو جواب دے کر ہک دک بیٹھی دادی سے مخاطب ہوئی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مگر آپ کو اتنا بتا دوں کہ ایک دن کا عمل ساٹھ سال کی عبادت پر بھاری ہے، یہاں ظلم کا یہ سلسلہ آپ کی سربراہی میں پچھلے چار سال سے جاری ہے تو سوچ لیجیے کہ میں ہوں یا آپ، یا کوئی بھی انسان قبر میں ہمارے ساتھ صرف ہمارے اعمال جائیں گے۔'' دادی کو سنانے کے بعد وہ رکی نہیں تھی، وہاں سے چل دی تھی۔

''ہائے میں مرگئی.....

یہ چھٹانک بھر کی لڑکی اور اس کی زبان.....توبہ استغفار.....کیا ظلم کر دیا اس پرہم نے.....باپ کے مرنے کے بعد گھر میں کھانے پینے، اوڑھنے کو سب میسر ہے.....ایک اس کی ماں گھر کے ایک دو کام نپٹا لیتی ہے تو تنتنا دیکھو.....بلاؤ ذرا ساجدہ کو.....'' دادی کا غصہ عروج پر تھا.....تائی محظوظ ہونے والے انداز میں اٹھیں اور دیورانی کو بلانے چل دیں۔

☆☆☆

وہ تیز تیز سیڑھیاں اتر رہی تھی جب راستے میں اسے بلال ملا.....

''کک.....کک.....کیا بات ہے صفا؟ ای.....ای.....اتنے غصے میں کیوں ہو.....؟''

''کچھ نہیں، راستہ دو.....تم نے کون سا میرا مسئلہ حل کر دینا ہے.....'' بے زاری سے اسے ہٹاتی وہ نیچے اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر کچھ سوچ کر وہ واپس پلٹی تھی۔

''اے سنو! بلال.....! تم ایک کام کر دو گے میرا، کسی کو بتائے بغیر.....؟''

''کک.....کک.....کیا مطلب صفا جی.....! کیسا کام ہے.....؟''

''بندہ مروانا ہے ایک تم سے.....'' اس کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

''جج.....جج.....جی.....! صفا جی! اے، اے.....ایسے کام تو جی آپ خود بڑی آسانی سے کر سکتی ہیں جی.....؟''

''یہ بھی صحیح کہا تم نے.....'' وہ ایک طویل سانس لے کر بولی اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو کچھ لمحے دیکھا پھر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''ابھی تو شاپس وغیرہ بند ہوں گی.....ویسے تو ہر کام میں خود ہی کر لیتی ہوں مگر اس طرح اس کو جا کر سنار کو بیچنا کچھ آکورڈ لگے گا.....نجانے کوئی کیا سوچے.... تمہارا جب بھی مارکیٹ کا چکر لگے۔ بیچ کر پیسے مجھے لا کر دینا.....اور میرے خیال میں یہ کم از کم پندرہ ہزار کی تو ہو گی تم فی الحال مجھے پانچ منٹ کے اندر اندر چار ہزار روپے لا کر دو، کہیں سے بھی، کیسے بھی.....اس کو بیچ کر اپنا ادھار لے لینا، باقی مجھے دے دینا.....اب اپنا یہ کھلا ہوا منہ بند کرو اور جلدی سے مجھے پیسے لا کر دو۔''

''صف.....صف.....''

''صفا.....'' اس نے تصحیح کی۔

☆☆☆

''میری تربیت ایسی تو نہیں تھی صفا کہ تم بڑوں سے اس قدر بدتمیزی سے بات کرو.....'' مشین پر جھکے جھکے ہی ان کو جیسے ہی اس کی کمرے میں موجودگی محسوس ہوئی انہوں نے کہا تھا۔

''مجھے پتا تھا مجھ پر تو کوئی داؤ چلنا نہیں ان کا، سو آپ کو ہی رگیدا جائے گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی لیکن آپ کو پتا ہے غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی..... انہوں نے یقیناً یہ نہیں بتایا ہو گا کہ انہوں نے مجھ سے کیسے بات کی تب ہی میں نے جواب دیا ان کو.....''

''وہ تینوں اس گھر کی بھی بڑی ہیں اور رشتے اور رتبے میں بھی بڑی ہیں، ہر بات کہہ سکتی ہیں، برا بھلا کہہ سکتی ہیں، میں بھی تو بہت دفعہ ڈانٹ دیتی ہوں تمہیں، بڑوں کی ڈانٹ میں بھی بچوں کے لیے بھلا ہوتا ہے۔''

''بھلا نہیں امی حضور برا اور صرف اور صرف برا ہی سوچتی ہیں اور کہتی ہیں وہ خواتین مجھے، آپ ان سے خود کو نہ ہی ملائیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ آپ جیسا صاف اور سادہ دل تو دنیا میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔''

''چلو مان لیا کہہ بھی دیتی ہیں کچھ پھر بھی ان باتوں پر کڑھنے یا جواب دینے کے بجائے یہ سوچ کر چپ ہو جایا کرو کہ تمہارے ابا کی وفات کے بعد یہ ہی لوگ ہمارے چھپر چھایا بنے ہوئے ہیں.....دو وقت کی روٹی، اور زندگی کی بنیادی ضروریات، ایک چھت کا آسرا بھی تو یہی لوگ دیئے ہوئے ہیں۔ آج یہ ہمیں ہاتھ سے پکڑ کر نکال باہر کریں تو کیا کریں گے ہم.....''

''ارے واہ! ایسے ہی نکال باہر کریں اور بھلا کس خوشی میں.....؟ میں آپ کی طرح نہیں ہوں.....دماغ سے سوچتی ہوں دل کے بجائے.....یہ گھر ان لوگوں کے ذاتی پیسوں سے نہیں بنا.....دادا ابا مرحوم کے خون پسینے کی کمائی ہے.....میرے ابا کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اور اگر دو وقت کی روٹی.....موسم کے ایک آدھ سوٹ دے دیتی ہیں تائی اور چچی محترمہ آپ کو تو احسان نہیں کرتیں.....گھر کے سارے کاموں کے علاوہ یہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائننگ کی سلائی کروا کے آپ سے لے جاتی ہیں اور خوب شو مارتی ہیں اپنے میکے میں اور دوستوں کے درمیان کہ فلاں بوتیک سے لیا ہے یا فلاں درزی سے سلوایا ہے.....

والدہ محترمہ! ذرا سا بھی آنکھیں کھول کے جائزہ لیں تو ہم بھاری ہیں ان پر یہ جو آپ کو دبا کر رکھنے کا پروگرام چلتا ہے ناں اس گھر میں تو مفت کی ملازمہ، درزن اور فل ٹائم کیئر ٹیکر سے کون ہاتھ دھونا چاہتا ہے۔'' وہ تائی اور چچی کی باقاعدہ نقل اتار کر کہہ رہی تھی۔ انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے قمیص مشین سے نکال کر اس کی فٹنگ چیک کی گویا صفا کو سمجھانا ان کے بس کی بات نہ ہو۔

''اچھا! یہ لو کچھ پیسے سلائی سے میں آج ہی لے آئی ہوں محلے سے، پتا نہیں کیسے لوگ ہیں، جب تک مانگو نہیں، اپنا حق بھی کوئی نہیں دیتا جبکہ کپڑے دیتے وقت نخرے وہ ہوں گے جیسے الٹا مجھ پر احسان کیا جا رہا ہو.....''

''یہی تو.....یہی تو میں کہتی ہوں امی! حق ایسے ہی نہیں دیتا آج کل کوئی، چھیننا پڑتا ہے۔ یقین کریں آپ میرے کہنے پر چلنے کی کوشش کریں تو سارے لوگ پانی بھرتے نظر آئیں ہمارے سامنے میں بہت کوشش بھی کر لوں تب بھی آپ جیسی صفائی اور مہارت میرے ہاتھوں میں نہیں ہے، ہوتی ناں تو میں دیکھتی کہ کیسے یہ تائی اور چچی میرے پیچھے ہاتھ باندھے پھرتی ہیں۔''

''اس لیے خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا.....'' امی نے اس کی بات کاٹی، صفا کا منہ بن گیا۔

''اچھا یہ پیسے اٹھا لو اور سو جاؤ! بہت رات ہو گئی ہے.....''

''آپ کو نہیں سونا.....؟'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جو رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔

''نہیں یہ دو قمیصیں رہ گئی ہیں۔ مکمل کر کے ہی اٹھوں گی۔''

''یہ پیسے آپ رکھیں.....ہو گیا تھا بندوبست

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں یہ چوبارے

فائزہ افتخار

قیمت -/400 روپے

پیسوں کا..... اور آپ اٹھیں سو جائیں کیونکہ علی الصباح اٹھنا ہوتا ہے آپ کو ..... آج میں کالج سے آنے کے بعد خوب سوئی تھی تو ابھی گھنٹہ دو گھنٹہ نیند نے پاس نہیں پھٹکنا..... یہ فیس میں مکمل کر لیتی ہوں..... خود ہی تو کہتی ہیں کہ میرے ہاتھ والی صفائی اور مہارت تب آئے گی جب پریکٹس ہوگی۔"

"تم..... صفا کرتو لوگی مگر وہ خاتون ذرا وہمی قسم کی ہیں۔" انہوں نے نیم رضامندی سے کہا کہ بدن کا دکھتا ہوا ہر جوڑ دہائی دے رہا تھا۔

"ارے امی! آپ ابھی جانتی نہیں ہیں صفا کی صلاحیتوں کو دیکھیے گا اس بار وہی خاتون سلائی کے علاوہ انعام نہ دیں تو پھر کہیے گا..... کیونکہ صفا مراد علی جب کوئی کام دل سے کرتی ہے تو پھر وہ ہر دل کو بھاتا ہے۔"

"اچھا بھئی صفا مراد علی! الارم لگا دینا چار بجے کا اور تم نے بتایا نہیں کہ روپوں کا بندوبست کہاں سے اور کیسے ہوگیا.....؟

اپنے بستر پر لیٹتے انہوں نے پوچھا۔

"ابھی آپ آرام سے سو جائیں..... اس بارے میں صبح بات ہوگی....." اس نے شاپر سے کٹے ہوئے کپڑے نکالتے ہوئے کہا اور ان میں اتنی ہمت اور سکت نہ تھی کہ مزید کچھ پوچھتیں، لمحوں میں ہی سو گئی تھیں وہ.....

☆☆☆

"اے صفا.....؟ اس موئی سائیکل کی ناز برداری سے فارغ ہو جائے تو آ جا تیل لگا دے سر میں میرے..... تیری ماں کو تو کچن ہی نہیں چھوڑتا یا وہ موئی مشین لے کے آنکھیں پھوڑتی رہتی ہے۔ اب بھلا کس چیز کی کمی ہے تم لوگوں کو اس گھر میں مگر نہ..... نیچا جو دکھانا ہے ہم سب کو بتانا جو ہے دنیا کو کہ آخر ایسی تو کوئی مجبوری ہے ناں کہ اجرت پر کپڑے سینے پر مجبور ہے بے چاری....."

"اب میں کچھ کہوں گی تو آپ کہیں گی کہ بدتمیزی کرتی ہے مگر وہ بات جو اندر جا کر میرے پیٹ میں درد کرتی ہے اس کا جواب دیے بنا بھی چارہ نہیں....." اس نے تیل کی بوتل کھول کر تھوڑا سا تیل ان کے بالوں میں ڈالا اور مساج کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اب یہی دیکھ لیں کہ دو سال پہلے جب میں نے بی ایس میں ایڈمیشن لیا تو خرچے کے حوالے سے سب نے ہری جھنڈی دکھا دی..... حالانکہ ہزار بار سب کو بتایا کہ اس تعلیم کا خرچا مجھے ملنے والے تعلیمی وظیفے سے پورا ہوگا..... پھر مسئلہ آیا سواری کا کہ انعم کا کالج ایک کونے پر، میرا دوسرے تو کون لائے لے جائے بس جی پھر فتویٰ لگ گیا کہ بس گھر بیٹھے صفا..... تب میری امی کے خون پسینے کی کمائی سے ہی میں نے ضد کر کے یہ سائیکل لی جسے آپ ابھی خونخوار نظروں سے گھور رہی تھیں۔ دکھ سکھ بھی انسانی زندگی کا حصہ ہیں، کتنی بار امی یا میری بیماری کی صورت میں ہمیں تائی اور چچی یا آپ کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا تو یہ ہنر ہی ہے امی کا جو آپ کو سخت ناپسند ہے حالانکہ اس سے سب سے زیادہ ماضی میں آپ اور اب حال میں تائی اور چچی مستفید ہوتی ہیں۔"

"سن رہی ہیں ناں.....؟"

مگر صفا کا موڈ خراب ہو گیا جب اس نے باقاعدہ چہرہ آگے کر کے دادی کے چہرے کا جائزہ لیا یہ سوچ کر کہ کیا آج سورج مغرب سے نکلا تھا جو دادی نے اس کی بات کاٹ کر بری بھلی نہ سنائیں، مگر وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں۔

"صف..... صف....."

'صفا! اتنے آسان نام کا حشر خراب کر دیتے ہو۔ اگر جو مشکل نام ہوتا تو پورا سال لگا دینا تھا اس کو پکارنے میں جیسے مستنصر حسین تارڑ..... جیسے سبکتگین مرزا....." بلال کی آواز سن کر وہ بیزاری سے بولی۔

"میرا نام یا کوئی بات کیے بغیر اشارے سے بتاؤ کہ میرا کام ہو گیا یا نہیں، باقی رقم کتنی ہے اور کہاں ہے.....؟ وہ اس کی طرف مڑی۔

"وہ..... وہ....." اسے گھورتے دیکھ کر وہ چپ ہو گیا اور کھسیاتے ہوئے جیبیں ٹٹول کر اس میں سے پچیس سو برآمد کیے اور اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔

صفا نے پرسوچ نظروں سے اپنے ہاتھوں میں پکڑی رقم کو دیکھا اور اس میں پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ لو تم میری مشکل میں کام آئے۔ اتنی دور مارکیٹ گئے تو کرایہ وغیرہ تو لگا ہوگا ناں..... میں اس گھر کے لوگوں جیسی ہرگز نہیں ہوں کہ انسان کی کمزوریوں اور مجبوریوں کو خرید کر اسے عمر بھر کے لیے غلام بنا لوں اور جواب میں شکریہ تو ایک طرف، اس کی مزدوری اور محنت کا حق بھی نہ دوں....."

"نہیں نہیں صفا! یہ رکھو اپنے پاس..... میں نے اس وجہ سے تو تمہارا کام نہیں کیا۔ بلکہ اس لیے کیا کہ مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہوئی۔"

"ارے تم تو بالکل ٹھیک بول رہے ہو..... یہ آ..... آ..... آ کی رٹ لگا کر ہمارا ٹائم ویسٹ کرتے ہو، مذاق اڑاتے ہو ہمارا..... تمہیں شرم نہیں آتی....., ورنہ پہلے تو صحیح بولتے تھے تم..... اب ایسا کیا ہو گیا ایک منٹ کی بات کو چھ ماہ تک کھینچتے ہو..... اس گھر کے مکین اس قابل ہیں کہ انہیں ایسی اذیت دی جائے مگر مجھے آئندہ ان میں شامل مت کرنا اور خبردار جو آئندہ میرے ساتھ ایسے بات کی تو....." خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ جھاڑا..... بلال ایک بار پھر اسی نفسیاتی دباؤ میں آ گیا جس کے تحت اس کے منہ سے بات پوری نکلتی ہی نہ تھی، اپنے سوا اس گھر کا ہر انسان اسے خود سے برتر لگتا..... وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

"اے صفا! ہاتھ کیوں روک لیا.....؟ بیٹھی رہ دو منٹ، سکون مل رہا ہے....." دادی نیم غنودہ آواز میں میں بڑبڑائیں۔

"بس دادی! اب اپنی دوسری پوتی کو بلا لیجیے اپنی خدمت کے لیے۔ میں نے ابھی اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے....." اس نے اطمینان سے کہا اور تخت کے نیچے گھس کر چپل نکالی اور پاؤں میں اڑس کر اپنی سائیکل کی جانب بڑھی۔ بلال نے ایک حسرت اور رشک کے ساتھ اس کے بے نیازانہ انداز کو دیکھا۔

"وہ صف..... صفا.....؟" اس بار خود کو گھورتے دیکھ کر اس نے اس کے نام کے صرف دو ہی ٹکڑے کیے تھے۔

"تم اتنی بہادر کیسے ہو؟ جج..... جج جو بھی بات دل میں ہو آرام سے کر لیتی ہو..... تم..... تم تمہیں ڈر نہیں لگتا کسی سے.....؟ اس کی بات پر وہ حیرت سے اس کی طرف مڑی۔

"کیسے بات کرتی ہوں.....؟ بھئی زبان سے اور کیسے..... اور ڈر کس بات کا..... یہ کوئی خونخوار درندے ہیں جن سے ڈرا جائے..... میں تو صرف اللہ سے ڈرتی ہوں بس؟ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ جو اللہ کا ڈر دل میں رکھے اس کو پھر اور کسی سے ڈر نہیں لگتا.....

تمہارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے.....؟ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"میرے اور تمہارے حالات ملتے جلتے ہیں مگر زندگی کے ابتدائی سالوں میں مجھے میرے ابا نے بہت پیار، اعتماد اور محبت دی، حق اور سچ کے لیے بولنا سکھایا..... اب ان کے گزر جانے کے بعد ان کی تربیت میری زادِ راہ ہے..... تمہارے ابا، اماں بچپن میں گزر گئے تو لوگوں کے دبانے سے تم دب گئے، کمزور پڑ گئے، خوف زدہ ہو گئے..... اور اپنی اچھی بھلی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا..... سوچو کس بات کی کمی ہے تم میں..... شکل صورت میں لاکھوں میں ایک، تعلیم بھی ہے..... کس بات سے ڈرتے ہو تم.....؟ یہ گھر تمہاری ماں کا بھی ہے، حق ہے تمہارا اس پر.....

سارا دن نوکروں کی طرح ان لوگوں کے کام کرتے کرتے تم نے خود کو نوکروں سے بھی بدتر تصور کر لیا۔ ارے مرد ہو تو مرد بنو بھی..... مجھے دیکھا ہے چار سال سے اس گھر سے بے دخل کرنے کی دھمکیاں مل رہی ہیں تائی اور چاچی کی طرف سے، مجال ہے جو عمل کرنے کا بھی سوچ لیں، اس گھر کو ہی آگ نہ لگا دوں گی میں..... میری تعلیم میں رکاوٹ بننے کی ہر ممکن کوشش کی سب نے مگر میں نے ہار نہیں مانی، اب تم دیکھنا میں اپنے کیریئر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھوں گی جلد ہی اور اپنے

اللہ کی مدد کے ساتھ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ان رکاوٹوں پر پاؤں رکھ کر اوپر سے اوپر چڑھتی جاؤں گی ..... ابھی بھی وقت ہے..... نکل جاؤ ان کے چنگل سے ..... ورنہ بہت ظالم لوگ ہیں یہ..... عمر بھر کی غلامی کے بعد آخر میں غلام بھی نہیں مانیں گے تمہیں..... ابھی مجھے ذرا جلدی ہے..... فارغ ہو کر پھر بات کروں گی تم سے۔"

"اے صفا! بیڑہ غرق تیرا کم بخت..... خود تو بے حیائی اور خودسری کے سارے ریکارڈ توڑ دیے..... اب اس معصوم بچے کو بھی ورغلا رہی ہے بے غیرت.....؟ دادی کی چپل اس کی کمر کو سینک گئی۔

"اس چوٹ نے میرا حوصلہ اور بلند کر دیا..... اور اگر جو تم ہوتے تو تم نے خوف سے دو دن کمرے سے ہی نہیں نکلنا تھا کہ اونچی آواز سے ہی تمہاری گھگھی بندھ جاتی ہے مگر یہ مشکلات اور لوگوں کے رویے تم جیسے لوگوں کو کمزور اور میرے جیسے لوگوں کو مضبوط کر دیتے ہیں....." اسے مسمرائز کر کے وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

"اے بلال! بت کیوں بن گیا ہے..... جا کوئی کام دھندہ پیٹ لے، اس لڑکی کے کہنے میں آ کر مت اپنی زندگی خراب کر میرا بچہ! تیری بڑی اور چھوٹی مامی کو پتا چل گیا ناں..... بہت ناراض ہوں گی....." دادی پچکارتے ہوئے بولیں۔

"تم یہاں مرے ہوئے ہو اور میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں..... کام چور ہے اس گھر کا ہر فرد..... ذرا سی نظر چوکی نہیں اور اپنا کام دکھایا نہیں اگلے بندے نے..... دوپٹے پیکو کرا کے لانے کو کہا تھا دو گھنٹے پہلے....." بڑی مامی اچانک ہی وارد ہوئی تھیں۔

وہ..... وہ..... مامی!"

"بس بس ان بہانے بازیوں کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ جلدی جاؤ..... وہ اس کی بات سنے بغیر جا چکی تھیں۔

☆☆☆

"کیا کرنے کا ارادہ ہے صفا تمہارا..... اس شرٹ کو ملا کے بارہ شرٹس تم سلوا چکی ہو مجھ سے، پہنے ہوئے تمہیں ایک بھی نہیں دیکھا۔" وہ اس کے دیے گئے ڈیزائن کو بغور دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

"کچھ نہیں بس ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتی آپ کو..... مجھے صرف اس کی کٹنگ کر کے دیں اور چنٹ کا بتا دیجیے گا کہ کیسے صفائی سے بنے گی کیونکہ ابھی تک باوجود کوشش کے آپ کے جیسی نہیں بنتی مجھ سے، بس یہ آخری شرٹ ہے..... اس کے بعد وعدہ کہ تنگ نہیں کروں گی آپ کو....." اس نے بڑھیا لان ایک خوب صورت پھولدار کپڑا اور مطلوبہ سامان ان کے سامنے لا کر رکھا۔

"پاگل ہو تم بھی صفا! تمہارا کام کرتے ہوئے میں نہیں تھکتی..... تم بس سلوائے ہی جا رہی ہو کپڑے، پہنا ایک بھی نہیں، جب کہ تم کپڑوں کی اتنی شوقین بھی نہیں ہو..... پھر تمہارے پاس روپے بھی نہیں تھے جو ان بارہ تیرہ شرٹس کے لیے کپڑا لے آئی ہو تو اسی بات کی تشویش ہو رہی تھی مجھے....."

"ارے امی! جن لوگوں کی نیت صاف ہو ناں، اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ میرا ایمان ہے، چھوٹا سا ایک آئیڈیا ہے، بس اس پر کام شروع کیا ہے، دعا کریں کامیابی مل جائے..... باقی میری طرف سے کسی تشویش کا شکار نہ ہوں، صفا مراد علی آپ کے لیے فخر کا باعث تو بن سکتی ہے، شرمندگی کا نہیں....."

"مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت اچھی ہے، بہت لائق اور فرمانبردار....."

"مجھے پتا تھا تم یہیں چھپی بیٹھی ہو گی، کچھ تو خیال کیا کرو۔ ساجدہ..... وہاں مہمان چائے کے لیے سوکھ رہے ہیں اور یہاں ماں بیٹی میں اٹکھیلیاں چل رہی ہیں۔

چھوٹی چچی تیکھے تیوروں سے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"چائے اور پکوڑے بنا کر میں رانی کے حوالے کر آئی تھی بھابھی اور وہ میرے سامنے ٹرالی لے کر گئی تھی۔ مجھے عصر کی نماز پڑھنی تھی، وہ پڑھ کر تھوڑا سا ستانے بیٹھ گئی ہوں۔" وہ حسب معمول گھبرا گئی تھیں۔

"ہاں تو وہ دے گئی تھی رانی..... اس کے بعد میری ان اور بھابھی آ گئی ہیں۔ ان کا کہہ رہی ہوں....."

"آپ کی بہن اور بھابھی آپ کی مہمان اور ذمہ داری ہیں چچی جان! بہتر ہوتا آپ یہاں آ کر اپنا ٹائم ویسٹ کرنے کے بجائے کچن میں جا کر چائے بنا لیتیں تو اب تک آپ کا اور ہمارا دونوں کا وقت بچ جاتا۔"

"تم چپ کرو صفا! بھابھی آپ چلیں! میں ابھی آتی ہوں....." ساجدہ چپل پاؤں میں اڑستی ہوئی جھنجھلا کر بولیں ساتھ ہی صفا کو بھی ڈانٹ دیا۔

"اس کو بھی ذرا تمیز سکھا دو..... گز بھر لمبی زبان ہوئی ہے۔" جاتے جاتے وہ زہر اگلنا نہ بھولیں۔

"اب تو کبھی نہیں جانے دوں گی آپ کو، میں بھی دیکھتی ہوں کیا کر سکتی ہیں، سارا قصور آپ کی اسی بزدلی کا ہے۔ پہلے دن ہی ایک کی چار سنائی ہوتیں تو آج یہ سب نوکر نہ سمجھتے آپ کو، وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ان دوبارہ بٹھا کے ــــ ضدی انداز میں بولی تھی۔

"صفا! تم بچی ہو! ابھی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھتیں، جن کو میں سمجھ کر چپ ہوں۔ ایک دفعہ تمہاری شادی ہو جائے پھر میں ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں گی..... تم نہیں جانتیں کہ دولت نہ بھی ہو تب بھی ایک خاندان کا سہارا ایک بیوہ اور یتیم بچی کے لیے بہت بڑی دولت ہے....."

"ایک تو مجھے یہ مسکینوں والی باتیں سخت بری لگتی ہیں اور مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ کو بھی ناپسند ہوں گی..... خاندان بھلے جوتے کی نوک پر رکھے آپ کو، آپ چاپلوسی میں لگے رہو۔ ارے اللہ نے دماغ، آنکھیں ہاتھ پاؤں سب دیے ہیں۔ ان کو استعمال کر کے نئی راہیں، نئی منازل تلاش کرنے کے بجائے فضول کا ظلم و ستم برداشت کرتے رہو۔ ٹھیک ہے آپ بیوہ اور میں یتیم ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی زندگیوں کی ڈور دوسروں کے ہاتھ میں تھما دیں کہ آؤ بھئی اور جیسا سلوک کر لو..... ہم حاضر ہیں۔ جانا ہے تو خوشی سے جائیں، مگر مجھے یہ کاٹ کر دیتی جائیں میں سی لوں بیٹھ کر اس کو..... پتا نہیں کب میں آپ کو

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

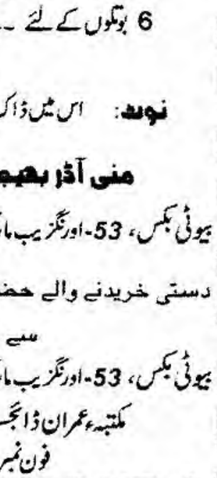

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

سمجھا پاؤں گی.....''

ساجدہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بیٹھیں جیسے تمہارا کوئی علاج نہیں صفا بی بی' ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے کہ صفا کی کسی بات سے انکار ان کے لیے ممکن نہیں تھا اور اس گھر کے لوگوں کا حکم بجالانا ان کے نزدیک وقت کا تقاضا تھا، جس کو صفا جیسی لا ابالی لڑکی کہاں سمجھ سکتی تھی، یہ ان کا خیال تھا۔ صفا ان سے ہرگز متفق نہ تھی۔

☆☆☆

''واؤ صفا! اتنا بہترین کام اور اتنی کم قیمت..... مجھے تو بھئی اپنی آنٹی کے بوتیک کا ایڈریس دو..... اور ان میں سے سات شرٹس تو میں نے لے لی ہیں..... باقی مسز خان نے لی ہیں..... یہ رہی سب کی پے منٹ.....'' میم کی بات پر صفا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا..... ایسے کامیابی کی امید تو تھی مگر اتنی شاندار کامیابی کی نہیں تھی..... امی سے سلوائی گئیں وہ بارہ تیرہ شرٹس اس نے استری کر کے ـــــ ایسے خوب صورت انداز میں پیک کی تھیں کہ وہ کسی برانڈڈ بوتیک کی شرٹس لگ رہی تھیں، ٹیچرز کی منظور نظر تو تھی ہی سو بڑے آرام سے ایک دو ٹیچرز کو بتایا تھا کہ اس کی آنٹی آن لائن شاپ کا آغاز کر رہی ہیں اور وہ ان کے گھر گئی تھی تو کچھ سیمپل اپنے ساتھ لے آئی تھی، اگر وہ دیکھ لیں تو..... پھر اس نے اپنا خرچ وغیرہ نکال کر ایک مناسب منافع کے ساتھ ہر شرٹ کی قیمت بتائی تو اسے اور اس کے کام کو ہاتھوں ہاتھ تو لیا ہی گیا۔ جلد ہی مزید تقاضا بھی ہونے لگا..... واپسی کا سفر اسے بے حد اچھا لگا تھا۔

''بھری جیب کے ساتھ دنیا کتنی حسین لگتی ہے، اسے آج پتا چلا تھا..... کالونی میں پہنچ کر اس نے سائیکل ایک سائیڈ پر روکی اور پھولوں بھری بیل کا ایک سرا زور سے ہلایا، کتنے ہی پھول اس پر گر کر اسے مسکرانے پر مجبور کر گئے۔

''واہ بھئی واہ! آج تو صفا بڑی خوش لگ رہی ہے.....؟ کیا بات ہے صفا رانی! ہمیں اپنی خوشی میں شریک نہیں کرو گی.....؟''

حامد بھیا کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''جی ہاں! بہت خوش ہوں اور اپنی خوشی صرف اپنوں سے شیئر کرنا پسند کرتی ہوں.....'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا اور سائیکل کو چلا کر گھر کی طرف لے جانے لگی کہ تین گھر چھوڑ کر تو اپنا گھر تھا۔ تائی کا یہ بھائی اسے زہر لگتا تھا جو نہ جانے کب ـــ اس گھر کا حصہ بنا تھا اور نہ جانے کیوں بنا تھا؟ اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی..... گزشتہ سال سے ہی اس کو اس کی بدلتی نظروں کا احساس ہوا تھا، تب سے اس کا لہجہ اس کے ساتھ بہت ہی تلخ ہو چلا تھا۔ بیوی مرے تین سال ہونے کو آئے تھے آج کل تائی ایک بار پھر اس کے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

گھر آنے پر اس نے ـــــ ماں کو ڈھونڈا اسے کچن میں ملی تو تھیں پرتائی اور چچی کے نرغے میں، آج شاید انعم کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے تب ہی پورے گھر پر ایمرجنسی نافذ تھی۔

''آجاؤ صفا! یہیں آجاؤ! تمہیں کھانا نکال دوں.....'' اسے اندر جھانکتے دیکھ کر ان کی مامتا بے قرار ہو گئی کہ وہ صبح ناشتے کے بغیر نکلی تھی۔

''اسے بھی اب گھر داری میں لگاؤ ساجدہ! سارا دن لونڈوں کی طرح گلی محلوں میں سائیکل دوڑائے پھرتی ہے، کل کو شادی ہونی ہے اس کی، اگلے گھر جا کر یہ لمبی زبان اور سائیکل سواری کام نہیں آنی..... گن اور گھر گرہستی کام آتی ہے.....''

''آپ بے فکر رہیں چچی! آپ کی بیٹی اپنے پھوہڑ پن اور بد سلیقگی کے ساتھ سسرال میں چل جائے گی تو مجھے تو پھر بھی ہر کام کی شدید ہے بے فکر رہیں آپ کے در پر نہیں آؤں گی مدد مانگنے اور ابھی تو میں نے بہت سے کام کرنے ہیں اپنے کیریئر کے حوالے سے، آپ اس سائیکل کی فکر میں گھلنا چھوڑ دیں کیونکہ اگلے ایک دو ماہ بعد میں بائیک لینا چاہ رہی ہوں، کیونکہ میرے آپ کی طرح حامد بھائی اور بلال جیسے نوکر نہیں ہیں حکم بجالانے کو..... اپنا سب کچھ میں

نے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہے.....''

''استغفر اللہ! اب یہی کسر رہ گئی تھی خاندان کی ناک کٹوانے کو..... میں تو آج ہی شاہد کو فون کر کے بتاتی ہوں کہ لڑکی کیسے ہاتھوں سے نکل گئی ہے..... بھئی نام تو خاندان کا ہی بدنام ہوتا ہے۔'' بڑی تائی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''چھوڑیں بھابھی! یہ تو پاگل ہے، ایسے ہی جو دماغ میں آتا ہے بول دیتی ہے، میں سمجھاؤں گی صفا کو.....'' ساجدہ نے گھبرا کر جٹھانی کو روکا..... پتا تھا ایک کی چار کر کے دبئی فون کھڑکا کے بتائیں گی۔

''رہنے دو ساجدہ! تم نے سمجھایا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آئی ہوتی کہ چھٹانک بھر کی لڑکی نے سارے گھر کی ناک میں دم کر رکھا ہے..... اس کو نکیل ڈالنا بہت ضروری ہے اس سے پہلے کہ اس کے کارنامے خاندان بھر کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑیں.....'' چھوٹی چچی کو بیٹی والا پھوہڑ پنے کا طعنہ بہت چبھا تھا، سو اب کی بار وہ میدان میں آئیں۔

''صرف آپ کی وجہ سے میں اس وقت کوئی جواب نہیں دے رہی۔ مگر کوئی بھی کسی بھول میں نہ رہے کہ صفا مراد علی کو کوئی ایرا غیرا اٹھ کر کچھ کہہ دے گا اور وہ چپ رہے گی.....'' اس نے کمال اطمینان سے بریانی کا آخری چمچ منہ میں ڈالا اور پریشان کھڑی ماں کو مخاطب کر کے باقی دو کو تلملاتا وہیں چھوڑ آئی تھی۔

''ساری خوشی غارت کر دی تم بختوں نے.....''

بڑبڑاتی ہوئی جس پل وہ بلال کے کمرے کے سامنے سے گزری تھی۔ کچھ عجیب تھا جس نے اسے ٹھٹک کر رکنے پر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ صفا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا جب اس نے بلال کو سسکیاں لے کر روتے دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ترنت اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا تھا، مگر اس وقت جو بوکھلاہٹ تھی اس کے چہرے پر اس نے صفا کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''تم..... رو رہے ہو..... مرد ہو کر رو رہے ہو.....؟ او مائی گاڈ موجودہ صدی کا سب سے بڑا لطیفہ کہ ایک مرد بزدلوں کی طرح کمرے میں منہ چھپا کر رو رہا ہے اور مجھے یقین ہے اس کے پیچھے جو وجہ ہو گی وہ اس سے بھی بڑا لطیفہ ہو گی تو اب شروع ہو جاؤ بتانا اور آج اس شرط سے تھوڑی دیر کے لیے آزاد کرتی ہوں کہ اگر میرے سامنے بولنا تو ٹھیک طرح سے بولنا ورنہ ایک فٹ کی بات دس میٹر تک پھیلا کر مجھے بور مت کرنا.....''

پھر بلال نے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ انعم کے کپڑے جو اس نے آج مہمانوں کی آمد پر پہننے تھے استری کرتے ہوئے جل گئے..... اس نے جواب میں خوب غصہ کیا اور اس کے منہ پر تھپڑ بھی لگایا، جیسے جیسے وہ بتاتا جا رہا تھا، غصے سے صفا کے نتھنے پھول گئے.....

''اور اگر میں نے مزید تمہاری بات سنی تو انعم نے تمہیں ایک تھپڑ لگایا، میں چار پانچ سے کم پر بس نہیں کروں گی.....'' اس کی آدھی بات سن کر وہ بات کاٹ کر غصے میں ٹہلنے لگی۔

''اور میں تو کہتی ہوں ابھی بھی کم لگائے تمہیں، باندھ کے مارنا چاہیے تھا تم جیسے بزدل کو.....''

خونخوار لہجے میں کہتی وہ اس کی طرف گھومی۔

''کیوں مر رہے ہو ادھر؟ صرف دو وقت کی روٹی کے لیے، جو تم اگر خود کو مرد سمجھو اور خود کماؤ تو اس سے کہیں بہتر کھا سکتے ہو..... میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ یا تو یہاں سے چلے جاؤ اور جا کر کہیں عزت کی زندگی گزارو..... گالیاں، کوسنے، مار اور ذلت کی زندگی ہی چاہتے ہو تو خود کو بھی احساسات سے عاری انسان تصور کرو اور ضمیر سے بھی ہو نہہ..... میں تو ہمدردی میں چلی آئی کہ ہو سکتا ہے کوئی مسئلہ ہو بیماری یا کسی چوٹ کی صورت میں، تم جیسے انسان سے تو میں ہمدردی بھی گناہ سمجھتی ہوں جس میں عزت نفس نام کو بھی نہ ہو..... انعم نے مارا۔'' وہ غصے سے کہہ کر، اس کی نقل اتارتی ہوئی وہاں سے جا چکی تھی۔ بلال کو ایک بار پھر اپنی قسمت اور زندگی پر روتا چھوڑ کر۔

☆☆☆

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو صفا.....؟''

''جی امی سو فیصد سچ کیونکہ آپ بھی جانتی ہیں صفا مراد علی کبھی جھوٹ نہیں بولتی، اب کل سنڈے آپ میرے ساتھ مارکیٹ چل رہی ہیں..... میں آپ کو نیٹ سے کچھ ڈیزائن دکھا دیتی ہوں۔ آسان والے میں خود سی لوں گی باقی آپ کو سینے ہیں اور اس بار صرف شرٹس کا نہیں بلکہ فل سوٹس کا پیکج تیار کر کے دینا ہے پندرہ دن کے اندر اندر، کم از کم پندرہ ہی سوٹ تیار ہو جائیں تو بھی بڑی بات ہے اس کے بعد میں واقعی میں ہی اپنی آن لائن شاپ کا آغاز کرنے والی ہوں، جیسے ہی امتحان سے فری ہوتی ہوں۔ مگر اس کے لیے مجھے آپ کی فل سپورٹ اور فل ہیلپ چاہیے ہوگی.....

مطلب اتنا ہی کام کریں گی آپ جتنا آپ کی صحت اور وقت اجازت دے سکے..... ان خواتین کو بھنک بھی پڑ گئی اس کام کی تو انہوں نے آپ کو اور مصروف کر دینا ہے، یہی دیکھ لیں، جب تک انعم کالج جاتی رہی میرا کالج جانا بھی برداشت رہا ان کو، جیسے ہی وہ شان دار طریقے سے فیل ہو کر گھر بیٹھی، میرا جانا کھٹکنے لگا..... دادی سے لے کر تائی، چچی اور پھر چچا اور تایا سے کہہ کر میری تعلیم میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی..... اب کہاں برداشت کریں گے کہ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی غریب بیوہ اور یتیم لڑکی اپنے بل بوتے پر جینے کی جرأت کیسے کر رہی ہیں.....؟ ساجدہ اس کی جذباتی سی تقریر پر مسکرا دی تھیں۔

''اچھا دادی اماں! تمہارا سارا کام کر دوں گی مگر مجھے نہ تو اس گھر کی خدمت سے روکو نہ ہی ان لوگوں سے قطع تعلقی پر مجبور کرو..... یہ گھر اور اس کے مکین جو کچھ بھی کریں پھر بھی ان کے احسانات زیادہ ہیں اس خدمت کے عوض جو میں ان کی کر رہی ہوں۔

اور سب سے اہم بات یہ بائیک لینے کا بھی پروگرام ختم کر دو۔ اچھا نہیں لگتا اس طرح لڑکیوں کا بائیک چلا کر جانا، بھلے کالج ہی کیوں نہ ہو.....''

''دنیا میں لڑکیاں جہاز تک اڑا رہی ہیں اور یہاں ایک بائیک کا رولا ڈال دیا ہے..... کتنی لڑکیاں ہمارے کالج میں گاڑیاں، بائیکس خود چلا کر آتی ہیں.....'' وہ بھڑکی۔

''ان کے سر پر باپ یا بھائی جیسی مضبوط ڈھال ہوتی ہوگی صفا اور بدقسمتی سے تم ان دونوں عظیم نعمتوں سے محروم ہو.....'' وہ آہستہ سے بولی تھیں۔ صفا نے طویل سانس لی۔

''واہ امی! ایک ہی پل میں آپ نے شیخ چلی کے سر سے انڈوں کی ٹوکری گرا کر اسے خوابوں کی دنیا سے نکال لیا، میں نے سوچا تھا کہ آپ یہ سب چھوڑ کر صرف یہی کام کریں گی، آرڈر پر آرڈر ملیں گے، میں پوسٹ آفس جا کر ایگریمنٹ کر لوں گی آن لائن ڈلیوری کا۔ دنوں ہی میں ہم ایک بہترین قسم کی شاپ ارینج کر لیں گے..... اس کے بعد میں خواتین ورکرز تلاش کروں گی، آپ صرف سپرویژن کرنا اور میں.....''

''ضرور کرنا صفا! میں تمہیں اس پروگرام کو ختم کرنے کا نہیں کہہ رہی بلکہ ابھی کچھ دن اس کو چھوٹے پیمانے پر چلانے کو کہہ رہی ہوں، جیسے ابھی صرف تمہارے کالج والے پھر کچھ دن تک جب تم فائنل امتحان دے دو گی تو مل بیٹھ کر اس کو سوچیں گے..... مگر تم سے التجا ہے میری کہ تم کسی سے بھی کسی بات پر مت الجھا کرو..... میں ہوں ناں سب دیکھنے کے لیے.....'' انہوں نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

''یہ میرے بس میں نہیں ہے امی! آپ جانتی ہیں، مجھ سے غلط بات برداشت نہیں ہوتی، اب آپ صبح بازار جانے کا بھی سوچ لیں میرے ساتھ..... اور سو جائیں سنڈے کی صبح تو خصوصی ناشتا تین گھنٹے لے جائے گا آپ کے.....'' وہ تکیہ برابر کرتے لیٹتی ہوئی بولی تو ساجدہ نے بھی سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

''میں سچ کہہ رہی ہوں اماں! اس لڑکی کو قابو میں کرنے کا یہی ایک ہی طریقہ ہے پھر کیا کمی ہے حامد میں، سوائے ایک عمر کے، اور مرد کی عمر کون دیکھتا ہے، ایسی لڑکی جس میں سوائے شکل کے اور کوئی گن نہیں، اپنی گز بھر زبان کے ساتھ کون اس کے ساتھ

گزارا کر سکتا ہے۔

''اماں! بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں..... ساجدہ کو تسلی بھی رہے گی کہ بیٹی آنکھوں کے سامنے ہے پھر حامد جیسے مرد بہت لاڈ سے رکھتے ہیں اپنی بیویوں کو جن کو کم عمر بیوی مل جائے..... بھابھی کو بھی دوسرا ہٹ ہو جائے گی صفا کے ہونے سے، اچھا کماتا ہے حامد..... بس ساجدہ سے بات کر کے ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے.....'' دونوں نے دادی جان کو گھیر گھار کر ایک اور ہی سمت میں لگا لیا تھا۔

☆☆☆

''مم..... مم..... مجھے ایک نوکری مل گئی ہے..... آ..... آپ کسی اور کو کہہ دیں اس کام کے لیے..... مجھے نو بجے نکلنا ہے.....'' اس کی بات پر جہاں صفا کا چائے کے لیے بڑھتا ہاتھ رکا تھا وہیں انعم پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔

''تم..... تم نوکری کرو گے بلال..... اوگاڈ، کیسے کیسے مزاحیہ پروگرام چلتے ہیں ہمارے گھر میں..... تمہارے پاس ہے ہی کیا جو کسی نے تمہیں نوکری دے دی..... مر مر کے تم نے غیر اہم سے سبجیکٹس میں بی اے کیا۔ انگلش چار سال بعد کلیئر ہوئی تمہاری..... دو لوگوں کو دیکھ کر تمہاری ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں..... چہرے پر ہمہ وقت طاری رہنے والی مسکینیت نے اس شکل کو عجیب سا ہوتق بنا دیا ہے..... میں تو بھئی اس شخص سے ملنا چاہوں گی جس نے تمہیں نوکری دے کر اپنا بیڑہ غرق کر لیا۔''

''اے جاؤ میاں! صبح صبح نہ جانے کیا اول فول بک رہے ہو..... جا کر یہ سارا راشن لے کر آؤ..... اور واپس آ کر مستری مزدوروں کی نگرانی کرو..... حامد کے پورشن کے لیے الگ سے واش رومز بنوا رہے ہیں..... وہ سامان بھی لینا ہے.....''

تائی نے اس کی بات کو چنداں اہمیت نہ دی تھی گویا اس کی بات واقعی ان کے نزدیک ایک مذاق ہی تھی۔

''اگر یہ سچ ہے تو مجھے تو بہت خوش ہو رہی ہے بلال..... کیسی جاب ہے؟ اور انعم! جب تک انسان اپنی صلاحیتوں کو جانچ کر استعمال میں نہ لائے، کیسے پتا چل سکتا ہے کہ وہ کس قابل ہے، تعلیمی قابلیت تو تمہاری بھی ماشاء اللہ سے ایسی ہی تھی، بلال نے پھر بھی اتنی مشکل زندگی کے باوجود بی اے کر لیا، بڑی بات ہے، تم سے تو چار سال میں بھی ایف اے کی انگلش نہ پاس ہو سکی تھی.....'' بلال جو تائی اور انعم کے ایسے ردعمل کے بعد ایک بار پھر اسی پرانے نفسیاتی دباؤ میں آ کر کچھ بول نہیں پا رہا تھا بس حلق میں نمکین پانی کا اٹکنا محسوس کر رہا تھا، کو جیسے ایک کمک ملی تھی۔

''اے..... ایک میڈیکل اسٹور پر ڈرائیور کی ڈیلوری کا کام ہے..... صبح صبح نو بجے سے پانچ بجے تک..... مختلف کمپنیوں سے دوائیاں لا کر اسٹور پر دینی ہیں..... اے..... ایک دن میں چار چکر ہوں گے ٹوٹل اسی شہر..... شہر میں ہیں کمپنیاں..... اے..... ایک دن کا ٹرائل دیا تھا..... اچھا..... اچھا لگا مجھے کام اور ان کو میرا کام.....''

''ویری گڈ..... بہت اچھی بات ہے بلال، بہت ہی اچھی بات۔''

''تم تو بی بی! چپ ہی رہو! خود تو خودسری اور بے حیائی کے سارے سبق پڑھ رکھے ہیں اب اس کو بھی اپنی راہ پر مت لگاؤ..... بلال بچے! تیرے دونوں ماموں باہر رہتے ہیں۔ گھر کے ہزاروں کام..... اکیلی عورتیں ہیں، مرد ملازم بھی نہیں رکھ سکتے میری جان! تیری کون سی ضروریات ہیں جو تجھے یہ ٹکے ٹکے کی نوکری کی ضرورت پڑ گئی..... روٹی، کپڑا، خرچ سب مل جاتا ہے ٹائم، پر بس چھوڑ یہ نوکری وکری کا چکر اور ویسے ہی چلنے دو جیسے چل رہا ہے.....''

دادی نے صفا کو لتاڑ کر بلال کو مخاطب کیا۔

''اچھا بھئی! میں تو چلتی ہوں..... آج بڑا ضروری ٹیسٹ ہے میرا..... امی دعا کیجیے گا اور دادی پہلے بھی کہا تھا آج بھی کہتی ہوں کہ بعض لوگوں کی عبادتیں اور ریاضتیں سب بے کار ہو جاتی ہیں، اگر جو ایک دکھی دل سے بھی بددعا نکل جائے اور ایک بھی بندے کا حق ذمہ رہ جائے تو....., اگر دبئی سے درہم

بھیجنے والے آپ کے بیٹے ہیں تو میں اور بلال بھی آپ کی اولاد کی ہی اولاد ہیں..... اور ہر رشتہ اور ہر حق جو ہمارے ذمہ ہے اس کی جواب دہی ہوگی روز آخرت..... اور تم بلال مت بھولنا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے.....''

کہہ کر وہ رکی نہیں تھی، ٹیبل سے بیگ اٹھا کر جھٹکے سے کندھوں پر ڈال کر باہر چل دی تھی۔

''بس اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتی اس لڑکی کی زبان درازی..... سن لو ساجدہ! میں نے شادی طے کر دی ہے تمہاری لاڈلی کی حامد میاں کے ساتھ دو ماہ بعد شادی بھی کر دوں گی..... غضب خدا کا..... ڈھیل پر ڈھیل ہے تو یہ دن دکھایا ہے کہ وہ اب بڑے چھوٹے کا لحاظ کیے بغیر منہ کو آنے لگی ہے.....'' دادی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں، جبکہ ساجدہ زرد چہرے کے ساتھ بس ساس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے اپنی بیٹی سے منوانا ہے، کیسے منوانا ہے یہ تمہیں پتا ہونا چاہیے اور اگر کسی کو بھی اس رشتے پر اعتراض ہوا تو ہم سے اور اس گھر سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم۔'' بلال ہونق پن سے کبھی ساجدہ کی حالت کو دیکھتا تو کبھی باقی خواتین کے چہرے پر نظر آتی سرشاری کو۔

☆☆☆

''نن..... نانی! میں اس گھر کے کاموں سے نہیں کترا رہا..... ھ..... ھ..... ہر حکم بجالاؤں گا..... مگر مجھے اجازت دے دیں نوکری کی..... تو..... تو..... یقین کریں اگر مجھے اچھا نہ لگا تو میں چھوڑ دوں گا..... مگر آپ مجھ سے ناراض مت ہوں۔'' وہ نانی کے پاؤں دباتے ہوئے لجاجت سے کہہ رہا تھا..... پتا تھا کہ اگر وہ وہاں کہہ دیں گی تو بڑی مامی اور چھوٹی مامی کی جرأت نہیں کہ وہ اسے کچھ کہہ سکیں۔

''اچھا اچھا..... جاؤ تم بھی شوق پورا کرلو..... زمانے کے دھکے کھا کر ہوش ٹھکانے نہ آ گئے تو پھر کہنا..... مگر یاد رکھنا کہ مجھے شکایت کا موقع نہ ملے، ہم تو بھیا تمہارے ہی فائدے کو کہہ رہے تھے کہ باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے خون تک چوس لیتی ہے انسان کا، تب جا کر کہیں چار پیسے ہاتھ آتے ہیں..... گھر کی ذمہ داریوں اور نوکری کے تقاضوں کو پورا کرتے کرتے گھن چکر نہ بن جاؤ تو پھر کہنا..... کر کے دیکھ لو..... تم بھی کر کے دیکھ لو.....''

وہ تیسری بار ان سے اجازت لینے آیا تو بادل نخواستہ انہیں اسے اجازت دینا ہی پڑی تھی۔

☆☆☆

''دادی نے کہا اور چپ کر کے آ گئیں..... اتنی سستی نہیں ہے صفا مراد علی کہ اس کا ہاتھ کسی بھی ایرے غیرے کے ہاتھ میں تھما دیا جائے اور وہ چپ رہے۔ ارے یہ حامد دنیا کا آخری مرد رہ جائے تب بھی صفا کو قبول نہیں ہے..... آپ کی بزدلی نے یہ دن دکھایا ہے امی..... ان سے تو میں خود پوچھتی ہوں ناں کہ کس نے حق دیا ہے میری زندگی کا فیصلہ کرنے کا.....''

''صفا رکو..... رکو میری بات سنو.....''

مگر غصے سے لال بھبوکا چہرہ لیے وہ دادی کے کمرۂ خاص میں آئی جہاں وہ اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ نہ جانے کس خاندانی بحث میں الجھی تھیں..... انعم بھی وہیں بیٹھی اپنے موبائل فون سے کھیل رہی تھی۔

''آپ اپنی اس لاڈلی پوتی کے لیے حامد جیسے شخص کا رشتہ قبول کر لیتیں..... دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں.....''

''تمہارے منہ میں خاک صفا! میری بیٹی کے لیے کیوں ایسا رشتہ قبول کرنے لگے ہم لوگ..... پتا نہیں کیوں ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔''

چھوٹی چچی غرا کر بولی تھیں..... تائی کا چہرہ بھائی کی تعریف پر سیاہ پڑ گیا۔

''بڑی ہوں اس گھر کی..... حق رکھتی ہوں اس گھر کے ہر فرد کے بارے میں فیصلہ کرنے کا.....'' دادی نے غرور سے کہا۔

''کر کے دکھا دیتیں پھر انعم بی بی کا بھی ایسا رشتہ

ہیرا میرے لیے ڈھونڈا ہے..... خدا کا خوف ا ں..... خوف..... میں بھی کسی کی بیٹی ہوں، مجھے آپ کا فیصلہ کسی بھی صورت قبول نہیں ہے۔''

''چپ کرو صفا! میں کرتی ہوں ناں بات.....''

ساجدہ نے آ کر بپھری ہوئی صفا کو بازو سے پکڑا تھا۔

''کر چکیں آپ بات اور دیکھ لیا میں نے.....''

اس نے ان کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔

''بس تو پھر بوریا بستر باندھو اپنا اور چلتی بنو اپنے عیال..... جنہوں نے آج تک تمہاری ماں تک کی خبر نہیں لی جوان کا خون تھی۔ اس نے کیا ہی ایسا کام تھا..... کیا وہ تمہیں منہ لگائیں گے۔ اس گھر نے تمہیں عزت، چھت اور ضرورت کی ہر آسائش دی۔ اس کا صلہ تم اس بدزبانی کی صورت دے رہی ہو..... میں دیکھتی ہوں کتنے دن تمہیں بٹھا کر کھلاتے ہیں.....''

''میری ماں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر ان کو یا مجھے شرمندگی ہو، صرف اپنی پسند کو اپنایا تھا جس کا حق ان کو ان کا مذہب دیتا ہے اور یہی کام آپ کی دونوں بہوؤں نے بھی کیا تھا، مگر وہ دونوں معتبر ٹھہریں کہ آپ کے سگے بیٹوں کی بیویاں تھیں، سونے پر سہاگا ایک آپ کی بھانجی تھی، ایک بھتیجی، میرے ابا بے چارے ایک تو سوتیلے، اوپر سے پسندیدہ عورت لا کر مجرم ہی ٹھہرے آپ کی نظر میں عمر بھر کے لیے اور امی ان سے بڑھ کر.....''

ساجدہ بیگم وہیں سر ہاتھوں میں پکڑ کر قالین پر بیٹھ گئی تھیں۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی دادی! یہیں رہوں گی اپنی ماں کے ساتھ، اپنے ابا والے پورشن میں..... آپ نے زیادہ زبردستی کی تو بقول آپ کے میں تو ہوں ہی بے حیا، زبان دراز، خودسر تو خودسروں کو جب زیادہ ستایا جائے ناں پھر وہ اپنی وہ خود سری دکھاتے ہیں کہ زمانہ دیکھتا ہے، میں پڑھی لکھی ہوں، باشعور اور سمجھ دار..... مجھے اپنا حق لینا بھی آتا ہے اور منوانا بھی.....''

''اٹھیے امی! یہ خودغرض لوگ! ان کو آپ خون بھی پلا دیں گی، تب بھی فیض نہیں ملنے والا..... چلیں چلتے ہیں.....'' اور زندگی میں پہلی بار رشتوں کی بے حسی نے صفا کی آنکھوں میں بھی مرچیں بھر دی تھیں۔

☆☆☆

''بہت غلط ہوا صفا! جو بھی ہوا، تمہیں اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی.....''

''انہیں بھی اس طرح کا کام نہیں کرنا چاہیے تھا.....'' امی کی نسبت وہ مطمئن تھی۔

''وہ خاموش نہیں بیٹھیں گی، ہمیں ضرور گھر بدر کر کے رہیں گی، تمہارے باپ کی مرضی سے شادی کو انہوں نے آج تک معاف نہیں کیا، میں نے تو ابھی اس بات کے لیے ان کے دل میں جگہ نہیں بنائی تھی، تم نے نیا کھاتہ کھول دیا.....'' وہ متفکر تھیں۔

''ایسے کوئی مائی کا لال ہمیں یہاں سے دربدر نہیں کر سکتا اور امی! میں نے صرف محاورتاً نہیں حقیقت میں کہا تھا، اگر انہوں نے ہمیں یہاں سے زبردستی نکالنے کی کوشش کی تو میں عدالت تک جاؤں گی..... فی الحال تو یقین کریں میں ان لوگوں کے چنگل سے آپ کے نکلنے پر بہت خوش ہوں، میں تو خیر پہلے بھی ان کے زیر تسلط نہیں تھی، اچھا ہے ہم اپنے کام پر زیادہ اچھے طریقے سے فوکس کر سکیں گے، اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اچھے کے لیے کرتا ہے، آپ فکر نہ کریں.....'' اس نے ہمیشہ کی طرح بہت بڑی بات کو بھی اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا بلکہ ساجدہ کی بھی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

اور واقعی اس نے صحیح کہا تھا ساجدہ جو وہاں کولہو کے بیل کی مانند جتی رہتی تھیں، رات کو بمشکل ایک دو گھنٹے اپنی نیند اور آرام کے سلائی کا کام کرتی تھیں، یہاں جیسے بالکل ہی فراغت ہی فراغت تھی، گھر ایک ہی تھا اگرچہ پورشنز الگ الگ تھے، گھر والوں خصوصاً دادی کی ناراضی کی فکر اپنی جگہ اب تو معاشی مسائل بھی ساتھ ساتھ تھے، یہی سوچ کر انہوں نے کمر کس لی اور باقاعدہ سلائی کا آغاز کر دیا تھا۔ نتیجتاً پندرہ دنوں میں

انہوں نے صفا کو بیس بہترین سوٹ تیار کر کے دیے تھے۔ جن کی خوب صورت پیکنگ جب صفا کے تخلیقی ذہن ۔ میں آئی تو وہ دیکھنے کے لائق بن گئے تھے۔ اب کی بار صفا میں زیادہ اعتماد تھا ان کو اپنے کالج میں پیش کرتے ہوئے۔ پچھلی دفعہ کی طرح اس بار بھی وہ سب ہاتھوں ہاتھ گئے تھے۔

''بھئی صفا! تم ہمیں ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر بھی تو دو، اپنی آنٹی کا.....

میں نے اپنی بہن کو ایک شرٹ دی تھی گفٹ اب اس نے کچھ اور خریداری کرنی ہے تمہاری آنٹی کے بوتیک سے.....''

''جی میم! اصل میں آنٹی نے ابھی باقاعدہ افتتاح نہیں کیا اپنے بوتیک کا، مگر ان کا ارادہ یہی ہے ان شاء اللہ..... ابھی تو گھریلو سطح پر جو تھوڑا بہت کر رہی ہیں، وہ میں لے آتی ہوں..... جیسے ہی آغاز ہو گا کام کا پروفیشنلی، میں دے دوں گی ان کا ایڈریس آپ کو..... اور ان شاء اللہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ کچھ نئے ڈیزائنز پر کام کر رہی ہیں، نیکسٹ منتھ میں آپ کو اس سے بھی زیادہ ورائٹی ملے گی..... اور میم! میں نے آپ سے پرمیشن بھی لینی تھی ایک بات کی.....''

''ہاں ہاں صفا! کہو کیا بات ہے.....؟'' مسز ملک جو کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی تھیں، نے پیکنگ کھول کر سوٹ کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں چاہ رہی تھی کہ نیکسٹ منتھ ہمارے کالج میں جو فن فیئر ہو رہا ہے اس میں جو ہمارا اسٹال ہے، وہاں مجھے اپنی آنٹی کے کام کو ڈسپلے کرنے دیا جائے..... بے شک کالج اس کا باقاعدہ کمیشن لے سکتا ہے، اصل میں ابھی تو صرف آپ لوگ ان کے کام سے واقف ہیں، ایسا کرنے سے کچھ اور لوگوں تک بھی ان کا کام پہنچے گا تو پھر ہی وہ وائڈلی کام کر سکیں گی.....''

''ہاں ہاں کیوں نہیں صفا! میں پرنسپل صاحبہ سے پرمیشن لے دوں گی، اس میں کوئی حرج بھی تو نہیں ہے۔ ہم باقی پروفیشنل لوگوں کو بھی تو فن فیئر میں اسٹالز کی اجازت دیتے ہیں ناں..... ایک تمہی سہی..... اور یہ تم میرا ناپ نوٹ کر کے اپنی آنٹی کو دینا..... ایک ہفتہ تک مجھے سات آٹھ بہترین قسم کے سوٹ تیار کر دیں، میں نے اپنی بہن کے پاس باہر بھجوانے ہیں، ہمارا ناپ برابر ہی ہے..... میں کوشش کروں گی کہ وہ اپنے سرکل میں تمہاری آنٹی کا کام انٹروڈیوس کرا کے وہاں سے بھی آرڈرز لے کے دے.....''

''او کے میم! تھینک یو میم..... تھینک یو.....''

سرشاری کی ایک الگ ہی کیفیت میں وہ گھر واپس آئی تھی۔

☆☆☆

''ارے بلال تم! اپنی نانی سے اجازت لے کر آئے تھے ناں..... یہ نہ ہو ہم سے ملنے پر کوئی دفعہ نافذ ہو جائے تم پر..... اور میں اپنی وجہ سے کسی معصوم پر ظلم ہوتا برداشت نہیں کر سکتی۔''

ایک شام جب وہ سو کر اٹھی تو بلال کو امی کے پاس بیٹھا دیکھ چونک گئی تھی، وہ سر جھکا کر مسکرا دیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے صفا جی! میں ان کو بتا کر آیا ہوں..... انہوں نے منع نہیں کیا تو روکا بھی نہیں..... ویسے بھی وہ منہ سے نہ بھی کہیں تب بھی لگ رہا تھا کہ وہ آپ لوگوں کو مس کر رہی ہیں۔''

''مجھے تو وہ قیامت تک مس نہیں کر سکتیں۔ ہاں امی کو ضرور کرتی ہوں گی..... مفت کی ملازمہ سے ہاتھ دھونا آسان کام نہیں ہے ناں بلال میاں.....''

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو..... اگلے ہفتے شادی ہے انعم کی..... دو ماموں بھی پہنچ رہے ہیں ایک دو دن تک.....''

''ہوں.....'' اس نے لمبا سا معنی خیز ہوں کیا۔

''اسی لیے تو..... اسی لیے تو آپ کی نانی محترمہ اور عزت مآب ماں میاں ذرا ڈھیلی پڑ گئی ہوں گی کہ اتنا بڑا ایونٹ ساجدہ کے بغیر بھگتانا آسان بات نہیں ہے ناں..... وہاں تو ایک گلاس تک دھونا ہو تو پہلی پکار ساجدہ کو پڑتی ہے۔ اب تو شادی کا موقع ہے، ہزاروں کاموں کے لیے ملازمائیں

ہی بلا رہی ہوں گی ناں.....''

''بس بھی کرو صفا! ہر ایک سے ہر وقت کی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی..... انعم بھی میری بچی ہے..... مجھے تو آج اماں جی اس گھر میں واپس بلا لیں تو میں سب کچھ بھول جانے کو تیار ہوں..... وہ بڑی ہیں، بزرگ ہیں چھوٹوں کا فرض بنتا ہے کہ بڑوں کی باتوں کو مانیں اور اگر وہ کچھ ایسا ویسا بول بھی دیں تو درگزر کر دیں.....''

''پتا نہیں امی! کس قسم کی عاجز مٹی سے آپ کو بنایا گیا ہے کہ کوئی بات بری ہی نہیں لگتی..... انہوں نے صرف برا بھلا کہا نہیں، برا کرنے کی کوشش بھی کی، وہ بھی آپ کی نواسی کے ساتھ..... آپ بھول بھی جائیں..... میں نہیں بھولی..... اور بلال! کیا پیو گے، چائے یا ٹھنڈا.....'' وہ بیک وقت دونوں سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں صفا! بہت شکریہ..... مم..... میں پی چکا ہوں چائے۔''

''مجھے کچھ عجیب سا لگا ہے..... ارے..... واہ بھئی واہ..... آ..... آہا..... باقی تکرار نہیں کر رہے تم..... کیا بات ہے بھئی..... پہلے سب کو بے وقوف بناتے تھے یا اب بنا رہے ہو.....''

وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر بولی، بلال ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

''ایسیج تھراپی کرا رہا ہوں..... پہلے مہینہ روزانہ ہوتی رہی ہے..... اب ہفتے میں تین دن ہوتی ہے..... کوئی بیماری تو تھی نہیں، بس تھوڑا سا نفسیاتی مسئلہ تھا وہ ڈاکٹر کے مشورے اور میری اپنی ول پاور اور پریکٹس سے اسی فیصد تو حل ہو چکا ہے..... ان شاء اللہ جلد ہی پوری طرح ری کور ہو جائے گا.....''

''او مائی گاڈ! کتنے اچھے لگ رہے ہو ناں اس طرح بات کرتے ہوئے، میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ دنیا کو خوامخواہ کا وہم ہوا کرتم نے اپنے اوپر ان کانفیڈنس سوار کر رکھا ہے..... اس خوف پر قابو پا کر اپنے آپ کو بدلو..... بہرحال مجھے بہت اچھا لگا.....'' وہ جوش سے بولی تھی۔

''شکریہ صفا!''

''ایک بات اور بھی ہے بلال! گھر کی ذمہ داری اٹھانا اچھی بات ہے مگر وہاں نہیں جہاں آپ کی کوئی قدر نہ ہو، نہ ہی وہ ذمہ داری آپ کی ہو..... تم بھی میری امی سے ملتے جلتے انسان ہو..... کام اور ذمہ داری کے لیے جان لٹا دینے والے اور جواب میں صلہ بھی نہ مانگنے والے، صلہ تو ایک طرف، ڈانٹ ڈپٹ کو بھی حق کی طرح وصول کرنے والے تمہاری اپنی ایک زندگی ہے، کل کو تمہاری فیملی ہو گی تو سوچو ان کے سامنے تمہاری کیا عزت ہو گی جب اس گھر میں تمہارا یہ حال دیکھیں گے بلکہ مجھے تو لگتا ہے امین منزل والے کبھی بھی تمہاری شادی نہیں ہونے دیں گے، اور اگر کبھی کی بھی تو کوئی تمہاری طرح کی کوئی مسکین، شریف سی لڑکی لے آئیں گے تاکہ دو دو نوکر عمر بھر کے لیے ملے رہیں تو بھئی! بھلے کام کرو مگر.....''

''صفا! بس بہت ہو گیا..... خود تو اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے گھر بدر ہوئی ہو، اب اس معصوم کو مت ۔ پٹیاں پڑھاؤ.....'' ساجدہ نے ٹوک دیا اسے۔

''ارے نہیں مامی! کہنے دیں! صفا دوسرے لوگوں کی طرح دل میں میل اور زبان پر مٹھاس لے کر دھوکا نہیں دیتی، نہ منافقت کرتی ہے..... مجھے اس کی کوئی بات بری نہیں لگی اور صفا! میرے جاب برقرار ہے، اب تو ڈرائیوری چھوڑ کر حساب کتاب کے کام پر رکھ لیا گیا ہے مجھے اور میں نے اپنی رکی تعلیم کا سلسلہ بھی جوڑ لیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس سب کا سہرا صفا کے سر جاتا ہے، اسی نے بار بار مجھے احساس دلا کر اپنی شخصیت کے ان گوشوں کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع دیا جن سے میں خود نا آشنا تھا۔ ورنہ تو کولہو کے بیل کی طرح بس امین منزل کے گرد ہی گھومے جا رہا تھا.....'' اس کا انداز ایک عقیدت مند جیسا تھا صفا کے لیے..... صفا نے گردن اکڑا کر ساجدہ بیگم کی طرف دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا.....'' وہ ترنت بولی۔

''ویسے بھی مامی! میرے اندر کی ان تبدیلیوں کو دیکھا ہے یا میری جاب کو کہ اب میرے اوپر کام کا ویسا برڈن نہیں ہے جیسے پہلے تھا۔ ایک لڑکا جز وقتی اور اس کی ماں کو کل وقتی ملازم کے طور پر رکھا ہوا ہے بڑی مامی نے..... انعم کی شادی تک..... باقی میرا ابھی گھر ہے امین منزل..... حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ جو میرے بس میں ہو، وہ کر سکوں

بہرحال اس ٹھرنے مجھے پناہ دی..... تحفظ دیا..... میرے اپنے ہیں۔"

"ہاں بیٹا بالکل ٹھیک کہا تم نے....." ساجدہ تو نہال ہی ہو گئیں اس کی فرمانبرداری پر..... کچھ ہی دیر بعد وہ چلا گیا تھا۔

"کتنا اچھا لگ رہا تھا ناں امی بلال..... اللہ پوچھے امین منزل والوں سے کیسے اچھے بھلے انسان کا بیڑہ غرق کر کے رکھا ہوا تھا انہوں نے..... شکر ہے بروقت عقل آ گئی اس کو....."

صفا نے تبصرہ کیا..... ساجدہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

پھر صفا تو نہیں ساجدہ انتظار میں ہی رہیں کہ کوئی تو آئے گا انعم کی شادی کے لیے ان کو منانے..... مگر ان کا خواب، خواب ہی رہا تھا۔ آج کل صفا بھی امتحانوں سے فارغ تھی اور فن فیئر پر ان کے کام کو بہت پذیرائی اور منافع ملا تھا تو ہفتہ ہو گیا وہ سائیکل لے کر صبح کی نکلی تین بجے لوٹتی تو کبھی چار بجے۔

ایک ہفتے میں اس دو کمروں کے چھوٹے سے پورشن میں سے ایک نسبتاً بڑا کمرہ وہ سلائی اینڈ ٹریننگ سینٹر کے لیے سیٹ کر چکی تھی..... کپڑوں کا معاوضہ اور اس کا اس سال پیف (PEEF) اسکالرشپ جو اسی فیصد سے زائد نمبرز لینے والے طلباء کو ملتا ہے، ملا کر اتنی رقم ضرور تھی ان کے پاس کے صفا نے ان سے چار مشینیں اور کم از کم پچاس میٹر کپڑا تو ضرور خریدا تھا..... ساجدہ حیرت سے دنگ رہ گئیں جب انہوں نے اسے مزدوروں سے مشین اور سلائی کا دیگر سامان اٹھا کر لاتے اور پھر انہی سے سیٹ کراتے دیکھا تھا۔

"یا اللہ! کیسے کر لیتی ہو صفا تم اتنے بڑے بڑے کام اتنی رقم تم بازار لے کر گئیں، اتنی مہنگی خریداری کی۔ اگر کوئی تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو....." سکتے سے باہر نکل کر انہوں نے اسے خفگی سے ٹوکا جو فخریہ انداز میں اپنے قائم شدہ سلائی سینٹر کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے میری پیاری امی جان! انسان خود مضبوط اور ارادے کا پکا ہو، پھر اللہ کی مدد شامل ہو تو ہر صورت کامیاب ہوتا ہے، اس میں مرد، عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے..... دنیا میں اتنے بڑے بڑے کاروبار عورتیں اپنے بوتے پر چلا رہی ہیں۔ ان کو کوئی کھا گیا کیا..... یہ ہمارے اندر کا خوف ہوتا ہے جو ہمارے ارادوں کو کمزور کرتے ہوئے ہمیں بھی بزدل بنا دیتا ہے۔

اب مجھے وہ خواتین یہاں لانی ہیں، جو محنتی اور کارگر ہیں، مگر روزگار کے مواقع نہیں ہیں ان کے پاس..... اس کے علاوہ اب تک ہم نے صرف ایک ہی ناپ یعنی میڈیم کے آؤٹ فٹ بنائے ہیں اس بار لارج اور اسمال کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی ورائٹی دینی ہے ہمیں..... میرے پاس صرف ایک مہینہ ہے اور اس میں، میں آپ کو سب کچھ سیٹ کر کے دینا چاہتی ہوں..... پھر میری اپنی کلاسز کے اسٹارٹ ہوتے ہی مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملنی..... کچھ کھانے کو ہی دے دیں امی! دماغ پلپلا ہو گیا کھپا کے....."

وہ وہیں قالین پر پیر پسار کر بیٹھ گئی اور دونوں پیروں کو دباتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... ہاں میں لاتی ہوں....." ساجدہ ایک دم جیسے ہوش میں آئی تھیں، صفا دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے دبائے لیٹ کر کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

پھر اسے واقعی بہت محنت اور مشقت اٹھانی پڑی تھی محنتی اور قابل ورکرز ڈھونڈنے کے لیے..... ساجدہ اس کے اس طرح باہر جانے پر، کام کے حوالے سے ہی سہی، سخت ناخوش تھیں، ان کے خیال میں اب تو ان کے سر پر خاندان کا ہاتھ بھی نہ رہا تھا تو اکیلی لڑکی کا باہر جانا لوگوں کو ان پر انگلی اٹھانے کا موقع بھی دے سکتا تھا اور ان کے لیے مشکلات بھی بڑھا سکتا تھا۔

ان کے خیال میں صرف ان کا کام ہی ان کے گزارے کے لیے کافی تھا، مگر صفا کو اس دنیا کی چنداں پرواہ نہ تھی جو محنت کر کے کھانے پر ان پر انگلی اٹھا سکتی تھی، ان کے بھوکے رہ جانے پر کسی قسم کی مدد

BOOKS.PK

[illegible] پاس نہ تھی اور جس دن اسے ایک اچھی سا کھ [illegible] بوتیک سے ایک بڑا آرڈر ملا، وہ بہت خوش [illegible] دو دن بعد اس کا چوتھا سمسٹر اسٹارٹ ہونے [illegible] تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی نیت صاف ہے تو [illegible] اللہ کبھی بھی مایوس نہیں کرے گا.....

☆☆☆

امین منزل میں بہت دن سے جو کھچڑی پک رہی تھی اس کا حل بھی ان خواتین نے نکال لیا تھا جو ساجدہ کے گھر بدر ہونے پر انگاروں پر لوٹ رہی تھیں کہ ٹکے ٹکے کے نوکروں سے روز روز کی چخ چخ آسان کام نہیں تھا..... ساجدہ کی صحیح قدر دل میں اب محسوس ہو رہی تھی اور اب تو صفا بوتیک کا سن کر گویا آگ ہی بھڑک اٹھی تھی دلوں کے اندر..... دادی البتہ کچھ چپ چپ سی ضرور تھیں کہ ساجدہ نے عمر بھر ایک پیر پر کھڑے ہو کر ان کی جو خدمت کی تھی، وہ سچ میں ہی خود کو حکمران سمجھ بیٹھی تھیں..... حتیٰ کہ رات کو پیروں پر مالش کروائے بغیر ان کو نیند ہی نہ آتی تھی اور اب ڈھائی ماہ سے حالات اتنے بدل گئے تھے کہ نہ ان کو اپنی پسند کا کھانا مل رہا تھا نہ ڈھنگ کے کپڑے دھلے اور استری کیے ہوئے، بہوؤں سے شکایت کرتیں تو وہ الٹا نوکروں کا رونا روتی نظر آتیں۔

ساری امین منزل عجیب سی آپا دھاپی کا شکار نظر آتی..... حالانکہ وہ چار پانچ نفوس ہی تھے گھر میں حامد اور بلال کو ملا کر..... اگر چاہتیں تو مل کر دونوں خواتین ہی تمام کاموں کو سنبھال سکتی تھیں مگر ساجدہ نے عمر بھر بٹھا کر کھلایا تھا تو تو اب ملازمہ کے معاوضے اور نخرے برداشت کرنا مشکل تھا۔ دونوں نے ہی کمر ایک بار پھر کسی اور دادی محترمہ کے حضور حاضر ہوئی تھیں پھر جیسے جیسے بڑی تائی ساری صورت حال بیان کرتی گئیں دادی کے چہرے کے پرسوچ زاویے ظاہر کرنے لگے کہ وہ بھی ان سے متفق ہیں۔

☆☆☆

"سنو بلال! میں صفا بات کر رہی ہوں..... ایک کام تھا..... پلیز اگر تم اسٹور پر جاتے ہوئے کرتے جاتے تو....." صبح صبح ہی صفا کی اس کے نمبر پر کال آنا اسے ہفت اقلیم کی دولت ملنے سے بھی زیادہ قیمتی لگا تھا۔

"ہاں ہاں صفا! بتاؤ کسی بھی تکلف میں پڑے بغیر بلکہ آج ہی کیوں جب بھی میری ضرورت ہو میں حاضر ہوں....." وہ پورے خلوص سے بولا تھا۔

"اصل میں میرا آج ایک ضروری ٹیسٹ ہے، کسی بھی صورت چھوڑ نہیں سکتی..... بوتیک کا تیار آرڈر دے کر نیا آرڈر لینا ہے..... تو آج کی ڈیٹ ڈیو تھی....."

"تم ویسے بھی مجھے کہہ سکتی ہو صفا! کوئی کام نہ ہو تب بھی..... مامی سے کہو تیار رکھیں، جو کچھ بھی پہنچانا ہے..... میں دس سے پندرہ منٹ میں لیتا ہوا جاؤں گا..... بلکہ....." وہ بولتے بولتے رکا۔

"آئندہ بھی مجھے ہی دینا، میں پہنچا آیا کروں گا....."

"تھینک یو بلال..... تھینک یو سو مچ..... تمہیں پتا ہے ناں میں کمٹمنٹ کی کتنی پکی ہوں..... ڈلیوری تو کل بھی جا سکتی ہے مگر میں اپنی بات سے پھرنا نہیں چاہتی تھی..... اوکے..... پھر بات ہو گی۔" اس نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

☆☆☆

"پتا ہے صفا! میں تم سے مقابلے کی دوڑ میں بس ہار ہی رہا ہوں، باوجود بے حد کوشش اور خواہش کے۔"

اس دن کے بعد وہ اکثر ہی صبح آ جاتا اور مامی یا صفا سے پوچھ کر ڈلیوری اور آرڈر لانے لے جانے کا کام خود ہی کرنے لگا..... اس چیز نے ان کے درمیان رسمی سا تعلق ختم کر کے ایک نئے رشتے کو پنپنے میں مدد دی تھی۔ بلال کی شخصیت میں آنے والی تبدیلیاں بہت حیران کن تھیں..... اس کی اس بات پر صفا الجھ گئی تھی۔

کیا مطلب..... کیسا مقابلہ.....؟

"تمہیں شاید کبھی پتا نہیں چل سکا صفا کہ تم جیسی

ہمت اور جرأت والے لوگ مجھ جیسے بزدل انسانوں کا خود بخود آئیڈیل بن جاتے ہیں۔ پہلے تو مجھے ادراک ہی نہیں ہوا کبھی اپنی کسمپرسی یا بے بسی کا مگر ماموں کی وفات کے بعد جس طرح کی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ تم کیا کرتی تھیں، اسے میں رشک سے دیکھا کرتا تھا..... بڑی مامی، چھوٹی مامی ہوں..... نانی یا انعم، تمہیں تو کسی سے ڈر ہی نہیں لگتا تھا..... لڑکی ہو کر تم بے دھڑک اپنی بات اور خیالات کا اظہار کر دیتی تھیں اور میں مرد ہو کر اپنی ذات میں ہی محصور ہوتا چلا گیا.....

مجھے تو یہ خوف ہی راتوں کو سونے نہیں دیتا تھا اگر میں نے ان کی حکم عدولی کی تو پہلے تو مجھے خوب مار پڑے گی پھر گھر سے نکال دیا جاؤں گا تو میں کیا کروں گا..... کیونکہ شروع سے اب تک گھر کی خواتین میری عمر یا جنس کا خیال کیے بنا ہی آرام سے میری تذلیل کر دیا کرتی تھیں، ضرورت پڑنے پر کبھی منہ تو کبھی کمر پر بھی زور آزمائی کی جاتی..... پھر جس دن انعم نے مجھے تھپڑ مارا اور میں ہمیشہ کی طرح کونوں میں منہ چھپا کے رویا اس دن تمہاری باتوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب ایک کمزور سی لڑکی اللہ کے سہارے اپنے حالات سے برسر پیکار ہے اس کا دنیا میں بھی کوئی مضبوط سہارا نہیں، صرف اپنی قوت ارادی اور خود اعتمادی سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے تو میں مرد ہو کر کیوں نہیں..... وہ گویا میری زندگی کا ایک نیا موڑ تھا..... میں نے تمہیں آئیڈیل بنا کر تمہارے نقش قدم پر چلنا شروع کیا..... کسی کی حکم عدولی نہیں کی لیکن کسی کو اپنی تذلیل بھی نہ کرنے دی پھر..... ابھی میں اپنی اس کامیابی کے بارے میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ پتا نہیں کن وجوہات پر تم لوگوں کو الگ کر دیا گیا اور اب تمہارے، میرے بیچ میری زبان کی لڑکھڑاہٹ تھی جو مجھے تم سے کچھ کہنے سے ڈرا کے رکھتی تھی..... پھر میں نے باقاعدہ ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا اور آج جب میں اپنی قوت ارادی اور باقاعدہ علاج کے بعد تم تک اپنے خیالات آرام سے پہنچا سکتا ہوں تو مالی سے کئی سیڑھیاں چڑھ کر تم بالکل ہی اوپر جا بیٹھی ہو میں ماہانہ بیس ہزار کمانے والا ایک معمولی ملازم.....

''تو کیا ہوا! تمہارے لیے سب سے بڑی با یہ ہونی چاہیے بلال کہ تم محنت سے رزق حلال رہے ہو..... اور آج ہماری — مالی حالت کچھ ہونے لگی ہے تو یہ بھی میری ماں کا صبر اور محنت ہے..... اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں..... بس ایک راہ ہی دکھائی ہے ان کو..... ویسے بھی رزق کی تقسیم میرے مالک سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا..... تم نے ارادہ کر لیا ہے محنت کا تو وہ تمہارا حصہ بھی ضرور دے گا..... بس اب کبھی بھی اس احساس کمتری کا شکار مت ہونا جس نے تمہیں تمہارے جیسے انسانوں کے سامنے جھکائے رکھا۔''

اور اس دن ان کے درمیان دو اچھے دوستوں کی طرح بہت سی باتیں زیر بحث آئی تھیں۔

☆☆☆

''یہ کیا کہہ رہی ہیں امی!'' وہ حواس باختہ ہو کر بولی..... اس کا ہوم ورک مکمل ہو چکا تھا..... آج کل میں وہ صفائی ٹریننگ سینٹر اینڈ بوتیک کا باقاعدہ آن لائن آغاز کرنے کا سوچ رہی تھی، وہ کالج سے آئی..... امی اسے کمرے میں ملی تھیں جو ان کا اور اس کا مشترکہ کمرہ تھا۔ عموماً وہ ٹریننگ والے کمرے میں ہوتی تھیں، ورکر خواتین کے ساتھ تندہی سے کام میں مصروف..... اسے کھانا دے کر انہوں نے چائے بنا کے دی تھی اور جیسے ہی اس نے معمول کے مطابق ان کو اپنے دن کی روداد سنانا شروع کی۔ انہوں نے جو بتایا، اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے کالج جانے کے بعد تائی اور چچی آئی تھی..... ان کے ہاتھ میں اس گھر کی ملکیت کے کاغذات تھے جو کہ تایا اور چچا کے نام پر ہے..... اس کے ابا کا کہیں تذکرہ ہی نہیں کیونکہ دادی نے جب دادا حیات تھے، ان کی دوسری شادی اور سوتیلے بیٹے کی حقیقت کو تبھی تسلیم کیا تھا، جب یہ مکان اپنے دونوں سگے بیٹوں کے نام کروا

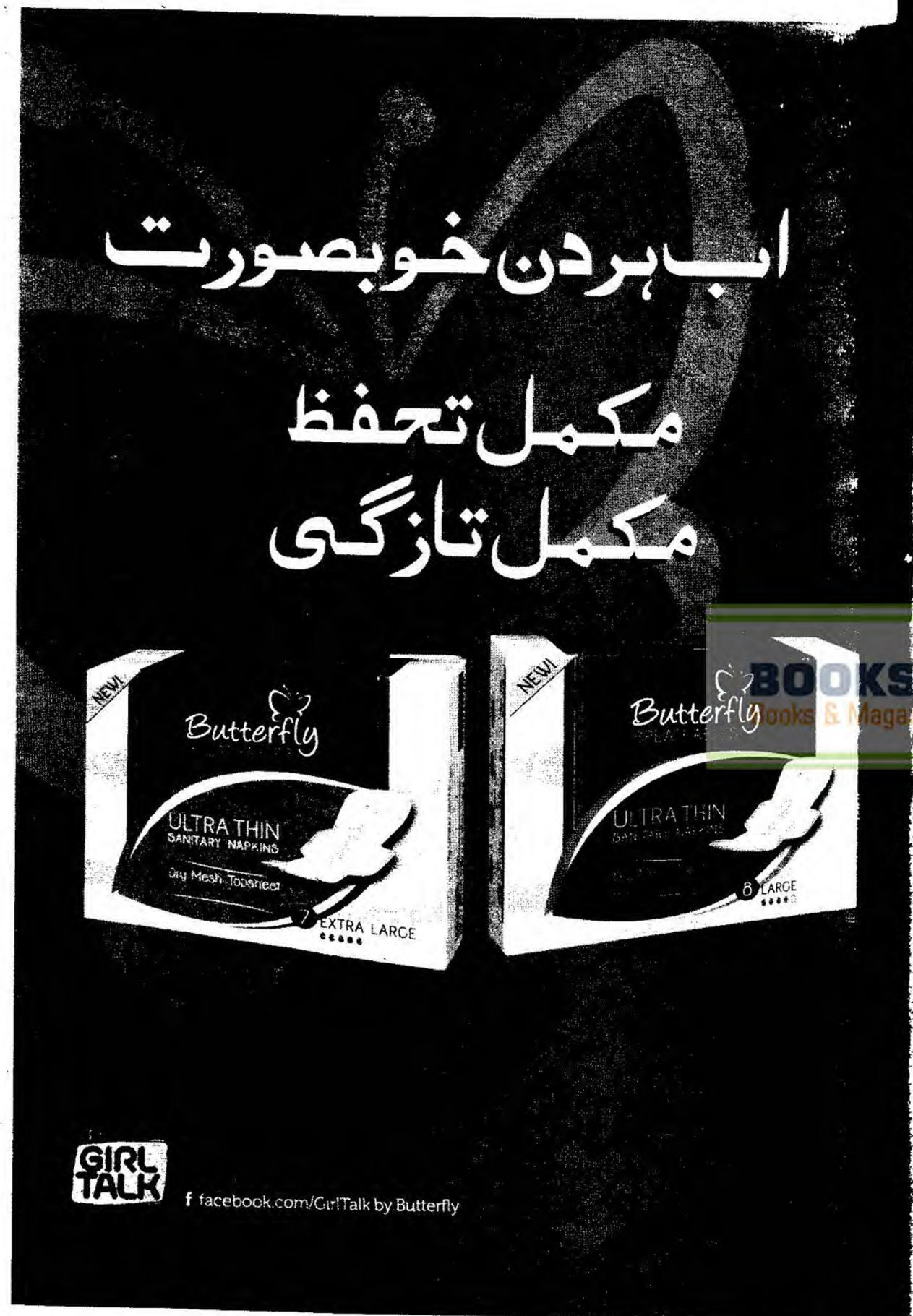

لیا تھا۔ اب صفا دنیا کی جس بھی عدالت میں چلی جائے اس ملکیت کو چیلنج نہیں کر سکتی کیونکہ دادا اپنی زندگی میں ایسا کر کے گئے تھے۔

"پھر..... پھر کیا مطلب تھا ان کا یہاں آنے کا؟" اس کے سوال پر امی نے اس کی طرف دیکھ کر نظریں چرا لیں۔

"بتائیں ناں..... کیا کہتی ہیں اب وہ خود غرض خواتین....."

"ان کا وہی پرانا مطالبہ ہے..... کہ یا تو آج شام تک تمہارا حامد سے نکاح کر دیا جائے یا صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کا یہ پورشن خالی کر دیں ہم لوگ....."

"اور اگر میں نہ مانوں تو کیا سزا مقرر کی ہے امین منزل والوں نے.....؟

"وہ ہمارا سامان باہر پھنکوا دیں گی..... میں تو کہتی ہوں صفا! تم چل کر اپنی دادی سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگ لو..... میں منت کروں گی کہ وہ تمہاری شادی حامد سے نہیں کرائیں۔ ان کا یہ فیصلہ تمہاری بدتمیزی کے ردعمل کے طور پر تھا۔ تمہاری تائی اس پر اڑ گئیں..... معافی مانگنے میں کوئی چھوٹا نہیں ہو جاتا بیٹا! بلکہ بڑا پن دکھاتا ہے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے..... یہ چھت چھن گئی تو کہاں جاؤں گی میں جوان بچی کو لے کر لوگوں کے ساتھ کیا کیا نہیں ہوتا گھروں میں..... مگر گزارا کرتی ہیں ناں عورتیں۔"

"میں اس ظالم عورت سے معافی مانگوں گی نہ ہی اس نکمے بوڑھے کھوسٹ سے شادی کروں گی..... مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ آپ ان خود غرض لوگوں کے دیے گئے راستوں پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا نیا ٹھکانہ ڈھونڈنے کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے..... مگر میں ایسے ہار نہیں مانوں گی..... پہلے وہ کاغذات بھی دیکھوں گی جو ــــ دادا ابا کے دستخط شدہ ہیں۔"

"اف صفا! پاگل کر کے چھوڑو گی تم مجھے..... کہاں جائیں گی ہم دو اکیلی عورتیں....." وہ روہانسی ہو گئیں۔

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے..... ہمیں صرف اسی کا دائمی سہارا چاہیے جو ہمیشہ سے ہمارا ہے..... جائیں بے فکر ہو کر..... صفا مراد علی کو بہت ہلکا لیا نے..... ویسے عجیب ہی اتفاق ہے کہ ابا بھی رشتوں کے ڈسے ہوئے تھے اور آپ بھی..... نے آپ کی شادی پر شکر کا کلمہ پڑھا کہ چلو بیٹی نے کی شادی کر کے قطع تعلقی اور جائیداد سے دستبرداری لیے ان کو زحمت نہیں دی اب دنیا صفا مراد علی کو بھی ہی سمجھ کر ٹھوکروں کی زد میں رکھنا چاہ رہی ہے تو یہ ال بھول ہے....."

اس کے لہجے میں چٹانوں کا سا عزم بول رہا تھا

☆☆☆

امین منزل والوں کو پورا یقین تھا کہ ساجدہ ج ڈرپوک عورت کبھی بھی نہ تو خود اس گھر کو چھوڑ کر جا گی نہ ہی صفا کو اجازت دے گی، اتنا تو طویل رفا میں جانتے ہی تھے اس کی فطرت کو، سو شام ہوتے پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے نکاح کی..... مولوی اور گواہان کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ تینو خواتین بڑے غرور اور طمطراق سے وہاں آئی تھ..... ساجدہ اس وقت عموماً سلائی ہو جانے وا کپڑوں پر مہارت سے استری کا کام کیا کرتی تھ جبکہ اس کے بعد پیکنگ کا کام صفا خود کر تھی..... آج ساجدہ بھی آنے والے وقت کی فکر منہ سر لپیٹے پڑی تھیں..... اپنی ساس کی ہٹ دھ فطرت سے بھی واقف تھیں وہ..... اور صفا بھی عا ضد میں انہی پر پڑی تھی..... صفا نے جو اپنے اور ما کے لیے چائے بنا کر لائی تھی، خاصی حیرانی سے ا خواتین کو دیکھا جن کی تیاری اور ہاتھوں میں موج سامان نے اس کو ٹھٹکا دیا تھا۔

"مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں..... رحمت بن کر آئے ہیں تو خوش نصیبی ہے ہماری..... ا کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر تشریف لائے ہیں تو واپس سکتے ہیں....." اس کی تیز آواز پر ساجدہ ہڑبڑا کر اٹ بیٹھی تھیں۔

"یہ کیا مذاق ہے ہمارے ساتھ ساجدہ! می

بھائی نکاح خواں بلانے گیا ہے، سارے خاندان کو خبر ا چلی ہوں..... پرسوں ولیمے کی دعوت بھی دے ای..... اب تمہاری بیٹی کیا بکواس کر رہی ہے۔"

تائی غرائی تھیں۔ اسی پل افتاں و خیزاں بلال اندر آیا تھا۔

"نانی میں نے آپ سے بات کی تھی ناں صفا لے لیے..... آپ نے کہا تھا سوچ کر بتائیں گی..... اب حامد بھائی کا فون آیا ہے کہ صفا کا نکاح ہو رہا ہے ان کے ساتھ، مجھے بطور گواہ بلایا ہے..... ایسا کیسے ہو ملتا ہے.....؟ حامد بھائی اور صفا..... صفا مان گئی لیا.....؟

"تم تو میاں گونگے ہی بھلے تھے..... بول بول لے سر کھا گئے ہمارا..... تمہاری تو بات ویسے بھی ہم طے کر چکے ہیں تقریباً، ایک دو دن میں چل کر باقاعدہ پکی بات کر آئیں گے..... اب حامد کو فون کرو ..... خود کہاں رہ گیا دولہا..... گواہان پہنچ گئے..... وہ نہیں آیا..... حد ہے بھئی سستی کی۔"

"نانی میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں....." وہ بے تابی سے ان کے گھٹنے پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ تائی کی بات کا جواب دیے بغیر۔

"نانی تمہاری اس بات کا جواب دے جائیں، یہ قیامت تک ممکن نہیں۔ اس گھر کے لوگوں کو زمین پر خدا بننا بہت پسند ہے، سو مجھ پر قابو پانے کے لیے ان کو حامد سے بہتر کوئی اور نہیں ملا اور تمہارے لیے بھی اھونڈ لی ہو گی کوئی بے زبان گائے..... آپ سب یہاں سے تشریف لے جا سکتے ہیں اور جو بھی تماشا کرنا ہے اپنے گھر جا کر کریں..... آپ دونوں خواتین کان کھول کر سن لیں! جو کاغذات آپ نے امی کو لا کر دکھائے، مجھے بھی دیکھنے ہیں، ان کے بغیر میں یہ گھر بھی چھوڑ کے نہیں جاؤں گی....."

"کیا.....؟ گھر کیوں چھوڑ رہی ہو صفا تم.....؟ اور نانی آپ میری بات کا جواب دیں۔ صفا سے کیوں زبردستی کر رہی ہیں.....؟ جب کہ مجھے آپ نے کہا تھا صفا جیسا مرد مار لڑکی تجھے کہاں گھاس ڈالے گی، چپکا بیٹھا رہوں..... میری چپ میں آپ نے یہ کھیل کھیلا ..... صفا تم..... تم مجھ سے شادی کرو گی.....؟

حواس باختہ ہو کر وہ کبھی نانی کو کبھی صفا کی طرف مڑتا۔

"یہ بھی جان لو میاں کہ ہماری بات نہ ماننے والے کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے، مفت خوروں کو ٹھکانہ نہیں لے رکھا ہم نے..... تم بھی جا سکتے ہو ان ماں بیٹی کے ساتھ....."

"ایسے مت کہو بہو! بلال میری بیٹی کا بچہ ہے..... اس کا بھی اس گھر پر اتنا حق ہے جتنا تمہارا....." دادی کو بلال کے بارے میں ایسا فیصلہ پسند نہ آیا تھا مگر سامنے بھی تائی تھیں جن کو اپنی ہر چال الٹی ہوتی محسوس ہو رہی تھی اور اسی بات نے انہیں غصے میں پاگل کر دیا تھا۔

"میرے گھر میں صرف میرا حکم چلے گا اماں! جس کو نہیں منظور وہ جا سکتا ہے یہاں سے، ہم نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھولا ہوا....." تائی نے کھڑے ہو کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ زندگی میں پہلی بار دادی کو ان کی بات بری لگی تھی۔

"مت بھولو جہاں آراء کہ گھر کی بڑی میں ہوں اور جس گھر پر تم اترا رہی ہو..... وہ میرے شوہر کی کمائی سے بنا ہے، اس پر میری بیٹی کا بھی حق تھا مگر وہ بھائیوں کے حق میں دستبردار ہو گئی تھی اس گھر سے، بلال کو بار بار یہ حوالے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں تو اب تو یہ گھر ہمارے شوہروں کا ہے ناں اماں اور آپ اگر چاہیں تو بلال کے ساتھ جا سکتی ہیں۔ بلال اور صفا میرے گھر میں اسی حیثیت سے رہ سکتے ہیں جس میں میں چاہتی ہوں، صفا حامد کی بیوی بن کر اور بلال بھی میری پسند کی لڑکی سے شادی کر کے..... چلو کوثر آرا..... بہت ہو گیا تماشا اور تم ماں بیٹی صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کہیں دفع ہو جانا....."

بہن کا ہاتھ پکڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور تنفر سے ساجدہ کو دیکھ کر کہا۔

"آپا..... آپا کہاں چل دیں آپ..... میں مولوی صاحب اور گواہ لے کر آیا ہوں....."

اندر آتے حامد نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور بہن کے سامنے آ کر بوکھلا کر کہا۔

☆☆☆

"خس کم جہاں پاک....." صفا نے ہاتھ جھاڑے۔

"دادی جان! جس گھر سے بڑے غرور سے آپ نے مجھے اور میری ماں کو نکالا تھا ناں آج آپ کو بھی اس سے دربدری کی سزا سنائی گئی ہے اور جس طرح آپ نے اپنی شرائط پر ہمارا وہاں رہنا ممکن بتایا تھا، آج آپ کو بھی کچھ شرائط دے دی گئی ہیں..... واضح ہوا کہ اللہ انسان کو اس کے اعمالوں کا بدلہ دے ہی دیتا ہے بشرطیکہ انسان عقل رکھتے ہوں اور اس سے سبق لیں تو..... ہم آپ جیسے ظرف کے مالک نہیں ہیں اس لیے چلیے آپ بھی چلیے جہاں اللہ نے ہمارے رزق اور رہائش کا سلسلہ جوڑ رکھا ہو گا..... دوسری صورت میں اپنی بہوؤں کے گھر ویسی ہی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جایئے جیسی کبھی ہم نے گزاری تھی....." صفا نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"تم مجھے فون ملا کر دو اپنے ماموں کو بلال! وہ گھر ان عورتوں کا نہیں میرے بچوں کا ہے، یہ مجھے کیا نکالیں گی..... میں ہی ان کا بندوبست کرتی ہوں....."

دادی نے صفا کی بات کا جواب دیے بغیر پریشانی سے ٹہلتے بلال کو مخاطب کیا۔

"میری عمر آپ سے کم مگر تجربہ آپ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں دادی..... تائی نے اتنی بڑی بات آپ کے انہی بیٹوں کے برتے پر کہی ہے جو کبھی آپ کے بیٹے تھے مگر اب صرف ان کے شوہر ہیں..... یہ خوش فہمی بھی دور ہو جائے گی جلد، کوشش کر کے دیکھ لیں..... تم بھی تسلی سے بیٹھ جاؤ بلال۔ میں چائے بنا لوں....."

صفا پتا نہیں کیوں ویسے پریشان نہیں تھی جیسے باقی تین نفوس تھے، شاید حامد سے جان چھوٹ جانے کی وجہ سے.....

☆☆☆

"صفا..... صفا..... کدھر ہو بھئی..... ٹائی نہیں رہی میری....." وہ کمرے سے ہی زور زور سے آوازیں لگا رہا تھا۔

"جاؤ بیٹا پہلے اس کی سن لو....."

دادی اور صفا کے گزشتہ تعلقات بھی گزشتہ میں ہوتے تھے، اب تو یک جان دو قالب والا معاملہ تھا۔

"یہ آپ کا نواسا ناں..... وہی آ..... آ..... وا میوزک کے ساتھ ہی اچھا تھا دادی! اب بولنے پر آیا۔ جب تک دوسرے کے کان سے دھواں نہ نکال دے، تک بولے چلا جاتا ہے..... بولے چلا جاتا ہے اور بو ہی چلا جاتا ہے..... موزے ٹائی سمیت گھڑی اور موبا تک کپڑوں کے ساتھ بیڈ پر ہی رکھ کے آئی تھی....."

"اچھا اچھا پھر بھی جا کے دیکھ لو..... اصل یہ بھی بیوی کی توجہ حاصل کرنے کا بہانہ ہے..... تمہارے دادا مرحوم بھی ایسے ہی تھے..... میں نظروں سے اوجھل ہوئی نہیں اور انہوں بہانے بہانے سے پکارا نہیں۔"

دادی ایک خوب صورت سی یاد میں گھر کر بولیں

"اب سارے ہی اس گھر میں موصوف حمایتی ہیں تو ایک صفا بیچاری کیا کرے..... جا ہوں آپ کے چہیتے کے پاس..... امی تازہ تا پراٹھا ڈال دیں..... بلال کو پراٹھا وہ بھی تازہ، آ کے ہاتھ کا پسند ہے، کہتا ہے لاکھ کوشش کر لو صفا، ما جیسا پراٹھا کبھی بھی نہیں بنا سکتیں تم....."

جاتے جاتے اس نے ساجدہ کو کہا جو دادی پوتی کی تکرار بڑے مزے سے سن رہی تھیں۔ انہو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی جناب فرمایئے! نزدیک کی نظر خراب تو ڈاکٹر کو چیک کرایئے کہ جس ٹائی کی رٹ لگا پورے محلے کو ڈسٹرب کر رکھا ہے وہ آپ کے سا ہی رکھی ہے۔

"ارے بیوی! ٹائی کس کم بخت کو چاہیے تھی ہمیں تو صفا رانی اپنے اردگرد نہ نظر آئیں تو اختلا

غالب ہونے لگتا ہے۔ میری عادت کا پتا بھی ہے پھر بھی گھنٹوں جا کر گم ہی ہو جاتی ہو....." اس نے اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود کرتے ہوئے کہا۔

"صرف پندرہ منٹ ہی ہوئے ہیں محترم یہاں سے گئے ہوئے۔" وہ اترائی۔

"آپ کی جدائی کا ایک پل بھی ایک صدی لگتا ہے ہمیں....."

"اچھا مسٹر مجنوں! جلدی سے باہر تشریف لے آیئے..... دادی اور امی ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں..... پھر جناب نے کام پر بھی جانا ہے....."

"صرف میں نے..... تم نہیں جا رہیں آج....."

وہ اس کے ہاتھ سے کوٹ پہنتے ہوئے شیشے میں دیکھ رہا تھا۔

"نہیں! میں امی اور نانی آج امین منزل جا رہے ہیں..... تایا کی برسی ہے آج..... تم بھی فری ہو کر جلدی آنے کی کوشش کرنا....." وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

یہ سب اچانک اور جلدی نہیں ہوا تھا..... ایک مشکل اور کٹھن وقت تھا جو ان سب نے ساتھ گزارا تھا..... اس دن دادی کے بیٹوں نے دبے لفظوں میں کہا تھا کہ جو تائی کہتی ہیں ویسے ہی کیا جائے، دوسرے یہ شکوے شکایت کے پروگرام لے کر ان کو پردیس میں پریشان نہ کیا جائے۔

سو یہ مختصر قافلہ پہلے ایک گیسٹ ہاؤس میں اور پھر بلال کی بھاگ دوڑ سے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں شفٹ ہوا تھا..... آگے کا سفر دشوار گزار سہی مگر ہمت، حوصلے اور ارادے کی پختگی کا زادِ راہ تھا ساتھ..... دو سے تین سال لگے تھے صفا کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی تھی، کام کو پذیرائی ملتے ہی ساجدہ نے خواتین ورکرز کی تعداد بڑھا دی تھی کہ اب ان کی آن لائن شاپ کا باقاعدہ آغاز ہوتے ہی دھڑا دھڑ آرڈرز ملنے شروع ہو چکے تھے۔ دادی کے مشورے سے بلال اب اسٹور والی جاب چھوڑ کر اسی کام سے منسلک ہو چکا تھا کیونکہ گارمنٹس کے آرڈرز لانا لے جانا۔ ادائیگی اور کپڑوں اور سلائی کے دوسرے لوازمات کے لیے پہلے پہل صفا اس کے ساتھ جاتی رہی تھی اب وہ اکیلا ہی جاتا تھا۔ کاروبار کے چل نکلنے تک دادی اور صفا کے تعلقات بھی مثالی ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس سے اپنے ناروا سلوک کی باقاعدہ معافی مانگی تھی..... صفا نے بھی کھلے دل سے ان کو معاف کر دیا تھا کہ ان کے نظریات سے چڑتی تھی وہ، ان سے نہیں اور دادی کی ایما پر ہی دونوں کی شادی کر دی گئی تھی۔

شادی کے ہفتہ بعد ہی ان کو تایا کی وفات کی اطلاع ملی تھی، دونوں بھائی ایک ہی گاڑی میں تھے جب حادثہ ہوا تھا، تایا تو جان کی بازی ہار گئے تھے، چچا کی بھی حالت ٹھیک نہ تھی، نہ ہی وہ دوبارہ پردیس جانے کے قابل رہے تھے..... تائی کا طمطراق شوہر کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا..... زندگی کی دوڑ میں اوپر رہنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ سدا اوپر ہی رہیں گے تو یہ ان کی بھول ہوتی ہے، انہیں نیچے بھی آنا پڑتا ہے، تب ہی تو سارے خسارے، زیاں اور زیادتیاں یاد آتی ہیں جو کبھی انسان دوسروں کے ساتھ کر چکا ہوتا ہے۔ حامد جس نے عمر بھر تایا کی کمائی پر عیش کیا تھا۔ حالات کے بدلتے ہی بیوی کو لے کر الگ ہو گیا تھا.....

تایا کے گزرنے کے چھ ماہ بعد تو وہ حال تھا کہ عمر بھر کی کمائی چچا کی علالت پر لگ چکی تھی..... جس دن ساجدہ نے تائی کے ہاتھ پر روپوں کا لفافہ رکھا تھا کہ وہ خرچ کریں..... وہ ہر ماہ ہی کچھ نہ کچھ بھیج دیا کریں گی..... تائی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں..... ساجدہ اب پرانی ساجدہ نہ تھیں..... صفا گارمنٹس اینڈ ٹریننگ سنٹر میں بیٹھ کر اپنی محنت کا اور صبر کا پھل کھانے والی میم تھیں جنہوں نے برے وقت میں شکر اور صبر کی لاٹھی کو تھامے رکھا تھا تو آسودہ حالی میں بھی اپنے رب کی شکر گزاری کرنا کبھی نہ بھولی تھیں.....

*

سدرۃ المنتہیٰ

دسائی

مچھیروں کی بستی میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ کریموں کے گھر کو آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے سارے کچے درختوں کی ٹہنیوں، کانٹے دار جھاڑیوں سے بنا دیواری ویڑھا لپیٹ میں لے لیا اور پھر بڑھتے ہوئے شعلے کی طرح بلند ہوا تو کچے مکان کی بانس کی چھتروں بھری چھت پر پھیل گیا۔

شور مچا کر افراد کو گھسیٹا گیا، تب بھی کسی کے دوپٹہ کسی کے رنگین دامن آگ نے پکڑ لی۔ سارے بے امان سے بھاگے۔ چیخیں، دوڑیں، دہائیاں سب تھا۔ ایک تماشا تھا جو حقیقت بن کر پھیل رہا تھا۔

وہ تو شکر ہے صبح کا وقت تھا، ہر کوئی دھندے دیہاڑی کو نکلا تھا۔ چند عورتیں اور بچے رہ گئے تھے جھونپڑی میں۔ آگ بجھانے کو دریائے سندھ چھوٹا پڑ گیا، ان کا بس چلتا تو دریا کو آگ کے اوپر الٹا دیتے۔

''ہائے نی دریا تو اب کیوں نہیں جوش مارتا۔'' دوڑ دوڑ کر بستی کی طرف دریا سے بھر کر بالٹیاں، ڈبے ــــــــــ ٹھٹھر ٹھٹھر کر آہ و زاری بھرتے، دوڑتے بھاگتے افراد آگ کی پیاس بجھانے لگے تھے۔ جن کی اوڑھنیاں اڑ گئیں وہ ہراساں دم بخود کوئی ماں کوئی ابے کے پہلو میں کھڑی تھیں اور ایک وسائی جو بلند ہوتے شعلے کو دم بخود دیکھتے ہوئے ہراساں کھڑی تھی۔ سب جل گیا۔ وسائی کا جہیز، مینا کے گڈی گڑیا، ابا کی سال بھر کی محنت کا لاد کر رکھا ہوا اناج۔ تازے بنے ہوئے مٹی کے لیپ کرنے کے لیے گارے، بکھر گئے، زمین میں پھیل گئے۔

انسان بچ گئے، اسی پر شکرانہ کیا گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ آگ نے ویڑھا جلا دیا مگر کھیتوں تک رسائی نہ پا سکی۔ بھلا ہو دریا کا جس کی سارے میں چھوٹی بڑی نہریں تھیں۔

دریا بھی کبھی کبھار ابا لگتا ہے، یہ وسائی کا خیال تھا۔ پانی دے کر پروان چڑھاتا ہے اور جب خا کھاتا ہے تو ڈنک مارتا ہے، پھیل جاتا ہے، چڑھ جا ہے۔ سارے پر۔ پھر کسی کو نہیں پہچانتا۔ سگی ہو سوتیلی، گاؤں کے گاؤں بہالے جاتا ہے۔ گھر کے اندر گھس آتا ہے، آگ بھی تو ایسی تھی جسے وہ ماں سے تشبیہہ کبھی نہیں دے سکتی تھی۔

چھوٹی ہو تو چولہا چلائے، اناج پکائے، سالن بنائے۔ اگر بڑھ جائے تو سب کو لپیٹ میں لے لے، بے رحم بن جائے، ماں تو رحم لیے لیے پھرتی ہے۔ اسے آج اس آگ سے بڑے گلے تھے۔

سنا تھا کہ منشی کے کاغذوں کی فیکٹری میں آگ لگی، سب کڑکڑا کے جل گیا۔ ساتھ والی بستی کے کھیتوں میں کسی نے تیلی لگا دی تو کھیتی ساری سڑ گئی لاکھوں کا نقصان ہوا۔ تب بھی وہ آگ کو اتنا برا نہیں سمجھتی تھی، مگر اب جب مینو کی گڑیا جل گئی۔ مینو اس کے چھوٹے چچا کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اپنے ابا کی پانچویں بیٹی، سب سے چھوٹی، سب سے لاڈلی۔ باقی سب کی کم عمری میں شادیاں ہو گئیں۔ سفوراں سکھاں، زلیخاں، رشو رہ گئی' وسائی جو ابھی تک بیٹھی تھی، بڑے چاچے کے اکلوتے بیٹے معشوق کے انتظار میں۔ معشوق کوئی اتنا سگھڑ سریلا نہیں تھا یہ خو اس کا کہنا تھا، وہ تو بس بچپن سے نام سنا تو پلے پڑ گیا

دل پر چڑھ گیا۔ ورنہ معشوق جیسے لاکھوں اس کی راہ میں بچھے بچھے جاتے تھے۔

کسی کے ساتھ بھی شادی ہو جانی تھی، اس کے لیے کون سے الگ تھے، سب ایک جیسے۔ خود معشوق بھی جو شہر میں کام ڈھونڈنے کے بہانے نکلا تھا۔

اور وہ بھی عام کہانیوں کے ہیرو کی طرح اب گوٹھ کچی بستی سے کٹ گیا تھا۔ آتا تو ساری رات مچھروں کو جھٹکتا، شکایت کرتا، بڑبڑاتا۔ صبح سویرے جب سارے لوگ کام کاج کو نکلتے، اس کا ابا ہاری (کسان) ہل چلاتا تھا۔ عورتیں بوائی کے وقتوں میں چنائی کے لیے جاتیں یا پھر بیج چھاننے، تو کوئی جانور گائے بھینس بکریاں چرانے نکل پڑتیں۔ وسائی اپنی بھینس کے بچھڑے کو گود میں لیے دوسرے میں ڈنڈا تھامے، ہل، چھی، ما، ہش، ہل کی آوازیں نکالتے ہوئے بھینس چرانے نکلتی اور وہ جو اس کا منگیتر سدا کا کاہل، معشوق جو خود کو شہزادہ تصور کرتا تھا کسی مچھیروں کی ریاست کا۔ رنگ کا گورا چٹا، نین نقش تیکھے، کشادہ پیشانی، کمانی بازو لہراتا، لمبا تڑنگا صحت مند چوڑے سینے والا نوجوان' گوٹھ کا گھبرو، مانا کہ اس جیسے چار اور بھی تھے مگر اس میں کچھ الگ تھا۔ کچھ ایسا جس پر بستی کی چھوریاں فدا تھیں۔ کسی حد تک وسائی بھی، پر اس کا تو حق تھا۔

وسائی کا ابا کھیتوں میں بھی کام کرتا تھا اور دریا سے مچھلی پکڑ کر چھوٹے کو بیچنے کے لیے بستی کے بازار بھیجتا تھا۔

ذات کے مچھیرے تھے۔ وسائی کے دونوں چچا کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ بڑی اکڑ سے ملاح، قدیر، ملاح حمید کہلاتے تھے۔ جو بستی آ کر قدو اور میدو بن جاتے تھے۔

پر بھی تو سب نے سر پر ہاتھ رکھے تھے کہ اب کیا ہوگا، گھر جل گئے، چارپائیاں جل گئیں۔ گھروں کی چھتیں نئی بنانی ہوں گی، کانے بانس کے لکڑ، سب نیا آئے گا۔ ہائے اتنا سامان..... گارے نئے بنیں گے۔ گوبر تھوپے جائیں گے۔ مہینہ لگے گا تب جا کر آدھی دیواروں کو بلند کر کے چھت چڑھائیں گے تب تک کیا کریں..... کہاں جائیں..... معشوق کو بھی فون کیا جو مسلسل مصروف پھر بند جانے لگا۔

وسائی جو پہلے کہتی تھی اماں میں معشوق کو لے (ڈھونڈ) آؤں شہر سے؟'' اس نے سر جھٹک کر کہا کہ مٹی پاؤ، دھول اڑاؤ۔ چل کر کہیں رہنے کا بندوبست کرو، اماں کی وہ آدھی اوڑھنی اوڑھے بیٹھی تھی۔

''چل بستی کے قریب سیدوں کی حویلیاں ہیں وہاں چل کر پناہ لیتے ہیں۔''

''رہن دے ابا! سید بس نام کے رہ گئے ہیں کچھ نہیں ملنا جا کر وہاں۔'' زلیخاں نے منہ بنا کر اب کو کہا۔

''سید سائیں نے پیغام بھیجا ہے کہ آ جاؤ۔''

''لو اب وہ اپنے چار گھروں میں کس کس کو رکھیں گے۔ سیدوں کے گھر سے کھانا آ گیا تھا، پوری دیگ آئی تھی۔ سب کھانے میں لگ گئے، کسی کو تھوڑا کسی کو زیادہ ملا تو پیٹ کی آگ دھیمی ہوئی اور پھر سے رہائش کے فکر نے آ لیا۔ کریموں نے اپنے دوست کو فون کیا جو ڈھائی سو میل کی دوری پر رہتا تھا بستی تو ان کی بھی پہلے سی نہ رہی تھی جب سے سیلاب آیا تھا، زمین بنجر ہو گئی تھی۔

کھیتوں نے نہ اُگنے کی ٹھان لی تھی، جو علاقہ سرسبز رہتا تھا وہ سوکھے کی بستی کہلانے لگا۔ جھاڑیاں پودے تک سوکھے تھے، کریموں کے بچپن کے یار کو دریا سے بڑے شکوے تھے۔ پہلاں کے نام سے جانا جاتا تھا، ذات کا راجپوت تھا۔ بڑے فخر سے ذات بتاتا تھا اور بستی کا ذکر آنے پر کملا سا جاتا اور اب یہ ہی حال کریموں کا تھا۔

''ہندوؤں کے گھروں میں کیسے جا کر رہیں گے، ان کے برتن' ہمارے برتن..... ان کا کھانا، ہمارا کھانا سب الگ۔'' اعتراضات اٹھتے گئے۔

اس سے بہتر تھا کہ سیدوں کے ٹکڑے کھا لیتے دیکھے ہی اچھے، اترنیں پہنیں تو بھی حرج نہیں۔ سیدوں کی گھر والی کے من میں جانے کیا سمائی جو اس نے عورتوں کے لیے کپڑوں کا ڈھیر، اوڑھنیوں کے ساتھ بھجوا دیا، سب نے ایک ایک کر کے لے لیے۔ اب تو دو ٹ بڑھ گئے۔

''پھر کدھر چلیں؟'' کریموں نے سب سے سوال کیا۔ دل میں پہلاج کی محبت تھی، بڑا پرانا ساتھ تھا۔

''ہم نے تو نہ کبھی برتن الگ کیے، نہ ہی کبھی حساب رکھا کھانے پینے کا۔ یار تو یار ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان۔''

مگر بیوی کہتی کہ آج کل تو فرقوں نے ہی اپنی اپنی مسجدیں بنا لی ہیں کریموں! یہ تو پھر بھی ہندو مسلے کا حساب ہے جو قیامت تک چلے گا۔'' بہر حال فیصلہ ہوا کہ پہلاج کی بستی کو چلتے ہیں کہ وہاں کھلے باڑے، چوڑے میدان اور وسیع کچی کوٹھیاں، جن کے آگے کھلے لمبے برآمدے بہت سارے لوگوں کو پناہ دے سکتے ہیں۔

سامان تو تھا نہیں، بس ڈھور ڈنگر لیے اور بیل گاڑیوں پر بیٹھ گئے۔

وسائی کی ماں نے دوپٹے کے پلو کی گرہ میں دو نوٹ چھپائے تھے۔ ضرورت کے لیے' جواب اوڑھنی بٹ جانے پر وسائی کی دسترس میں آ گئے تھے۔

''چھوڑ اماں! یہ دو سو روپے رہنے دے۔ ان سے کرایہ کر کے شہر جاؤں گی اور معشوق کے منہ پر ایک جوتا مار کر آؤں گی۔''

''تجھے حیا نہیں آتی اپنے ہونے والے سائیں کو جوتا مارے گی۔''

''سائیں ہوگا وہ اپنا، میرے لیے وہ معشوق تھا بس' پر اب تو اس کی ذرا عزت نہیں رہی میری نظر میں۔ دیکھ اماں! پوری دستی اجڑ گئی، اس کمینے نے اپنے ماں پیو تک کی خبر نہ لی۔''

''کہتی تو تُو ٹھیک ہے وسائی! بھلا نہیں کیا اس نے یہ۔ ادا میدو کا منہ دیکھو کیسے اترا ہے، شکل مرجھائی ہے اس کی، بیٹے کی لاپروائی سے۔ کتنا کہا تھا شہر نہ بھیج۔''

''اماں! سٹھیا گیا ہے چھورا..... مت ماری گئی اس کی۔ معشوق کہیں عاشق نہ بن بیٹھا ہو کسی شہری چھوری کا۔''

''کبھی بھلا نہ بولنا، ہمیشہ ایسی باتیں کرنا بدشگونی کی۔''

''لے بھلا اس میں کیا بدشگونی ہے اماں! سچ تو ہے یہ۔''

باتیں کرتے کرتے رات بیت گئی۔ پہلاج کی بستی آ گئی، بیل گاڑیوں کا کرایہ تک پہلاج نے ادا کیا کہ کسی کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا تھا سب کو، چائے' پانی، کھانا پینا، روٹی کپڑا، گھر۔

حیرت کسی کو نہیں تھی، سب ساتھ بیٹھے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ پہلاج نے سارا بندوبست کر دیا تھا، دو ہفتے تک وہ لوگ آرام سے رہ سکتے تھے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ عورتیں اور بچے یہاں رہیں گے اور مرد ساز و سامان خرید کر گھر بنانے نکلیں گے اور جب گھروں پر چھتیں پڑ جائیں گی تو آ کر عورتوں اور بچوں کو لے جائیں گے مگر یہ ہو نہ سکا۔ دو دن رہ کر سب نے واپسی کی راہ لی، یہاں عورت اور مرد مل کر کام کرتے تھے، گھر بنانے میں بھی اور کھیتوں میں بھی..... سو یہ ہی ہوا۔

مشکل وقت آن پڑا پر یقین تھا کہ گزر ہی جائے گا۔ ماچس کی ڈبیا بچوں سے چھپا کر رکھی جانے لگی، کہیں کوئی انجانے میں غلطی سے بھی تیلی نہ مار دے۔ سب لوگ اندر ہی اندر ہراساں تھے، آگ سب کے حواسوں پر طاری تھی۔

کوئی بچہ نیند میں ڈر کر اٹھ جاتا تھا۔ خود مینو گڑیا گڑیا کہہ کر رونے لگتی۔ وسائی کی ماں سوتے وقت فکریں بھی کھاتی رہتی۔

''کریموں! اب وسائی کا داج (جہیز) کتھا آئے گا۔''

''اللہ دے گا بھاگی۔''

''اللہ داج دے گا کیا؟''

''ہاں تو اور کون دے گا بھلا۔''

''آسمان سے تو نہیں برسے گا نا، خود جوڑنا ہوگا۔''

''ہاں تو جڑ جائے گا۔''

''کہاں سے جڑے گا، بھانڈاری (گولک) تو جل گئی۔ سارا پیسہ گیا۔''

''اب میں بھانڈاری میں پیسہ نہیں رکھوں گی۔''

''دوپٹے کے پلو سے مت باندھنا، کوئی کھول دے گا چری۔''

''پیسہ ہے کہاں جو باندھوں۔ بس اتنا آئے کہ روٹی دانہ ہو۔''

''آتا ہے چری، آتا ہے پیسہ آ جاتا ہے۔ پیسے نے کہاں بھاگ جانا ہے، گھومتا ہی رہتا ہے امیروں کے ہاتھوں میں ہر وقت، غریب کے پاس کبھی کبھار پر آ جاتا ہے، تو یقین رکھ، ویساہ کر اللہ کی ذات پر۔''

''اوہ اس پر تو ہے ویساہ' پر وہ بڑا تر ساتر سا کر دیتا ہے پیسہ۔ دکھا کر چھین لیتا ہے، غریب کے ساتھ کھلواڑ کرتا ہے۔''

''بک نہ بھاگی، عقل سے کام لے۔ اللہ کو کوس رہی ہے۔''

''ہاں تو اور کسے کہوں، اسی کے ہتھ میں تو سارا کچھ ہے' دے دے نہ ہمیں۔ کیوں ترساتا ہے، ہن کتنی مشکل سے وسائی کا ڈاج کیا تھا، ہک تیلی نے سارا جلا دیا۔''

''زیادہ کڑکڑ نہ کر بھاگی، سونے دے اب مجھے۔''

وسائی کا دل چاہتا کہ جا کر معشوق پر تھوک آئے۔ لعنتی کہیں کا، منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اگلے جمعہ کو جاؤں گی جب ابا پیر بخش کے میلے پر ہوگا۔ اچھے وقت کو سوچتے ہوئے اس نے دوپٹے کے پلو کی گرہ مٹھی میں کر لی اور اس پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ جو گہری نیند آنے کے بعد ہلکی ہو گئی تھی۔

نیند کی گہرائی میں گرہ کا کونا لڑھک گیا۔ چارپائی سے دوپٹے کا پلو لہرانے لگا۔ زبردست کروٹ پر پلو منجھی کی نواڑ میں اٹکا، گرہ کھلی، دو سوکھے چرمرائے ہوئے نوٹوں نے سکھ کا سانس لیا جیسے ہو دوش پر روانہ ہو گئے ڈیوڑھی سے۔

صبح اس نے سر پیٹ لیا تھا۔ ماں نے کہا تھا کہ پیسہ غریب سے اسی طرح بھاگتا ہے اور پھر اس کا نصیب جو ایک الگ پہیلی تھا۔

☆☆☆

''تمہارا نام معشوق کس نے رکھا تھا؟'' وہ سویٹر بنتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

''ظاہر ہے بی بی! اماں ابا نے ہی رکھا ہے او

کون رکھے گا بھلا، زمین پر اللہ میاں تو آنے سے رہے۔'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

بڑے صاحب نے گزرتے ہوئے سن لیا۔

''اللہ میاں ہر وقت زمین پر ہی ہوتے ہیں معشوق! ان کی توجہ زمین پر ہوتی ہے اور نام بھی اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ نام کا پہلا ہندسہ پہلے سے منتخب ہو چکا ہوتا ہے میاں۔''

''بڑے ابا کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔'' وہ متاثر ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں بھی یہی سوچتا ہوں بڑے ابا کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔ ویسے اچھا نام نہیں ہے میرا۔ عشق عاشقی کا ہی تصور آتا ہے۔''

''تمہارا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے، ''م'' سے مجیب، محبوب، محبّ، محراب..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب تمہارے ماں باپ نے اسے معشوق کر دیا۔'' وہ پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ مسکراتے ہوئے اوزار جوڑنے لگا۔ پھر فٹ کیے واشنگ مشین میں اور پھر مشین اسٹارٹ کی، پلگ لگا، ایک زور کا جھٹکا لگا۔ بڑی بھابھی دوڑ کر کمرے سے نکل آئیں۔

''ہائیں اسے کیا ہوا معشوق! کرنٹ تو نہیں آ گیا پھر سے۔''

''نہیں بھابھی جی! بس اب ٹھیک ہے۔ فی الحال تو چلے گی، کچھ مہینے ٹرٹر نہیں کرے گی۔'' اس نے دوبارہ ہلکے سے گول بٹن گھماتے ہوئے کاریگرانہ انداز میں کہا۔ معشوق اس گھر کا فرد بن چکا تھا۔ پہلے پہل کوئی مشینری خراب ہوتی اور دکان پر جاتی، بڑی بی کو ہر وقت یہ وہم ہوتا کہ دکان دار اصل پرزے نکال لے گا اور ہوتا بھی یہی تھا۔ جب سے معشوق آیا تھا، ہر چیز اچھے سے چلنے لگی تھی۔ کبھی وہ اسٹور لے جاتا تو کبھی گھر پر آ کر کام کر جاتا۔ یہ بھی تسلی تھی کہ پرزے نہیں جائیں گے۔ معشوق نے واشنگ مشین ٹھیک کی اور نکل گیا پتی دھوپ میں وہ پسینے میں بھیگا، کرموں کے کیبن پر آ کر بیٹھ گیا۔

''کدھر گیا تھا سالے؟'' شوکی اسے ڈھونڈتا ہوا آ نکلا تھا۔

''بڑے صاحب کے گھر گیا تھا۔'' بیڑی دکھا کر کش لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ تیری منگ کے دس فون آ چکے ہیں، لے بات کر۔ گالیوں کا رسہ دے چکی ہے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے، بندہ پہلے پوچھ لے کہ کون بات کر رہا ہے پھر بکے۔''

''اوہ تو تُو کیوں بگڑ رہا ہے، گالیاں کون سا وہ تجھے دیتی ہوگی، مجھے ہی دے رہی ہوگی گالیاں..... لا دے۔'' فون شوکی سے لے لیا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''کہہ رہی تھی شہر آ کر تھوکے گی تجھ پر۔''

''لے، شہر آ کر تھوکے گی مجھ پر۔'' دہراتے ہوئے ہنس دیا۔ ''اسے لگتا ہے شہر میں مزدوروں کے بجائے چھوریوں کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں۔ اب کتا ہوں کیا جہاں ہڈی ملی وہاں بیٹھ گیا۔''

''وہ تو یہی کہہ رہی تھی تجھے۔''

''کہ..... کتا ہوں میں؟'' بھڑ گیا۔

''اور نہیں تو کیا، جانتی ہے وہ تجھے۔''

''او چل..... ہٹ..... ادھر سے، بکتا ہے۔ جانتی ہے بڑا، ابھی جاؤں گا گاؤں تو سیدھا کر آؤں گا اسے۔ رشتہ نہیں ملے گا اسے کوئی دوسرا۔ اگر چھوڑ دیا میں نے تو۔''

''تو واقعی اسے چھوڑے گا معشوق؟'' شوکی کو غم لگ گیا۔

''نہ..... تیرے لیے نہیں چھوڑوں گا بے فکر رہ، بھاجائی (بھابھی) ہے وہ تیری رشتے کی۔ شادی کر کے رکھوں گا اسے وہیں پر، سمجھتی کیا ہے خود کو ساری حیاتی انتظار کرے گی تو بھی نہیں جاؤں گا۔ سڑتی رہے بس، پتا لگے گا، ہر وقت گالیاں بکتی ہے۔ جب دیکھو تب گالی، کتے کمینے کے سوا بات نہیں کرتی۔''

''آج تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی،

بتاؤں؟"

"خبردار، چپ کرجا۔ وڈا آیا بتانے والا، مٹی ڈال۔" بیڑی لمحوں میں آدھی ہو چکی تھی۔ "جاؤں گا ایک دو دن میں، گالھ کر آؤں گا چاچے سے۔ ڈال آتا ہوں نکاح، بند ہو اس کی ٹیں ٹیں بھی۔ تو فوزیہ سومرو کے گانوں کی کیسٹ لگا، کرموں!"

"مرگئی بے چاری، اب تو جان چھڈ اس کی معشوق!"

"ارے مرگئی ہے پر اس کا فن تو زندہ ہے نا، ہک ہا۔ آواز چھڈ گئی پیچھے۔"

"یہ بتا یہ جو علم دار چوک والی فرزانہ ہے، اس کے ساتھ چکر ہے تیرا؟" شوکی بھی کہاں چھوڑنے والا تھا اسے۔ تب پوچھا جب وہ من پسند گانے کی دھن میں کھویا تھا۔

"کوئی چکر وکر نہیں ہے شوکے، بس دل پشوری ہے۔"

"دل پشوری۔ ابے وسائی کو جو پتا لگا تو؟"

"کون بتائے اسے بھلا؟"

"میں تو نہیں بتاؤں گا۔"

"پھر خواب میں نہیں آئے گا اس کے۔"

"تو ہک کم کر شوکی! سیٹھ سے بات کرا اپنے اک رکشہ لادے مجھے چلانے کے لیے۔"

"ہاں، تاکہ تو شہر کی چھوریاں ڈھونڈتا پھرے۔"

"ابے نہیں نہ یار! کمائی اچھی نہیں ہوتی پلمبری میں۔"

"بک نہ معشوق! اچھی بھلی کمائی ہے تیری۔"

"او پر دل نہیں لگتا نا، سارا دن ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جی بھر گیا ہے۔ رکشہ ہوگا تو کبھی سندھو کنارے، کبھی باغ کی سیر، کبھی میلے میں، کبھی ٹھیلے..... چکر لگتے رہیں گے۔"

"بڑا ہی رنگین مزاج ہو گیا ہے تو یہاں رہ کر معشوق! پہلے تو اچھا بھلا تھا، بس [illegible] کی بات کیا کرتا تھا۔ اب تو فریج اور [illegible]

اچھی کمائی ہوتی ہے۔ کیوں گلی گلی خوار ہونے کی کرتا ہے، تھک جائے گا۔ مجھے دیکھ، نہ گرمی نہ سردی، ہر ویلے تیار رہ۔ پھٹ پھٹی کا دھواں پھیپھڑوں میں بھر گیا ہے میرے۔ مجھے اگر فریج ٹھیک کرنا آئے، کبھی نہ رکشہ چلاؤں۔"

"او تو مجھے بس رکشہ لادے۔"

"تاکہ تو فرزانہ سے روزانہ ملنے جائے؟"

"او نہیں نا ایک فرزانہ تو نہیں ہے۔"

"ہیں؟ پھر کتنی ہیں؟" شوکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ادھر ہمیں تو کوئی گھاس نہیں ڈالتا کبھی، چھوریاں دیکھ کر سڑ جاتی ہیں۔"

"ذرا۔" اپنی شکل آئینے میں دیکھ۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر بولا۔

"تو رکشے کی بات کرے گا نا شوکے؟"

"ہاں کروں گا، پہلے چلا کے دکھا اچھا چلاتا ہے نا۔ ساری زندگی تو تو نے بیل گاڑیاں دھکیلی ہیں، اب ترقی کرنے لگا ہے۔"

"او دیکھنا اک دن موٹر بھی آجائے گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، چن چن کر حسیناؤں کو بٹھانا۔"

"میں کہوں تیرے نام کا اثر آ گیا ہے مزاج پر تیرے۔"

نام کی تو بھلی کہی تو نے شوکے! آج بڑے صاحب کی بیٹی بھی پوچھ رہی تھی تیرا نام کس نے رکھا ہے۔"

"تو نے پھر کیا کہا، ویسے لڑکیوں سے بات کر کے کتنا خوش ہو جاتا ہے نا تو..... شکل ذرا بھلی کیا مل گئی اکڑ گیا ہے۔"

"شکل تو مل گئی شوکے! پر نصیب بھی تو بھلا ہو نہ خالی شکل سے کیا ہوتا ہے۔"

"نصیب میں تو وسائی آئی، کالی کلوٹی..... میلے دوپٹے کو اڑاتی، ٹھی ٹھی کرتی، سارا دن جانوروں میں گھسی رہتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی اپنی صفائی کی فکر

کرلے۔"

بڑے ابا کے گھر کی عورتیں تو اتنی اجلی ہیں، صاف ستھری۔ چھوٹی بی بی کا رنگ تو دودھ جیسا ہے۔"

"او شرم کر پرائی دھیاں (بیٹیاں) تکنے جاتا ہے معشوق۔"

"اڑے نہ یار نہ، میری توبہ! اس گھر کی عورتیں تو میری مائیں بہنیں ہیں۔ بیبیاں ہیں۔ میں تو بس یوں ہی بات کر رہا تھا۔ کبھی دل تو چاہتا ہے نا یار کہ ہم بھی کسی بڑے گھر میں بڑا نصیب لے کر پیدا ہوتے۔

کسی بڑے نام کے ساتھ..... کوئی محبوب، مجیب..... کوئی سیٹھ ویٹھ، کوئی بڑی کرسی والا، کالی موٹر والا شوشیں مارتا ہوا، کڑکڑاتے کپڑے پہنتا۔

حیاتی پر تو مچھیروں کی ذات کا اثر چڑھ گیا ہے، ابے کے کپڑوں سے ایسی مچھیوں کی گندی بو آتی ہے۔ گھر..... اور اماں ہر وقت ہر ویلے گوبر سے بھری، کبھی گارے میں، کبھی بھینسوں کے ساتھ باڑے میں یہ بھی کوئی حیاتی ہوئی..... ہک ہا۔"

وہی ہنکارہ جو ہر انسان اپنی حالت پر بھرتا ہے

☆☆☆

سندھو بڑی موج کے ساتھ بہہ رہا تھا، خدا کی بستی کے کچھ آگے کھیتوں کی طرف انہوں نے نئی بستی بسائی تھی۔ یہاں سے دریا کچھ نزدیک پڑتا تھا، دریا نے اپنے کئی دروازے بنا لیے تھے۔ بڑی دور دور تک نہروں کی صورت پانی کا بٹوارہ تھا، وہ لوگ بھی نہر سے لگ کر ہو گئے۔

مچھیرے پانی کے مزید نزدیک آ گئے تھے۔

کریموں نے بھی مچھلی پکڑنا شروع کر دی تھی، چھوٹے کو پیر میں موچ آئی تھی۔ ایک مچھلی کا کھارا وسائی نے سنبھال لیا، ایک ابے نے۔ مچھیرے کی بیٹی، مچھیرن ہی اچھی' البتہ اس نے کبھی اپنا نام فخر سے لیتے ہوئے گردن اکڑا کر نہیں کہا تھا۔ وسائی ملاح، کبھی اس کا بھی دل کیا ایسے کرلے پر ابھی تو دو سو روپے جمع ہو کر نہیں دے رہے تھے۔ جتنا کماتے اتنا کھا لیتے، روز کا دانہ پانی آٹا ہو جاتا۔ کھیتی میں بھی دیر تھی، ابھی چھ ماہ جیسے تیسے گزارا کرنا تھا، ہر کوئی یہاں آگ کو کوستا تھا۔

اور وہ بھی..... خیالوں میں مگن مچھی کا اسٹال لگائے میلے بورے میں چھوٹی بڑی مچھلیاں رکھے، دوپٹے کے پلو سے مکھیاں بھگا رہی تھی۔

تب ہی دو تین نوجوانوں کا ٹولہ وہاں آ نکلا۔ کوئی گلے میں کیمرہ، کوئی ہاتھ میں پین کاغذ تھامے۔ اس نے سمجھا ٹیکے لگانے والے آئے ہیں یا پھر کیمپ والے ڈاکٹر..... مگر وہ تو کیمپ کے اندر بیٹھے ہیں، لوگوں سے گھبرائے۔ بستی کے آدھے لوگ رہ جاتے ہیں اور کیمپ بند ہو جاتا ہے۔ یہ ادھر کیسے نکل آئے۔ پھر ان کے پاس تو نہ دوائیوں کے باکس تھے نہ گلے میں لٹکا آلہ..... یہ کون ہیں۔

وہ سوچتی رہ گئی، جب کاغذ قلم تھامے ایک خوش شکل نوجوان آگے بڑھا۔

"تم مچھلی بیچتی ہو؟"

"نہ جھک مارتی ہوں اتھے بیٹھ کر۔"

"اچھا۔" وہ ہنس پڑا۔ "کتنے کی ہے یہ مچھلی؟"

"چار سو کی۔"

"ہیں چار سو تو زیادہ ہیں۔"

"مچھلی بھی دیکھ بابو!" پروں سے اٹھا کر سائز دکھایا۔

"ہمم..... ہے تو اچھی، پکا کر دو تو زیادہ پیسے ملیں گے۔"

"میں پکاؤں؟ ایویں..... جا کر اپنی نانی سے پکوا۔"

"میری تو کوئی نانی نہیں ہے یہاں۔"

"پھر خود پکا جا کر۔"

"کہاں پکاؤں؟ آگ کہاں جلاؤں، میں تو مسافر ہوں۔"

"اچھا چل بیٹھا تھے، پکا کر آتی ہوں۔"

او ناں میری مچھلی اگر [illegible]

BOOKSPK Books & Magazines

"یہ دیکھ، یہ میری انگوٹھی ہے چاندی کی اور یہ گھڑی، یہ والٹ سب رکھ لو، امانت کے طور پر۔"

"نہ نہ صاحب، اتنی بھی بے ایمانی نہیں مجھے۔"

"اوبھا..... ذرا دیکھنا اسے میں ابھی آئی۔"

ایک دو تین چار..... آٹھ بارہ، اٹھارہ، بس گنتی آتی تھی، پوری مچھلی گن کر ایک لے گئی بڑے سائز والی۔ کچھ دیر میں گرما گرم مچھلی کے ساتھ چاول کی روٹیاں لائی۔ وہ خوش ہوگیا، وہیں بیٹھ کر کھایا۔ دوستوں کو بھی کھلایا، اسے ہزار کا نوٹ دیا۔

"ہیں اتنے پیسے صاحب؟"

"تمہارا بہت شکریہ، تم نے اتنی محنت کی۔"

"ہوں..... اب میں شہر جاؤں گی۔"

"تمہیں شہر جانے کا شوق ہے؟"

"ہاں صاحب! معشوق رہتا ہے شہر، اس کے منہ پر جوتا مارنے جاؤں گی۔"

"معشوق تمہارا بھائی ہے؟"

"بھائی ہوگا تیرا، میرا تو منگیتر ہے۔"

"اوہ..... اوہ..... واہ بھئی۔ تم اس سے ناراض ہو؟"

"سو تو ہوں۔"

"اچھا، کہاں ہوتا ہے شہر میں وہ مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا پیغام دے دوں گا اسے۔"

"یہ تو نہیں پتا، شو کے کے ساتھ کیبن پر بیٹھتا ہے اور استاد کے ساتھ مشینیں ٹھیک کرتا ہے۔"

"چلو میں اسے ڈھونڈوں گا، پھر تمہارا پیغام دوں گا۔"

مگر نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا ناں..... وسائی ہے صاحب۔"

"وسائی کا مطلب کیا ہے؟"

"اللہ جانے۔"

"نام کس نے رکھا تھا؟"

"ابے نے۔"

"تو پھر ابا جانتا ہوگا؟"

"ہوگا..... میری تو آج کمائی ہوگئی۔ بہت شکریہ صاحب۔"

"کوئی بات نہیں، آج کل میرا چکر لگتا رہے گا۔ میں تم سے مچھلی پکوا کر کھا سکتا ہوں وسائی!"

"آپ ہمارے ویڑھے آجایے گا، ہم کھلادیں گے مچھلی آپ کو۔"

"کس طرف ہے تمہارا ویڑھا؟"

"خدا کی بستی سے ذرا آگے کو ہے، مچھیروں کی بستی۔ وہاں جو ملاح مل گیا، کہنا وسائی کے گھر جانا ہے۔ اوہ ناں، تو کہنا کریموں کے گھر جانا ہے۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔"

اگلے دن وہ واقعی آدھمکا تھا۔ پورے ویڑھے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کریموں کے ساتھ اس کی خوب جمی تھی۔ کریموں نے بتایا کہ وہ پہلے خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے پھر دریا کنارے آکر آباد ہوگئے تو یہاں سے اٹھنے کا دل نہیں کرتا تھا۔

"پہلے جب بھی کہیں تو میں آباد ہوئی ہیں، دریاؤں کے کنارے آباد ہوئی ہیں۔ پانی تو انسان کی بقا ہے۔" وہ تاریخ کا شاگرد رہ چکا تھا اور ابھی بھی تہذیب و تاریخ ہی اس کا مضمون تھا۔

تب ہی چار دن کی بھی چھٹی ملتی تو وہ قصبوں، دیہاتوں، میلوں، ٹھیلوں میں نکل جایا کرتا تھا۔ اسے دلچسپی تھی لوگوں کے رہن سہن میں، بولی (زبان) تہذیب، لہجہ، سوچ اور طرز زندگی میں۔ ہر ایک کی زندگی کو دلچسپی سے دیکھتا تھا وہ، کئی بستیوں سے ہو آیا تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں خدا کی بستی کے آگے کی کچے کی چھوٹی سی آبادی کے افراد کی کشش بار بار کھینچ لاتی تھی۔

وسائی سر پر مچھی کا کھارا رکھ کر نہر کنارے لگے بازار کی طرف جاتی تھی۔ جاتے ہوئے یہ کھارا خالی ہوتا جس میں صرف، مچھلی کو پکڑنے کی جالی اور کانٹا تار کے ساتھ جڑا ہوتا۔ واپسی پر کبھی دو چار مچھلیاں بچا

آتی تو کبھی کھارا خالی ہوتا اور ابھی وہ خالی کھارا لیے ڈیوڑھی کے پار بیٹھی تھی۔ جب منصف وہاں سے گزرتے ہوئے رکا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"تیری مرضی ہے بابو! یہ زمین میرے پیو کی تھوڑی ہے۔" لہجے میں تلخی تھی، جس کی وجہ بھی وہ جانتا تھا۔

ایک دن پہلے وہ چھوٹے اور وسائی کو شہر لے گیا تھا۔ پلمبروں کی دکانیں چھانیں، معلوم کیا، پوری مارکیٹ دیکھی معشوق کہیں نہ ملا۔ چھوٹے کو رج کہ ربڑی کھلائی، وسائی کے حلق سے کچھ اتر کر نہیں دے رہا تھا۔ اسے بس معشوق کی تلاش تھی۔

اور پھر واپسی پر اس نے گاڑی رکوائی، شہر کے بیچ ایک ڈھابے پر اس نے معشوق کو فرزانہ کے ساتھ دیکھ لیا۔ رکشہ بھی کھڑا تھا، دونوں بنچ پر چائے پی رہے تھے۔

وہ پھرتی سے گاڑی سے نیچے اتری اور پاؤں سے اتار کر جوتا اسے کھینچ مارا۔ ٹھیک نشانے پر جالگا تھا۔ معشوق کے منہ پر، چائے کا کپ گر گیا۔ وہ پہلے حیران پھر حواس باختہ ہوا جب ہوش آیا تب تک وسائی اس کے سامنے زمین پر تھوک کر گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی۔

وہ پیچھے بکتا جھکتا نظر آیا۔ منصف نے اس وقت بھی وسائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور اب بھی نمی تھی۔

"تمہیں پتا ہے وسائی! میں نے چھ سال پہلے شادی کی تھی، جب میں پڑھ رہا تھا۔ آخری سال میں تھا اور— لو میرج کا مطلب سمجھتی ہو نا، یعنی کہ پسند کی شادی۔" وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ دنیا میں ایک وہی دکھی نہیں ہے۔

"مگر آج ہم دونوں الگ ہیں۔ میرا ساڑھے تین سال کا بیٹا ہے جو کبھی اپنی نانی تو کبھی دادی کے پاس ہوتا ہے۔"

"تجھے زنانی نے چھوڑ دیا صاحب!"

"نہیں وسائی! ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔"

"تو اسے مارتا تھا بابو؟"

"نہیں وسائی۔"

"پھر وہ تجھے مارتی تھی کیا؟" وہ آنکھ کے گوشوں کو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ تھی۔

"نہیں، وہ بھی مجھے نہیں مارتی تھی۔"

"تو اسے گالیاں بکتا تھا؟" وہ اپنے تئیں وجہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"نہ وسائی! بس ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہ رہ سکے تھے۔"

"تو نے اسے کپڑے دلائے؟"

"بہت سارے وسائی۔"

"سرخی لاتا تھا۔"

"وہ ان چیزوں سے خوش ہونے والی نہیں تھی۔" وہ اس کی معصومیت پر ہنس پڑا تھا۔

"پیار سے بات کرتا تھا اس کے ساتھ؟"

"بہت دفعہ کی۔"

"تب بھی چھوڑ گئی؟"

"تب بھی چھوڑ گئی۔"

"تو اب جا اسے منا کر لے آبابو!"

"اب نہیں ہوسکتا نا، اب تو ہماری علیحدگی ہوچکی ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی شادی تھی۔"

"اس کی شادی؟" وہ دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

"ہاں..... اس کی شادی۔"

"تو کتنا ظالم ہے بابو! اپنے بچے کو جدا رکھا ہے۔"

"رات کو جاتا ہوں تو لپٹ کر سوتا ہے۔"

"دن بھر دادی کے پاس رہتا ہے۔"

"ماں کو یاد کرتا ہوگا؟"

"ماں کو بہت یاد کرتا ہے وسائی!"

"صاحب! اب تو بھی شادی کر لے۔"

''اب جی نہیں چاہتا وسائی!''
''جی کی خاطر نہ کر، بچے کی خاطر کر لے۔''
''کون اس بچے کو اپنائے گی؟''
''صاحب تجھے بہت چنگی چھوری ملے گی، دیکھنا وسائی کی دعا ہے یہ۔''
وہ اس کی تسلی پر صرف مسکرا دیا۔

☆☆☆

اگلے دن معشوق آدھمکا تھا، پورے ویڑھے کو سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ تماشا کھڑا کیا ہوا تھا۔
''مجھے نہیں رکھنی یہ منگنی۔ بھرے شہر میں جوتا مار کر گئی ہے۔'' معشوق گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا تھا۔ ماں پیو سے نہیں سنبھل رہا تھا۔ وسائی ڈھیٹ بنی بیٹھی تھی۔ کریموں کا سر جھکا ہوا تھا، ملول تھا۔ بھاگی کی آنکھوں مین آنسو تھے، اس نے ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ معشوق کو ماں پیو سمجھا رہے تھے کہ درگزر کر پر وہ سب کچھ منہ پر مار کر نکل گیا۔ بستی میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ جیسے چھناکے کے ساتھ کوئی خواب ٹوٹا ہو۔

وسائی رات کے پچھلے پہر ویڑھے سے باہر دریا کے کپ (کنارے) پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ پانی اس کے دکھ کا ساتھی تھا۔ وہی اس کی آنکھوں میں بھی تھا۔
اسے لگا اس کے آنسوؤں سے دریا بھر جائے گا۔ خشکی کا حصہ ڈھک جائے گا، ریت ڈھک جائے گی، دکھ ڈھک جائے گا۔

☆☆☆

ویڑھے والے کہہ رہے تھے، معشوق وسائی پر تھوک کر گیا ہے۔ جوتا مار گیا ہے اس کے منہ پر، اسے ٹھکرا کر۔
اور وہ صبح سویرے مچھلی کا کھارا لیے چھوٹے بازار کی طرف جا رہی تھی۔ جب منصف اسے ملا۔
''وسائی! آؤ آج میں تمہیں مزے کی چیز دکھاؤں۔'' اس نے موبائل کی اسکرین کو چھوا اور البم کھل گیا، اس کے بیٹے کی کئی تصویریں تھیں۔
''کتنا سوہنڑاں ہے یہ صاحب!''
''اللہ سائیں اس کے نصیب بھی اچھے رکھے، آمین۔'' اس بار اس نے وسائی کی آنکھوں کا سمندر دیکھا۔ غضب کا دکھ تھا، کل کی کارروائی کا بھی پتا چلا تھا۔ وہ موبائل بند کرنے کے بعد کئی منٹ خاموش رہا۔
''میں جاؤں صاحب؟''
''وسائی کچھ کہو نا، مجھے پتا ہے تم رات بھر روئی ہو گی۔'' اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھتے بولا۔
''صاحب! میرا قصور تھا یا معشوق کا؟''
''وہ تمہاری قدر نہیں کر سکا وسائی!''
''مجھے تو قسمت کھا گئی صاحب۔''
''نہیں وسائی، تم تو بہت اچھی ہو۔ پریشان نہ ہو بہت اچھا رشتہ آئے گا تمہارے لیے۔''
''رہن دے صاحب' کوڑ نہ مار (جھوٹ نہ بول)۔''
''جھوٹ نہیں بول رہا، نہ تسلی دے رہا ہوں۔ سچ بول رہا ہوں۔''
''کسی کی قسمت ٹوٹ جائے تو سدا ٹٹ جاتی ہے۔''
''ابا کہتا ہے ہک واری لاری چھٹ جائے۔ پھر نہیں ہتھ چڑھنی۔''
''لاری نہیں چھوٹی وسائی!
لاری تو وقت پر آئے گی، تم دل بڑا رکھو۔''
''چھوڑو صاحب! آسرے نہ دیو۔''
''آسرا تو اللہ کا ہوتا ہے وسائی! جب کوئی انسان دیتا ہے تو وہ بھی اللہ کی طاقت کا آسرا ہی دیتا ہے۔''
''تو نے نہیں کہا تھا کہ میں تیرے لیے دعا کروں گی۔''
''بس پھر میں بھی کروں گا تمہارے لیے دعا۔'' وہ بھی اس بار کھوکھلی ہنسی ہنس دی تھی۔
''تجھے معشوق کو چھوڑنے کا دکھ ہے وسائی؟''
''تو بس ہک دعا کر صاحب! کہ وسائی کا جتنا

دل دُکھا ہے معشوق پر اتنی سزا نہ چڑھ جائے۔ بھرے کا تو پتا لگے گا، پر میں نہیں چاہندی کہ بھرے۔''
''تو اسے معاف کر دے گی؟''
''نہ صاحب! اتنا بھی دل بڑا نہیں میرا۔''
''بس پھر چھوڑ دے وسائی!''
''چھڈ دیا بابو! لاری کوں چھڈ دیا، جتھے کھے اتھے رکھے۔'' وہ کھارا سر پر رکھے آگے بڑھ گئی۔
منصف حیران رہ گیا۔

☆☆☆

مچھیروں کی بستی میں بہار آئی تھی۔ بہار کے ساتھ شہر سے بارات آئی تھی۔ یہ بارات منصف کی تھی وسائی کے لیے۔ وہ بس حیران ہوا تھا، اس کی ہمت اور فیصلہ قبول کر لینے کا تحمل دیکھ کر۔ وہ تحمل جو بڑے بڑے پڑھے لکھوں میں بھی نہ تھا۔ وہ تحمل جو حیاتی کے پیچ وخم سکھاتے ہیں۔ سمجھ تو آتے آتے آتی ہے، اسے پھر کیسے آ گئی۔ وہ جو سر پر مچھی کا کھارا رکھے لاپروا سی پھرتی تھی۔

☆☆☆

منصف کی ماں، بیٹے کے کہنے پر وسائی کا رشتہ مانگنے آئی تھی۔ وسائی کی بستی میں رونق آئی تھی' نصیب ایسے جاگتے ہیں یہ کسے پتا تھا۔
بس ایک ہاں کے بعد جیسے بند قفل کھل گیا اور فوارے پھوٹ پڑے۔ وسائی کو دکھ اور خوشی دونوں کیفیتوں میں پانی دکھتا تھا۔ پانی کی مثالیں بھری ہوئی تھیں۔
اس بار نہ جہیز کی مانگ ہوئی، نہ سونے کی۔ وسائی کے لیے شہر سے پہلے ڈھیر سارے کپڑے اور میک اپ کا سامان آیا اور پھر بارات آ گئی۔
آج معشوق اتفاق سے گاؤں لوٹا تھا، اسے فرزانہ نے چھوڑ دیا تھا۔ سوچا تھا کہ گوٹھ جا کر وسائی کو منا لے گا۔ بس دریا کا واسطہ ہی تو دینا تھا اور کہنا تھا کہ اگر نہ مانی تو اسی دریا میں ڈوب کر مر جاؤں گا۔
گاؤں آ کر وہ حیران رہ گیا، یہ کیا وسائی کی بارات..... وہ بھی شہر سے بقول اس کے وسائی میلی کچیلی..... مچھیوں کی بو سے بھری۔ دن بھر آوارہ رلتی۔
کہاں شہر کا پڑھا لکھا بابو..... اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ سوچنے لگا کہ یہ جھوٹ ہے، چاہنے لگا کہ خدارا جاگتے کا خواب ہو، ادھر آنکھ کھلے یا پھر پلک جھپکے یا پھر کروٹ بدلے اور سب کچھ بدلا ہوا ملے۔
وسائی شہری بابو کے ساتھ رخصت ہو کر جا رہی تھی۔ وہ جو سوہنڑاں تھا، شہزادہ دکھتا تھا۔ مچھیروں کی بستی کی آن تھا، آنکھ کا تارا تھا۔ اب سب کی آنکھوں میں اٹکا تھا۔ لوگ اس پر۔ تھو تھو کر رہے تھے وہ جو کل وسائی کی ہنسی اڑاتے تھے' آج اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ لوگ اس طرح پینترا بدلتے ہیں؟ وہ حیران تھا۔ وہ باراتیوں کے جھل مل کرتے مکھڑے، سجی گاڑیاں، رونق دیکھتا رہا۔ وہ بس دیکھتا رہا اور وسائی منصف کے ساتھ رخصت ہو کر شہر کی ہو گئی۔
اور وہ رہ گیا..... بارات کے پیچھے کھڑا، دیکھتا رہا۔ جس کو ٹھکرا کر کبھی وہ شہر بھاگا تھا۔ وہ اسے حیران چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اس نے وسائی کو ڈاج دینا چاہی تھی، نصیب اسے ڈاج دے گیا۔ کھیل گیا، وہ اپنے ساتھ ہی کھیل گیا۔
ملاح نے ساون گایا۔ لہریں اٹھیں، بادل آئے، موسم بدلنے کی پہلی برسات آئی۔ وسائی نے دریا کا رخ کیا۔
بھولی بھالی وسائی، خوشبوؤں میں بسی، کشتی میں بیٹھی، جال میں کانٹا پھنسایا۔ منصف کے ساتھ شرط لگائی اور مچھلی نکل آئی۔ وہ ہنس پڑا۔
برسات برس گئی' دونوں چھپر کی اوٹ میں ہو گئے۔ مچھیروں کی بستی کی ایک جھونپڑی میں رکھی لالٹین کی لو بڑھا دی گئی اور طاقچے میں رکھا دیپ جلایا گیا۔ رات سارے پر چھا گئی اور چھما چھم برستے بادلوں نے دریا کے ساتھ معاہدہ کیا، پانی کی دست یابی کا۔

مکمل ناول

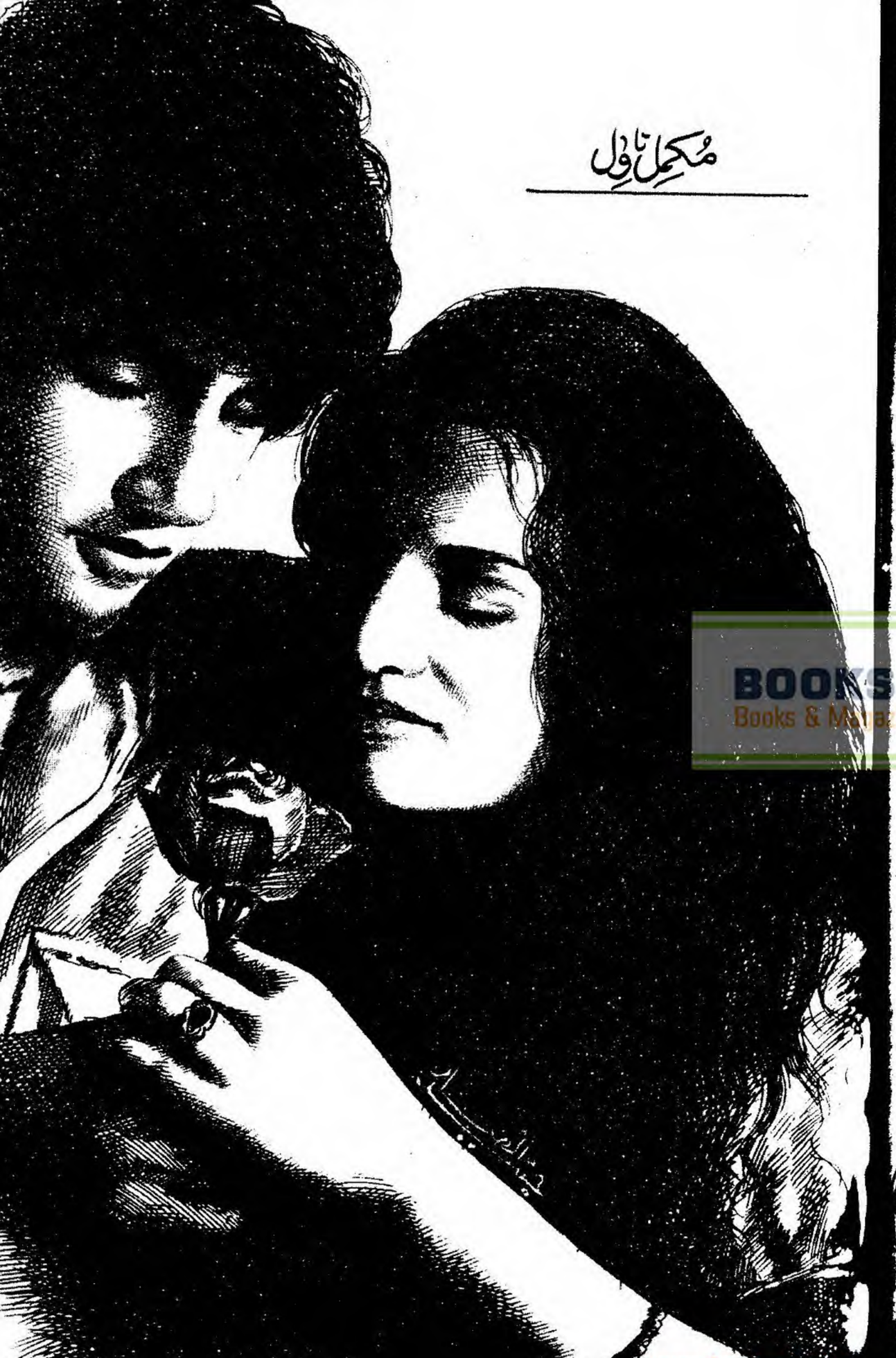

فرح بخاری

سن ساوی

دھرمیشور کلکتہ کا مشہور رئیس، بظاہر مویشیوں کا بیوپاری ہے لیکن در پردہ وہ سندر بن سے لائے نایاب جانوروں کی بیرون ملک اسمگلنگ کا کام، ابوصالح کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ بنگلہ دیشی ابوصالح کا فشری کا قانونی کاروبار ہے اور صمیم طالب اس کا بزنس پارٹنر ہے لیکن دو نمبر دھندے میں ابوصالح دھرمیشور کا ساتھی ہے۔

ایک چھاپے میں دھرمیشور، ابوصالح کو پھنسوا دیتا ہے تو وہ انتقاماً اپنے بھروسے کے آدمی رافع محمد کے ذریعے اس کی بیٹی ویملا کو اغوا کرالیتا ہے۔ ویملا اپنی سوتیلی ماں سے تنگ ہے اور اس اغوا میں، اس کی رضامندی بھی شامل ہے۔ دونوں کے درمیان تاوان کی رقم آدھی آدھی بانٹنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر ابوصالح، دھرمیشور سے ڈیل کر کے خود کو دھوکے سے پھنسائے گئے معاملے سے بری کروالیتا ہے۔

وہ رافع، دھرمیشور اور ویملا تینوں کو فریب دے رہا ہے اور تینوں ہی ابوصالح کی بدنیتی سے بے خبر ہیں۔ رافع، ویملا کو منصوبے کے مطابق دوسرے آدمیوں کے حوالے کر دیتا ہے مگر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے وہ پتا چلالیتا ہے کہ ویملا ان کے قبضے میں نہیں، وہ اسے جنگل میں بے ہوشی کی حالت میں ملتی ہے۔

BOOKSPK
Books & Magazines

تیسری اور آخری قسط

رافع جانتا تھا کہ ویملا کا سکون دراصل اس کی بے خبری ہے۔ سومیہ اور اُس کے رشتے کے بارے میں جاننے کے بعد ویملا کا یہ موجودہ سکون یقیناً نہیں نہیں ہونے والا تھا۔ جس کنگن کو وہ اپنے اور رافع کے نئے رشتے کا آغاز سمجھ رہی تھی، وہ پہلے ہی سومیہ کی کلائی میں سج چکا تھا رافع کے نام سے۔

☆☆☆

اظہار تمنا بہتی ندی پہ رواں ناؤ جیسا تھا۔ کشتی کو گیلے ساحلوں سے بہتے پانیوں کی اور دھکا دینے تک کا فاصلہ۔ پھر موج جانے یا وہ نازک پتوار کہ جس کا ملاح اسے ہر آندھی طوفان سے بچائے لے جانے کا تہیہ کیے بادِ مخالف کا ہر تھپیڑا خود اپنی ذات پر سہے چلا جاتا ہے اور جھیلوں سا گہرا، بھید بھرا وہ سبک دل سوائے رافع محمد کے کس کا ہوسکتا تھا۔ محفل میں لوٹ آنے کے باوجود جو سُندری کی چھاؤں تلے کہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ کبھی کہیں اور نہ جانے کے لیے۔ کسی ایک راہ کا مسافر بن کر۔ ویملا افتاں وخیزاں کبھی یہاں تو کبھی وہاں بھٹک رہی تھی۔ بے باکی و بہادری سرشت میں نہ ہوتے دکھانی پڑ جائے تو اور حواس باختہ کرتی ہے۔ نشاد نے اس کے بالوں میں پھول اٹکائے تو اُس نے کانپتے ہاتھوں سے گھبرا کر اُتار پھینکے۔

من کسی اور جانب مائل ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جانے رافع نے کیا سوچا ہو۔ یوں بے دھڑک بولنے والی بات بھی نہ تھی۔ وہ متحیر و متردد پھر کسی کمرے میں گھس گئی۔ دل کی وحشت سے نمٹنا آسان نہ تھا۔

رافع سب دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ ویملا کا سٹپٹانا اُس لمحے جس قدر مزا دے رہا تھا۔ اُن لمحوں کی طوالت میں زیادہ دخل خود اسی کی بے رُخی اور سنجیدگی کا تھا۔ چہرے پر متانت اور بھرپور بدبے کا تاثر لیے وہ ہر گز گزرے کچھ پلوں سے متاثر نظر نہ آتا، جبکہ ایک وہی جانتا تھا کہ اطراف کیسی دھند چھانے لگی تھی اور اِس دھند کے پار ایک ویملا تھی جو پوری طاقت سے ہر منظر پر حاوی و طاری نظر آتی تھی۔ ہر سُو ایک وہی تھی۔ جوگن کا سا روپ دھارے، جوگ لینے پر مجبور کرتی، کیا وہ واقعی کبھی سومیہ کا تھا؟ ایک اظہار کیا باہوش وحواس وعدے کے پاس دار کسی سلجھے ہوئے انسان کی یوں مت مار دیا کرتا ہے کہ وہ سب بھول بیٹھے۔

یہ غلط ہے۔ یوں نہیں ہوتا، یوں ہونا نہیں چاہیے۔ پر یہ ہوا تھا، ویملا کے خود کو شادی شدہ کہنے کی بات نے اول دن سے رافع کے دل پر تالے لگا رکھے تھے۔ اور اب۔ پنچھی کو قید سے رہائی ملی تھی اور کیا خوب ملی تھی۔ کھلی فضاؤں کو بانہوں میں بھر لینے کا خوش کن احساس رافع کو اوپر ہی اوپر اڑائے لیے جا رہا تھا۔

اور ایک وہ تھی۔ بظاہر ہنستی کھلکھلاتی، مگن اور مست، پر رافع پر نظر پڑتے ہی بوکھلا کر دائیں بائیں ہوتی کہ اب تک کے وقت میں رافع نے اس کی ایک بھی بات پر اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

وہ سومیہ اور نشاد کے ساتھ کسی بات پر ہنستی ہوئی باہر نکلی لیکن نظر رافع کے سنجیدہ چہرے پر پڑی تو گھبرا کر نیچے دیکھنے لگی۔ رافع نے بے ساختہ در آئی ہنسی کو لبوں میں چھپایا۔ جانے کیوں پر اس کی گھبراہٹ خوب لطف دے رہی تھی۔ وہ بار بار کسی امید پر چہرا اپڑھنے کے لیے چور نگاہیں رافع کر جانب ڈالتی تو وہ وہی سنجیدگی اوڑھے سراسر لاتعلق بیٹھا دکھائی دیتا۔

ویملا اپنی عجلت پر بلاوجہ پشیمان سی ہونے لگتی۔ مایوس ہو کر لوگوں کو چھوڑتے ایک بار پھر تنہا باہر نکل گئی۔ رافع نے ایک اچٹتی نظر باہر جاتی ویملا پر ڈالتے چوکھٹ پہ گرے پھولوں کو دیکھا۔ اب وہ کیسے سمجھاتا کہ سوائے اس جوگن کے اب تو اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سومیہ کا حسن اس کے ناز و ادا تو کبھی دل میں براجمان ہی نہ ہوئے تھے۔ امانت سمجھ کر نفس کا دفاع کرتے وہ تو دل کی خیانت سے خود کو پہلے پل بھی بچا نہیں پایا تھا۔ ہر سُو ایک وہی تھی جو آج اور ابھی سے نہ تھی۔ لانچ کے نچلے کمرے میں اندھیرے حصے سے روشنی میں آ کر ہاتھ جوڑے اسے کلکتہ واپس مڑنے کی التجا کرتی ہرنی جیسی آنکھوں والی مضطرب، گھبرائی لڑکی اور وہ منہ زور جذبوں پر آپ ہی دو حرف بھیجتے انہیں جبراً پیچھے دھکیلتے باہر نکل گیا تھا۔ ہاں پر وہ ویملا ہی

تھی۔۔ ہمیشہ سے اندر موجود۔

لب سمٹ گئے، دل ایک نئی لے پر بے اختیار دھڑکا۔۔ بس اب اور تنگ کرنا اپنے اختیار سے بھی باہر ہو رہا تھا۔ اس نے چوکھٹ پہ گرے پھول اپنے رومال میں ڈالتے خود بھی چپکے سے باہر کی راہ لی۔

"پھولوں سے کون بے دردی سے پیش آتا ہے۔ ہوں؟"

رافع نے کچھ پھول اس کے بالوں میں اٹکائے۔

"لو اب یہ بھی اپنے ہاتھوں سے پہنا دو۔ دعا دی ہے، رسم بھی تو پوری کرو۔" رافع نے کنگن اور کلائی اس کے سامنے کی جو درخت کے پیچھے چھپتی ہی جا رہی تھی۔ جذبات بدلتے کیا آواز بھی بدل جایا کرتی ہے۔ یہ انداز یہ آواز رافع کی تو نہیں ہوسکتی۔ وہ سختی سے آنکھیں میچے کھڑی تھی۔ رافع نے اس کی بھیگی ہتھیلی کھول کر کنگن اس میں پھنسایا اور اپنی کلائی سامنے کر دی۔ ویملا بے یقینی سے اس کے آگے بڑھے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ کہیں وہ اس کا دل رکھنے کو۔

وہ سوچ کر مخمصے میں تھی

"دل رکھنے کو نہیں کہہ رہا۔" رافع نے مبہم سا مسکرا کر باور کرایا تو وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ بنا کہے رافع نے کیسے جانا تھا۔

"سب جانتا ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔" اس نے انگلی کی نوک سے ویملا کی ٹھوڑی اونچی کی تو وہ جھینپ کر منہ موڑتے اپنی ہنسی نہ چھپا سکی۔

"میں جاؤں ویملا! کوئی آ جائے گا۔" اسے ماحول کی نزاکت کا بھی احساس تھا۔

"نہیں۔" وہ ایک دم بے چین ہوئی۔ ہاتھ آئے حسین لمحوں سے ابھی تو ڈھیر ساری خوشیاں چرانی تھیں۔

"کل صبح پانچ بجے ہماری زندگی کے نئے سفر کی شروعات ہوگی ویملا! مجھے ابھی بہت کچھ کہنا بہت کچھ سننا ہے۔ ایک دوسرے کی سنگت میں کل ہم وہ سندر روپ دیکھیں گے جس کی تم نے چھبی بھی نہیں دیکھی۔"

وہ اس کے کان میں بولا تو ویملا شرما کر آگے بھاگ گئی۔ رافع کے محبت بھرے انداز نے زبان ہی گنگ کر دی تھی۔

رافع تیز قدموں سے گھاٹ کے راستے پر اس کے پیچھے آیا۔ ویملا بجائے رُکنے کے بے دھیانی میں چلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس درختوں کے جھنڈ اور کہیں کہیں مچھلیاں رکھنے کے خود ساختہ صاف تالاب تھے۔

"بستیوں میں بھی باگھ نکل آیا کرتے ہیں۔" اس نے ہم قدم ہوتے رسان سے اطلاع دی۔

ویملا نے اس کی آواز پر مسکراہٹ ضبط کی، لیکن چپ رہی۔

"میں ساتھ ہوں۔ اِس لیے باگھ سے ڈر نہیں لگتا؟" وہ جانے کیا سننا چاہتا تھا۔

ویملا سر جھکائے مسکراتی ہی رہی۔

"اور..... اکیلے واپس جانا پڑے تو؟"

"واپس..... کہاں.....؟" وہ بیچ راہ میں ٹھٹھک کر رُکی۔ تھرکتی پتلیوں میں لہروں سا اضطراب تھا۔ وہ ایک دم ہی ہنس پڑا۔

"ارے بھئی میں تو بارڈر تک جا سکتا ہوں، آگے تو اکیلے ہی جاؤ گی۔"

"انڈیا.....!" وہ زیرلب بڑبڑاتے جیسے کسی طویل خواب سے جاگی تھی۔

"لیگل طریقے سے نہیں بھیج سکتا۔ ظاہر ہے چوری چھپے ہی بارڈر پار کروانا پڑے گا۔" وہ اب سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ ویملا حیرت سے اس کے بدلتے رنگ کو دیکھے گئی۔

"اور تم م م....." وہ کہتے کہتے ہچکچا گئی۔ رافع نے تعجب سے کندھے اُچکائے۔

"مم..... میرا مطلب ہے۔" وہ مدعا نہ سمجھا پاتے ہچکچا کر آگے بڑھ گئی۔

"میں" کیا؟" وہ پُرشوق نگاہیں ڈالے جو سننا چاہتا تھا ویملا کے لیے بیان کر دینا ناممکن ہو گیا اُس لمحے۔ سر جھکائے وہ خاموش ہی کھڑی رہی۔

''ہونے والی سسرال میں ہمیشہ کا داخلہ چاہیے تب ایک بار تو میکے جانا ہی پڑے گا۔ ہوں.....؟''
اس نے ایک ابرو اٹھا کر تائید چاہی اور وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ رافع نے مونچھوں کو عادتاً انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے سیدھا کرتے مسکرا کر دیکھا اور اُن دونوں کی تلاش میں چوری چھپے پیچھے آنے والی سومیہ نے درخت کی اوٹ سے یہ منظر نہ صرف دیکھا بلکہ باوجود آواز سنائی نہ دینے کے سمجھا بھی۔

☆☆☆

بھرے بھرے گہرے بادلوں نے سورج کو چہرا دکھانے کی مہلت ہی نہیں دی اور منہ اندھیرے ہی آسمان کو ٹھنڈی سرمئی چادر اوڑھا دی۔ رافع اپنے ایک دوست کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ صبح پانچ بجے ماماجی کے گھر آیا تو تھکے ہارے سب ہی بے سُدھ سوئے تھے۔ ویملا اس کی توقع کے خلاف نہ صرف جاگ چکی تھی بلکہ گھر کے باہر والی بانس کی حد بندی کے ساتھ لگی اسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بنا کسی کو جگا کر ڈسٹرب کیے دونوں گھاٹ پر آ گئے۔ اُن دونوں کے علاوہ صرف نشاد جاگ رہی تھی، اس نے صبح سویرے کی ٹھنڈ اور موسم کو دیکھتے ویملا کو ایک میرون شال اوڑھا دی تھی۔

چھوٹے سائز کی اس قدرے جدید لانچ کو پانی کی لہروں پر چھوڑتے اب اُن دونوں کا رُخ انڈین سرحد کی طرف تھا اور یہ ایک اچھا خاصا طویل راستہ تھا۔

صبح سویرے سفر آغاز کرنے کا رافع کا مقصد ہی یہی تھا کہ دن کی روشنی میں وہ کسی طرح یہ سارا سفر تیزی سے پانیوں پہ طے کرتے شام تک بارڈر کے قریب پہنچ جائے۔ اب تک کا تمام سفر خوب احتیاط سے انجام دیتے اب آخری دن وہ کوئی بے احتیاطی کر کے ویملا کے یہاں سے جانے کا کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اسٹیئرنگ کے دو ہینڈلز کو ہاتھ میں لئے رافع محمد صبح سے بھی کہیں زیادہ فریش اور تروتازہ نظر آتا تھا۔ نہا کر سفید شرٹ کے ساتھ اس نے کاٹن کی سادہ ڈارک براؤن پینٹ پہنی تھی۔ گیلے بال لچھوں کی صورت اب کہیں کہیں سے سوکھ کر اڑنے لگے تھے۔

دریا کے چوڑے پاٹ کے کنارے کنارے طویل درختوں کا سلسلہ، بادلوں بھری گہری کسی قدر اندھیری سی صبح، اور شفاف، نیچرل، ہر قسم کی آلودگی سے پاک اُس مکمل قدرتی نظارے کو دیکھ کر رافع کو اپنے دل سے اٹھتی نئی نئی محبت کی لہریں کبھی تو پانیوں جیسی رواں محسوس ہوتیں، کبھی سرسبز چراگاہ جیسی کھلی تروتازہ اور کبھی بادلوں جیسی دبیز گہری بھری بھری، بہت حسین، سبک، پاکیزہ، پیار سے بھی پیاری..... نرم ہنسی اس کے لبوں سے جدا ہی نہ ہو رہی تھی۔

رافع محمد کی آنکھوں نے محبت کی شفاف نظر سے دکھائی دیتا ایسا سندر بن آج سے پہلے خود بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔ جانے اب وہ صبح نئی تھی یا سندر بن میں کوئی اچھوتا پن آ گیا تھا۔ کیا ان ہی پانیوں کے تلے خوفناک مگرمچھ اور زہریلے سانپ پھرا کرتے ہیں، کیا یہی ہیں وہ سرسبز جھاڑیاں اور درخت جن کی اوٹ سے چمکتی آنکھوں والے باگھ انسانی خون سے اپنی پیاس بجھانے کو گھات لگائے چھپ کر بیٹھا کرتے ہیں۔ دلدلی کیچڑ سے بھری یہ زمین یہ پانیوں سے بھرے نم جنگل آج ریشمی بسنتی آنچل اوڑھے ہوئے ایسے خواب آگیں کیوں دکھائی دیتے تھے۔

اور خوابوں میں رنگ بھرنے والی وہ سحر طراز۔ کیا خود بھی کسی منتر کے زیر اثر آ گئی تھی۔ رافع نے ذرا سا گردن موڑتے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ویملا جنگلے کے قریب نیچے بیٹھی آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ وہ بھی گھر سے غالباً نہا کر نکلی تھی۔ کھلی نم لٹوں نے میرون شال کے ہالے سے جھانکتے اس کے چاند چہرے کو کسی حد تک چھپا رکھا تھا۔ جانے کس خیال میں گم تھی۔ آنے والی حسین صبح کے تصور سے شاید رات بھر سو نہیں پائی تھی۔

''چائے پی لیں ویملا؟'' اُس نے توجہ اپنی جانب کرنے کو پکارا تو ویملا نے چونک کر سر اٹھایا۔

''ہوں۔'' اثبات میں سر ہلاتے وہ فرماں برداری سے فوراً اُٹھ گئی۔ رافع کو کسی عجیب سے احساس نے فوری طور پر گھیرا پر وہ سر جھٹک کر سامنے متوجہ ہو گیا

حالانکہ دل میں آیا۔ ایک خاموشی وہ بھی تھی، جس نے رافع کے جوابی اظہار کے نتیجے میں ویملا کی بولتی بند کر دی تھی۔ پر اس خاموشی میں ایک مکمل بیان تھا۔ وہ لبوں تلے چھپی شرمگیں ہنسی اور گھنی پلکوں میں کپکپاتی جھجک، جس کے گریز میں بھی وارفتگی تھی۔

ویملا نے دس ہی منٹ میں چائے کا کپ اور بسکٹ سامنے لا کر رکھ دیے۔ نہ صرف یہ بلکہ خاموشی سے ٹرے رکھ کر سیدھا سپاٹ چہرا لیے فوراً پلٹ بھی گئی۔ رافع کی حیرت اور بے یقینی اس لمحے مزید بڑھی تھی۔ جب سے سفر آغاز ہوا تھا۔ سوائے رافع کے چائے والے ایک جملے کے دونوں کے درمیان کسی ایک جملے کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ رافع جس حسین صبح کے ان گنت رنگوں سے دامن بھرتے قوسِ قزح کی رتھ پر سوار جانے کہاں کہاں کی اُڑان بھر آیا تھا۔ اُس صبح کا ماتھا ویملا کی چمکتی ہنسی سے یکسر خالی و محروم دکھائی دیا۔

رافع کا نرم حساس دل ایک دم خالی کسی چڑیا کے اجڑے گھونسلے سا کھوکھلا ہوا۔ چائے پر ٹھنڈ کی تہہ نے جمع ہوتے بالآخر اُسے یکسر بدمزا کر دیا۔ پر اپنا دھیان بظاہر سامنے کی طرف لگائے اُس نے واپس پلٹ کر نہ ناشتے کی طرف دیکھا نہ ہی ویملا کو۔

چور نگاہوں سے ناشتے کی یوں درگت بنتے وہ بھی نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ سخت بے چینی محسوس کرتے اسے پکار کر متوجہ بھی کرنا چاہتی تھی۔ اب ناشتے سے کیسا بیر۔۔ وہ اس کے حصے کی بھوک اور چائے کی طلب اپنے اندر محسوس کرتے اب اضطرابی کیفیت میں ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔ وہ خفا ہو گیا تھا۔۔ بس اتنی سی بے رُخی سے۔۔

اُف وہ صبح..... ویملا کا دل پسیج کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔ سفر آغاز کرنے کی وہ پہلی صبح آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ جب رافع نے اسی طرح چائے بنانے کی فرمائش کی تھی اور وہ ڈھٹائی سے اپنے لیے ایک کپ بنا کر اسے ترستا چھوڑ نیچے کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اپنی آنکھوں کا پانی وہ اس لمحے اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔ جنگلے سے ہٹ کر مزید پیچھے کو جاتے وہ اب اس کی نظروں سے پرے آ چکی تھی۔ منہ دبا کر سسکیاں لیتے وہ اس شدت سے رو رہی تھی کہ اگر لانچ اور لہروں کا ملا جلا شور ماحول پر حاوی نہ ہوتا تو جنگل ویملا کی سسکیوں اور آہوں سے ہل جاتا۔ لانچ چلتے چلتے ایک دم رُک گئی تھی۔ ویملا نے جھٹ آنسو صاف کرتے پاس رکھے پانی کے کین سے جلدی جلدی چھینٹے مار کر چہرا صاف کیا۔ اندازہ یہی تھا کہ رافع شاید اس کی طرف آ رہا ہوگا۔ لیکن بہت دیر گزرنے پر بھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ویملا پھر بھی پیچھے اپنی جگہ پر جمی رہی۔

لانچ کا فرش لکڑی کے تختوں سے مل کر بنا ہوا تھا۔ قدموں کی قریب آتی آواز پر ویملا کا دل جیسے گردن میں دھڑکنے لگا۔

''تمہارے لیے۔'' رافع نے چند قدم پیچھے رُکتے کچھ آگے کو بڑھایا۔ وہ بے ساختہ تھوڑا سا مُڑی۔

ایک چیتل ہرن کا ننھا بچہ معصوم حیران آنکھوں سے لانچ کو تیز تیز سر گھماتے دیکھنے لگا تھا۔ ویملا نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ سفید دھبوں والا وہ اورنج براؤن سا چھوٹا معصوم ہرن۔ کتنی خواہش تھی اسے سندر بن کے ہرن کو چھو کر پیار کرنے کی۔ گردن اس ننھے ہرن کی پتلی گردن سے ملائے وہ خوشی سے پھر رو پڑی تھی۔

رافع دیکھ کر پلٹ گیا۔ وہ ہرن کو سینے سے لگائے خود بھی لانچ کے سامنے والے حصے پر آ گئی۔ دریا کے کنارے درختوں کی ساحلی سرسبز چراگاہ پر کچھ بارہ پندرہ کی تعداد میں ہرن گھوم پھر رہے تھے۔ رافع نے ان ہی کو دیکھ کر لانچ روکی تھی۔ ہرن کے بچے کو لیے ویملا بھی نیچے اُتر آئی۔ ماحول میں سندری کے پتوں کی مہک رچی تھی۔ کالے سرمئی بادل کچھ اور نیچے اُتر آئے تھے۔ ہوا یوں بے تابانہ سب کچھ اڑا رہی تھی جیسے زمین اور بادلوں کے بیچ اُسے کہیں چھپنے کی راہ نہ ملتی ہو۔

ویملا کی شال سر سے اُڑی تو لمبی کالی زلفیں بھی بکھرنے لگیں۔ اس نے ہرن کے چھوٹے سے منہ کا نرم بوسہ لیتے نیچے چھوڑ دیا اور وہ نیچے اتر کر بجائے

قلانچیں بھرنے کے وہیں مڑ کر آنکھیں پٹپٹاتے ویملا کو دیکھنے لگا۔ ویملا کو ہرن کی حرکت نے اتنا حیران کیا کہ وہ پھر ہنستے ہنستے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ رافع کی برداشت جواب دے گئی، کلائی سے کھینچ کر ویملا کو بالکل سامنے بہت قریب لا کھڑا کیا اور اب وہ کیسی شیفتگی سے اس کی دونوں آنکھوں میں دیکھ رہا تھا

''اتنے آنسو؟'' وہ محض یہی پوچھ پایا اور ویملا کی آنکھوں سے ندیا بہہ نکلنے میں پھر وہی روانی تھی۔ اس کی متورم سوجی آنکھوں کو خوب قریب سے دیکھنے پر رافع کو احساس ہوا کہ شاید وہ رات بھر روتی رہی ہے۔

''بولو ویملا! کیوں ندی کے بان توڑنے پہ تلی ہو۔ بولو ناں کیا ہوا ہے۔''

''میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اس نے رندھے گلے کو بمشکل بولنے لائق بنایا۔ ''یوں ہی وقتی غبار ہے۔ تم سفر شروع کرو، ہم لیٹ نہ ہو جائیں۔''

''ایسے کیسے سفر شروع کروں؟'' اس نے جاتی ویملا کا آنچل تھام کر روکا۔ ''چند آنسو میرے حصے میں ڈال کر مجھے بھی شریک بنا دو۔ اکیلے تو اب کوئی درد تمہیں سہنے نہیں دوں گا۔ یہ برباد دل اب تمہارے ہر خوشی غم میں برابر کا بھاگے دار ہے ویملا۔''

''نہیں ہے۔'' وہ تڑپ ہی اٹھی۔ ''کوئی ادھیکار نہیں میرا۔۔ نہ اِس دل پہ، نہ تم پہ، نہ ہی تم اپنے جذبات کو ایسے بے لگام ہونے دو گے۔ میں تمہیں بہکانے کا کارن بنی تھی۔ اب میں ہی کہتی ہوں بھول جاؤ سب۔'' وہ ذرا سیا مڑ کر بنا آنکھیں ملائے، لہجہ مستحکم کرنے میں کوشاں تھی۔

''رافع محمد کسی کے بہکاوے میں نہیں آتا ویملا۔ یہ بھول ہے تمہاری۔ تم مجھے ''وہ'' سب نہ کہتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ کیا ہے ہمارے بیچ۔''

''کچھ نہیں ہے۔'' وہ سُنّد لہجے میں چیخی۔ ''نہ کچھ ہے نہ ہوگا۔ کبھی نہیں۔''

''اوں ہوں۔'' وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لیتے اس کے سامنے آیا۔ ''یہ رافع محمد کی محبت اس کے جنون کا قصہ ہے۔'' وہ اب سبک سر لہجے میں پوری دلجمعی سے گویا تھا۔ ایسے کہ ویملا گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ ''میری محبت کسی ضدی انسان کی بری عادت سے بھی بری ہے ویملا! اب مجھے تم بھی پیچھے نہیں ہٹا سکو گی۔''

''اور سومیہ؟'' ویملا نے ٹھنڈے ٹھنڈے بالآخر کہہ ہی دیا وہ سچ، جو درد جیسا دل میں شام سے چبھا تھا۔ رافع کے جاتے ہی سومیہ اس کے پاس آئی تھی اور چھوٹتے ہی یوں اسے اپنے اور رافع کی منگنی کے متعلق بتایا تھا کہ اگر ابھی نہ بتایا تو جانے کتنا بڑا نقصان ہو جائے اور نقصان کا اندازہ تو ویملا لگا سکتی تھی۔ جس نے رافع محمد کو دیکھ رکھا ہو۔ وہ اتنی آسانی سے دست بردار کہاں ہو سکتا ہے۔

''سومیہ نے بتایا؟'' رافع نے ایک گہرا سانس لیا۔

''کیا فرق پڑتا ہے رافع!'' وہ اُونچے زینے پہ پاؤں رکھتی دوبارہ لانچ میں سوار ہو گئی۔

''یہ ہرگز اتنی سنجیدہ بات نہیں ہے۔'' وہ قدرے جھنجھلایا سا اُس کے پیچھے آیا۔

''چھوڑ دو یہ باتیں۔ مجھے میرے گھر جانا ہے۔'' وہ لانچ کے داہنے ہاتھ والے جنگلے سے لگے لمبے بنچ پر بیٹھ گئی۔ لیکن رافع چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بھی وہیں قریب آ بیٹھا۔

''جس بات نے رات سے تمہیں رُلا رکھا ہے۔ اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''میں اپنے پہل کرنے پہ پشیمان ہوں، رونا بھی اپنی غلطی پر آیا تھا۔ بس اور کوئی بات نہیں اور تم فکر نہ کرو میں اپنا دماغ آرام سے ہٹا لیتی ہوں۔'' وہ رُخ پھیر گئی۔

رافع نے صاف دیکھا کہ آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئی تھیں۔ گلا بھی مزید بولنے لائق نہیں رہا تھا۔ وہ ایک کھلے کو ہلکا سا مسکرایا۔

''اور دل؟''

''ہوں؟'' وہ بے تحاشا چونک کر مُڑی۔ رافع کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر گڑبڑاتے ہوئے منہ

پھیر لیا۔ اُسے تو معمولی سی بھی پروا نہیں ہوئی تھی۔ نہ افسوس نہ پچھتاوا۔

''بار بار خود کو الزام دیے جا رہی ہو۔ کہا ناں تمہارے اظہار سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں۔''

''مان لیا رافع! میرے اظہار کرنے سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں۔'' وہ اب کے چبھتے لہجے میں کہتے مُڑی۔ ''یوں بھی میں انجان تھی، پر تم نے سومیہ کے بارے میں کیوں نہیں سوچا، کیوں تم اتنے کٹھور بن گئے۔''

''کیونکہ مجھے پیار نہیں تھا اس سے اور پہلے میں یہ بات جانتا نہیں تھا کہ پیار کیسا ہوتا ہے۔''

''سب قصے کہانیوں جیسی باتیں ہیں رافع۔ محض ایک وقتی اُبال۔ میں بھی انڈیا پہنچتے یہ سب بھول جاؤں گی۔ یاد آیا بھی تو ہنس پڑوں گی اپنی نادانی پر۔''

''اچھا۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔ ''پھر تو مبارک ہو تمہیں۔ پردیسیوں کے بارے میں ہم بھی ایسی ہی باتیں سنا کرتے تھے۔ بھول جانے والے، پلٹ کر نہ آنے والے، اپنی یاد میں روتا چھوڑ کر بالآخر جان نکال لینے والے۔'' رافع نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر سر کے پیچھے کیں۔ کٹھور انداز میں تبصرہ کرتے اس لمحے وہ سچ مچ ویملا کی جان لے گیا۔

''ایسے کیوں کہہ رہے ہو۔'' وہ نظریں چُرا گئی۔

''کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔''

''پر تم مر جاتیں اُس دن۔ جب میں دلدل میں جا رہا تھا۔'' وہ ایک دم اتنا بے ساختہ بولا تھا کہ ویملا نے جھٹکے سے گردن موڑی۔ رافع کے لبوں پر ہنسی چمک کر معدوم ہوئی۔ ''میرے زندہ درگور ہوتے شریر سے طاقت بن کر ٹکرایا تھا یہ جملہ..... ''میں بھی مر جاؤں گی رافع..... اور وہ چھینک جو جیون دان جیسی میرے پورے وجود میں دوڑی تھی، چمتکار تھا اس جذبے اس محبت کا جو قدرت نے تمہارے لہجے میں محسوس کی۔''

''تم مجھے مائل نہیں کر سکتے ایسی باتوں سے۔''

اس نے دونوں پاؤں اوپر بنچ پر سمیٹتے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ اب شرارت سے ہنسا تھا۔ ویملا کو اپنی بے بسی پہ رونا آ گیا۔ یہ اُسی دیوانی کا دیا اعتماد تھا جو رافع کے لب و لہجے سے یقین بن کر جھلک رہا تھا۔

''ہمیں اب چلنا چاہیے۔'' اس نے بلاوجہ آسمان کو دیکھا۔

''بنا چائے پیے تو میں ہل بھی نہیں سکتا۔ پہلے ناشتہ کروں گا۔'' وہ مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔

''میں بنا دیتی ہوں۔ تم لانچ اسٹارٹ کرو۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بڑی جلدی ہے گھر پہنچنے کی۔'' وہ بھی مسکرا کر اٹھا۔

''ہاں ہے۔'' وہ تنک کر آگے بڑھ گئی۔

''اور جو میں نہ لے گیا تو؟'' وہ پیچھے سے پکارا۔

''کب تک بھٹکو گے اس جنگل میں۔''

''جب تک تم ضد نہیں چھوڑ دیتیں۔''

''تب تو فضول ہوگا انتظار۔'' وہ اسٹوو جلانے لگی رافع نے نتھنے پھلا کر اس ضدی لڑکی کو دیکھا اور بنا کچھ کہے لانچ اسٹارٹ کرنے لگا۔ ویملا نے ایک گہرا سکون کا سانس چھوڑا اس عہد کے ساتھ کہ وہ ہرگز ہار نہیں مانے گی۔

☆☆☆

''کیا اطلاع ہے یوسف!'' ابوصالح نے سامنے کھڑے یوسف کو ہاتھ کے اشارے سے سامنے بیٹھنے کا کہا۔

''شوب اُس نے کوٹکا کے عبدالرزاق سے لانچ لی ہے۔ لیکن لڑکی کو لے کر ہرین گھاٹا سے روانہ ہوا ہے۔ رزاق کی لانچ پتھر گھاٹا سے ہرین گھاٹا پہنچی تھی۔''

''اب کہاں ہیں دونوں؟''

''آدھا سفر تقریباً طے کر چکے ہیں۔ رُخ سیدھا بارڈر کی طرف ہے۔''

''کیا لگتا ہے، کہاں سے بارڈر پار کروائے گا؟''

''شوب! لڑکی اکیلی ہے۔ لگتا تو یہی ہے کہ ہیم نگر

کے آس پاس۔ وہاں سے آبادی قریب ترین ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔" ابوصالح نے کندھے اُچکائے۔ "لیکن ہم اسے بارڈر تک پہنچنے دینے کا رسک نہیں لے سکتے۔ یہیں راستے میں کہیں قابو کرنے کا سوچو۔ لڑکی تو میں ہی دھرمیشور کو دوں گا۔ وہ بھی آج رات۔ رافع کی موت کی اطلاع کے ساتھ۔"

"شوب! ہم رافع سے رابطہ نہیں کر سکتے۔ کسی بھی بہانے۔"

"نہیں یوسف! مجھے یقین ہے میرا وہ جھوسٹ جو میں نے رافع سے بولا وہ کھل چکا ہے۔ لڑکی اور رافع کا ساتھ اگر اُس پہلی رات تنکونا آئی لینڈ تک رہتا تو کچھ بھی سامنے آنے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن یہ پولیس کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے رافع اور لڑکی کا سفر طویل سے طویل ہوتا چلا گیا۔ اب یقیناً رافع یہ بھی جان چکا ہے کہ لڑکی نے اپنا اغوا نہیں کروایا اور یہ بھی کہ وہ گھر سے کسی آشرم وغیرہ جانے کے لیے نکلی تھی۔ اس کے بعد اعظم اور نمیزل نے اکیلا اسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی قیمت مجھ پہ بھروسا نہیں کرے گا اور اپنے ہاتھوں اسے بارڈر پار کرا کے ہی دم لے گا۔" ابوصالح نے پہلی مرتبہ خوب کھل کر نہ صرف اعتراف کیا بلکہ پیش آنے والے حالات کا تجزیہ بھی وہ کھلی آنکھوں سے کر رہا تھا۔

"شوب! پھر کیسے معلوم کریں کہ رافع اس وقت کہاں ہے؟"

"اینگ اور شمی کو لانچ دے کر ارپن گاسیا بھیجو۔ اگر وہ درمیان میں پہنچا ہے تو اب ارپن گاسیا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہاں کے چوڑے پاٹ میں شاید وہ اس کو جالیں۔"

"جی شوب!" یوسف فوراً اُٹھا۔ "وہ قریب ہیں وہاں سے۔"

"رزاق سے لانچ کی تفصیل اگلوانے کی کوشش کرو بلکہ کوئی ایسی ترکیب لڑاؤ کہ رزاق ہمیں رافع سے معلوم کر کے دے اپنی لوکیشن کے متعلق..... لیکن رزاق کو بھی شک نہ ہو کہ ہم کسی خاص مقصد سے پوچھ رہے ہیں۔"

"رفید اس کا دوست ہے۔ وہی پوچھ کر بتا سکتا ہے۔"

"ہوں جاؤ۔" ابوصالح کسی حد تک مطمئن ہوتے نیم دراز ہوگیا اور یوسف نے چلتے چلتے ہی کال ملا کر موبائل کان سے لگالیا۔

☆☆☆

"پورانو، باشونا..... او..... التاتورکا چھی اشو۔"

وہ ایک مسافر بوٹ تھی جس کا ملاح ایک خوب صورت بنگلہ گیت گا رہا تھا۔ اس کی درد بھری سریلی آواز کھلی فضاؤں میں دُور تک پھیل گئی تھی۔ آسمان پر بادل ٹکرانے سے زوردار گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔ سرمئی بادلوں میں کالی بدلیاں اُمڈ اُمڈ کر اکٹھا ہوئی جا رہی تھیں۔ دوپہر کے دو ڈھائی بجے بھی ماحول میں شام کا سا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ لانچ کے شیشے پر موٹے موٹے قطروں سے آغاز لیتی بارش ایک دم پوری شدت سے برسنا شروع ہوگئی۔

وہ لوگ دریا کے بڑے پاٹ کو چھوڑ کر اس وقت ایک ذیلی ندی سے گزر رہے تھے۔ یہاں ندی کے کناروں پر خودرو لمبی جھاڑیوں کے بجائے کھلا وسیع دُور تک پھیلا ہلکی سنہری گھاس کا علاقہ تھا۔ گھاس سے بہت پیچھے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ کشتی کے ملاح نے اپنی کشتی کنارے سے لگا دی تھی۔ دُور درختوں کے پیچھے ضرور کوئی بستی تھی کیونکہ کئی مسافر چھتریاں کھول کر تیز قدموں سے بھاگنا شروع ہوگئے تھے۔

ملاح نے پتوار چھوڑ دیے تھے۔ چند ایک مسافروں سمیت وہ کشتی کے چھپر والے حصے میں بارش سے بچ کر بیٹھا تھا۔ رافع کی لانچ ان سے کافی فاصلے پر تھی۔ اُس نے بھی کچھ دیر آرام کے خیال سے لانچ روک دی اور لانچ کے بنچ پہ بیٹھ کر بارش کو تکنے لگا۔ ایسا گمبھیر ہولاتا موسم اور گانے کے درد بھرے بول اس کے دل کی آگ کو بجائے ٹھنڈا کرنے کے اور زیادہ بھڑکائے دے رہے تھے۔

لحظہ لحظہ قریب آتی شام، سات روزہ طویل ترین

فر کا بالآخر اختتام، ویملا سے جدائی اور اِن ہی راستوں میں خالی دل و نگاہ لیے واپسی۔ شاید یہ واپسی اس کی جان لے لے گی۔ رفید نے کہا تھا، ابوصالح ہر قیمت دھرمیشور پر احسان جتانا چاہتا ہے۔ رافع کو اُس نے ویملا کا اغوا کار ثابت کر کے اپنے آپ کو اس کا ہمدرد ظاہر کرنا تھا۔ اب اگر رافع ویملا کو بحفاظت بارڈر پار کروا بھی دیتا تو ابوصالح اس کی جان لیے بنا نہ رہتا۔ دھرمیشور سے وہ کہہ دیتا کہ رافع کو مار کر اس نے لڑکی کو بارڈر پار بھیجا ہے۔ دھرمیشور اگر ویملا سے اس کی تصدیق کرے تو وہ شاید اپنے دل کی مجبوریوں کو دیکھتے رافع کا نام ہی نہیں لے گی۔ سب کچھ ابوصالح کے حق میں جائے گا اور بغیر کسی شور ہنگامے کے ایک دیوانہ آج رات یہ دنیا چھوڑ جائے گا۔

ویملا لانچ رُک جانے یا شاید بارش اور بادلوں کی گھن گرج سے اُوپر نکل آئی تھی۔ یہاں کا موسم بارش اور بادلوں کی وجہ سے اس قدر حسین ہوگیا تھا کہ وہ بے اختیار جنگلے تک بڑھ آئی تھی۔ نچلے کمرے کے جس سے بالکل برعکس تھا باہر کا موسم۔ بارش کے ہلکے چھینٹے اور ٹھنڈ جھرجھری بن کر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ دھیرے سے ایک چور نظر بنچ پہ بیٹھے رافع پر ڈالی جس نے اتفاقاً عین اسی وقت اپنی تھکی تھکی بوجھل پلکیں اٹھا کر ویملا کو دیکھا تھا۔ گانے کے مدھم بول ابھی بھی ہواؤں میں گونج رہے تھے۔

رافع کو شک کی گنجائش نہ رہی کہ ویملا نیچے کے کمرے میں بھی روتی رہی تھی۔ سونے کا بہانا کر کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر وہ اپنے درد سے لڑتی رہی تھی۔

ویملا نظر ہٹا کر بارش، منظر اور دوسری مسافر کشتی کو دیکھنے لگی۔ رافع کا خاموش سرد رویہ دل کو مٹھی میں لے رہا تھا۔ اُسے اپنی ضد سے باز رہنے پر منتیں کرنے والا اچانک اتنا دُور بیٹھا کیوں لگنے لگا تھا۔ وہ موم سی پگھل رہی تھی۔ جی میں آیا سب مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اسے منا لے تاکہ یہ جان لیوا خاموش نظریں اُسے ایسے نہ دیکھیں اور شام تک کا وقت وہ ایک دوسرے کی محبت میں گم، آنے والے دنوں کے سپنے بُنتے گزار دیں۔ پر ہوا صرف یہ کہ وہ خاموشی سے دوبارہ اسٹوو کے پاس آ کر چائے بنانے لگی۔ قریب دو گھنٹے پہلے اُن دونوں نے اُبلے چاول اور اچار کھایا تھا۔ اب موسم اور رافع کی تھکن کے خیال سے اُس نے دوبارہ چائے بنانے کا سوچا۔ چائے بنانے کے دوران اُس نے اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچ پر خود کو سرزنش بھی کی۔

آج وہ ہمیشہ کے لیے اُس سے دُور ہو رہی تھی۔ اگر یہ باقی بچے چند گھنٹے وہ کسی طرح خود پہ جبر کر کے گزار دے تو رافع اس کی طرف سے مکمل مایوس واپس پلٹے گا۔ ایسے میں اگلی صبح کا سورج کچھ اور نئی تبدیلیاں لیے طلوع ہوگا۔ رفتہ رفتہ بالآخر وہ اسے بھول ہی جائے گا۔ وہ سومیہ اور اس کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے اتنی قربانی تو دے ہی سکتی تھی۔ میرانے بھی زندگی محض اپنے شیام کے نام پر گزار دی تھی۔ وہ جوگن ان ہی کا دم بھرنے کو پیدا ہوئی اور ان ہی کے نام کی مالا جپتے خاک ہوگئی۔

وہ چائے پیالوں میں ڈال رہی تھی جب رافع کو کسی کی کال آئی۔ جانے کس سے بات کر رہا تھا۔ چہرے پر تفکر کی لکیریں سی پھیل گئی تھیں۔ قریب پانچ سات منٹ بولتے رہنے کے بعد بھی اس کی پیشانی کی شکنیں اور چہرے کا تناؤ ختم نہیں ہوا تھا۔ ویملا نے خاموشی سے چائے قریب رکھی اور دوسری طرف والے بنچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ رافع نے لہروں اور بارش پر نظریں جمائے وہ چائے ختم کی۔ ویملا نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ وہ اُٹھ کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گھبراہٹ اور جلدی میں وہ گرم گھونٹ سے لب جلا بیٹھی۔ سانس روک کر وہ ساکت صامت سی بیٹھی رہ گئی اور رافع نے قریب آ کر اکڑوں بیٹھتے سیٹ کے نیچے سے اپنا آرچری کا سامان نکالا۔ ویملا کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ رافع اُس تھیلے کو کھینچ کر اپنے اسٹیئرنگ تک لے گیا۔ تھیلے میں سے گن نکال کر صاف کی۔ کچھ دیر گھما پھرا کر چیک کیا اور اسٹیئرنگ کے قریب ایک اونچی جگہ پر رکھ دی۔ باقی کا تھیلا بھی نزدیک ہی رکھ لیا۔ ویملا کے من میں کھدبد لگی

تھی کہ بھلا ایسی کون سی کال آئی تھی کہ یہ سب نکالنا پڑ گیا۔ خالی کپ اٹھا کر اس نے بہرحال ہمت مجتمع کرتے پوچھ ہی لیا۔

"یہ سب سامان کیوں نکالا؟"

"تمہیں آرچری سکھانی ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "تمہیں بہت اچھا لگتا ہے ناں یہ تیر کمان۔"

نہایت عام سے لہجے میں کہتے اُس نے لانچ اسٹارٹ کردی۔ وہ حیران حیران سی واپس آکر بیٹھ گئی۔ بارش اب رُک چکی تھی۔ لانچ کا سفر اس بار کچھ اور تیز رفتاری سے شروع ہوا۔ پانی کی لہروں کو چیرتے لانچ اب تیر کم اُڑ زیادہ رہی تھی۔ ویملا نے گھبرا کر مضبوطی سے جنگلے کو تھاما۔

جانے کیسا جنون تھا رافع کا۔ اُسے پہنچانے کی ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ شاید راستہ طویل ہو اور ٹائم کم۔ وہ اس بار بھی چپ چاپ دیکھتی رہی۔

"ویملا! نیچے جاؤ۔" دفعتاً رافع نے مڑ کر چیخ کر کہا تو وہ بوکھلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"نیچے....." وہ زور دے کر چلایا تو ویملا فوری طور پر نیچے ہوتے زمین پر لیٹ گئی۔ رافع کو اُس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر بندوق اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ فضا میں ان کی لانچ کے علاوہ جو خاموشی چھائی تھی اسے ایک دوسری لانچ کی آواز نے توڑ دیا تھا۔ رافع کا بندوق سیدھا کرنا بتا رہا تھا کہ دوسری لانچ سامنے کہیں سے نمودار ہوئی تھی۔

رافع نے لانچ کا یک لخت اس تیزی سے رُخ موڑا کہ لانچ پوری ترچھی ہوگئی۔ دریا سے اُس نے لانچ ایک ندی کی طرف موڑ دی تھی وہ بھی انتہائی ایمرجنسی میں۔۔ ویملا کو ایک ساتھ دو تین فائر بھی سنائی دیے۔ رافع نے لانچ کو دائیں ہاتھ موڑتے بندوق کو بائیں طرف گھماتے خود بھی ایک فائر کیا تھا۔

ویملا نے سر اوپر اٹھایا۔

دوسری لانچ چونکہ تیزی سے آرہی تھی۔۔ رافع کی لانچ کے اچانک دائیں مڑنے کا اسے گمان بھی نہیں تھا وہ تیز رفتاری کی وجہ سے آگے نکلتی چلی گئی۔۔ رافع نے ان کے پلٹ کر یہاں تک پہ سے پہلے کچھ کرنا تھا۔ لانچ کو تھوڑا اور آگے لے جا اس نے ایک طرف روکا اور بندوق، تیراندازی تھیلا اور اٹھ کر کھڑی ہوتی ویملا کا بازو کھینچ کر نیچے طرف بھاگا۔ لانچ کی آواز ایک بار پھر قریب آر تھی اور کسی بھی وقت وہ ندی کی طرف موڑ کاٹ کرا کی طرف آسکتی تھی۔

رافع اسے لیے فوراً اس منگرو دو فارسٹ میں گھس گیا۔ یہاں کے پودے اور جھاڑیاں اتنی نیچے تھیں کہ ا دونوں کو سر جھکا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اور یہ جھاڑیاں اتنی گھ تھیں کہ بھاگنے کا راستہ بھی بہت مشکل سے مل ر تھا۔ عام حالات میں ایسے راستے کو کسی قیمت پر کوئی چلنے کے لیے استعمال نہیں کرسکتا تھا لیکن معاملہ زندگی بچا کا تھا۔ کیچڑ اور پھسلن بھری راہیں بھی یوں بھاگ کر عبور ہو رہی تھیں جیسے کوئی شاہراہ ہو۔ دوسری لانچ کی آواز آنا اب بند ہوگئی تھی یعنی دشمن بھی اب اُن کی طرف جھاڑیوں میں گھس آیا تھا۔

رافع نے ذرا دیر ستانے کو قدم سست کیے ویملا بھی رُک کر گہرے گہرے سانس لینے لگی ضروری نہیں تھا کہ اُن کے رُکتے ہی دشمن تھوڑی دیر میں ان کے سر پہ آپہنچتا۔ راستہ اتنا گنجلک تھا کہ دائیں بائیں گھومتے جانے وہ کس راہ پر آنکلے تھے۔

"یہ لوگ پوری حفاظت سے تمہیں بارڈر پار پہنچا دیں گے، تم چاہو تو ان کے ساتھ جاسکتی ہو۔"

"ہیں.....؟" ویملا کو اپنی سماعت پہ دھوکا ہوا۔

"یہ گولیاں برسانے والے؟" وہ تعجب سے دبا دبا چیخی۔

"ہوں۔" وہ مختصر جواب دے کر نظر چُرا گیا اور بات کسی حد تک ویملا کی سمجھ میں آگئی۔

"تو یہ تمہارے پیچھے پڑے ہیں لیکن تم بھی تو مجھے بارڈر ہی لے جا رہے ہو تو پھر حملے کی وجہ؟"

"شاید کریڈٹ لینا چاہتے ہوں۔ بہرحال تم سوچ لو۔ بلاوجہ یہ بارڈر تک ہمیں پریشان کریں اچھا ہوگا تم خود ہی ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہاں سے واپس ان کی لانچ تک پہنچ جاؤ۔ میرا وشواس کرو وہ تم

پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔"

"اور تم؟"

"میں تم لوگوں کے جانے کا انتظار کروں گا پھر واپس جا کر اپنی لانچ میں خود بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ سہولت سے اُسے خود سے الگ کر رہا تھا اور ویملا سخت کشمکش میں تھی۔ کہیں تو کچھ ایسا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"تو تم خود مجھے اِن کے حوالے کردو۔ یہ بھی اُسی داڑھی والے کے آدمی ہوں گے ناں۔" ویملا کا اشارہ ابوصالح کی طرف تھا۔ رافع فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے پایا۔ کیسے بتاتا کہ اس کے سامنے آتے ہی وہ اسے بھون دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابوصالح کے لیے فی الحال دھرمیشور کو خوش کرنا سب سے اہم تھا اور اپنے مفادات کے لیے ایسی چھوٹی موٹی قربانیاں ان کے لیے بے معنی تھیں اور یہی تھی وہ گندی سیاست جس سے دُور ہونے کی کوشش کرتے رافع ہمیشہ اس راہ کا آپ شکار بن جاتا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ آگے بڑھا۔ "تم میرے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں جاؤ گی۔ جو ہوگا دیکھ لیں گے۔"

"تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے۔" وہ ہنوز خفا سی پیچھے ہولی۔

"ابھی کے لیے یہ سوچو کہ لانچ تک کیسے پہنچیں گے۔" وہ صاف طرح دے گیا

"آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چلو واپس اپنی یاٹ کی اور چلتے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں آگے بھٹکتے رہیں اور ہم تھوڑا سا رُوٹ بدل کے واپس یاٹ تک پہنچ کر بھاگ جائیں اس ایریے سے۔"

"ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے اور کوئی چارہ بھی نہیں لانچ تک پہنچے بنا۔" رافع نے فوراً تائید کرتے رُخ پھیرا۔ اب وہ دونوں پھر واپسی کی راہ پر چل رہے تھے۔

"تمہاری پکی اِن سے کچھ اور دشمنی ہے۔ کریڈٹ لینے والی بات مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔" وہ اب آگے آگے چل رہی تھی۔

"قرض دینا ہے ان کا۔ چُکا نہیں پا رہا ہوں۔" وہ بھی تلخ ہوا۔ ویملا نے باقاعدہ مُڑ کر گھورا تب ہی ایک آدمی گن ہاتھ میں لیے اچانک سامنے آیا۔

"ہینڈز اپ۔" اس نے گن دونوں پر تانی اور بے اختیار ویملا نے ہاتھ کھڑے کردیے۔ وہ اُس وقت عین رافع کے سامنے کھڑی تھی۔

"شائیڈ لو لڑکی (سائیڈ پہ ہوجاؤ لڑکی)" اُس آدمی نے خالص بنگلہ لہجے میں اسے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا تو وہ پہلی بار چونکی۔ وہ آدمی اس کے بجائے رافع پر گن تانے ہوئے تھا اور اس کو سامنے سے ہٹانے کا مقصد رافع کو ہٹ کرنا۔ اُسے رافع کے جملے میں صداقت نظر آئی کہ وہ اُس پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے اور اسے بحفاظت بارڈر پار کروادیں گے۔ وہ قطعی طور پر اَن سنی کرتے وہیں ڈٹ کر جمی رہی۔

"شُونا نہیں (سنا نہیں)۔" وہ پھر چلایا۔

سر اٹھا اُٹھا کر ویملا کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویملا کو حیرت ہوئی کہ اتنا لمبا رافع اسے نظر کیوں نہیں آرہا۔ وہ خود تو مُڑ کر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تب ہی خاموشی میں فائر کی آواز گونجی اور گن اُس آدمی کے ہاتھ سے دُور جا گری۔ ویملا نے بے ساختہ گھوم کر دیکھا۔ رافع نے اپنی گن سے اس کے بازو کا نشانہ لیا تھا۔ ویملا کے سامنے کھڑے ہونے کا رافع نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ آدمی بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی کو زور سے پکڑتا نیچے بیٹھتا گیا جہاں سے اب خون کا فوارہ چھوٹ نکلا تھا۔

"کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟" رافع نے گردن دبوچ کر اسے نیچے لٹا دیا۔

"دد.....دو....." وہ بوکھلا سا گیا۔

"اِسے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" رافع کے برعکس ویملا نے ہندی میں اسے مخاطب کیا۔ بنگالی مکالمہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"بولو ورنہ شوٹ کردوں گی۔" ویملا نے رافع سے ریوالور چھین کر اس آدمی پر تانا۔ رافع سے ہنسی

ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ابوشولے نے بولا بٹ تم کو ہم کوچ ہونے نہیں دے گا۔ آج ہی تم کو شیماپار.....''

''شٹ اپ۔'' وہ اُسے بیچ میں ہی جھاڑ کر آگے بڑھ گئی۔ رافع نے آدمی کا رومال اس کے گلے سے نکال کر اس کے دونوں پیر باندھ دیے اور اسے پیٹ کے بل کیچڑ پر اوندھا گرا دیا۔ اب جب تک وہ اپنے آپ کو وہاں سے اٹھنے کے قابل بناتا، وہ لوگ کافی دُور پہنچ سکتے تھے۔ رافع نے ویملا کی کلائی تھام کر پھر پہلے جیسی پھرتی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس بار کنارے تک پہنچنے کی راہ میں کوئی اور حائل نہیں ہوا۔ دونوں لانچیں سامنے خالی کھڑی تھیں۔ وہ بھاگ کر اپنی لانچ میں سوار ہوئے اور اُسی تیزی سے اسٹارٹ کر کے بجائے پیچھے دریا کی طرف جانے کے ندی میں ہی آگے بڑھتے گئے۔ تھوڑی دُور جا کر ندی خود بخود بائیں ہاتھ مُڑ گئی اور دونوں اطراف کے گھنے جنگل کے درمیان سے گزرتی وہ کئی بل کاٹتی کہاں سے کہاں نکل گئی۔

''یہ راستہ بھی بارڈر کو جائے گا۔'' وہ عین اس کی پشت پر کھڑی تھی۔

''نہیں۔'' رافع کے مختصر جواب نے اُسے تعجب میں ڈالا۔

''ہیں..... تو.....؟''

''پاس کسی بستی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔''

''ارے..... وہ کس لیے؟'' ویملا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کسی بڑھیا ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔'' وہ بالکل ہی اکڑ گیا۔

''لوگ دو نمبر ہوتے ہیں۔ تم.....'' وہ ذرا سا رُکی۔ ''تم چار نمبر ہو اور تم نے بتایا کیوں نہیں وہ تمہاری جان لینا چاہتے ہیں؟'' وہ اب دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے کھڑی تھی۔

''میں نے تو— (تجویز) دی تھی، چلی جاؤ اُن کے ساتھ تم ہی کو منظور نہیں ہوا۔'' اس نے کندھے اُچکا دیے اور ویملا بے طرح چونکی۔ اُس نے کچھ دیر پہلے والی باتوں پر غور کیا، جو کچھ رافع نے کہا تھا اور جو اُس آدمی سے سنا۔

''مطلب، میں تمہارے ساتھ بارڈر تک گئی وہ تمہیں.....'' بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی رافع نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''رُک جاؤ رافع!'' اس نے آگے بڑھ کر اسٹیئرنگ پہ رکھے رافع کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ رافع نے بس ایک شکوہ بھری نگاہ ڈال کر چہرا سیدھا کیا۔

''تم بھی تو پیچھا چھڑا کر جا رہی تھیں۔ یہی کام وہ ذرا الگ ڈھنگ سے کر رہے ہیں تو ہونے دو۔''

''میں تمہاری جان کی دشمن تو نہیں ہوں۔'' وہ ہلکا سا منمنائی۔

''مجھے اب جینے کی کچھ اِچھا (خواہش) نہیں۔'' وہ سامنے ہی دیکھتا رہا۔

''اچھا اب باتوں کے تیر نہ برساؤ اور یاٹ روکو۔''

''دھیرج رکھو۔ ابھی ہم واقعی کسی بستی کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ میرے مرنے میں ابھی کچھ وقت ہے۔'' وہ سفاکی سے ہنستے ویملا کی پوری جان نکال گیا۔ غصے سے پیر پٹختی وہ دُور بنچ پر جا بیٹھی۔ رافع مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

ندی کے دونوں کناروں پر گھنا جنگل کم ہوتے اب کھلے میدان نظر آنے لگے تھے۔ ویملا کسی آبادی کو تلاش کر لینے کے اشتیاق میں اُٹھ کر جنگلے کے نزدیک آ گئی۔ دُور دور تک گھاس تھی۔ کہیں کہیں اونچے نیچے سرسبز ٹیلے بھی تھے۔ ایسا علاقہ اب سے پہلے کم از کم سندربن میں اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ٹیلوں کے پیچھے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ بہت ممکن تھا کہ اُن سے پیچھے آبادی بھی ہوتی۔ رافع نے بھی لانچ کو کنارے پر روک دیا تھا۔ اپنی رائفل، اس آدمی کا ریوالور اور شکار کا سامان لیے وہ خود ہی نیچے اُتر گیا۔ ویملا نے بھی بھاگ کر پیش قدمی کی۔ رافع نے پلٹ کر اُسے دیکھا تک نہیں تھا۔ لمبی گھاس کے

بیچوں بیچ پگڈنڈی جیسا راستہ تھا۔ وہ دونوں اسی پر چل رہے تھے۔

''اچھا سنو۔'' وہ دوڑ کر ہم قدم ہوئی۔ ''مجھے یہ کمان دلواؤ ناں۔''

''کیا؟'' وہ ٹھٹک کر پوچھ بیٹھا۔

''یہ تیر کمان..... پلیز۔''

''میں کوئی انسٹرکٹر نہیں ہوں۔ اپنے انڈیا میں سیکھ لینا کسی سے۔'' وہ اب سخت بدمزاج لگ رہا تھا۔

ویملا نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہنسی دبائی۔ یہاں رہنے کا دورانیہ کیا بڑھا۔ اس کو پھر سے سب بھولنے لگا۔ بدلیاں برس کر ایسے گئیں کہ من پہ رکھے پتھر جیسے بوجھ بھی کھسک گئے۔ وہ اب پھر سے ''اُس'' کی ویملا بن گئی تھی۔ اور سمجھ تو رافع بھی کچھ کچھ رہا تھا۔ اس کی جان پہ پل بھر کو کیا بنی ویملا کی ساری الڑ ہوا ہوتے دیکھ لی۔ البتہ یہ تختی کا خول اس کے گزشتہ رویے کے باعث ایسا چڑھا تھا کہ اب وہ چاہ کر بھی اپنا رویہ معمول جیسا نہیں کر پا رہا تھا۔

''ایسی شانت، کھلی جگہ پھر کہاں ملے گی، اور کن لائٹ بھی باقی ہے۔ بس ایک بار مجھے یہ تیر کمان دے دو، میں خود ہی سیکھ لوں گی۔'' وہ للچائی نظروں سے اس کے تھیلے کو دیکھ رہی تھی۔

''ہوں اور نشانے پر کیا ہوگا؟'' رافع نے ایک دم پوچھ لیا تو وہ جھینپ گئی لیکن زبان کو پھسلنے سے باز نہ رکھ سکی۔

''کسی کا دل۔''

''دیکھ لینا۔ کہیں وہ پہلے سے زخمی نہ ہو۔'' وہ اب رُک کر سامان کھولنے لگا تھا۔ ویملا کے دل کو کچھ ہوا۔ فوری طور پر وہ بالکل ہی لاجواب ہوئی تھی۔

''لو..... رافع نے کمان اس کی طرف بڑھائی اور تیر نکالا۔ ''کر لو شوق پورا۔'' وہ اب ایک طرف ہو گیا تھا۔

''اُف۔ اتنی بھاری کمان اٹھا کر کوئی نشانہ کیسے لے سکتا ہے۔'' ویملا کی تو کمان ہاتھ میں لیتے حالت خراب ہو گئی۔ دائیں بائیں دیکھتے اب وہ نشانہ لینے کا مقام متعین کر رہی تھی

''وہ درخت ٹھیک رہے گا۔'' اس نے ذرا فاصلے پر ایک چوڑے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ رافع نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے۔ ہاتھ سینے پہ باندھے وہ ویملا کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے اب کمان سیدھی کر کے تیر اُس میں ڈالتے درخت کا نشانہ لیا تھا۔ تیر بجائے درخت کو لگنے کے کہیں اور پہ نکل گیا۔ رافع نے اسے کچھ اور تیر نکال کر دیے۔

''کرتی رہو ٹرائی۔ میں تیر لے آتا ہوں۔'' وہ بھاگ کر وہاں تک گیا جہاں ویملا نے تیر پھینکا تھا۔ جسے لے کر وہ اب وہیں رُک گیا تھا۔ ویملا نے دوسرا نشانہ باندھا لیکن وہ بھی ناکام۔ بازو تو دوسری کوشش میں ہی تھکنے لگا تھا۔ بعد کی تین چار کوششوں میں کچھ تیر تو درخت تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ رافع نے مسکراہٹ ضبط کرتے سب ہی تیر اکٹھے کیے اور واپس آیا۔

''ذرا دیر بازو سیدھے کر لو پھر میں سکھاتا ہوں۔'' وہ اب سنجیدہ تھا۔ ویملا نے فوراً کمان نیچے رکھ کر بازو سہلایا اور جلد ہی دوبارہ اُدھر متوجہ ہو گئی۔

رافع نے کمان میں تیر ڈالتے اس کے ہاتھ میں دیا اور ویملا نے اپنا بازو سیدھا کیا۔ رافع نے ہاتھ سے اس کے بازو کی سمت درست کی اور خود اس کے کندھے کے پیچھے آ کر جھک کر دیکھنے لگا۔

''تھوڑا سا اور اوپر۔ ہاں بس۔ اب لیفٹ ہینڈ پیچھے کو کھینچو لیکن تیر کا اینگل نہ بگڑے اور اگلا بازو تو کسی قیمت پر ہلنا نہیں چاہیے۔ اب اس جگہ کو دیکھو جہاں نشانہ لینا ہے۔ اوکے۔ ڈن۔'' پوزیشن سے مطمئن ہو کر رافع نے انگوٹھا اٹھایا۔

''یس۔ یس۔'' وہ زور سے اُچھل کر چلائی اور مُڑ کر خوشی سے رافع کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تیر اس مرتبہ درخت میں ہی لگا تھا۔

''ویری گڈ۔ جاؤ اب بھاگ کر تیر اٹھا لاؤ۔'' وہ بھی ہنس رہا تھا۔ ویملا دوڑ کر درخت تک گئی۔ پہلے نیچے پڑا تیر اٹھایا اور پھر درخت میں لگے تیر کو نکالا۔ ذرا دیر رُک کر کچھ سوچا پھر تیر کی نوک سے اس جگہ کی

چھال کھرچنے لگی۔ رافع وہاں سے دُور اب بکھرا ہوا سامان سمیٹ رہا تھا۔ ویملا نے نیم دائرے جیسی ایک جگہ کی چھال ہٹا کر نوک سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ تیر بڑا ہونے کی وجہ سے مشکل تو پیش آرہی تھی پر وہ دونوں ہاتھوں کی طاقت استعمال کرتے خوب محنت سے لگی ہوئی تھی اور جب تک رافع وہاں پہنچتا، وہ کچھ لکھنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''بنگالی میں؟'' رافع کے چہرے پر حیرت بھری بڑی پیاری مسکراہٹ آئی تھی۔ ویملا نے درخت پر بنگالی میں اپنا نام کندہ کیا تھا۔

''تم ہی سے سیکھا ہے۔'' وہ اپنے نام پہ انگلی پھیرتے مسکرا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''مجھ سے؟'' وہ مزید حیران ہوا۔

''اُس دن گھاٹ کی گیلی مٹی پر تم میرا نام لکھ رہے تھے ناں۔۔ یوں دیکھنے میں تو میری باتیں سن رہے تھے۔ پر تمہارا دھیان کہیں اور تھا۔ میں نے بہت دھیان سے اس لفظ کو دیکھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیا ہے اس وقت تمہارے اندر جو بلا سوچے مٹی پہ ابھرتا جا رہا ہے۔ اور پچھلی رات میں نے یہی لکھ کر نشاد سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ دیکھ کر خوب ہنسی کہ اپنے ہی نام کا مطلب پوچھ رہی ہو۔''

''بڑی ہوشیار ہو تم تو.....'' رافع کھسیا گیا۔

''اِس سے بھی زیادہ۔'' ویملا نے ادا سے ابرو چڑھائے۔ ''اب ذرا آنکھیں بند کرو۔''

''کیوں؟'' وہ شک سے دیکھنے لگا۔

''کرو ناں بابا! اچھا تو منہ پھیرو۔ بس دو منٹ۔'' اس نے زبردستی اسے دوسری طرف دھکا دیا اور پھر سے کچھ لکھنے لگی۔

''لو۔ اب دیکھو۔'' ویملا کے بلانے پر رافع پلٹا تو ویملا نے اپنے نام کے سامنے بنگالی میں ہی رافع لکھ دیا تھا۔ رافع کو ہنسی آگئی۔

''اب یہ کیسے؟''

''میں نے نشاد سے کہا کہ اب وہ اپنا نام بنگالی میں لکھ کر دکھائے۔ پھر، سومیہ، سندر بن، انڈیا، انترا، وغیرہ کی فرمائش کرتے سرسری رافع بھی کہہ دیا اور اُن ڈھیر سارے شبدھوں میں سے ایک تمہارے کو یاد کرلیا۔ باقیوں کی آوشکتا نہیں تھی۔''

''ہوں اور یہ کیا ہے۔'' رافع نے دائرے میں لکھے ناموں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا مطلب اس کی کیا ضرورت۔''

''اب یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔'' وہ منہ کر رخ موڑ گئی۔ ''کوئی لڑکی اپنے نام کے آگے لڑکے کا نام کیوں لکھے گی؟''

''مجھے کہاں آتی ہیں ایسی سمجھ داری وا باتیں۔'' وہ پھر آگے آگے چلنے لگا۔

''تمہیں اچھا نہیں لگا؟'' ویملا اس کے سنجید تاثرات پر سخت مایوس ہوئی۔

''میرا خیال ہے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچ سمجھ ضروری ہے۔'' وہ مزید سنجیدہ ہوا۔

''تو تمہیں اتنا برا لگا۔'' وہ ایک دم روہانسی ہوگئی۔

''تمہیں سومیہ کے متعلق بھی سوچنا چاہیے۔''

''سومیہ!'' ویملا کے خالی خالی لہجے میں انتہا درد تھا۔ رافع کے لبوں سے اس کا نام ادا ہونا بھی، ویم کو اس لمحے قیامت سے کم نہیں لگا۔ دل بری طرح در سے بھر گیا۔ جانے آج صبح تک کیسے وہ اس نئے رشتے سے دست بردار ہونے کو تیار ہوگئی تھی۔ رافع کے منہ سے تو اس کا نام سننا بھی اُسے گوارا نہیں ہوا۔

''سومیہ سے پچھلی رات کیا باتیں ہوئی تھیں؟'' رافع کا دھیان ابھی بھی وہیں تھا۔ اُس نے بظاہر سرسری لہجے میں استفسار کیا، لیکن ویملا کے اندر تو الاؤ جلنے لگا۔

رافع اُس سے سومیہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ اس کی منگیتر کس قدر غصے یا شاید صدمے سے دوچار تھی۔ ویملا کا سارا جوش، جذبہ دھواں بن کے اُڑ گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی وہ پھر سے اپنے عہد بھولنے لگی تھی۔ اُسے تو قربانی دینا تھی۔ سومیہ کی خاطر اور رافع۔ وہ سوچ میں ہی اٹک گئی۔

کیا وہ بھی اتنی آسانی سے پلٹ گیا تھا۔ جیسے سومیہ سے میری طرف آنے کا سفر آسان تھا ویسے ہی

سے وہاں تک واپسی کا۔ وہ عجیب عجیب وہموں میں گھری جانے کہاں تک ہو آئی۔ رافع نے سوال کا جواب نہ پا کر اس کی غائب دماغی کو محسوس کیا۔

''بولو ناں ویملا۔ کیا کہا تھا سوم.....''

''اُسی سے پوچھ لینا۔ بڑے پھول جھڑتے ہیں ہاں بولتے ہوئے۔'' وہ ایک دم تپ گئی۔ رافع نے بس بول لیا سوچنے میں اور آگے چلتی ویملا کو کلائی پکڑ کر روکا۔ دونوں سبزے بھری پگڈنڈی پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ویملا چاہ کر بھی نظر نہیں اٹھا پائی۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں ویملا! کہ اُس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔ وہ ذرا منہ پھٹ ہے، بنا سوچے کچھ بھی بول دیتی ہے۔'' رافع نے اپنے سوال کا مقصد اتنی نرمی سے ظاہر کیا کہ ویملا کے کھولتے دل کو جیسے بارش پڑنے سا سکون ملا۔

''تم..... اِس لیے پوچھ رہے تھے۔'' وہ جھینپ گئی

''تو تم کیا سمجھیں؟'' رافع کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ ویملا کی کلائی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ شرما کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

''مجھے یاد تو رکھو گی ویملا؟'' وہ دھیرے سے بولا تو ویملا نے گھبرا کر ڈھلتے سایوں کو دیکھا۔

''جانے کی بات مت کرو رافع! میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔''

''پر جانا تو ہے۔'' اُس نے تھکی تھکی آہ بھری۔ ''بستی کی تلاش میں اس لیے آنا پڑا کہ یہاں کچھ دیر رُک کر تم اپنے بابو جی سے سپرک (رابطہ) کرنا۔ تمہیں انہیں کہنا ہوگا کہ وہ بارڈر کراس کرنے کی کوئی سرکھشت جگہ ہمیں بتائیں اور اُس پار سے تمہیں لینے کے لیے بھی کسی کو بھیجیں۔ بارڈر پار بھی ایسے ہی سنسان ویران علاقے ہیں۔ میں تمہیں وہاں اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''لیکن اگر وہ مجھ سے خفا ہوئے تو؟''

''ابو صالح کی باتوں سے تو لگتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے وہ تمہیں ان کے حوالے کر کے اُن پہ احسان جتانا چاہتا ہے۔ ابھی تک تو یہی لگ رہا ہے کہ تمہارے بابو جی تم سے ملنے کو بہت بے تاب ہیں۔ پھر فون پر بات کرنے سے تمہیں خود بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

''اور اُس کے بعد؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے اُن خوابوں کو کھوج رہی تھی جو کھلی آنکھوں سے دن رات وہ خود بھی دیکھتی آئی تھی۔

''میں نے آج کی صبح کے انتظار میں پوری رات جاگ کر کاٹی تھی ویملا۔ سوچا تھا کل کا دن بس ہم دونوں کا ہے۔ اب تک کے سارے سفر کا سب سے حسین دن۔ جسے ویملا اور میں اپنی لازوال محبت سے یادگار بنا دیں گے۔ اپنے دل کا حال تم سے کہتے تمہارے پیار کا اظہار سنتے، بھوشے کے خواب بنتے ہم آج شاید ستاروں کو چھو آئیں گے۔ پر رافع محمد کی یہ اِچھا (خواہش) بھی دوسری کئی اِچھاؤں جیسی ادھوری ہی ٹھہری۔'' اُس نے ٹانگ سے لگا شکار کا بیگ جھک کر اٹھایا، ارادہ مزید آگے بڑھنے کا تھا۔ ویملا دو قدم بھاگ کر اس کے بازو سے آلگی۔

''مجھے معاف کر دو رافع! اپنے جذبے کو میں آپ ہی سمجھی نہیں تھی۔ مجھے جانے کیوں یہی لگا کہ ایک بار میں اپنے انڈیا چلی جاؤں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پر یہ.....'' وہ سسک پڑی۔ ''یہ اَسمبھو ہے رافع! تمہارے بِنا اب جیون کے کوئی معنی نہیں۔ میں مر جاؤں گی رافع۔ تمہارے بغیر مجھے صرف موت آسکتی ہے۔ اب ویملا کے جیون میں سوا تمہارے کہیں کچھ نہیں ہے۔'' آنسو موتیوں کی طرح اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

''اگر تم اِس شدت سے میری راہ دیکھو گی ویملا تو میں ضرور آؤں گا۔ ایک دن تمہیں تمہارے بابو جی سے مانگنے۔ تمہیں اپنا بنانے، یہاں ساتھ لے آنے۔''

''میں اُس دن کے انتظار میں آج اور ابھی سے گھڑیاں گننا شروع کروں گی رافع!''

''ہوں اور سومیہ کا کیا ہوگا؟'' وہ سچ مچ اسے چھیڑ ہی رہا تھا، پر بھیگی آنکھوں کو ہتھیلی سے صاف

کر کے دُور ہوتی ویملا ہرگز مذاق کے موڈ میں نہ تھی۔
''اگر تمہیں ایسا لگے رافع کہ سومیہ تمہارے پیار میں جان دینے کی حد تک دیوانی ہے تو تمہیں قسم ہے اپنے پیار کی۔'' اُس نے آگے بڑھ کر رافع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے سر پر رکھ لیا۔
''تم اُسے ہی اپناؤ گے اور میری طرف کبھی لوٹ کر نہیں۔''
''یہ کیا کر رہی ہو ویملا!'' رافع نے تڑپ کر اپنا ہاتھ دور کیا۔ ''ہٹاؤ یہ قسم وسم میرے اوپر سے۔''
''نہیں۔'' وہ ضد سے بولی۔ ''تمہیں یہ شپتھ (قسم) نہ صرف یاد رکھنی ہوگی بلکہ اس کا مان بھی رکھنا ہوگا۔''
''یہ زبردستی ہے۔ میں نہیں مانتا۔'' وہ سخت خفا نظر آ رہا تھا۔
''شپتھ دی ہی اسی لیے جاتی ہے، جب اگلا کچھ ماننے سننے پر راضی نہ ہو۔'' وہ اب بھیگی آنکھیں لیے ہنس رہی تھی۔
''ابھی تم نے کہا تم مر جاؤ گی میرے بنا۔'' وہ اُسے کن اکھیوں سے دیکھتے اب اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔
''مجھے ڈائیلاگ بازی میں مزا آتا ہے ورنہ سات دن کی محبت کا بچپن کے پیار سے کیا مقابلہ رافع!'' وہ اظہار کے چند جملے بول کر پھر پچھتاووں میں گھرنے لگی تھی۔ اپنے ہی ضمیر کی تشفی کے لیے ایک بار پھر بے گانگی دکھانے لگی۔ محبت ایسا دھوپ چھاؤں سا کھیل ہی تو تھی۔۔ رافع نے ہنس کر اس نازک سی لڑکی کو دیکھا جو ہر مرتبہ اسے ہار ماننے پر مجبور کر دیتی تھی۔
''تم نے بتایا نہیں سومیہ نے کیا کہا؟''
''اب چھوڑو بھی۔ ہر بات پوچھنے کی نہیں ہوتی۔'' وہ منہ بنا کر آگے چل دی۔
''او کے چھوڑ دیا۔ پر ایک چیز نہیں چھوڑ سکتا۔'' رافع نے ایک دم ہی پیچھے دونوں شانے مضبوطی سے پکڑ کر اُسے ایک جگہ پہ روک دیا۔
''ہلنا مت اپنے جگہ سے۔'' کان کے پیچھے گردن سے رافع کی سرگوشی اُبھری، ویملا کے نے بڑی دقت سے تھوک نگلا۔ اگلے ہی لمحے اُ اپنی چٹیا پر کسی سرسراہٹ کے احساس نے گدگدایا بے اختیار کسمسائی۔
''ہلو مت ویملا!'' رافع سنجیدگی سے جھنج تو وہ تعجب سے مُڑی۔ رافع اپنی ہتھیلی پوری پھیلا نیم جھکے سے پورا اُٹھ کھڑا ہوا۔
''دو منٹ سیدھی نہیں کھڑی ہو سکتیں۔'' پیشہ یہ بدمزاجی کی لہریں تھیں تو آنکھوں میں سخت خفگی۔
''کیا کر رہے ہو؟'' وہ سانس بحال کر بدقت بولی تھی۔
''تمہاری چٹیا کی لمبائی ناپ رہا تھا۔ قینچی نہیں ہے میرے ہاتھ میں جو کاٹ ڈالوں گا۔ صرف.....''
''کک..... کیا مطلب؟'' وہ دل پہ ہا رکھے اس سرپھرے کو دیکھ رہی تھی جو سخت بر برے منہ بناتا اپنی بالشت کو گھور رہا تھا۔
''بہت دن سے تجسس تھا دل میں کہ تمہارے کتنے لمبے ہیں پر ناپ نہیں پاتا۔ اوپر سے تم ہو دو گھڑی آرام سے نہیں کھڑی ہو سکتیں۔'' وہ اب دونو ہاتھ کمر پہ جمائے سخت بے زاری سے ویملا کو گھور تھا۔ وہ..... جسے کچھ دیر تو حیرت کے سکتے سے باہر نہ میں لگی، اُس کے بعد اپنی سوچ پر حد درجہ شرمندگی باہر آتے، بے اختیار ایک قہقہہ سا چھوٹا۔
''تم تو بالکل ہی بوندو ہو رافع!'' وہ پیٹ ہاتھ رکھ کے ہنستی جا رہی تھی اور اب ہنستے ہنستے پیچھے جا رہی تھی۔
''اچھا ہنس لینا بعد میں۔ پہلے پلیز مجھے نا تو دو۔'' وہ ہرگز اپنی بالشت سمیٹنے پر آمادہ نہیں تھ ویملا ٹھینگا دکھاتی دُور دوڑ گئی۔
''دُلہن کو لینے انڈیا آؤ گے تب سوچیں گے۔''

☆☆☆

دھرمیشور کے کانوں میں زندگی بن کر دوڑی وہ آواز.....
''ویملا میری بچی۔ کہاں ہو تم۔ کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں بابو جی۔'' وہ دھیرے سے ں اتنا ہی کہہ پائی۔
''کہاں ہو بٹیا؟ کب آؤ گی اور.....''
ور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سب کچھ ایک ساتھ ی لے ابھی کیسے جان لے۔
''بابو جی میں بارڈر کے قریب ہوں۔ لیکن ار پار جب تک مجھے کوئی لینے نہیں آئے گا میں ار کراس نہیں کروں گی۔''
''تم ہو کہاں بٹی۔''
''سندر بن کے کسی گاؤں میں ہوں، نام نہیں علم۔ آپ مجھے بتائیں کہ بارڈر پار کرنے کے ل کوئی سیف جگہ ہے؟''
''ہاں ہاں بیٹا۔'' وہ جلدی جلدی کچھ سوچنے گے۔ ''میں تمہیں تفصیل سے سمجھاتا ہوں اور یہاں ے کسی آدمی کو گاڑی دے کر ابھی بھیجتا ہوں۔''
''تو کب تک پہنچے گا وہ آدمی؟'' ویملا کو لگا لتے سے بارڈر تک آتے تو شاید اگلی صبح ہو جائے۔ ں ایک خوشی کی لہر سی اُبھری۔ رافع کے سنگت ہونے اور طویل ہونے کا احساس بڑا ہی خوش کُن تھا۔
''وہیں قریب کچھ لوگ ہیں۔ مشکل سے ایک گھنٹہ بھی نہیں لگے گا سب پر بندھ (بندوبست) ہو جائے گا۔ پر ویملا! تم کس کے ساتھ ہو؟''
دھرمیشور کو حیرت تھی کہ ابھی پچھلے دن ہی ابو صالح نے اس سے دو روز کی مہلت مانگی تھی ویملا کو اس کے والے کرنے کی اور اب ویملا کچھ گھنٹوں بعد بارڈر راس کرنے والی تھی۔
''ہیں کچھ لوگ باپو! میں آرام سے پہنچ جاؤں گی۔'' اُس نے ایک نظر رافع کو دیکھا۔
''اچھا ٹھیک ہے بٹیا! کوئی مسئلہ ہو تو رابطہ کرنا۔ اب یہ پتہ دھیان سے سن کر انہیں بتا دو۔ تم جس وقت بھی وہاں پہنچو گی میرے آدمی تمہارے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔ تمہیں لیے بنا وہ وہاں سے نہیں آئیں گے۔''
دھرمیشور نے اُسے ہر ممکن تسلی دیتے لوکیشن سمجھانا شروع کی۔ اسپیکر رافع نے آن رکھا تھا۔ دھرمیشور جگہ کے بارے میں بتانے لگا اور رافع کے لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

☆☆☆

درختوں کے پار بھی بستی تو کوئی نہیں ملی، وہ دونوں واپس آ کر لانچ کے قریب ایک خشکی کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اب اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دھرمیشور کی بتائی جگہ وہاں سے قریب گھنٹہ بھر کی دُوری پر تھی۔ باوجود پرمٹ وغیرہ ہونے کے رافع کو ہر قسم کی احتیاط مدنظر رکھنی تھی کیونکہ معاملہ ویملا کو چوری چھپے بارڈر کراس کرانے کا تھا۔ بارڈر ایریا میں پولیس لانچ چلنا معمول کی بات تھی اور ویملا کو ساتھ لیے تو رافع ہرگز ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار ویملا اُس طرف چلی جاتی پھر اُسے کوئی ڈر نہیں تھا۔
بارش برس جانے کے بعد آسمان یکسر بدلیوں سے پاک ہو چکا تھا۔ چاند کی دھیمی روشنی چہار سو پھیلی تھی۔ ایک چاند سامنے آسمان پر تھا۔ اور ایک نیچے مالنچا ریور سے جھانک رہا تھا۔
''اِس جگہ کو دیکھو رافع!'' ویملا نے اپنی بھنورا کالی آنکھیں رافع کی جانب گھمائیں۔ کنارے کی چھوٹی گھاس پر جوتا نکلیں سامنے سیدھی کیے ہتھیلیاں پیچھے گھاس پر جمائے پانی میں ملتے چاند کے جھلمل عکس کو دیکھ رہا تھا۔ کالی خمار آلود آنکھ میں اُداسیوں کے ڈیرے تھے۔ خاموشی اُن لمحوں میں درد چھپانے کو بھرم کا کام دے رہی تھی۔
''کیا یہ وہی دُنیا ہے جہاں انسان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ میں ایک دوسرے پر اوندھے پڑے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ نفرت، محبت، اپنے، پرائے کا کھیل جہاں ایک گنجلک پزل جیسا ہے۔ ویوہار (رویے) ایسے معمہ کہ چہرے پڑھنے میں ہی عمر بیت جائے۔ پر یہ انسان پھر بھی ایک مسٹری، ایک بھید۔ ایک اَن کہی نامکمل داستان، جس کا کوئی نہ کوئی پنا (صفحہ) نظروں سے اوجھل ہی

رہتا ہے۔ پتا ہے رافع!'' وہ نرم سا مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جو پورے انہماک سے فطرت کے اُس ملاوٹ سے پاک نظارے میں چاندنی سی اُجلی روشن اور شفاف دکھائی دیتی ویملا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ ویملا کے ارتکاز کو توڑنا چاہتا تھا نہ اپنے۔۔ ہلکا سا سر ہلا کر اُسے جاری رہنے پر اُکسایا۔

''میں نے باگھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، دو دو بار۔ پر مجھے اُس سے خوف محسوس نہیں ہوا۔ جانتے ہو کیوں..... کیونکہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اس کا سامنے ہونا مجھے بتا رہا تھا کہ سو بھاگے (قسمت) سے بچ گئے تو ٹھیک ورنہ اس نے ہمیں پھاڑ ہی کھانا ہے۔ کاش انسان کی دشمنی بھی باگھ جیسی ہوتی۔ تو ہر موڑ پہ دل پر چوٹ نہ پڑتی، ہر قدم کسی ان دیکھی کھائی میں نہ گرتا۔

کبھی کبھی لگتا ہے بھگوان نے مجھے پراکرتی میں کھو جانے کے لیے ہی بنایا ہے۔ میں شہر میں رہتے بھی خاص اُن جگہوں پہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رُک جاتی جہاں پراکرتی کی ایک پرچھائیں بھی دکھائی دے جاتی۔ لوگ کہتے ہیں ہاورا برج بہت خوبصورت ہے۔۔ اور مجھے دیکھو دریا کے کنارے ڈرائیو کرتے کرتے وہاں تک نکل جاتی جہاں نہ ہاوڑا برج دکھائی دیتا نہ لوگ، نہ ہوٹل، دوکانیں، بس دور تک بہتا پانی، نرم گھاس، نیلا آسمان اور ایک دیوانی ویملا۔۔

تم سے محبت بھی میرے اسی جنون کا پرتو ہے رافع! تم بھی جنگلوں کے واسی ہو، پراکرتی کا ایک حصہ، ان ہی جیسے شُدھ، سُندر۔''

وہ اب آگے اُٹھے اپنے گھٹنے پر ہاتھ دھرے اس پر اپنی ٹھوڑی رکھے مبہوت سی رافع کو دیکھ رہی تھی، جو مکمل خاموشی اوڑھے آج جیسے اسی کو سننے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

''تم سے خوابوں کا سمبندھ تھا رافع! دُھند میں لپٹا ایک آرچر، جو میری اور پشت کیے دریا کنارے ایک اونچے پتھر پر پاؤں رکھے جانے کس ان دیکھی دشا کا نشانہ لیتا ہے۔ میں دھیمے دھیمے اس کی جانب بڑھتی ہوں اور وہ۔ وہ اب جھک کے پانی سے منہ پہ چھینٹے مار رہا ہے اور اوپر اٹھتے ہوتے وہ اپنے گیلے ہاتھ بالوں میں پھیرتے گردن پر پڑے لچھے دار بالوں تک لے جاتا ہے

''اچھا۔'' وہ بھرپور دلچسپی سے سیدھا ہو

''اور اس کی صورت؟''

''سپنے میں دکھائی نہیں دی پر آج۔ میرے سامنے ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''کچھ تفصیل بتاؤ ناں ویملا! کیسا سپنا؟''

''میں نے یہ سپنا ایک بار ہی دیکھا رافع! جیسے ہزارات کوئی نہ کوئی خواب دیکھتے ہیں۔ بالکل ایسا نہ تو میں سپنوں میں جیتی ہوں اور نہ ہی مجھے کوئی خواب آتے ہیں، نہ ہی بار بار کسی خواب کا آنا۔ لیکن کچھ سپنے ایسے ہوتے ہیں جو بالکل ہی کسی اجنبی کے ہوتے ہیں۔ کئی بہت پرانے خواب صرف اسی ہمیں ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں کہ وہ ہماری زندگی سے بہت الگ دنیاؤں جیسے ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔'' رافع نے بھی تائید میں سر ہلا

''ایسا ہی ہے۔ کچھ عجیب و غریب خواب میں بھی بھول نہیں سکا۔''

''جس سپنے کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ وہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ اس میں جب کچھ طے نہیں ہوتا، کچھ باتیں بڑا عجیب پرنام (اثر) چھوڑ جاتی ہیں۔ مجھے بھی اچھی لگتی سپنوں، پھولوں، رنگوں، تتلیوں کی باتیں۔ میں جب سپنے میں ایک ہیرو جیسے ویر، بہادر کو دیکھا سپنا میری پوری ہستی پر چھا گیا۔ مجھے پورا یقین میں دوبارہ ضرور یہ سپنا دیکھوں گی اور مجھے اس چہرا بھی ضرور دکھائی دے گا۔ کچھ عرصے بعد کہیں موی میں بان کمان دکھائی دیئے تو مجھے پھر وہ پوری شدت سے یاد آ گیا۔ آرچری سے میری دلچ بھی اسی سپنے سے شروع ہوئی۔ میں اس سپنے اور لڑکے کو ایسے یاد کرتی جیسے بچپن کا کوئی ساتھی جائے اور اس کے دوبارہ ملنے کی آشا لیے آپ جی

ان گزارتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سپنا مجھے کبھی دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ ہاں لیکن ٹھیک اس سے جانا منظر میں نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہاں دن میں دیکھا۔ وہ اگلی صبح جب میں چراگاہ کی نکل گئی تھی۔ واپس آتے جوں ہی دریا پر نظر پڑی ایک پاؤں پتھر پہ رکھے جھک کر دریا کے پانی سے ھو رہے تھے اور ابھی میرا سکتہ ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ ھا کھڑے ہوتے تم نے گیلے بالوں کو پیچھے اپنی دن تک پھیرا۔

''ہوں..... پھر؟'' رافع مسکراتے لبوں کے ساتھ بھرپور انہماک سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

''پھر اس سے اگلی مرتبہ باگھ سے بچ کر بھاگتے ب میں لانچ کی طرف دوڑ رہی تھی، تم بان کمان سنبھالے باگھ کا نشانہ لیے ہوئے تھے۔ اور تب بھی میں نے یہی سوچا کہ ایسی باتوں کا کوئی مطلب نہیں۔ حالانکہ اندر کی آواز کہہ رہی تھی ویملا کماری تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔''

''قسم واپس لے لو ویملا!'' گھاس نوچتے اب وہ ایک دم حد سے زیادہ سنجیدہ ہوا تھا۔

''دل..... لیکن.....'' دل پورا ڈوب کر پیروں میں کہیں کھسک گیا۔ ویملا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، وہ اس کی باتوں کو اس انداز میں لے گا۔ روانی میں بولتے وہ بھی یہ فراموش کر گئی تھی کہ اس کے اور رافع کے درمیان سومیہ تھی جس کے رشتے کی طاقت نے ایک بار بھی ویملا کو کھل کر اپنی محبت کو محسوس نہیں کرنے دیا تھا۔ کیونکہ اس نے میرابائی جیسی محبت کو اپنا آئیڈیل بنایا تھا وہ غاصب نہیں ہو سکتی تھی، کبھی نہیں۔۔ رافع نے بڑی دیر بعد اپنی شکوہ بھری نگاہ اس کی جانب اٹھائی تو ہلکے گلابی ڈورے سے اس کی آنکھوں میں تیرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اُن الوداعی لمحوں کے درد کو اب پوری شدت سے دل پہ گزرتا محسوس کر رہا تھا۔ ویملا نے نظر چرا لی۔

''شاید بابو جی کے آدمی آ گئے ہوں۔ ہمیں چلنا چاہیے۔''

ماہنامہ کرن

اگست 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

"کرن کا دسترخوان"

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- "14 اگست" کے حوالے سے معروف شخصیات سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "شامل خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- آواز کی دنیا سے "عاصم محمود" اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ "صائمہ سحر" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "شب نم کی سحر" رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- "لذت غم عشق" صائمہ قریشی کا مکمل ناول،
- "آخری فتح" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "نین تارا۔ اور اک نئی کوکب" منشا محسن علی کا مکمل ناول،
- "میں واری جاواں" ریحانہ آفتاب کا ناولٹ،
- "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- نادیہ احمد، فرح بھٹو اور قرۃ العین سکندر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

''مت جاؤ ویملا!'' رافع نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ ''کہیں مت جاؤ۔''

''میرے باپو میرا انتظار کررہے ہیں رافع!'' وہ دھڑکتا دل لیے فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دھڑکتا دل جو چیخ چیخ کر رافع سے کہنا چاہتا تھا کہ قسم کیوں پلٹوانا چاہتے ہو۔ ویملا کو تو پورا یقین ہے کہ اس جیسی محبت پوری کائنات میں رافع محمد سے کوئی نہیں کرسکتا۔ سومیہ کی محبت کبھی رافع کی راہ نہیں روک سکتی۔ اس کی دی قسم کا لیول سومیہ کے پیار سے بہت اونچا ہے۔ پر وہ ساری چیخوں کو دل میں دبائے عجلت میں لانچ پر آ گئی۔

☆☆☆

ابوصالح کے مسکراتے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک اس وقت دوچند ہوگئی جب کچھ آدھا گھنٹہ پہلے اُسے دھرمیشور کی کال آئی۔

''ویملا کے ساتھ بارڈر پر کون ہے ابوصالح؟ میرے آدمی دوسری طرف پہنچ چکے ہیں۔''

''ہوں؟'' صالح فوری طور پر سمجھ نہیں سمجھ سکا لیکن اپنی کیفیت پر اس نے لمحوں میں قابو پاتے لب ولہجہ سنوارا۔

''ہاں ہاں۔ ہمارا ہی آدمی ہے۔ کیوں کیا ہوا؟''

''یار جس نمبر سے کال آئی تھی، اب اس کے سگنل نہیں مل رہے۔ میرے آدمی ادھر آدھا گھنٹہ ہوا پہنچ بھی گئے۔''

''فکر نہ کرو، وہ بھی پہنچ جائیں گے۔'' ابوصالح نے جلدی جلدی کچھ سوچا۔ ''تمہارے آدمی ہیں تو اُسی بتائی ہوئی جگہ پر ناں؟'' صالح کو اب لوکیشن جاننی تھی کسی طرح۔

''ہاں ہاں بالکل۔ نیلی لائنوں والی سفید یاٹ پر میرا آدمی ہے، سور یا نام ہے۔'' دھرمیشور نے فوراً مطلع کیا لیکن ابوصالح سخت بدمزہ ہوا۔ دھرمیشور کسی مچھلی کی طرح خود ہی جال میں آن تو پھنسا تھا پر اپنی معلومات کے خزانے سے ابوصالح کو مستفید نہیں کر پا رہا تھا۔ بھلے انجانے میں سہی۔

''لوکیشن دوبارہ سمجھاؤ دھرمیشور۔ میں اپنے آدمی سے بات کرتا ہوں۔ کہیں تم دونوں نے سمجھنے غلطی نہ کی ہو۔'' بہرحال وہ ابوصالح تھا۔ ہاتھ آیا قیمتی سنہری موقع ہرگز کسی قیمت پر گنوا نہیں سکتا تھا۔

''ہیم نگر سے قریب دس کلومیٹر دور عین بار کنارے کی گھاٹی۔ یاد ہے پچھلے سال جہاں سے بنگال ٹائیگرز آئے تھے۔ مسٹر جین لارنس۔''

''اوہاں ہاں۔'' صالح کی چھوٹی چھوٹی آنکھ میں زندگی سے بھرپور چمک جاگی تھی۔ ''لوکیشن تو ہے دھرما! چلو ٹھیک ہے میں پھر بھی چیک کر لیتا ہوں اپنے آدمیوں سے کہو وہاں سے نہ ہلیں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ وہ وہیں رہیں گے۔ دھرمیشور نے کال آف کی اور ابوصالح نے فی الف اپنے بارڈر پار کے آدمیوں کو کال ملائی۔ بارڈر پر لیے دین کے یہ کام، دن ہو یا رات کسی نہ کسی جگہ سے پاتے ہی رہتے تھے۔

گورو اور جونی ہیم نگر گھاٹ پہ اس وقت موجود تھے۔

''کسی تیز جدید لانچ پہ ابھی کے ابھی پہنچ رافع ایک لڑکی کو لے کر وہاں آنے والا ہے۔ لڑکی رافع کے قبضے سے نکال کر حفاظت سے دھرمیشور کے بندوں کو دینا ہے۔''

''لیکن صاب! ہم تو پہلے سے اِس طرف موجود ہیں۔ دھرمیشور کے آدمیوں کو سمجھ آ گئی تو.....'' جونی نے عجیب لگا سن کر کہ وہ تو خود انڈین سائیڈ پہ تھا۔ لڑکی رافع سے لے کر وہ دھرمیشور کے آدمیوں کو کیسے یقین دلا پائے گا کہ وہ لڑکی کو اُن کو حوالے کرنے آیا ہے۔

''بے وقوف۔ کس نے کہا دھرمیشور کے آدمیوں کو بھی بتا دو کہ تم لوگ اُدھر سے آئے ہو۔ پانی کے راستے گھوم کر اس طرح سامنے آؤ کہ لگے بنگلہ دیش کی طرف سے آرہے ہو۔ کوشش کرو کہ اُن تک پہنچنے سے پہلے رافع کو قابو کرو اور لڑکی اپنے قبضے میں کرلو۔ رافع کا اُنہیں بھی نہ چلنے دو۔ باقی فرض کرو رافع تم سے پہلے اُن تک پہنچ جاتا ہے تو ڈٹ جانا اِس بات پر کہ اِس نے زبردستی لڑکی تم سے چھینی ہے۔ رافع کو اُدھر ہی قابو کر لینا۔ وہ اِن

کی لر نہیں جانا چاہیے۔''

''سمجھ گیا صاب! ایسا ہی ہوگا۔ پر صاب لڑکی نے کچھ کہہ دیا تو.....؟''

''وہ میں نمٹ لوں گا۔'' ابوصالح نے ناک سے مکھی اُڑائی۔ دھرمیشور کے کان رافع کے خلاف بھرنا اُس کے لیے اور بھی آسان ہوجاتا۔ وہ تو پہلے ہی دھرمیشور پہ ظاہر کرچکا تھا کہ لڑکی جذباتی طور پر رافع کی طرف مائل ہے۔ دھرمیشور بیٹی کی کھنچائی تو ضرور کرے گا پر ابوصالح سے بدگمان ہونے کا امکان پھر بھی کم تھا۔

☆☆☆

دو ملکوں کو جدا کرتے اُن پانیوں پر رافع کی لانچ اُس مقام سے تھوڑا ہی دور تھی جہاں سے پہلی مرتبہ اُس نے ویملا کو مانک اور اس کے آدمی سے لیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور رافع نے ایک چادر میں اسے رول کر کے اپنے کندھے پر ڈالا تھا۔ اور آج پورے چاند کی اِس رات میں وہی ویملا اُس کے پہلو سے لگی ہر لمحہ واپس جانے پر خوش نظر نہ آتی تھی۔ یہ سوچ اگرچہ پہلے دن بھی، رافع کے ذہن میں موجود تھی کہ لڑکی اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں آئی ہے لیکن تب کی سوچ کی رافع کے دل میں کوئی وقعت وعزت نہ تھی۔

''کہا تو یہیں کا تھا۔'' رافع نے بے چینی سے لب چباتے دور تک دیکھا۔ ''اور تمہارے بابو جی نے تو کہا تھا وہ لوگ پہلے سے موجود ہوں گے؟''

''اچھا آجائیں گے۔'' ویملا کے اضطراب میں جھنجھلاہٹ چھپی تھی۔ رافع نے ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا۔

''پولیس وغیرہ کی وجہ سے جلدی کر رہا ہوں۔''

''تم واپس آؤ گے رافع؟'' وہ بڑی دیر سے اُس محبوب چہرے کو پورے انہماک سے اردگرد سے لاپرواہو کر تک رہی تھی۔

''ان شاء اللہ۔ میں جلد آؤں گا اور مجھے ہی آنا ہے اِس بار۔ میرا.....'' بات رافع کے منہ میں رہ گئی اور خاموشی میں ایک لانچ کی آواز سنائی دینے لگی۔

''بات تو پوری کرو۔'' ویملا کو سخت کوفت ہوئی اُس لمحے لانچ کی آمد پر۔

''میرا انتظار کرنا ویملا۔'' وہ لانچ سے نظر ہٹا کر اس کی گہری کالی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ لانچ قریب آئی تو رافع اُچھل کر نیچے اُترا۔ ویملا کو ہاتھ سے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دوسری لانچ کنارے پر رُک چکی تھی۔ رافع نے حساس ایریا ہونے کی وجہ سے پانی میں دور تک ایک بے چین نگاہ دوڑائی۔ بارڈر سیکیورٹی فورسز کا خطرہ لگاتار سر پہ منڈلاتا سا محسوس ہوا تھا۔ پھر بھی شکر رہا کہ اب تک کے سفر میں اُسے ایسی کسی رُکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بس ایک بار ویملا بحفاظت اس ایریے سے اپنے ایریے میں داخل۔ دوسری لانچ سے اُترنے والوں نے نزدیک آتے ہی اُسے سختی سے دبوچ لیا تھا۔ رافع نے اِس اچانک ٹوٹتی افتاد پر مزاحمت کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ دو آدمیوں نے ایک چادر اس کے منہ سر پہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے

بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت -/120 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

ڈال کر اس بری طرح بازوؤں سے جکڑا تھا کہ رافع کو نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ ملنے جلنے کی سکت ہی باقی رہی تھی۔ بازوؤں سمیت اس کے پورے وجود کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ ویملا کی چیخیں البتہ خاموشی میں بری طرح گونج رہی تھیں۔ تب ہی فضا میں ایک اور لانچ کی آواز سنائی دی۔ آواز کہیں دور سے آرہی تھی اور اب رفتہ رفتہ نزدیک ہو رہی تھی۔

پہلے رافع کو شبہ ہوا کہ حملہ کرنے والے اسے باندھ کر ویملا کو لیے لانچ پر واپس جا رہے ہیں۔ لیکن ویملا کی چیخیں وہیں قریب سے آرہی تھیں اور لانچ کی آواز پیچھے کہیں دُور سے۔ رافع کچھ نہ سمجھتے پھر سے زور لگانے لگا۔ اُس بوری جیسی چادر میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ بندھے بازوؤں کے ساتھ وہ زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ رافع نے چند لمحے پہلے کی سوچ کے برعکس اِس بار دل سے یہ دعا کی کہ آنے والی لانچ یارڈر سیکیورٹی فورسز کی ہو لیکن..... لانچ رُک چکی تھی۔ ویملا بدستور چیخ رہی تھی۔

''لڑکی کا منہ کیوں باندھ رکھا ہے۔ جانتے بھی ہو کن کی بیٹی ہے۔'' کسی کی بھاری آواز رافع کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اور یہ کون ہے؟'' آنے والا بنگالی میں بات کر رہا تھا۔

''ہم جانتے ہیں یہ دھرمیشور شکلا کی بیٹی ہے۔ ہم ابوصالح کے آدمی ہیں۔ اپنے باس سے کہنا شکر پڑھیں صحیح سلامت لڑکی اُن تک پہنچا دی ہے۔ ہمارے صاب کا احسان نہ بھولے۔ لڑکی ابھی بھی بنگلہ دیش چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ ہمارے صاب نے دھرمیشور سے دوستی کی خاطر بڑی مشکل سے اِسے ممکن بنایا ہے۔'' دوسری آواز رافع کے کانوں سے ٹکرائی اور اب وہ معاملے کو سمجھنے کے قابل بھی ہو گیا۔ اُس پر حملہ کرنے والے ابوصالح کے آدمی تھے اور ویملا کو اس سے چھین کر دھرمیشور کی نظروں میں ابوصالح کو اچھا ثابت کر رہے تھے۔ وہ ویملا کو لے جانے کے خیال سے کسی قدر پُرسکون ہوا۔ ہاں وہ تمام تر تکلیف اور اس سانس بند کرتی گھٹن کے

''اور یہ رافع محمد ہے جس کی خاطر لڑکی ہمارے ملک تک بھاگ آئی تھی۔ اب جلدی کرو لڑکی کو لے کر یہاں سے نکلو، اِس سے پہلے کہ کوئی بڑی مصیبت سر پر پہنچ جائے۔''

''اوں اوں۔'' ویملا کا منہ شاید باندھ دیا گیا تھا۔ وہ گھٹے گلے کے ساتھ آواز نکالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ آدمی اُسے لیے دُور جانے لگے تھے کیونکہ ویملا کا احتجاج اب آہستہ ہو رہا تھا۔ رافع نے زور لگانا جاری رکھا۔ اپنے ہاتھوں کو وہ رسیوں سے آزاد کرنے کے لیے بنا درد کی پروا کیے کلائیوں سے جھٹک رہا تھا اور یہ شدید تر زور لگانے کا نتیجہ تھا کہ ایک ہاتھ اس کا رسیوں سے باہر آ گیا تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر اُس نے چادر اپنے منہ سے ہٹائی۔ دھرمیشور کی بھیجی لانچ اب ویملا کو لیے دُور جا رہی تھی۔ ابوصالح کے دونوں آدمی اس کے سامنے اس کی طرف پیٹھ کیے جاتی لانچ کو دیکھ رہے تھے۔ ویملا نے اُسے اُٹھ کر کھڑا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ آدمی سے

ہاتھ چھڑوا کر اس نے بازو بے تابی سے اس کی طرف بڑھایا اور شاید یہی اس کی بھول تھی۔ کنارے پر کھڑے ابوصالح کے آدمی جو رافع کی طرف سے پشت کیے بے فکری سے کھڑے تھے یک لخت چونک کر پلٹے۔ رافع کا اپنا دھیان بھی ویملا کی جانب تھا۔ وہ ابھی تک بے چینی سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ابوصالح کے آدمیوں نے رافع کو آزاد کھڑے دیکھا تو جھٹ اپنی جیبوں سے ریوالور نکال کر رافع پر تان لیے۔ دُور جاتی لانچ پر بے بسی سے چلاتی ویملا نے وہ ایک آخری منظر جو بقائمی ہوش وحواس دیکھا، رافع پر دو ریوالوروں سے بیک وقت گولیاں چلنے اور گولیوں کے نتیجے میں رافع کے اُچھل کر پیچھے گرنے کا تھا۔ رافع اُس کی غلطی سے دشمنوں کی گولیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ وہ آخری سوچ تھی جس نے ذہن کے پردے پر دھیرے دھیرے دُھند سا چھاتے اُسے بے سُدھ کر دیا اور وہ وہیں لانچ کے فرش پر اوندھی ہو گئی۔

گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کی جگ میں خاک عزت نہیں ہوا کرتی پر بھاگ کے کسی طرح واپس آجانے والی تو نیچ پن کے سب سے آخری درجے پر جا پڑتی ہیں۔

فون پر تڑپ تڑپ کر اس کی خیریت دریافت کرنے والے بابو جی اب اسے ردی میں پڑے کسی مڑے تڑے غیر اہم کاغذ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

سلیکھا جو، اب سے پہلے چیخ چیخ کر گھر بھر میں اپنی اہمیت کا ڈھنڈورا پیٹا کرتی تھی۔ نوکروں، بچوں اور دھرمیشور پر اپنی اہمیت اور بڑائی ثابت کرنے میں جی جان سے جتی رہتی تھی اب ایک دم شانت سی لگنے لگی تھی۔ اب سے پہلے وہ جس کے مقابلے میں خود کو برتر ثابت کیا کرتی تھی وہ تو سامنے کھڑی ہو کر بھی اب مقابل نہ تھی۔ اب بھلا اس کا اور ویملا کا کیا مقابلہ۔

وہ نخوت سے طنزیہ چبھتی نگاہ ڈال کر دائیں بائیں سے گزر جاتی۔ انترا البتہ بڑی بے تابی سے آملی تھی۔ ہاں لیکن اس کی حیران آنکھوں کے سوال بڑے تکلیف دہ تھے۔

اور ویملا..... وہ اب زندوں میں کہاں تھی۔ سلیکھا کیا سوچتی ہے، بابو جی کیوں نفرت سے دیکھنے لگے ہیں۔ انترا کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ اُسے کہاں یہ سب دکھائی اور سجھائی دیتا تھا۔ آنکھ کے پردے سے جو ایک منظر چپک کر رہ گیا تھا اس کے آگے پیچھے سب دھندلا سا تھا۔

رافع اس کی غلطی کی وجہ سے دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ کیا وہ بچ گیا تھا؟ اب وہ کہاں تھا۔ یہ ایک سوال شاید جلد ہی اس کی جان لینے کا باعث بننے والا تھا۔ اول روز سے اب تک وہ ایک لفظ بھی منہ سے نکال نہیں پائی تھی۔

انترا سے ہی ویملا کو معلوم پڑا کہ بابو جی اس کے لیے لڑکا دیکھ رہے ہیں۔ اب ایسی سچوئیشن میں بھگوان جانے کون اس سے شادی کو تیار ہوتا، پر دھرمیشور شکلا شاید اپنے پیسے کے بل پر داماد خریدنا چاہتے تھے۔ اور اگر واقعی ایسا تھا تو دولت کے پجاریوں کی یہاں کمی نہ تھی۔ جلد ہی شاید اسے کسی ایسی جگہ دھکا دے دیا جاتا جہاں سے واپس بلانے کی نہ تو دھرمیشور کو کبھی چاہ ہوتی نہ ہی وداع کر کے لے جانے والا اس کے من کی کچھ سننے پر آمادہ ہوتا۔ دولت برسا کر ایک بدنما دھبے کو مٹانے یا ہلکا کرنے کی کوشش ضرور کی جا رہی تھی اور وہ..... وہ یقیناً ایک ایسی زندگی جینے جا رہی تھی جس میں اب کبھی رافع نہیں آسکتا تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ بیت گیا تھا۔ پورا ایک ماہ..... رافع کی راہ دیکھتے۔ اس کے فون کا انتظار کرتے۔ خود کو کوستے، اپنے آپ پہ لعنت ملامت کرتے۔ باقی پچھتاوے اپنی جگہ۔ یہ غلطی ہی کیا کم بڑی تھی کہ اتنے دن ساتھ رہنے کے باوجود وہ اس کا نمبر تک اُس سے لے نہیں پائی تھی۔ حتیٰ کہ آخری دن۔ اتنی اہم بات بھلا کیوں اور کیسے وہ فراموش کر سکتی تھی کہ ایک دوسرے سے نمبرز بھی ایکسچینج کرنے ہیں۔ ہاں بس

ایک اُمید کہ آخری دن اُس نے رافع کے نمبر سے بابو جی کو کال ملائی تھی۔ اگر رافع ٹھیک ہے، صحیح سلامت ہے تو وہ اُسے ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

کبھی سوچتی کہیں وہ رافع کے لیے بھی اب ردی میں پڑے کسی مڑے تڑے کاغذ جیسی بے مایہ نہ رہ گئی ہو۔ اپنا آپ کسی ٹوٹے برتن جیسا بے کار و بے مول لگنے لگا تھا اور پھر ان ہی دنوں میں معلوم ہوا کہ کہیں اس کی بات طے پا گئی ہے۔ نہ بابو جی نہ سلیکھا۔ کسی نے اس سے پوچھنے یا بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اور اس کی تو خیر ویملا کو امید ہی نہیں تھی۔ بقول سلیکھا آنٹی ایسی کالک پوتنے والیوں کے منہ پر تو اپنے تھوکا بھی نہیں کرتے۔ اس کے والدین اس حساب سے عظیم تھے کہ اسے گھر واپس لائے تھے۔ وہ بس چُپ تھی اور اتنی گمبھیر چپ کہ دنوں اُسے اپنی ہی آواز سنے بغیر گزر جاتے۔ جانے وہ کیا واپس لائی تھی سندر بن سے..... دل، دھیان، سوچ، باتیں، ہنسی، آج بھی شاید جنگل میں گونجا کرتی ہوں۔۔ اس کے پاس تو ایک کھوکھلا وجود تھا۔ کسی خالی پنجرے سا۔۔ روح کا پرندہ جانے کب سے ساتھ چھوڑ سندر بن کی آزاد فضاؤں میں کسی تیرانداز کو دیکھ دیکھ من بہلایا کرتا۔ رافع زندہ ہے اور وہ ایک دن ضرور آئے گا۔۔ اِس سوچ کے سہارے زندگی کاٹنا قدرے سہل ہو رہا تھا اور بس وہ جیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''اے ویملا! تُو یہاں بیٹھی ہے۔ میں اندر تیرے کمرے تک ہو آئی۔'' انترا اُسے ڈھونڈتی ہوئی پائیں باغ میں آ گئی۔ اُس نے بس ایک نظر اُٹھا کر انترا کو دیکھا، جو مہینہ ڈیڑھ ہوا اب اس خاموش نگاہ کی عادی ہو چلی تھی۔

''بابو جی بتا رہے تھے۔ تمہارے بیاہ کی تاریخ لینے آج لڑکے والے آ رہے ہیں۔'' وہ آلتی پالتی مار کر قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

''اور لڑکا کہنا تو بڑا انیائے ہے ویملا!'' انترا کے لہجے میں درد بھر آیا۔ ''اُس بڈھے بنواری کے بیٹے بھی برسوں پہلے بیاہ رچا کر بال بچے دار ہو چکے ہیں۔ تم نے دیکھا اسے ویملا!'' وہ اس کے بازو ہاتھ دھرے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی ویملا نے ہلکے سے سر نفی میں ہلایا۔

''کسی طرح اس بیاہ کو روکو ویملا! وہ بڈھا تمہارے بابو جی سے بھی عمر میں بڑا لگتا ہے۔ کیا نے ایسے پتی کا سپنا دیکھا ہوگا۔ بھگوان کی سوگندھ! وہ کہتے کہتے رُکی۔ ویملا کی آنکھ بے اختیار چھلک پڑی تھی۔ انترا کے لیے شاکنگ تھا یہ لمحہ۔ ڈیڑھ بعد بالآخر ویملا کی جانب سے ایک پہلا ردعمل آ تھا۔ اب تک کے وقت میں انترا نے ثابت قدم سے ڈٹ کر بس ایک ہی کوشش کی تھی کہ ویملا کس طرح اپنی زبان کھول دے۔ پر زبان کھولنا تو دور وہ سوائے ایک مردہ ڈمی کے کچھ نہ تھی۔ لیکن آج..... انترا کی خوشی سے پلکیں نم ہو گئیں۔ ویملا رو پڑی تھی اور ایسا کیا کہا تھا اُس نے۔ انترا ٹھہر کر اپنے ہی جملے پر غور کرنے لگی۔ ''کیا تم نے ایسے پتی کا سپنا'' سوچ کر حیران تھی کہ ایسا بھلا کیا تھا اِس جملے میں۔

''بیاہ کے پرتی ہر لڑکی کے کچھ سپنے ہوتے ہیں ویملا۔۔ ہم نے بھی بُنے تھے کچھ خواب اور کیوں بُنیں۔ جیون بھی تو ہم نے بتانا ہے ناں اور تمہا اپرادھ ہی کیا ہے کہ اس طرح سجا (سزا) سنا جائے۔ اپنے پکش میں کچھ تو بولو۔۔ بھلے تھوڑا سمے اور مانگ لو۔ پر کسی طرح یہ بیاہ مت ہونے دو تم کہو تو میں انکل سے بات کرتی ہوں اور..... اور تم بھی کہو تو میں انکل سے بات کر کے رہوں گی۔'' ایک دم ہی فیصلہ کن انداز میں اٹھنے لگی۔ ویملا کلائی تھام کر اسے روک دیا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں۔'' آخر کار ویملا نے لب کشائی کی۔

''کیوں فائدہ نہیں۔ آخر تم نے کیا کیا ہے تمہیں کڈنیپ کیا گیا تھا ویملا! کوئی تم گھر سے نہیں بھاگی تھیں۔''

''میں گھر سے بھاگی تھی انترا!'' وہ آنکھیں صاف کر رہی تھی لیکن آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''دیکھو میں جانتی ہوں، شروع شروع میں یہاں سب کو یہی وہم ہو گیا تھا کہ شاید تم بھاگی ہو۔ میرے بابو جی بھی ایسا ہی کچھ سن کر آئے تھے اور تو اور میں بھی کنفیوز ہو گئی تھی۔ مجھے لگا تم مجھ سے بھی جھوٹ بول گئی ہو پر وہ سب غلط نکلا ناں ویملا! بس تم۔''

''میں گھر سے بھاگی تھی انترا!'' وہ لگاتار بہتی آنکھیں اور سرخ سرخ ناک کو رگڑتے آج شاید کچھ چھپانے کے موڈ میں نہ تھی۔ انترا نے واپس دھم سے بیٹھتے اپنی زبان کو بریک لگائی۔ اُسے یقیناً ویملا کو سننا چاہیے تھا۔ اپنی بھیرویں کو وہیں اسٹاپ لگاتے وہ بغور ویملا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں آشرم جا رہی تھی یہاں سے بھاگ کر ہمیشہ کے لیے۔ مجھے شانتی کی تلاش تھی۔ من کی شانتی، روح کا قرار۔ مجھے لگا آشرم جا کر مجھے وہ سب مل جائے گا جو یہاں کے ہنگامہ خیز جیون سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پر میں اغوا ہو کر وہاں جا پہنچی جو میرے خوابوں کا دیس تھا اور میں خود نہیں جانتی تھی کہ میرے سپنے کا انواد (تعبیر) وہاں سندر بن میں سوچھ میرے سامنے آنے والا ہے۔''

''کیسا سپنا!'' انترا کے حلق میں کچھ پھنسا اور کھوئی کھوئی ویملا تو وہاں حاضر ہی نہ تھی۔

''وہ آر چرا انترا۔'' ویملا روتے روتے ہنس پڑی اور انترا کا منہ سیٹی کے انداز میں کھلا۔

''اوہ..... تو وہ آ گیا تمہاری لائف میں۔''

''اور چلا بھی گیا۔'' ویملا کا دل کٹنے لگتا تھا اس بے رحم تذکرے پر۔ پھر بھی جانے کیوں دل چاہتا ہر ایک سے بس اسی کی باتیں ہوں۔ ہر پل لبوں پہ بس ایک ہی نام ہو۔

''وہ بھی تمہیں چاہتا ہے ویملا؟'' انترا کو کچھ امید سی بندھتی دکھائی دی

''ہاں۔ بہت زیادہ۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے ندی کے رواں پانی جیسے بہہ رہے تھے۔

''تم بھاگ جاؤ ویملا! میں تمہاری مدد کروں گی۔ چلی جاؤ یہاں سے اور.....'' وہ کہتے کہتے چونکی۔

''پاگل تم واپس ہی کیوں آئیں۔ ارے بھاگنے کا آروپ تو لگ ہی چکا تھا۔ کون سے جھنڈے گاڑنے آئی ہو اور..... اور چلا بھی گیا کا کیا مطلب۔'' انترا کی بوکھلاہٹ میں اس وقت کتنا پیار چھپا تھا۔ ویملا صاف دیکھ پا رہی تھی۔ پہلی بار وہ مسکرا دی۔

''اُس سے سپنوں کا رشتہ تھا انترا! بس آنکھ کھلی اور سپنا اُڑن چھو۔''

''بہلاؤ مت ویملا! بولو ناں کیسے بچھڑ گئے تم اور اب کہاں ہے وہ۔''

''اس کی سگائی (منگنی) ہو چکی تھی۔ بس میں اُسے اس کی منگیتر کے لیے چھوڑ کر آ رہی تھی اور پھر آخری دن اُس سے بچھڑتے سمے۔ کچھ ایسا ہو گیا کہ اب تو یہ سگائی اور بیاہ کی باتیں بھی اُس حادثے کے آگے چھوٹی پڑتی دماغ سے اُتر ہی گئی ہیں۔''

''کیسا حادثہ؟''

''کچھ لوگوں نے اُس پر حملہ کیا میری آنکھوں کے سامنے۔ اُسے گولیاں لگیں اور وہ نیچے گر گیا۔ میری لانچ بھی دور نکل گئی۔ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا۔ مجھے آج تک نہیں معلوم۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا دے کر رونے لگی تھی۔ انترا کے سارے جوش کو ایک نہایت افسردہ کرتی مایوسی نے گھیر لیا۔

''تم نے جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ اب وہ کیسا ہے؟''

''میرے پاس اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی نمبرز لینا بھول گئے ایک دوسرے کا۔''

''بے وقوف۔'' انترا بے بسی سے بڑبڑا کر رہ گئی۔ ''اور کوئی طریقہ نہیں تھا یہ جاننے کا کہ اب وہ کہاں ہے کیسا ہے؟ میں نہیں مان سکتی کہ تم نے اتنے

جلدی سرینڈر کر دیا ہوگا۔"

"میں نے صرف انتظار کیا ہے اُس کا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔" ویملا اپنی روئی گلابی آنکھیں دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔

"اُسے ڈھونڈنے کی کوشش۔" انترا کا لہجہ مضبوط و مستحکم تھا۔ ویملا نے چونک کر اُس کی صورت دیکھی۔

"لیکن....."

"سب سے بڑا اودھم تمہارے اندر اِس ہونے نہ ہونے کے سوال نے مچا رکھا ہے ویملا! سب سے پہلے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اُس روز اُس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور..... نام کیا تھا اُس کا۔" انترا کو خیال آیا پر ویملا بنا جواب دیے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ اُسے یہ بتا کر کہ "وہ" مسلمان تھا وہ انترا کے جوش و خروش پر پانی نہیں پھیرنا چاہتی تھی۔

"خیر جو بھی تھا۔" انترا نے مٹی پاؤ اسٹائل میں ہاتھ جھاڑے۔ "تو مائی ڈیئر ویملا! تم یہ سوچو۔ اُن چھ سات دنوں کو اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے کہ کون سی جگہ یا کون سا آدمی ایسا ہوسکتا ہے جو تمہیں اُس ہیرو کا پتا بتا سکتا ہے۔ خوب دھیان لگا کے ایک ایک بات سوچنا۔"

"مجھے نہیں لگتا۔"

"تمہارے لگنے کی نہیں ہو رہی۔" انترا سخت خفا نظر آئی۔ "مجھے ابھی تک کے قصے میں صرف ایک بات سمجھ میں آرہی ہے ویملا! اور وہ یہ کہ تمہارے سپنوں کا شہزادہ اتنی آسانی سے بھگوان تم سے چھین نہیں سکتے اور تم خود سوچو۔ وہ جو برسوں پہلے خواب میں دکھائی دیا تھا، بھاگیہ تمہیں اُس تک کیوں لے گیا۔ وہ بھی ایسے عجیب و غریب حالات میں۔ کہاں ہمارا کلکتہ، کہاں بنگلہ دیش کا سندر بن اور ٹھیک اسی کی سنگت میں گزارے سات دن۔ آخر کیوں اُوپر والے نے تمہارے سپنے کو سچ بنا کر تمہارے سامنے لا کھڑا کیا۔ بولو ویملا! یہ مسٹری تم کیسے سلجھاؤ گی۔" وہ اب بری طرح جھنجھلا رہی تھی۔

ویملا کو خود بھی پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہاں تو پھر کیوں ہوا اتنا کچھ اُس کے ساتھ۔ ایسے سیئوگ (اتفاق) کے سامنے رافع اور سومیہ کی سگائی کی بات تو شاید کچھ بھی نہیں تھی تو وہ کیوں واپس آگئی۔

"بولو ناں ویملا! میں کچھ کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟"

"ہاں۔" وہ آنکھیں صاف کر کے اب جوش سے گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ انترا کو دیکھ رہی تھی۔ "مجھے اسے ڈھونڈنا ہوگا انترا! تم میری مدد کرو گی ناں۔"

"ضرور کروں گی۔ پر یہ تو اب تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"مجھے سوچنے دو انترا!" وہ اب اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور لان میں ہی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ڈیڑھ ماہ اس نے خاموشی سے بیٹھ کر رافع کی راہ دیکھ لی تھی اور جتنا وہ اسے جان پائی تھی، وہ ایسے لاتعلق بن کے نہیں بیٹھ سکتا تھا تو اگر اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ۔ وہ ایک جھرجھری لے کر حال میں واپس آئی۔ انداز ایک بار پھر ہار مان لینے والا تھا۔ انترا اس کی کیفیت خوب دھیان سے دیکھ اور سمجھ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر نرمی سے اُس نے ویملا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بھگوان پہ بھروسا رکھو، اُس نے تمہارے بھاگیہ میں کچھ اچھا ہی لکھا ہوگا ہوسکتا ہے ہم اُسے ڈھونڈ ہی لیں اور بیاہ کی ڈیٹ بھی آج طے ہو جانے دو، کم از کم ہمیں اتنا پتا چل جائے گا کہ ہمارے پاس کتنا سمے ہے۔"

"تھینک یو انترا!" ویملا نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ "تمہاری باتوں سے دل کو بڑا آنند بڑی پریرنا ملی ہے۔ میں اُسے ڈھونڈ لوں گی بہت جلد۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، کل اسی ٹائم واپس آؤں گی۔ تمہیں کوئی اچھا آئیڈیا سوجھ جائے تو مجھے کال کر کے بتا سکتی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کر واپسی کے لیے مڑ گئی اور ویملا نے عشق پیچاں کی دیوار پر چڑھتی بیل کو مسکرا کر دیکھا۔ تمہارا عشق تمہارا

جنون اس دیوار کو پھلانگنا ہے ناں۔۔ اِسی کو لگن کہتے ہیں۔ ایسی ہی لگن ویملا بھی محسوس کرتی ہے اپنے کسی بہت پیارے کے لیے۔

☆☆☆

دیوالی سے اگلے روز کی تاریخ طے پائی تھی۔ اندازاً اُس کے پاس اٹھارہ دن تھے جن میں کچھ کرنا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے پوری دل جمعی سے ڈائریکٹری میں ایشوری پور، ہرین گھاٹا اور شرن کھولا کے نمبرز نکالے۔ اگرچہ بہت مشکل تھا اس طریقے سے آگے بڑھنا پر اس کا جنون اِن باریکیوں سے نمٹنے کو با آسانی تیار تھا۔ اب اسے کوئی مشکل، مشکل نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اس کا رافع جلد اس کے سامنے ہوگا۔

لیکن دیوالی سے قریب دس روز پہلے کچھ ایسا ہوگیا جو کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہاں تو گھر میں شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں اور کہاں وہ پولیس کی ریڈ۔ دھرمیشور شکلا کو اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ٹائیگرز کی بیرون ملک اسمگلنگ کی واردات کو پولیس نے ناکام بناتے پورے گینگ کو موقع پر گرفتار کیا تھا۔ گینگ کی سرپرستی دھرمیشور شکلا کر رہا تھا اس بات کے بھی ثبوت مل گئے تھے۔

دھرمیشور کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال کر اس کے خلاف مقدمے کا آغاز کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ضمانت پر رہائی بھی نامنظور کر دی گئی۔ خبر کو نہ صرف اخبارات بلکہ میڈیا کی بھی خوب زینت بنایا گیا۔ چمڑے کا مشہور و معروف بیوپاری دھرمیشور شکلا ٹائیگرز، ہرن اور نایاب جانوروں کا اسمگلر نکلا۔

برسوں سے اس دو نمبر دھندے میں ملوث دھرمیشور شکلا کی زندگی کے کچھ اور سنسنی خیز واقعات سے بھی پردہ چاک ہونے کا وقت آگیا۔ دھرمیشور شکلا کی جواں سال بیٹی کے اِل لیگلی بنگلہ دیش پائے جانے کے بھی شواہد سامنے آئے ہیں۔ کیا دھرمیشور اپنی بیٹی کے ذریعے مال کی اسمگلنگ کرواتا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کی طالبہ ویملا شکلا کیا باپ کے دو نمبر کاروبار میں اس کی معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دیکھیے کچھ اور سنسنی خیز انکشافات۔

"لو۔ اب رہی سہی کسر تم بھی پوری کر دو۔" سلیکھا نے غصے سے ریموٹ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ "آوارہ، لچی، کوچھنی دُشٹ۔ جا کے مرو، وہیں۔" وہ چیخ چیخ کر اسے کوسنے دے رہی تھی۔

اور اسی شام ویملا کے بابو جی کو جیل میں فالج کا حملہ ہوا۔ پولیس ایمبولینس میں انہیں ہاسپٹل پہنچایا گیا۔۔ لیکن فوری علاج بھی ان کی حالت سدھانے میں ناکام رہا۔ آدھا دھڑ مفلوج ہو جانے کے باعث وہ فی الحال ہاسپٹل کے ایک کمرے میں ہی تھے۔

سلیکھا اپنے چھ بچوں سمیت چیختی چلاتی پھر رہی تھی۔ اس نے ویملا کو ہاسپٹل بھی جانے نہیں دیا۔ وہ بس گھر بیٹھے سسکتی رہتی۔ باپ کی حالت پر رہ رہ کر ترس آتا پر سلیکھا تو اُسے ہی اُن کی اِس حالت کا ذمہ دار ٹھہرانے پر تُلی تھی۔

ارمیندر چاچا سے معلوم ہوا کہ اُس کے بابا بول نہیں سکتے پر ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ دیکھ کر پہچانتے بھی ہیں۔ وہ اُسے کہنے لگے کہ ضرور وہ ویملا کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا اُسے ہاسپٹل جانا چاہیے۔ لیکن یہاں سلیکھا آنٹی پہرے دار بن کر بیٹھی تھیں۔ دو روز بعد البتہ انترا کی آمد نے اسے چونکا دیا اس نے آتے ہی سوال کیا تھا۔

"تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"آج۔" وہ چونکی۔ "نہیں تو..... کیوں؟"

"آج اُس آدمی کی کہانی چھپی ہے اخبار میں، تمہارے بابو جی کے پکڑوانے میں جس کا ہاتھ تھا۔"

"آدمی۔" ویملا کی بھنویں تن گئیں۔ اُس کے بابو جی تو ٹائیگر کی اسمگلنگ کرواتے تقریباً رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ اب یہ کون آدمی تھا۔ یوں ہی شاید کوئی کریڈٹ لینے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

"کوئی بنگلہ دیشی ہے۔ رافع محمد۔"

"ہوں؟" ویملا کی اندر کو کھینچی سانس واپس پلٹنا بھول گئی۔ "کک۔۔ کون۔۔؟"

''رافع محمد لکھا تھا۔'' انترا نے کندھے اُچکائے۔ ''لکھا تھا، وہ پیشے سے ایک گائیڈ ہے جو سیاحوں کو سندربن کی سیر کرواتا ہے لیکن اب اس نے سویکار (قبول) کیا ہے کہ وائلڈ لائف وبھاگ نے اُسے اسی مقصد کے لیے ایک سال پہلے ہائیر کیا تھا۔ دھرمیشور شکلا اور کسی ابوصالح کے دو ممبر دھندوں کا اُسی نے پردہ چاک کیا۔'' انترا ایک روانی سے اُسے بتانے میں مگن تھی۔ ویملا کے اندر بیک وقت اگر الاؤ سا جل اُٹھا تھا تو کہیں نہ کہیں ٹھنڈی پھوار سا برسا تھا ایک لفظ ''ہے'' وہ ہے۔ زندہ سلامت۔ اُس کی ٹانگیں ٹھہرنے کی سکت نہ پاتے ایک دم لڑکھڑائیں۔ دل بری طرح سکڑ سمٹ کر پھیلا تھا۔ وہ قریبی کرسی تقریباً ڈھے سی گئی۔

''تمہیں حیران کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے ویملا!'' کانوں میں ایک تسلی آمیز سرگوشی گونجی۔ کتنے اعتماد سے وہ جھوٹ اُس کے کانوں میں پھونک رہا تھا۔

''تم نے سنا تھا وہاں ایسے کسی بندے کے بارے میں۔'' انترا نے یوں ہی سرسری انداز میں سوال کیا۔

''نن..... نہیں..... میں نہیں جانتی۔'' وہ سینے کی جلن کو دباتی سختی سے سر نفی میں ہلانے لگی۔

''اچھا ابھی چلو میرے ساتھ۔'' انترا اچانک ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں تمہیں انکل سے ملوا لاتی ہوں۔ یوں تو تم بیٹھی ہی رہو گی۔ باپ بے چارا آنکھیں کھولے راہ تک رہا ہے۔ اُٹھو شاباش۔'' وہ زبردستی اُسے کھینچنے لگی اور ویملا کسی معمول کی طرح ساتھ ہولی ورنہ ذہنی طور پر اندر اتنی اکھاڑ پچھاڑ مچی تھی کہ وہ تنہا بیٹھ کر اپنے زخمی ٹوٹے دل کی کرچیاں سمیٹنا چاہتی تھی۔ ''ہو چکے'' نقصان میں اپنے نقصان کا تخمینہ لگانا چاہتی تھی۔

ہاسپٹل آئی تو بابو جی کی بے بسی دیکھ کر ویملا اپنے آنسو نہ روک سکی۔ ویملا پہ ایک خالی خالی نظر ڈال کر اُنہوں نے آنکھیں موند لیں۔ وہ بنا ایک بھی

شبد بولے واپس آ گئی۔

بابو جی اپنے ہی کرموں کا پھل بھوگ رہے تھے۔ کچھ بھی کہنا بے کار تھا تو یعنی ایک طرف یہ تھے تقدیر نے جنہیں اپنے شکنجے میں جکڑا تھا تو کیا خوب جکڑا تھا اور دوسری طرف وہ تھا جو اپنی کامیاب پلاننگ سے خوب واہ واہی وصول کر رہا تھا۔ بھلے اس کامیابی کی راہ میں کسی کا ٹوٹا بکھرا دل پڑتا تھا پر رافع محمد شاید اس دل کو کب کا روند کر آگے بڑھ گیا تھا۔

ایک وہی بے وقوف تھی جو، اب تک کے سفر میں کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ جوگن، دیوانی تو خود استعمال ہو رہی تھی۔

اور پھر مشکل سے مہینہ بھر کی اذیت سہہ کر دھرمیشور بھی دنیا سے سدھار گئے۔

☆☆☆

ویملا کی زندگی کو ایک شخص نے اس کی دنیا سے جا کر اور دوسرے نے اس کی زندگی سے جا کر ہمیشہ کے لیے ویران اور اُجاڑ بنا دیا تھا۔ بابو جی کو گزرے بھی ایک برس ہونے کو آیا تھا۔

سلیکھا نے کچھ عرصہ تو ویملا کو اپنے ہاں برداشت کیا پھر وہ اس کی شادی کے بہانے اسے نکال باہر کرنے کی ترکیبیں کرنے لگی۔ سب سے پہلے اسے وہیں دھکا دینے کی کوشش کی جہاں دھرمیشور اس کی بات طے کر گئے تھے پر ویملا نے صاف جتا دیا کہ اگر کسی نے اس کا بیاہ زبردستی رچانے کی کوشش کی تو وہ منڈپ میں انکار کر دے گی پر کسی قیمت کسی کے ساتھ رخصت نہ ہو گی۔

سلیکھا کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو کر کچھ نیا اور الگ سوچنے لگی۔ ویملا کو اس گھر سے نکالنا تو طے تھا۔ پر کیسے؟ جی میں تو آتا کہ ہمیشہ کے لیے اس چڑیل کو ملتی دے دے لیکن بے احتیاطی سے وہ معاملات اپنے خلاف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بہت سوچ بچار کرتے بالآخر اپنے ایک کزن کو مینگلور سے بلوا بھیجا۔ پیسے کا لالچ دے کر اس کے ذمے ویملا کو ستانے کا کام سونپ دیا۔

سواپنل بے اندازہ خوش تھا ایک ایسی دلچسپ نوکری پا کر۔ ایک بڑے عالیشان گھر کے ٹھاٹ، پرکشش معاوضہ اور ایک خوبصورت لڑکی کو بہکانے کی دلچسپ نوکری۔ اس کی تو پانچوں گھی میں تھیں، پر سوتے جاگتے ویملا کی زندگی عذاب بن گئی کیونکہ سواپنل اپنی نوکری خوب جانفشانی سے انجام دے رہا تھا۔ ویملا کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ سواپنل کی نگاہوں سے بچ کر کہاں جا رہے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے وہ بس سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتا۔ ویملا کو لگنے لگا کہ بہت جلد یا تو وہ اپنا خاتمہ کر بیٹھے گی یا سواپنل کا۔ تنگ آ کر دن میں وہ لائبریری نکل جاتی۔ دوپہر تک وہاں بیٹھے کتابیں پڑھتی پھر کسی کسی روز انترا کی طرف آ جاتی۔ پر وہاں اس کی شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ وہ اُکتا کر واپس آ جاتی اور گھر.....

اُف.....

کبھی کبھی ویملا کو لگتا یہ سب اس کی ناشکری کی سزا ہے۔ ایک روز سلیکھا اور اس کے چھ بچوں سے تنگ آ کر اس نے یہ گھر چھوڑا تھا۔ اگر اب سوچتی تو وہ وقت اسے نعمت محسوس ہوتا۔ کم از کم بابو جی تو زندہ تھے اور یہ سواپنل نام کی مصیبت بھی نہیں پڑی تھی گلے میں کسی گھنٹے جیسی..... اور پھر بھاگ کر بھی کیا ہاتھ آیا۔ اُلٹا محبت کا روگ پال کر بلاوجہ ہی دامن کو دکھوں سے بھر بیٹھی تھی۔

رافع محمد..... ایک درد بن کر رگ و پے میں دوڑتا اور ویملا کو لگتا درد کی یہ ٹیس دھیرے دھیرے اُسے نگل رہی ہے۔

انترا ابھی بیاہ کر چل دی تو سلیکھا کو پھر اِس چنتا نے گھیر لیا کہ وہ تو کچھ کر ہی نہیں رہی۔ سواپنل نے تو نرا مایوس ہی کیا تھا اب تک۔ اس نے پھر سے پنڈت بلوا کر رشتہ ڈھونڈنے کا کام ذمے لگا دیا۔ سواپنل نے سنا تو اسے زبردست طیش آیا۔ وہ تو ویملا سے شادی کا خواب سجا رہا تھا۔ اور اس کی دیدی اسے کہیں اور بھیجنے پر تلی تھیں

''یہ کیا دیدی! پنڈت کو کیوں بلا بھیجا؟''

''وہ سب تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں بھیا۔ تم بس اب جانے کی تیاری کرو۔''

''ایسے تو نہیں جائیں گے بہنا!'' سگریٹ کے مرغولے کو دھیرے دھیرے منہ سے نکالتے اس نے اطمینان سے پیر پھیلائے

''نہ بھیا!'' سلیکھا نے ہاتھ جھٹکا۔ ''تم سے نہ ہو گا۔''

''ایک منٹ۔'' سواپنل نے رُکنے کا اشارہ کرتے اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نکال کر سلیکھا کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو۔ آج رات کسی طرح یہ دو گولیاں ویملا کے دودھ یا جوس میں ملا کر پلوا دینا۔''

''اب یہ کیا ہے؟'' وہ چھوٹی چھوٹی سفید گولیوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''پریشان نہ ہو، سلیپنگ پلز ہیں۔''

''تو.....؟''

''اب تو انگلی ٹیڑھی کرنے سے ہی مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔''

''ارے کچھ سمجھاؤ گے بھی؟'' سلیکھا الجھنے لگی۔

سواپنل نے کھسیا کر بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی۔

''تم کسی طرح یہ دودھ پلوانے میں کامیاب ہو جاؤ پھر آدھی رات کو ہمیں بھی کشٹ دے دینا۔''

''ہوں اور اس سے ہو گا کیا؟'' سلیکھا اب کسی قدر مضطرب نظر آ رہی تھی۔

''اِجت پہ بٹا لگ جائے تو پھر شادی سے بھاگنے کے لیے یہ لڑکیاں زیادہ ہاتھ پیر نہیں مارتیں۔''

''تم کرو گے شادی؟'' وہ کچھ کھوج لینا چاہتی تھی۔ سواپنل ہنس پڑا۔

''اِٹس اپ ٹو یو۔ تمہیں اِس سے کوئی پرابلم نہیں تو مجھ سے کروا دینا۔ ورنہ مجھے میری رقم سے زیادہ سروکار ہے۔ تم اسے کہیں اور دھکا دے دو تب بھی مجھے کوئی پرابلم نہیں۔''

"ٹھیک ہے۔" سلیکھا نیم رضامندی سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ اسے زیادہ امید نہیں تھی کہ یہ فارمولا اسے کوئی کامیابی دلا سکتا ہے۔ پورے سات روز وہ ایک پرائے دیش میں اغوا کاروں کے ہاتھ میں رہی تھی۔ جانے کیسا کیسا سلوک دیکھا اور سہہ چکی ہو۔۔ سواپنل کا ٹریپ تو اُس دربدری کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔۔ شادی کے لیے رضامند ہونا ہوتا تو سال بھر پہلے باپ کے کہنے پر سر جھکا دیتی۔ خیر دیکھ لیتے ہیں۔

☆☆☆

ویملا ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھی جب سرلا کمرے میں دودھ لیے داخل ہوئی۔

"دودھ پی لیں دیدی!"

"ابھی سوئیں نہیں تم؟" اُس نے کتاب میں انگلی رکھی۔

"آج کام ذرا زیادہ تھے۔ بس اب جا رہی ہوں۔ اچھا دودھ ضرور پی لینا دیدی!"

"میرا تو جی نہیں چاہ رہا سرلا! تم ہی پی لو۔ پلیز۔"

"ارے نہیں دیدی! کیسی باتیں کرتی ہیں۔" وہ جھینپ گئی۔ "آج تو دعوت تھی ناں۔ میں نے تو خوب ڈٹ کر کھانا کھایا ہے۔ آپ نے تو تب بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ دودھ ہی پی لیں۔" وہ گلاس اٹھا کر زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔ ویملا نے کچھ بدمزہ سا ہو کر گلاس کو دیکھا۔ اگر بنا پیے سائیڈ پہ رکھ دیتی تو صبح تک یوں ہی دھرا رہتا اور ضائع کرنا اسے اچھا نہیں لگا اس لیے لبوں سے لگا کر آنکھیں زور سے میچے دوائی کی طرح چڑھا گئی۔

کتاب پڑھتے ویملا کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگیں، کتاب وہیں سینے پہ دھری رہ گئی اور وہ بے سدھ۔

کسی کی سانسوں کی گرمی اپنے نتھنوں کے بالکل پاس محسوس ہوئی۔ ویملا نیند میں کسمسائی اور اگلے ہی لمحے کسی نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سختی سے دبوچ لیا۔ وہ بری طرح چیخ کر اُچھلی۔ سواپنل اس غیر متوقع ردعمل کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کے حساب سے تو ویملا کو بے ہوش بے سدھ ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہڑبڑا کر دُور ہوا کیونکہ ویملا بری طرح شور مچا رہی تھی۔ ایک دو نوکروں کے راہداری میں دوڑنے کی آوازیں آئیں تو وہ جلدی سے بھاگ نکلا۔

"اری اُٹھ منحوس! بھنگ پی کے سوئی تھی کیا؟" سلیکھا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سرلا پاگل کو ہوا کیا ہے۔

سمجھ تو ویسے سرلا کو بھی نہیں آ سکتی تھی کہ رات جو دودھ کا گلاس چوری چھپے فریج کے پیچھے ٹھہر کر اس نے پیا یہ ساری کارستانی اس کی ہے۔ چوری چھپے دودھ کا ایک آدھ گلاس پی لینا تو شروع سے اس کی عادت تھی۔ رات سلیکھا جی جی کچن میں ایک گلاس میں چمچ ہلاتی یہ کہہ کر اسے دے گئیں کہ ویملا کو جا کر دے دینا۔

سرلا نے سوچا یہ بڑے لوگ اپنے دودھ میں ضرور بادام، زعفران ملا کر پیتے ہوں گے۔ دیدی کو تو میں نیا گلاس بھی بنا کر دے سکتی ہوں۔ کون سا اسے سمجھ آنی ہے۔ وہ ایک سانس میں سلیکھا جی جی کا بنایا گلاس ختم کر کے ویملا کے لیے نیا گلاس بنا کر لے گئی تھی۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ ویملا نے آدھی رات کو چلا چلا کر گھر سر پر اُٹھا لیا تھا تو یہاں سرلا کماری دن چڑھے تک کچن کے فرش سے اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سلیکھا کی سمجھ میں کہانی آ تو گئی پر اب وہ کسے الزام دیتی۔ سواپنل کا پلان ٹوٹلی فیل ہو گیا تھا۔

"ہوں۔" سلیکھا نے راہداری میں کھڑے کھڑے ایک ہنکارا بھرا۔ "اب تو بس وہ آخری حربہ ہی بچا ہے۔ بہت دنوں سے ایک بڑی خاص بات جو اس نے دیکھی اور محسوس کی تھی اسے اب پوری طرح دنیا کے سامنے لانے کا شاید یہی ٹھیک سمے تھا۔ ویملا اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھی۔ سلیکھا حتمی فیصلے پر پہنچتی جلدی سے اس کے کمرے میں گھس گئی۔

☆☆☆

اور آنے والے چند دنوں میں جو کچھ ویملا کے ساتھ پیش آیا اُس نے ویملا کو دوسری مرتبہ گھر کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں رہنا اب محال ہو گیا۔ ہاں البتہ اس بار اُس نے کسی آشرم کا رُخ نہیں کیا تھا۔ نئی جگہ آ کر یہاں سیٹ ہوتے ہی اس نے گھر واپس آ کر سلیکھا آنٹی کو بھی بتایا تھا کہ وہ محض اس کی آزادی کی خاطر یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی ہے اس لیے اپنے سوشل سرکل میں وہ اسے "کسی" کے ساتھ بھاگ جانے کی خبر بنانے سے پرہیز کرے۔

"اور کسی بھول میں بھی مت رہیے۔" وہ جاتے جاتے پلٹی۔ "ہماری اگلی ملاقات آپ کے کسی کلب میں ہی ہو گی۔ میں ہر اُس جگہ آپ کے پیچھے پہنچوں گی جہاں آپ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں۔"

"ہونہہ۔" سلیکھا نے نفرت سے منہ پھیرا۔ "آدرش، سمان کی باتیں وہ کرے جس کے پاس یہ سب کچھ ہو۔ عورت کی آن پر ایک بار بٹہ لگ جائے تو قیامت تک وہ داغ نہیں دھلتا، تم اپنی کارستانیاں ایک ہی سال میں بھول بیٹھیں۔ میں نہ بھی بتاؤں ویملا رانی تو دنیا تیرے بارے میں خود بھی یہی اندازہ لگا لے گی۔ ایک سال کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

"ایک سال۔" ویملا اپنے آنسوؤں کو پیتی لب کاٹتے۔ پچھلے قدموں پر باہر دوڑ گئی۔ "ایک سال بیت گیا تھا۔ بابو جی سے جدا ہوئے، اپنے دکھوں پر روتے، وقت کو کسی طرح آگے کی اور دھکا دیتے اور..... اور اس کے آگے ویملا کی سانسیں رُکنے لگتیں۔ اِس ایک سال میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

جیون میں وہ سات دن نہ آئے ہوتے تو کیا ویملا ایسی ہوتی۔ سر پر کسی کی یاد کا آنچل ایسا آن ٹھہرا تھا کہ نہ وہ برستا تھا نہ ٹلتا تھا۔ وقت کسی شکاری کے جال کی طرح عین ان سات دنوں پر ایسا جا پڑا تھا کہ دن، لمحے، گھنٹے باوجود آگے کو کھسکنے اور بڑھنے کے ویملا کو اُن ہی چند دنوں میں قید کر گئے تھے۔ اب نہ دنوں کا حساب باقی تھا نہ مہینوں اور سالوں کا۔ اب کے جیون کی گاڑی جس اسٹیشن پہ رُکی تھی وہاں سے آگے لے جانے والے کسی انجن کا وہاں سے گزر نہیں ہوتا تھا۔

اور جس کی خاطر یہ عمر بھر کا جوگ لیا تھا وہ نجانے کب کا اسے اپنے جیون سے، اپنی یادوں سے گرد کی طرح جھاڑ کر آگے بڑھ گیا تھا بلکہ یاد بھی کیسی۔ ویملا تو اس کے کام کا حصہ تھی۔ ایک پروجیکٹ جسے کامیابی سے مکمل کر کے وہ فائل میں ڈال چکا تھا۔

☆☆☆

"کماری ویملا! آپ کا فون ہے۔" نرمل واڈیا نے کمرے میں جھانکا۔ قریب کا چشمہ بھی عرصہ چھ ماہ سے کتابیں چھانٹ چھانٹ آنکھوں پہ سج گیا تھا۔ وہ عینک اُتار کر کتاب کے اندر رکھتے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہاں کس کا فون آ سکتا تھا اس کے لیے۔" اس کے جاننے والے محدود ترین حلقے کے پاس اس کا موبائل نمبر موجود تھا۔ جانے یہاں کس کی کال آ گئی تھی۔

"ہیلو!" ویملا کے ماتھے پہ اُلجھن کا پتا دیتی ایک گہری لکیر سی کھنچی تھی۔

"نمستے دیدی! میں ہوں سرلا۔"

"او۔ سرلا! کہو کیسی ہو۔ گھر میں سب ٹھیک ہے؟" ویملا کے لیے اگرچہ اس کا فون بھی غیر متوقع تھا لیکن لہجہ نارمل رکھا۔

"دیدی! آپ کے لیے ایک سندیسہ ہے۔"

"سندیسہ؟" ویملا اچنبھے سے رُکی۔ "کس کا؟"

"یہ تو معلوم نہیں دیدی! پرسوں سے گھر پہ بہت فون آ رہے ہیں۔ جی جی اٹھاتی ہیں تو کہتی ہیں ہمیں نہیں معلوم، وہ یہاں نہیں رہتیں۔ کل شام میں نے فون اٹھایا تو کسی آدمی نے آپ کا پوچھا۔ میں نے کہا وہ اب یہاں نہیں رہتیں۔ پوچھنے لگے کہاں ہوتی ہیں تو میں نے کہا یہ نہیں بتا سکتے کہا آپ کو بتا دوں کل وہ

آپ کی ہاؤز اریسٹ پہ راہ دیکھیں گے۔"

"پر وہ ہے کون؟" دل بری طرح سر کا تھا جگہ سے۔

"یہی تو نہیں بتایا دیدی! میں تو کہتی ہوں اپنا دھیان رکھیے۔ معلوم نہیں کون پیچھے پڑا ہے۔ کہیں اُدھر نہ آجائے۔ بڑی بھاری غصے والی آواز تھی۔"

"تمہیں یہاں کا نمبر کس نے بتایا؟"

"یہ مجھے چندن بھیا نے دیا ہے۔ اچھا اپنا خیال رکھنا دیدی!"

"ہوں۔" وہ کسی خیال میں گم واپس کمرے میں آگئی۔

"کون ہوسکتا ہے ایسا سندیش دینے والا۔ کہیں سوا پنل کی کوئی چال نہ ہو لیکن ہاورابرج۔ نہیں نہیں....." وہ الجھی الجھی سی پھر خود کو ایک کتاب میں گم کرنے لگی۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔

☆☆☆

دریائے ہُگلی کی شوریدہ سر ٹھنڈی موجیں کنارے سے ٹکراتی ایک دوسرے کو دھکے دیتی آگے ہی آگے رواں تھیں۔ یہ مسلسل بہتے آگے کو بڑھتے پانی جو دوبارہ کبھی پلٹ کر نہیں آتے۔ جن کی پیچھے سے آتی ہر لہر نئی ہے، ہاں مگر پھر بھی ہُگلی کا حصہ کہلاتی ہے۔ ویملا کو دریاؤں کے یہ پانی بھی جفا کار شخص کی طرح دکھائی دیتے۔ بے وفا، ہرجائی۔ کبھی لوٹ کر واپس نہ آنے والے۔ کہانیاں جن کے کناروں پہ جنم لیتی پلتی بڑھتی اور آخر کار کسی منطقی انجام کو پہنچتی یا آدھی ادھوری اپنی موت آپ مرتی یہیں کہیں دفن ہوجایا کرتی ہیں۔ دریا پھر بھی بہتا رہتا ہے۔ اپنی قوت پہ نازاں کسی کو خاطر میں نہ لاتا، سرکش، ضدی، مغرور۔

ٹھہری جھیل سا نیلا لباس پہنے وہ چہرے پر صدیوں کا سکون لیے ہوئے تھی۔ ریشمی نیلا آنچل شانوں پہ کھنچا تھا اور سیاہ کالی زلفیں پیچھے پشت پر بکھری تھیں۔ کشادہ غزالی آنکھوں میں کاجل کی بہت گہری لکیر تھی۔ چہرا میک اپ سے عاری لیکن صاف شفاف اور بچوں جیسا نرم تھا۔ سلور کے نازک بریسلٹ کے لاک سے کھیلتی وہ فلاور شاپ کے نزدیکی بنچ پر بیٹھی مضطرب لہروں کو دیکھتی خود بھی کسی قدر اضطراب کا شکار تھی۔ جب براؤن لیدر جوتوں میں دو قدم عین اس کے مقابل آن کر رُکے۔ ویملا کا بریسلٹ سے کھیلتا بایاں ہاتھ اپنی جگہ پہ رُکا اور کچھ دیر وہ یوں ہی اُن قدموں کو دیکھتی رہی۔ نظر نے کسی قدر سستی سے دھیرے دھیرے اوپر تک کا سفر کیا اور ایک گہری سرد آہ کھینچتے وہ بنچ سے اُٹھ کر دریا کے کنارے تک چلی گئی۔

"تم اِس کنارے پر کہیں دُور تک جایا کرتی ہوناں۔ مجھے بھی لے چلو۔" وہ اپنی گرم چیسٹر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی پشت پہ بول رہا تھا۔ ویملا چپ چاپ کنارے کے ساتھ چلنے لگی۔

"ناراض ہو ویملا؟" رسان سے پوچھا گیا لیکن وہ پھر بھی چپ رہ کر اپنے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے میں لگی تھی۔

"تم جانتی تھیں میں نے بلایا ہوگا؟" اور ویملا نے گال پر اُتر آتے آنسو کو گردن تک بہہ جانے دیا۔ ہتھیلی سے صاف کر کے وہ رافع پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ساتھ ساتھ چلنے کی وجہ سے وہ اس کا چہرا اُس طرح نہیں دیکھ پا رہا تھا جیسے آمنے سامنے ہونے پر دیکھا جاسکتا تھا۔

"مجھے معاف کردو ویملا! میں نے دیر کردی آنے میں۔" وہ اب گھوم کر سامنے آتے اُس کی راہ روکے ہوئے تھا۔ ویملا نے نفی میں سر ہلایا، آنسو پوری شدومد سے چہرا بھگوئے جا رہے تھے۔

"معاف نہیں کروگی؟" رافع نے نفی میں سر ہلانے سے یہی اخذ کیا اور وہ کچھ بولنے کی کوشش میں مسلسل ناکام ہوتے ابھی بھی سر نفی میں ہلا رہی تھی۔

"میری کچھ مجبوریاں....."

"میں نہیں جانتی تمہیں۔" اس کا بھیگا لہجہ جھیلوں سا پرسکون تھا۔ "تم کہیں نہیں ہو رافع! میری ذات میں، میرے جیون میں۔ کہیں نہیں..... کبھی بھی

نہیں۔" وہ چھلکتی آنکھوں سے دیکھتی سائیڈ سے گزر گئی۔ گزرے سال کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم سا چلنے لگا تھا۔ بابو جی کی موت سے اب تک کے حالات کو مدنظر رکھتی تو سارے نقصان سارے کیے دھرے کا ذمہ دار وہی تھا۔ جس کی باوجود تمام تر نفرت اور بدگمانی کے اس نے راہ دیکھی تھی۔ لگاتار۔ دن رات، ہر لمحہ، ہر پہر۔۔۔ باوجود تمام تر شکوے شکایات و ناراضی کے پل پل جسے سوچا تھا۔ چاہا تھا، کبھی ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنے دل کو اس کے تصور سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی اور ویملا کو سب سے بڑی شکایت اپنے دل سے تھی۔ وہ باغی جو آج بھی اُسی سمت جھکتا تھا۔

"میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں ویملا! بس ایک بار مجھے سُن لو۔ صرف ایک بار۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بازو سے پکڑ کر روک بیٹھا۔ ویملا نے بازو فوراً ہی جھٹک دیا اور لوگوں کی آس پاس موجودگی کی وجہ سے قدرے الگ اور تنہا حصے کی طرف بڑھ گئی۔ رافع بھی چند قدم چل کر اُس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"تمہارے بابو جی کی گرفتاری میرے پلان کا حصہ نہیں تھی۔ واللہ میں وہاں ابوصالح پر نظر....."

"تم نے کہا تھا میرے پاس تمہیں حیران کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور تم....."

"میرا مقصد تم سے اپنا آپ چھپانا ہوتا تو کیا میں تمہیں اپنے گاؤں اور گھر لے جاتا۔ اپنوں سے ملواتا۔ اپنی پہچان کا ایک انگ تم سے چھپانا میری مجبوری تھی۔ اگر تم کسی وجہ سے مجھ سے الگ ہوکر دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتیں اور وہ تم سے زبردستی کچھ اگلوانے کی کوشش کرتے تو ہم دونوں کے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی۔"

"اور میرا اغوا کس کا رن کروایا؟" وہ اب چبھتے لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ "میرے بابو جی کو سامنے لانے کے لیے میرا اپیوگ (استعمال) کیا گیا ناں۔"

"تمہاری کِڈنیپنگ کا میرے مشن سے کوئی لینا دینا نہیں ہے ویملا! بلیوی۔ تمہارا اپہرن (اغوا) سراسر ابوصالح کی سازش تھی اور میرا چناؤ کرنے میں بھی اس کی غرض شامل تھی۔ تم بھی جانتی ہو کہ ایسے حساس ایریا میں موو ہونے کے لیے پرمٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسے ایک ایسا شخص چاہیے تھا جو اُن علاقوں سے اچھی طرح واقف بھی ہو اور آزاد گھومنے کے لیے جس کے پاس پرمٹ بھی ہو۔

تم نے بھی دیکھا تھا کہ میں نے کھلے سمندر اور بڑے دریاؤں کا سفر کم سے کم کیا تھا۔ چھوٹے دریاؤں، درمیانی ندیوں اور مشکل راستوں سے گزرتے مجھے اپنی منزل تک پہنچنا پڑتا تھا تاکہ نہ پولیس سے سامنا ہو نہ ہی جواب دینا پڑے۔ اب یوں تو میرے پاس اپنے ڈیپارٹمنٹ کا کارڈ تھا میں وہ دکھا کر پولیس کو سیٹسفائیڈ بھی کرسکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا اس معاملے کی بھنک بھی ابوصالح کو پڑے کیونکہ ہمارا اصل مشن تو ابوصالح کے دو نمبر کام سامنے لانا تھا۔

باقی ہمارے سفر کے دوران میرا فوکس صرف اور صرف تمہیں سُرکھشت (بہ حفاظت) تمہارے دیش پہنچانے پر تھا۔ تمہیں بارڈر پار کروا دینے کے بعد مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے خوب کڑی تفتیش کا سامنا ہوا۔ تمہیں اِل لیگلی بارڈر پار کرانے کو وہ بہت شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ خود میرا کریکٹر وہاں مشکوک ہوگیا تھا اور جب پیپر میں یہ خبر بھی چھپ گئی کہ دھرمیشور شاید اپنی بیٹی کے ذریعے یہ سب کر رہا تھا تو مجھ پر شکوک اور بڑھ گئے۔ میں تم سے رابطہ کرتا تو ان کا شک پختہ ہوجاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا تم اور کسی مصیبت میں پڑو، اس لیے جان بوجھ کر ایک لمبے ٹائم کے لیے خود کو دُور کرلیا۔"

"اور اب؟"

"اب میری وفاداری ثابت ہوگئی ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"لیکن تم نے یہ سب کیا ہی کیوں؟ کیا فشری اور گائیڈ کا کام تمہارے لیے کافی نہیں تھا۔" وہ چڑ رہی تھی۔

"میرے لیے تو میری چھوٹی سی بوٹ اور شرن کھولا کی زندگی ہی بہت کافی تھی ویملا!" رافع کے چہرے پر اداسی کا پردہ سا آیا۔ وہ سوچوں میں کہیں بہت دُور نکل گیا تھا۔ ویملا چلتے چلتے بھیڑ سے پرے آچکی تھی۔ رافع اب اطمینان سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"مجھے شروع سے سب بتانے دو ویملا!"

اُس وقت سے جب رافع محمد باپ کی راہ پر چلتے صرف ایک ہنٹر تھا۔ جانوروں سے میری محبت اس ہنٹنگ میں ایک نیا موڑ لائی اور میں اپنے ایریے کے ان سب لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا جو باگھ کی اسمگلنگ میں حصہ دار تھے۔ یہ لوگ بنا کسی پرمٹ کے ایسے حساس ایریاز میں گھس جاتے اور پھر ان میں سے کوئی ایک کسی باگھ کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تو یہ لوگ پولیس میں رپورٹ تک نہیں کرتے تھے اور رودھو کے چپ بیٹھے رہتے۔

ابوصالح کا ایک خاص دوست ہاشم ان لوگوں کی بیک پہ تھا۔ مجھے تب تک یہ بات پتا نہ تھی۔ خیر تو کھانے کمانے کے چکر میں' میں نے گائیڈ بننے کا سوچا اور گائیڈ بن کر جب میں نے سیاحوں کو علاقے کی سیر کرانے کا کام شروع کیا تو اس سفر میں بھی میرا سامنا کئی مرتبہ باگھ سے پڑا۔ میرا شروع دن سے ایک ہی مقصد تھا کہ باگھ کو ہلاک کر کے اپنی جان نہیں بچانی بلکہ مجبوراً زخمی بھی کرنا پڑا تو وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کرنا ہے اور یہ میرے دل کی آواز تھی اور حیوانوں سے میری محبت کا ثبوت تھا اس کے علاوہ رافع محمد کا اس راہ میں کوئی لابھ کوئی غرض نہیں تھی۔۔اس طرح میری ہنٹنگ کی شہرت آس پاس کی بستیوں تک بھی پہنچی۔ اب دھنی، اُلفت اور نوین جیسے لوگوں کا دو نمبر کام خطرے میں پڑ چکا تھا۔ انہوں نے ہاشم کی مدد سے مجھے گاؤں سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ہاشم نے شاید سے فیور مانگی۔ اس نے مجھے اپنی فشری والی ایک لانچ دے کر پورٹ پر بھیج دیا۔ میں نے شاید پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ مجھے میرے علاقے سے نکالنے کے لیے انہوں نے میرا گھر اور کشتی جلائی۔ اگلے روز اتفاق سے مجھے ایک زخمی باگھ کو لے کر سینکچوری (جانوروں کی پناہ گاہ) جانا پڑا تو پیچھے میری ماں کو دھمکایا گیا کہ اگر اپنے بیٹے کو لے کر جلد از جلد اس علاقے سے نہ گئیں تو اگلا نشانہ تمہارا بیٹا ہے گا۔

اُدھر جب میں باگھ کو لے کر سینکچوری پہنچا تو پہلی مرتبہ میرے سامنے یہ آفر رکھی گئی کہ باگھوں اور ہرن کی اسمگلنگ روکنے کے لیے کیا میں ان لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔ وہاں کے ایک آفیسر تھے نیل داس بابو! وہ ایک عرصے سے مجھے دیکھ اور جانچ رہے تھے۔ جانوروں سے میری محبت ان کی آنکھوں دیکھی تھی۔ پھر میری شکھشا (تعلیم) بھی کام آئی اور انہوں نے مجھے اپنے ہاں نوکری دے دی۔ اُنہوں نے مجھے ابوصالح اور دوسرے بڑے بزنس مینوں کے نام بتائے کہ وہ اس کام میں شامل ہیں اور بنا اپنا نام ظاہر کیے کامیابی سے اسے چلا رہے ہیں۔ ہاشم کے بارے میں بھی ان ہی سے پتا چلا۔ میں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ کام اپنی اوقات سے بڑھ کر لگا تھا۔ میں دُکھدا میں گھر اوہاں سے واپس آیا تو میری ماں بستر بوریا سنبھال وہاں سے جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ وہ مونگلا جانا چاہتی تھی اور ہر قیمت پر۔۔تب دل ہی دل میں ایک فیصلے پر پہنچتے میں ہاشم کے پاس گیا۔ اب تو مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہاشم ہی ہے جو مجھے بستی سے نکلوانا چاہتا ہے لیکن اس پر یہ بات ظاہر نہ کرتے ہوئے اس سے کام مانگا اور وہ تو خود مجھے دھکا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس نے ابوصالح سے کہہ کر مجھے بارڈر پر ایک فشری کی بوٹ کا ڈرائیور بنا دیا۔ میں نے نیل داس بابو کو بھی بتا دیا کہ ابوصالح کے گروپ میں شامل ہو کر ان کے قریب رہ کر ہی میں ان لوگوں کی اچھی طرح مخبری کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ ضروری ہدایات دیں اور میں اپنے کام پر لگ گیا۔

تمہارے اپہارن کے معاملے سے میں بالکل

انجان تھا۔ ہاں ویسے دھرمیشور کا نام میں بہت بار سن چکا تھا کہ بارڈر پار وہ ان کاموں میں ابوصالح کا پارٹنر ہے لیکن میرے ہاتھ تب تک کوئی ڈھنگ کی چیز یا ثبوت نہیں آیا تھا کہ ایک دن ابوصالح نے مجھے بلوا بھیجا۔ تمہیں کڈنیپ کرا لینے کے بعد اب تمہیں ان نے کسی سرکشت (محفوظ) جگہ پہ چھپانا تھا۔ تن لونا کا چناؤ کرتے اس نے یہ کام میرے ذمے لگایا۔ میں نے لڑکی کے اغوا کی بات سن کر فوراً منع کر دیا یہ کہہ کر کہ ایسے کام میں کبھی نہیں کر سکتا تو ابوصالح نے پینترا بدلتے تمہیں گیم میں شامل کر دیا اس نے کہا کہ تم روپوں کی خاطر خود اپنا اپہارن کروانا چاہتی ہو۔

تب یہ سوچ کر میں نے ہاں کر لی کہ شاید نیل داس بابو کے کام آنے کا یہی اُچت (مناسب) موقع ہے۔ تن کو ناجا کر ان کے کام دھندے کو قریب سے دیکھنے کا اِس سے بڑھیا چانس نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے ابوصالح کی بات مان لی اور اس کے بعد سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔

رافع نے ایک طویل گہرا سانس لیتے ویملا کی طرف دیکھا۔

"کیا معصوم بے زبان جانوروں کی نسل کشی روکنا اپرادھ ہے ویملا! جن سات دنوں کا ایک ایک پل تم میرے ساتھ تھیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی ان معصوموں کی سُرکھشا کی ہے۔ اگر ایک اچھے مشن کی راہ میں' میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا تو ان کو ہلاک کرنے والوں کو کیسے معاف کر سکتا ہوں۔ ستیہ (سچ) کی راہ بڑی کٹھن ہے ویملا، اس راہ میں اپنے پرائے کی چنتا نہیں کی جاتی۔" وہ دونوں دریا کے کنارے کنارے واک کے انداز میں چلتے جا رہے تھے۔ ویملا نے ہوا سے اڑتے آنچل کو سمیٹ کر اپنے گرد لپیٹا۔

"اب کیوں آئے ہو؟" رافع جو کہہ رہا تھا، وہ دل کے داغ دھونے کو بہت تھا۔ وہ لاجواب ہوئی تھی اس سیدھی سیدھی وضاحت پر۔ سچ کی طاقت کے آگے بھاری بھرکم الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ وہ سچا تھا اور ہاں..... ہمیشہ سے حق پر تھا۔

"تم سے ملنے، تمہیں دیکھنے اور تمہیں یہی سب کچھ بتانے۔"

"اور یہاں سب کچھ ایسا نہ ہوتا۔"

"میں نے بتایا ناں ویملا! میری دیری کی وجہ میری سستی نہیں بلکہ میری مجبوری تھی۔ کیا میرے ذہن میں یہ سارے وہم نہیں تھے۔ کیا تم سے جدائی کے سمے میرا دل کسی انجانے خوف سے نہیں دھڑکا ہوگا۔"

"تم زخمی ہو گئے تھے اُس آخری دن۔" ویملا وہ درد بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔

"ہاں، دو گولیاں لگی تھیں۔ پیٹ اور کمر میں۔ لڑکھڑا کر نیچے گرا تو اُن دونوں کو لپک کر اپنی طرف آتے محسوس کیا۔ اِس سے زیادہ ان کے اتیاچار (ظلم) کا نشانہ نہ بنوں یہ سوچ کر سانس تک روک لی اور خود کو ایک طرح بے جان ظاہر کیا۔ وہ دونوں بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ میں نے فون پہ نیل داس بابو کو اپنے زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ قریب آدھے گھنٹے بعد مجھے ریسکیو کرا لیا گیا۔ چار گھنٹے آپریشن چلتا رہا۔ شاید تمہاری دعاؤں کا اثر تھا کہ جان بچ گئی۔"

"اور سومیہ؟" ویملا اُسے بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ رافع چلتے چلتے رُک گیا۔

"اُس نے چھوڑ دیا تھا مجھے تب ہی اُن ہی دنوں میں۔"

"اُس نے یا تم نے؟" ویملا کے لہجے میں طنز تھا۔

"وہ کہتی ہے اُسے شیئرنگ برداشت نہیں ہوتی۔ اُسے ایسا رافع قبول نہیں جس کے دل میں کوئی اور ہے۔"

"اور یہ بات بھی اُسے تم نے بتائی ہوگی؟" وہ سخت خفا تھی۔ رافع کی خودغرضی اس سمے بہت بھاری پڑ رہی تھی ویملا کے نازک اعصاب پر۔

''اُسے اندازہ ہوگیا تھا۔ تب ہی جب میرے مکمل تندرست ہونے کے بعد ہماری شادی کی بات چھڑی تو سومیہ نے خود ہی پہلا سوال یہی کیا تھا کہ کیا میں اس کے علاوہ کسی کو چاہتا ہوں۔''

''ہاں اور تم نے بتادیا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''تو کیا جھوٹ بولتا۔'' رافع پہلی بار ذرا سا مسکرایا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' ویملا نے ذرا سی گردن موڑی۔ ''دل رکھنے کے لیے اتنی سی ملاوٹ جھوٹ نہیں کہلاتی اور شادی ہوتے ہی ویسے بھی دل بدل جاتا۔''

''وہ دل..... جو میرے پاس تھا ہی نہیں۔'' وہ چڑ اکر مزا لیتے اس کے کندھے کے قریب بولا تو وہ بے ساختہ پرے ہوئی۔

''اپنی ڈھٹائی کا الزام سومیہ کے سر مت تھوپو۔''

''ہوں اور کمپرومائز تو وہ بھی کرسکتی تھی، سوچ لیتی کہ شادی کے بعد میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔''

''یہ اشارہ بھی تم ہی نے دیا ہوگا۔'' وہ اُڑ گئی۔

''کیا کہ میں کبھی نہیں بدلوں گا۔'' وہ پھر مسکرایا۔

''تمہیں وہ قسم یاد رکھنی چاہیے تھی۔ کیا پتا سومیہ کی محبت مجھ سے زیادہ ہوتی۔ تم نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''محبت ثابت ہوتی ہے ویملا! اس کے جاننے کے لیے کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ تم نے خود کو الگ کرکے مجھ سے دور کرکے محبت کی قربان گاہ پہ چڑھنا چاہا اور وہ..... وہ اتنا بھی سمجھ نہیں پائی کہ یہ بھاونائیں بنا ہم سے پوچھے بتائے من میں گھر کرلیتی ہیں۔ اب ہوجاتے ہیں ناں جیون میں ایسے بھی سنوگ (اتفاق) جب ہم اپنے آپ پہ وکلپ (اختیار) کھودیتے ہیں، پھر بھی میں نے اتنا کیا کہ اُس کا ہاتھ مانگنے میں پہل کی۔ خود رشتہ جوڑنے گیا لیکن اس کے لیے اس سب کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔ وہ میرے دل سے تمہیں کھرچ لینا چاہتی تھی۔ تم بتاؤ۔ تمہاری کہیں اور شادی ہوجاتی تو تم دل سے میرا نام کیسے صاف کرتیں۔ کیا ایسے ایک دم۔'' وہ بغور اسے دیکھتے اب سوال کررہا تھا۔

''سچ لگتا ہے ناں ایک فیز سے نکلنے میں۔ بولو ناں ویملا! کیا میں غلط.....''

''میں کیوں کرنے لگی کسی سے شادی۔'' وہ ایک دم ناراض ہوگئی۔ جیسے سارا دھیان اسی جملے پر اٹک گیا ہو۔ رافع نے مسکراہٹ روکی۔

''اچھا۔ تم کیوں نہیں کرسکتیں کسی اور سے شادی؟''

''اکیلے جیون بتادینے میں ایسی کون سی اچنبھے والی بات ہے۔ شادی کرنا اتنا بھی ضروری نہیں لائف میں۔''

''کیا اب بھی؟'' وہ سامنے کھڑا اب باقی ہر چیز سے لاتعلق تھا۔ ویملا کے لیے یہ ہی کٹھن مرحلہ ہوتا۔

''میں یہاں تمہیں پروپوز کرنے آیا ہوں تو کہو کماری ویملا دیوی! تمہیں رافع محمد کا ساتھ قبول ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سامنے پھیلائے کھڑا تھا۔ ویملا نے دیکھ کر رُخ پھیرلیا۔

''پلیز ویملا! کیوں جان نکالنے پہ تلی ہو۔'' رافع کا سچ مچ ہی دل ڈوب گیا۔

''مجھے سوچنے کے لیے سمے چاہیے۔'' وہ ازحد سنجیدہ تھی۔

''سمے؟ لیکن کیوں؟'' رافع دبادبا چیخ اُٹھا۔

''پچھلا پورا ایک سال.....'' ویملا اس کی آنکھوں میں سرد مہری سے جھانک رہی تھی۔ ''وہ ایک سال..... میں نے تمہاری راہ ضرور دیکھی ہے رافع محمد! لیکن میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔''

''میں اپنی تمام غلطیوں کی معافی مانگتا ہوں۔ اتنی کٹھور نہ بنو ویملا!'' رافع کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

''کل صبح۔'' وہ ایک دم ہی آگے آگے چل دی۔ ''خاتون محل سینما۔''

''اب یہ کیا ہے۔'' وہ پیچھے بھاگا لیکن ویملا نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔

''ایس اے فاروق روڈ پر خاتون محل سینما کے سامنے ہماری زندگی کا فیصلہ وہیں طے ہوگا۔''

''ویملا!'' وہ پکار کر رہ گیا اور وہ اس کی نظروں کے سامنے تیز تیز چلتی وہاں سے دور ہوگئی۔

☆☆☆

ایس اے فاروق روڈ پر سینما کے سامنے وہ ایک بارونق جگہ تھی۔ ٹریفک کا شور بھی تھا، آتے جاتے لوگ اور ملی جلی بے شمار آوازیں۔ رافع کو سخت الجھن اور اضطراب نے گھیرا تھا۔ ایسی بے تکی جگہ پر کیسے اور کیوں کر ان کی زندگی کا فیصلہ طے پاسکتا تھا اور وہ خود۔ بار بار چاروں طرف نظر گھما کر پھر مایوس سا گھڑی دیکھنے لگتا۔

کہیں ویملا اُسے کسی سے ملوانا تو نہیں چاہتی۔ دل میں کسی عجیب سے وہم نے سر اُبھارا اور اتنا عجیب کہ رافع کو خود بھی اِس وہم کے سر پیر کا اندازہ نہ ہو پایا۔ ایسی مصروف جگہ پہ بلانے کا اور کیا مقصد۔ بائیں ہاتھ پہ سڑک کنارے دور تک نگاہ دوڑانے کے بعد اس نے دائیں جانب دیکھا اور مایوس سا واپس پلٹا۔ لیکن کسی چیز نے دوبارہ سر اٹھا کر اسی جانب دیکھنے پر مجبور کیا۔ سامنے سے آتی گلابی کپڑوں میں وہ شاید ویملا ہی تھی لیکن اُس نے تصدیق کے لیے دوبارہ گردن گھمائی۔ رافع کا دل جیسے اس کے روئیں روئیں میں دھڑکنے لگا تھا۔ بلاشک وشبہ وہی تھی لیکن اس کا حلیہ۔ وہ سچ مچ اعتماد سے چلتی آج بھی کل جیسی ہی سنجیدہ نظر آتی تھی۔ رافع کے لیے تو ویسے بھی حیرت کا ایک در، وا ہوا تھا۔

''ویملا..... تت..... تم.....''

''آؤ! تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' وہ سڑک کراس کرتے سیدھی چلتی گئی۔ رافع نے دھونکنی سے دل کو گہرے گہرے سانس لیتے کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار ویملا سے یہ کہنے کی بھول کر بیٹھا تھا کہ ''تمہیں حیران کرنے کو میرے پاس اور کچھ نہیں ہے'' پر ویملا اُس ایک جملے کی پاداش میں جانے اس سے کتنے بدلے لینے والی تھی۔ حیران کرنے کے لیے ابھی شاید بہت کچھ باقی تھا اُس کے پاس۔

کچھ دُور چلتے اب وہ ایک بلڈنگ کے سامنے آگئے تھے۔ یہ جگہ اتنی بارونق نہیں تھی۔ ویملا سڑک سے اُتر کر اب مکمل سائیڈ پہ آکھڑی ہوئی تھی۔ رافع نے تعجب سے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ وہ اُسے کسی سے ملوانے والی تھی۔

''کسی نے آنا ہے ویملا؟'' اُس نے نگاہ سمیٹ کر پھر ویملا کو دیکھا۔ وہ اِس پورے عرصے میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔

''نہیں۔''

''تو تم مجھے کس سے ملوانے والی تھیں؟''

''ہاں۔'' اُس نے مصافحے کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''میٹ شرینہ محمد۔ ڈاٹر آف لیٹ دھرمیشور شکلا۔ ناؤ کنورٹڈ ٹو اسلام۔'' (دھرمیشور شکلا کی بیٹی نے اسلام قبول کرلیا ہے)۔

اُس نے اس بار کھل کر مسکراتے ہوئے رافع کی طرف دیکھا جس کا حیرت سے کھلا منہ اور اُس سے بھی زیادہ حیرت زدہ سی ہنسی رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ویملا کے بڑھے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے اس نے پرجوش انداز میں ہلایا۔

''بہت بہت مبارک اور ویلکم!'' ویملا کا ظاہری حلیہ اگرچہ واشگاف الفاظ میں خود ہی بتا رہا تھا کہ جو وہ کہہ رہی ہے وہی سچ ہے لیکن رافع اس کے سر پہ اوڑھے کندھوں تک آئے بلیک حجاب، پنک شلوار قمیص اور گلے میں پڑے دوپٹے سے تھوڑی دیر پہلے اللہ جانے اور تو کیا سمجھا تھا لیکن بہرحال ''یہ'' نہیں سمجھا تھا۔

''لیکن.....'' رافع کچھ کہتے کہتے اٹکا۔ ''یہاں کیوں؟'' اِس نہ سمجھ میں آنے والی جگہ کا انتخاب ابھی بھی رافع کی سمجھ سے باہر تھا۔ ویملا مسکراتے ہوئے

آگے بڑھی اور ساتھ کھڑی اونچی بلڈنگ کے دروازے پر آئی۔

''مسلم میرج رجسٹریشن آفس۔'' بورڈ کی طرف اشارہ کرتے وہ مسکراتے ہوئے رافع کی طرف مڑی۔

''میں رافع محمد کا پروپوزل قبول کرتی ہوں اور یہاں آئے بنا اس لیے چارہ نہیں تھا کہ اس بھری دُنیا میں اب میں بہت اکیلی ہوں رافع! تمہارے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لینے کے بعد آگے کا سفر بھی ہمیں آپ ہی طے کرنا ہے۔ میں نہیں جانتی تم یہاں کتنے دن کے لیے ہو لیکن جانے سے پہلے تمہیں ایک مضبوط سمبندھ میں مجھے باندھنا ہوگا تاکہ پھر میں وہاں آسکوں جہاں تم ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ تمہیں کوئی آپتی (اعتراض) تو نہیں؟''

''کیسی آپتی۔'' رافع دل کی سچی خوشی سے ہنسا۔ ''سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہوا تو مجھے اس رشتے کو نام دینا ہوگا تاکہ تمہارے بنگلہ دیش آنے کی راہ آسان ہوسکے۔ اِس پورے پراسیس کا اس بار لیگل اور صاف شفاف ہونا بہت ضروری ہے۔''

''ہمیں قاضی صاحب سے کوئی جلد از جلد کی اپائنمنٹ لینے کی کوشش کرنی ہوگی۔''

''اپائنمنٹ۔'' رافع نے لب سکوڑے۔ ''آج نہیں ہوسکتی۔''

''نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''آج تو ہمارا تفصیلی انٹرویو ہوگا۔ پھر ہم ایک اسٹیٹ سے نہیں ہیں۔ کوئی سمسیا بھی کھڑی ہوسکتی ہے۔ دعا کرو سب کچھ آسانی سے ہوجائے۔''

''یہ سب کیسے ہوا ویملا؟'' وہ ابھی بھی حیران تھا۔

''ویملا نہیں۔ شرینہ!'' وہ آگے بڑھتے کچھ سوچ کر رُکی۔ ''تمہیں یاد ہے یہ نام؟''

''کیا؟'' رافع نے کچھ نہ سمجھتے کندھے اُچکائے۔ ویملا نے ناک سکوڑ کر ہاتھ جھٹکا۔

''تم سب ہی مرد ایک جیسے بوندو ہوتے ہو رُوکھے، نان رومانٹک۔''

''ارے پر ہوا کیا؟'' وہ بری طرح حواس باختہ سا پیچھے لپکا۔

''یہ نام تم نے مجھے دیا تھا۔ جھتولا بیچ سے ہرین گھاٹا ماما جی کے گھر مسافر بوٹ پر جاتے۔ تم نے کہا کوئی روک کر پوچھ لے تو کہنا اِس سڑیل کی بیوی ہوں شرینہ محمد۔'' وہ اب چبا چبا کر بول رہی تھی۔ رافع کے قہقہے نے کاریڈور سے گزرنے والوں کو گھور کے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

''شرینہ تو میری ایکس گرل فرینڈ کا نام تھا۔'' بنا سوچے منہ پہ آگیا تھا۔

''وہاٹ۔'' وہ پوری گھوم کر چیخی۔ اب تو وہ باقاعدہ پیر میں دے چکی تھی مذہب بدلنے پر نام کی تبدیلی کا۔ حتیٰ کہ نیا آئی ڈی کارڈ بھی بن کر آچکا تھا۔ اب کیا وہ ساری زندگی شرینہ شرینہ کہلوا کر رافع کو اس کی سہیلی کی یاد دلائے گی۔

''مذاق کر رہا ہوں۔ کیوں دیواروں میں شگاف کرنے پر تُلی ہو۔'' وہ منہ بناتے کان کھجا رہا تھا۔

''کھاؤ قسم۔'' وہ انگلی اُٹھا کر خوب کڑے تیوروں سے گھور رہی تھی۔

''سندر بن میں ملنے والی شہزادی کی قسم۔'' وہ لبوں میں مسکراہٹ دبائے اُسے ایسی دل ربا نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ گھبرا کر فوراً ہی پلٹ گئی۔

''تم نے تو ایک سال میں اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھا ویملا!'' وہ پیچھے پیچھے آتے ازحد سنجیدہ سا بولا۔ ویملا پریشان سی واپس مُڑی۔ سوکھ کر ڈھانچا تو پہلے ہی ہوچکی تھی۔ رافع کو شاید اچھا نہیں لگا تھا دیکھ کر۔ اُس کی مایوسی ویملا کو کئی وہموں میں مبتلا کر گئی۔ جانے کیا کچھ سوچ کر آیا ہوگا اور دیکھنے کو کیا سڑی مری ہوئی شکل پائی۔

''کیوں؟'' اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''کتنی لمبی ہوا کرتی تھی تمہاری چُٹیا۔ دیکھو ناں،

ایک آدھ فٹ تو ضرور کم ہوچکی ہوگی۔'' وہ انگوٹھا اور شہادت کی انگلی پھیلائے پھر بالشت ماپنے کو تیار تھا۔ ویملا نے ماتھے پہ ہتھیلی ماری۔

''اُف رافع! پلیز۔''

''احھا رُکو تو.....''

''بالکل نہیں۔ پہلے ہی ہم لیٹ ہوچکے ہیں۔ اب باقی باتیں اندر سے ہوآنے کے بعد۔'' وہ اسے لیے اندر داخل ہوگئی۔

☆☆☆

''بابو جی کے دیہانت کے بعد میری تو دنیا اندھیر ہوگئی تھی رافع! اپنے گھر سمیت پورا کلکتہ اب ایسا لگتا جیسے اُس رات میں سندر بن میں زہریلے لیڑے مکوڑوں کے رحم وکرم پہ پڑی تھی۔ خود پہ ٹکی ہر نظر میں ایسے سوال دکھائی دیتے کہ لگتا جسم پر ایک نیلا نشان اُبھر آیا ہے۔ بابو جی کی موت کا مجھے ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا جارہا تھا۔ اس پورے اسکینڈل میں میرا بھی کہیں ہاتھ ہے اسی کے پرمان ڈھونڈے جا رہے تھے۔ پترکار (صحافی) تو گھر تک پہنچ جاتے انٹرویو کرنے پر میں سامنے نہیں آتی تھی۔ ادھر سلیکھا بابو جی کی جائیداد اور گھر پر اپنا پورا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ ایک دو جگہ اس نے میرے ویواہ کی بات بھی چلائی لیکن میں نے بھی کڑے شبدھوں میں منع کردیا۔ گھر کا ماحول اب ایسا ہوچلا تھا کہ کئی کئی دن مجھے اپنے آپ کو کمرے میں بند رکھنا پڑتا۔

گھر کے ماحول سے پیچھا چھڑا کر باہر نکلتی تو سوائے انترا کے کوئی نہیں تھا جس سے دل کا حال کہتی لیکن ظاہر ہے اب میں روز تو انترا کے سر پر بھی سوار نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں بزی تھی۔۔ اِن حالات میں مجھے پہلا خیال لائبریری کا آیا۔ کچھ باتیں کچھ پرشن (سوال) جو بڑے دنوں سے اندر اودھم مچائے ہوئے تھے، اُن کا جواب مجھے صرف یہیں پر مل سکتا تھا۔

من کی شانتی کے لیے میں آشرم کی راہ چُن رہی تھی اور اللہ نے مجھے کہاں بھیج دیا۔ پھر تم سے ملنا، تمہارا چرتر (شخصیت) ۔۔ تم سے محبت۔۔ مجھے آشرم واشرم سب بھول گئے۔ ایک الگ ہی دنیا اور عجیب ہی ویوہار (رویے) دیکھنے کو ملے جنہوں نے ہر موڑ پہ مجھے سوچنے پہ مجبور کیا تھا۔ میرے بابو جی مسلمانوں سے جتنی نفرت خود کرتے تھے اتنی ہی انہوں نے ہمارے اندر بھی ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں پہلے بھی ایسا کبھی کر نہیں پائی تھی جب مجھے مسلمز کے بارے میں بہت کم جانکاری تھی۔

میرے سوشل سرکل میں بھی بابو جی نے کسی مسلمان کو کبھی شامل نہیں ہونے دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے ان کے بچے مسلمانوں سے زیادہ گھلیں ملیں اور میں بھی یہ سوچ کر مسلمانوں سے دور ہی رہی کہ ہوسکتا ہے بابو جی صحیح ہوں، میں ناسمجھ ہوں مجھے کہاں ان باتوں کی کچھ عقل ہے۔ لیکن آشرم کی راہ کا بنگلہ دیش مُڑ جانا اور تم سے ملنا میرے جیون کے ایسے بڑے حادثے تھے کہ جنہوں نے میری لائف کا دھارا ہی بدل دیا۔ اب میں کہی سنی پر وشواس کرنے کے بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور اپنے دل کی سن رہی تھی۔ تمہیں تو بہت قریب سے جان اور پرکھ لیا تھا اب تمہارے دھرم کو جاننا چاہتی تھی۔ لائبریری میں، میں نے تمہارے دھرم کی بکس پڑھنا شروع کیں۔

شروعات میں لگتا کسی خواب میں ہوں۔ خود کو چٹکی کاٹ کر اپنے آپ سے سوال کرتی کیا یہ میں ہوں جو ایسی بکس کی اسٹڈی کر رہی ہے۔ اسلامی کارنر کو چھوڑ کر اپنے دھرم کی بکس کی طرف بڑھ جاتی کہ نہیں یہ میری جگہ ہے۔ وہاں تو رافع کی محبت گھسیٹ لے جاتی ہے جو دو چار شبدھ پڑھ لیتی ہوں۔

پر جانے کیا ہوتا رافع! اپنے دھرم کی بکس کھولتے میری آنکھوں پہ دھند کے پردے آجاتے۔ دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ رافع محمد سے زیادہ یہ بکس مجھے اپنی اور کھینچنے لگیں۔ کسی بک کو پڑھتے پڑھتے

ادھورا چھوڑ کر گھر آنا پڑتا تو اگلی صبح تک بے چین رہتی کہ کب وہ بک میرے ہاتھ آئے اور میں آگے پڑھوں۔۔پھر میں ان بکس کو گھر لانے لگی کہ اپنے کمرے میں تو چھپ چھپا کر پڑھ ہی سکتی تھی۔ پھر میں نے قرآن مجید کی ٹرانسلیشن بہت ہی ڈرتے ڈرتے اسٹارٹ کی، دل کو عجیب عجیب واہمے جکڑ رہے تھے۔ اپنے اندر پیدا ہوتا بدلاؤ مجھے حیران پریشان کررہا تھا۔لیکن جوں جوں پڑھتی گئی، ذہن کی بند گرہوں کو جیسے کوئی کھولنے لگا۔سب سے پہلے مجھے اپنے اِس پرشن (سوال) کا جواب ملا کہ آخر کیوں میں نے وہ سپنا دیکھا تھا بلکہ بنگلہ دیش سے واپس آنے کے بعد اور چھ سات مہینے گزر جانے کے بعد جب تمہارے ملنے کی آشا بھی اب میں کھو چکی تھی، یہ خیال اور زیادہ ستانے لگا تھا کہ جب ملنا نصیب میں لکھا ہی نہیں تھا تو سپنے میں تمہارے آنے کا کیا کارن تھا۔

اسلام کی کشش اب پوری طاقت سے مجھے اپنی اور کھینچ رہی تھی، تب اپنے آپ مجھے میرے سوال کا جواب بھی مل گیا۔میں سمجھ گئی کہ میرا مسلم ہونا آرمہ (ازل) سے طے تھا اور اللہ پاک نے یہ کارے تمہاری سہایتا سے انجام دینا تھا۔ دریا کی اور منہ کرکے ہاتھ میں بان کمان لیے تم جس دشا کا نشانہ لیے ہوئے تھے وہ ویملا کا دیس اور ویملا کا دل تھا۔ دل پر چوٹ پڑی تو ہی میری آنکھیں کھلیں اور دل پر چوٹ اس لیے پڑی کہ اسلام کی طرف اٹریکشن کی وجہ اسی درد نے بننا تھا۔ واپس آکر تمہیں یاد کیا کرتی تھی۔ تمہیں، تمہارے دھرم تمہارے لوگوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں کرانتی کی اور اکساہت کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو گھنٹوں لائبریری میں جان کھپانا کسی طور ممکن نہ تھا۔ واپس آکر میں بھی چند دنوں میں سب بھول بھال جاتی۔ پراب میں سمجھ گئی تھی کہ تمہارا میرے سپنے میں آنا،تم سے اصل میں ملنا،محبت ہونا سب اس نئے دھرم کی اور جانے کے راستے تھے۔دل میں اپنے آپ سکون اُترنے لگا۔

لیکن اس کے بعد مجھے کچھ گراؤنڈ ریالیٹز کا سامنا کرنا پڑا۔ بابو جی کے گزر جانے پر اب مجھے گھریلو شڑینتروں کا سامنا تھا۔ اسٹیپ مدر مجھے کچھ بھی کرکے گھر سے نکالنے کے درپے تھی۔ سوا پنل نے پہلے پھانسنے کی کوشش کی پھر ہراساں کیا۔سلیکھا آنٹی نے اسلامک بکس دیکھ لیں، اب وہ سب سے کہتی پھرتی تھی کہ ویملا نے کسی مسلم سے بیاہ رچالیا ہے، خود بھی مسلم ہوگئی ہے، اشُدھ ہے اور جانے کیا کیا۔ میرے لیے گھر چھوڑنا پھر ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن پچھلی بار کے بھاگنے نے جو رسوائی بخشی تھی اُسے میں بھولی نہیں تھی اس لیے اب میں یہ لیبل خود پر لگوانا نہیں چاہتی تھی کہ کسی کی وجہ سے یا کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔اس لیے لیڈیز ہاسٹل شفٹ ہوکر واپس آکے سب کو اپنے وہاں ہونے کا بتایا۔ پر سلیکھا نے میرے کنورٹ ہونے کی بات پورے خاندان میں پھیلا دی۔

اب باقی رشتہ دار بھی مجھ سے سمبندھ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ سویتا موسی ۔۔وہی حسن آباد والی۔۔بس ایک اُن ہی نے مجھے کچھ تھوڑا بہت سمجھا پر اپنے ساتھ رکھنے پر وہ بھی تیار نہ ہوئیں۔ اُن کی مجبوریاں تھیں۔ ان کے پتی اور سسرالیوں سے یہی مسلم والی بات برداشت نہ ہوتی اس لیے۔بس اب ہاسٹل میں زندگی بسر ہورہی تھی۔گزر بسر کے لیے میں نے معذور بچوں کے ایک اسکول میں جاب کرلی تھی اور پھر۔

وہ ذرا کے ذرا مسکرا کر رافع کو دیکھنے لگی۔جس نے ایک لمبا گہرا سانس چھوڑتے ویملا کی طرف ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ پورے چہرے کو رونق بخشتی اس کی نرم مسکراہٹ بھی لبوں میں دبی تھی۔

''پھر تم آگئے۔''

''اور خواب کو مکمل تعبیر مل گئی۔'' رافع نے جملہ جوڑا پر ویملا کے چہرے کو اضطراب کی لہری چھو کر گزری۔ رافع نے پل میں اِس تبدیلی کو محسوس کیا اور

سے تعجب سے۔

''پریشان ہو کسی بات سے؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آگے سب کچھ کیسے ہوگا رافع؟'' وہ اب گھبرا کر رافع کو دیکھ رہی تھی۔''تمہارے ساتھ جانے کی راہ کٹھن نہ ثابت ہو۔ میں بالکل اکیلی ہوں کوئی بھی ساتھ دینے کو تیار نہیں، ایسے میں ایمبیسی نے اگر پرمیشن نہ دی اور ہم.....''

''تم بالغ ہو ویملا! اور کل کے بعد میری منکوحہ بھی ہوجاؤ گی۔ مجھے یقین ہے ہم ساری مشکلات کو پار کرجائیں گے اور ڈرو مت۔ جب تک سارے مسئلے حل نہیں ہوجاتے، میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔ تمہیں کسی خطرے کے حوالے کرکے کہیں جاؤں گا نہیں۔'' رافع نے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بھی تسلی محسوس کرتے مسکرادی۔

☆☆☆

کلکتہ کی وہ نئی صبح خوب اُجلی اور حسین تھی۔ رجسٹرار آفس سے باہر نکلے تو بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے رافع نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ فوری طور پر نظریں تو نہیں ملا پائی لیکن ہنسی چھپانے کو رخ پھیرلیا۔

''چلیں۔'' وہ بالکل نہیں ہنس رہا تھا۔ بڑی ہی رعب جتاتی آواز تھی۔ ویملا کی اور زور سے ہنسی نکلی۔

''ہمارے ہاسٹل میں مردوں کا داخلہ منع ہے رافع! شگفتہ دیدی تو تمہیں آنکھوں سے نگل جائیں گی۔''

''اچھا؟'' رافع ذرا شرمندہ نہیں ہوا۔''دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ تو اُسے لیے بیچ مچ ہی سڑک کنارے آگیا اور باقاعدہ ہاتھ دے کر ٹیکسی روکی۔

''مرواؤ گے رافع!'' وہ دبی دبی آواز میں سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ رافع اس کا ہاتھ چھوڑ کر ٹیکسی والے کی طرف بڑھ گیا۔

''آجاؤ۔'' بات مکمل کرکے سیدھا کھڑا ہوتے ویملا کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی والے نے موڑ کاٹ کر ٹیکسی سیدھی کرتے سفر آغاز کیا۔

''یہ ہم کہاں جارہے ہیں؟'' ویملا نے پاس بیٹھے رافع سے دبی دبی سرگوشی کی۔ جس راستے ٹیکسی والا جارہا تھا وہ کم از کم اس کے ہاسٹل کو تو نہیں جاتا تھا۔

''گھوم کر ہاسٹل.....'' رافع نے شرارتی مسکراہٹ روکتے اسی دبی دبی آواز میں جواب دے کر گویا چڑایا تو وہ ہنکارا بھر سامنے دیکھنے لگی۔

''چیٹر.....'' ٹیکسی مختلف سڑکوں سے گزرتی ایک جگہ آکر رُک گئی۔ ویملا کو جھانک کر باہر دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ رافع نے نیچے اترنے کا کہا۔ وہ باہر آکر ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی، جان نگر روڈ پہ رافع کا کیا کام۔

''یہ لو۔'' رافع نے جیب میں سے ایک چابی نکال کر ویملا کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ چابی لے کر ٹیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''یہ میرا ہوٹل ہے۔تھرڈ فلور، روم نمبر چھتیس۔تم جاؤ اندر، میں بس ابھی آرہا ہوں۔''

''ہوٹل۔'' ویملا نے پوری آنکھیں کھولتے زور دے کر دہرایا۔''نہ بابا! میں تمہیں کسی ہوٹل ووٹل میں جارہی اور تم.....تم کہاں جارہے ہو؟''

''اُٹھا کر چھوڑ آؤں کمرے میں۔'' وہ غصے سے آنکھیں نکالتا دھمکانے کے انداز میں قریب آیا۔ وہ سٹپٹا کر فٹ پاتھ پہ چڑھی۔''چلو۔ بھاگو۔'' وہ اب مُکا دکھا رہا تھا۔

''جھوٹا، فریبی، مکار، دو نمبر۔ نہیں چار نمبر آدمی۔'' وہ اونچا اونچا بڑبڑاتی ہوٹل میں گھس گئی۔ رافع نے ہنس کر پیدل پیچھے کی راہ لی۔

☆☆☆

اتنا خوب صورت ہوٹل۔ ویملا متاثر سی کمرے کو گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ ٹی پنک اور ڈارک گرے کے امتزاج سے سجا وہ ایک بہت خوب صورت اور کشادہ کمرا تھا۔

"وائلڈ لائف وبھاگ کا، کاریکرتا (کارکن)۔ سب افورڈ کر سکتا ہے۔ ایک نمبر کا جھوٹا۔" وہ ناک سکوڑ کر باتھ روم میں جھانکنے لگی، لیکن ہینگر پہ ٹنگا سوٹ دیکھ کر حیرت سے منہ پہ ہاتھ رکھتی پوری اندر آ گئی۔ اورنج اور سرخ رنگ کی برائیڈل ساڑھی تھی۔ سامنے مرر کے ساتھ کچھ اور لوازمات۔ وہ سخت شرمندہ سی کھسیا کر ہنس پڑی۔

نئے رشتے کے حوالے سے رافع کی جذباتیت اور کیئر ویملا کے سچ مچ دل کو چھو گئی تھی۔ فریش ہو کر ڈریس تبدیل کرتے اس نے لائٹ سا میک اپ اور وہ چند ایک زیورات بھی پہن لیے جو رافع نے اُسے اِس خاص روپ میں دیکھنے کے لیے وہاں رکھے تھے۔

آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیتے اس نے آنچل اپنے سر پہ لیا اور کمرے میں واپس آ گئی۔

"اب کچھ سرپرائز اُسے بھی دینا چاہیے تھا رافع کو۔"

وہ بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب ہوٹل کے کمرے میں اُسے کیا ملنا تھا۔ باہر سیڑھیوں پر کچھ آوازیں سنائی دیں تو ویملا نے جلدی سے ساری لائیٹس بند کر کے خود کو پردے کی اوٹ میں کر لیا اور یہ پردہ داخلی دروازے کے عین بائیں ہاتھ کی پوری دیوار کے ساتھ ساتھ لگا تھا۔ دروازے پر پہلے ہلکی اور پھر دوسری بار قدرے اونچی بے چین سی دستک کی آواز آئی لیکن ویملا پردے سے باہر نہیں آئی۔ چند سیکنڈز کی خاموشی کے بعد کلک کی آواز آئی اور رافع بری طرح پریشان سا اندر داخل ہوا۔

"ویملا۔" وہ اونچی آواز میں پکار رہا تھا، کمرے کی لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ "ویملا! کہاں ہو بھئی؟" وہ بے چین سا کمرے اور باتھ روم میں چکر کاٹ رہا تھا۔

"ویملا!" وہ اسے کمرے اور باتھ روم میں نہ پا کر پھر سے روم کے باہر جانے لگا جب ویملا نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رافع کا اچانک بازو پکڑا۔

پہلے تو وہ سچ مچ ہی بری طرح بدکا لیکن ہینگر کے دسویں حصے میں شعور آ گیا کہ یہ کن کی حرکت ہو سکتی ہے۔ رافع نے اپنے قدموں کو روکتے مسکرا کر پردے کی طرف دیکھا۔ ویملا ابھی بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کا ہاتھ پردے کے اندر سے رافع کو روکے کا باعث بنا تھا۔ رافع نے دور تک جاتے پردے کے کھلے حصے کو دیکھا اور پردے کے ساتھ ساتھ چلتا اس کھلی جگہ سے خود بھی پردے کے اندر داخل ہوا۔

کمرے میں تو مکمل روشنی تھی لیکن گہرے گرے پردے کے پیچھے اس روشنی کا ہلکا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ سرخ اور نارنجی آنچل میں بلاشک وشبہ وہ اس کی دُلہن تھی۔

"جان ہی نکال دی تھی پاگل!" وہ تھوڑا اور نزدیک ہوا۔ ویملا نے گھبرا کر پردے کی اوٹ سے نکلنا چاہا تو رافع نے ہاتھ بڑھا کر کلائی پکڑ لی۔

"مجھ سے بھاگنے کے دن گئے شرینہ رافع محمد!" وہ کچھ اور قریب ہوا اور پھر کندھے سے کھینچ کر سامنے سیدھا کھڑا کیا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"ہاسٹل۔" وہ اب چھیڑ رہی تھی۔

"اچھا جی۔ اِس حلیے میں؟" رافع نے میٹھا سا طنز کرتے دھیان دلایا کہ وہ اُس کے خیال کو دل کی خوشی اور رضا مندی سے حقیقت کا روپ بخش چکی تھی۔

"میں تو بس دیکھ رہی تھی کہ کیسی لگوں گی اس روپ میں۔" وہ دھیرے سے منمنائی۔

"یعنی..... کب؟" رافع نے "لگوں گی" کی وضاحت چاہی۔

"جب ہم بنگلہ دیش جائیں گے اور وہاں دھوم دھام سے باقاعدہ رخصتی....." ویملا نے نیچے دیکھتے مسکرا کر جانے یوں ہی کہہ دیا تھا یا یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ رافع نے رُک کر کچھ دیر سوچا پھر اس کی کلائی چھوڑ کر پردے سے باہر آ گیا۔ ویملا کا تو دل

اچھل سے رہ گیا۔ وہ باہر آ کر ناراض ناراض سا بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔ چہرے پر خفت کی سرخی چھانے لگی تھی۔ خاموش سنجیدہ صورت اور سخت ناراضی کا تاثر دیتے پیشانی کے بل۔

"سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ویملا تڑپ کر اس کے پہلو میں بیٹھی۔ "خفا کیوں ہو گئے۔ میں تو یوں ہی ایک بات....."

"جاؤ ویملا! اپنے ہاسٹل جاؤ۔" وہ اب سختی سے نظریں قالین پر جمائے ہوئے تھا۔ ویملا نے سخت بے چینی سے لب کاٹے۔

"ہم جنگل واسیوں کو کہاں ایسی شہریوں سی تمیز آتی ہے۔ آئی ایم سوری۔ گو ناؤ۔" وہ ایک دم روکھا اور کھنچا کھنچا ہو گیا۔

"میں نہیں جانا چاہتی۔" وہ بالکل ہی رو دینے والی ہو گئی۔ "میں تو ویسے ہی شرارت کر رہی تھی۔ میرا اب تمہارے علاوہ کون ہے رافع!" وہ کہتے کہتے ایک دم ہی ضبط چھوڑ بیٹھی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ رافع نے بجائے روکنے کے خاموش رہتے اسی کو بولنے دیا۔

"میں سچ مچ بہت دل سے تمہاری دلہن بنی تھی۔ پر شاید تمہیں میرا یہ روپ پسند نہیں آیا۔" سسکی کچھ اور لمبی ہوئی۔ رافع کا اسی لمحے موڈ بدلا لیکن ویملا کی تقریر شاید لمبی تھی وہ ہنسی ضبط کیے سنتا ہی رہا۔

"شاید میں تمہاری اُمید پر پوری نہیں اُتری۔ اب تم دھکا دے رہے ہو۔ کوئی نئی دلہن سے ایسے کرتا ہے۔ سہاگ رات بھی کوئی پتی جھگڑا کرتا ہے کیا۔" ہچکیاں لیتے اسے پتے کی بات سمجھا رہی تھی۔ رافع کی ہنسی بے ساختہ بری طرح چھوٹی، ویملا نے گھور کر دیکھا تو زبان دانتوں میں دباتے رافع نے کان کی لو کو چھوا۔

"سوری۔ کہا ناں جنگل کا باسی ہوں۔ مجھے کہاں آتے ہیں یہ شہر کے رکھ رکھاؤ۔ اچھا بتاؤ ناں اور کیا کیا....." اور ویملا نے بات پوری ہونے سے پہلے اٹھا کر تکیہ اس کی پیٹھ پہ مارا۔

"شرم تو نہیں آتی۔ برے انسان۔ جنگلی۔" وہ تابڑ توڑ تکیے برسا رہی تھی۔ رافع نے بس ایک ہاتھ آگے کیا اور تکیے سمیت اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ویملا کی زبان اور ہاتھ کو ایک ساتھ بریک لگی۔

"تو.....؟ نہیں جانا ہاسٹل۔" وہ ابرو چڑھائے نہایت قریب سے سوال کر رہا تھا۔ ویملا محض نفی میں سر ہلا پائی۔

"ہوں۔" وہ سیدھا ہو کر اُٹھ بیٹھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی۔

"لاؤ ہاتھ آگے کرو۔" وہ دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر جمائے اب انگوٹھی نکال رہا تھا۔

"پسند آئے گی تو پہنوں گی۔" ویملا نے نخرے دکھائے۔ رافع نے آدھی کھلی ڈبیا کو ایک پُرسوچ ہنکارا بھرتے دوبارہ بند کیا۔

"پسند تو آئے گی پر میری بھی اب ایک شرط ہے۔"

"شرط؟" ویملا نے بھنویں سکیڑیں۔ "اب یہ کیا بات ہوئی اور کیسی شرط؟"

"پہلے ہاں بولو۔" وہ تو بالکل ہی اڑ گیا تھا۔

"ارے ایسے کیسے۔ کچھ بتاؤ کیسی شرط؟"

"وہ بعد میں۔" رافع اب لب دبائے بدمعاشی سے ہنس رہا تھا۔ ویملا نے چڑ کر گھونسا دکھاتے ہار مانی۔

"ٹھیک ہے منظور۔ اب بولو۔" لیکن رافع نے بجائے بولنے کے ڈبیا کھول دی۔

"بتاؤ۔ کیسی ہے۔" وہ بغور اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ ویملا اب مخمصے میں تھی کیونکہ رافع نے شرط ابھی تک نہیں بتائی تھی۔ اب پسند آنے میں بھلا تھا یا نہ آنے میں۔ وہ بری طرح کنفیوز ہو گئی تھی۔

"ایک سال بعد تم چار سے ناں۔ آٹھ نمبر ہو گئے ہو۔"

"ہاہاہا..... بتاؤ اب۔"

"اب جھوٹ کیسے بولوں۔ بہت سندر ہے۔" وہ برے برے منہ بھی بنا رہی تھی۔

WITH COLORLOCK TECHNOLOGY ™
BLACK ROSE
ColorSupreme
PERMANENT
HAIR COLO
DEEP NOURISHING EFFI
AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHA
COLOR EXPERTS!
www.blackrosecosmetics.com

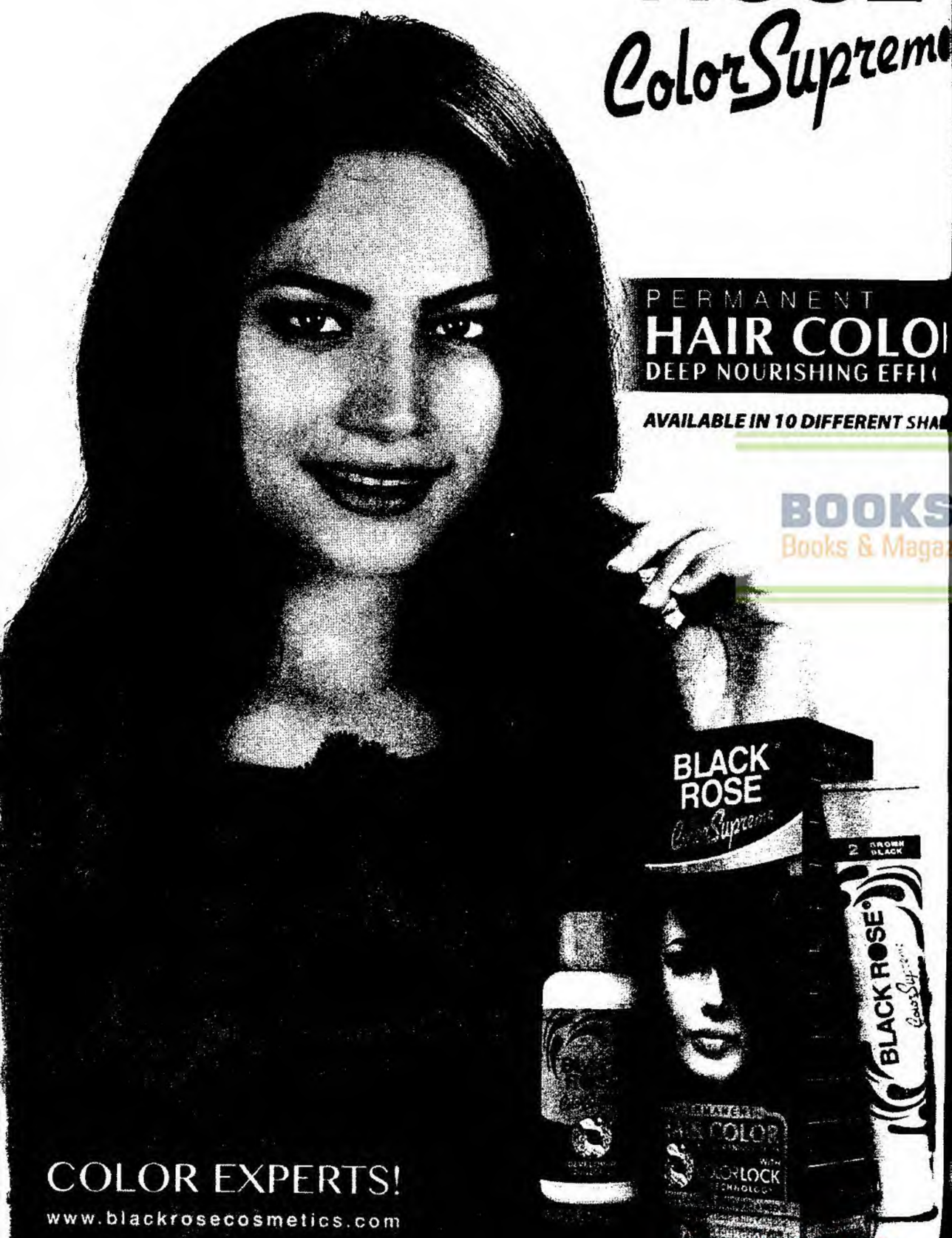

BOOKSPK
Books & Magazines

''گڈ۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر ڈبیا بند کردی۔ ''تو ڈیئر سندر پتنی۔ شرط یہ تھی کہ اگر تمہیں رنگ پسند آگئی تو رافع محمد یہ آپ کو کوٹکا واچ ٹاور پہ جاکے پہنائیں گے اور.....''

''رئیلی۔'' ویملا بنا پوری بات سنے زور سے چہکی۔ ''تم مجھے دوبارہ لے جاؤ گے وہاں۔ قسم سے میں تو.....''

''ہاں اور اگر تمہیں پسند نہ آتی تو سندر بن میں ہنی مون کا پلان کینسل ہوجاتا۔''

''میرے تو سچی کبھی من میں یہ وچار آیا ہی نہیں تھا کہ ہم دوبارہ بھی سندر بن جاسکتے ہیں اور کتنا اچھا لگے گا رافع!'' وہ سب بھول بھال جیسے ایک سال پیچھے چلی گئی۔ ''میں کتنا یاد کرتی تھی رافع! وہاں کی ایک ایک ڈالی، پتے، پھول، موجیں پتوار، وہ ہوا، ہریالی، باگھ، چیتل ہرن۔ ہماری یاٹ، وہ چائے۔'' ویملا دیوانوں کی طرح دوہراتے اپنی نم پلکوں کو سرخ آنچل سے پوچھتی جارہی تھی اور ہنستے ہنستے جانے کیا ہوا کہ ہچکیوں میں رونے لگی۔ رافع بھی ایک نظر دیکھ کر ہنس پڑا۔ وہ جانتا تھا اپنی شرط کی گہرائی۔ اُس میں چھپے جذبات کی قیمت اور سات دنوں کے ایک ایک پل کی قدر اس کا اثر۔

''تم شاید دلدل، مچھروں اور لیزرڈ کو بھول رہی ہو۔'' اُس نے ماحول کی گمبھیرتا کم کرنے کی کوشش کی اور کمرا سچ مچ ویملا کے قہقہے کی کھنک سے گونج اُٹھا۔

''بھول تو ویسے تم بھی رہے ہو۔''

''ہوں؟'' رافع کو اچنبھا ہوا۔ ''کیا؟''

''کوٹکا بیچ سے ماماجی کا گھر اور سومیہ.....'' وہ دھیرے سے سومیہ کہتے جھجک کر رُک گئی۔

''کیسے بھول سکتا ہوں۔ کوٹکا بیچ سے ماماجی کے گھر ہی جائیں گے کیونکہ نیکسٹ منتھ سومیہ کی شادی ہے۔ اینڈ ڈونٹ وری وہ بہت خوش بھی ہے۔''

''اچھا۔'' ویملا کو دلی سکون پہنچا تھا اتنی اہم خبر سن کر۔

''اور تمہاری ممی رافع؟''

''اپنی بہو کی راہ دیکھ رہی ہیں اور ہم دونوں کی خیریت سے بنگلہ دیش پہنچنے کی دعا کررہی ہیں۔''

''میری بات کرواؤ نا رافع! کیسی بری بات کہ.....''

''سوری۔ بات تو نہیں ہوسکتی۔''

''ہیں۔ کیوں.....؟''

''بڑی گمبھیر سمسیا ہے۔ کوئی حل نہیں۔'' رافع سخت مایوسی اور اداسی سے سر نفی میں ہلا رہا تھا۔

''ہائے اللہ۔ کیسی سمسیا رافع!'' ویملا کا دل گھبرانے لگا۔

''ممی کو ہندی نہیں آتی اور بہو کو بنگالی۔'' اس نے اسی سنجیدگی سے وضاحت کی اور ویملا کا بے ساختہ قہقہہ نکلا۔

''توبہ ہے رافع! ڈرادیا مجھے تو۔''

''ہاں پر اشاروں میں کب تک چلے گا۔ دو عورتیں زبان کا پریوگ (استعمال) نہ کرسکیں تو نوبت کہیں ہاتھوں تک نہ آجائے۔ اب میں تو نہیں پڑوں گا ہاتھا پائی کے جھگڑے میں۔''

''میں بتاتی ہوں ناں کیسے بچنا ہے ہاتھا پائی سے۔'' اس مرتبہ ویملا نے اکٹھے تین چار کشن ایک ساتھ گھیر کر بازوؤں میں لیے۔ رافع بھاگ کر دروازے تک گیا۔

''تم لڑنے کی پریکٹس کرو۔ میں کھانا لے کر آتا ہوں۔'' اور پل میں کمرے سے باہر۔ ویملا کے پھینکے کشن بند دروازے سے ٹکرا کر نیچے پھسل گئے اور وہ ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔

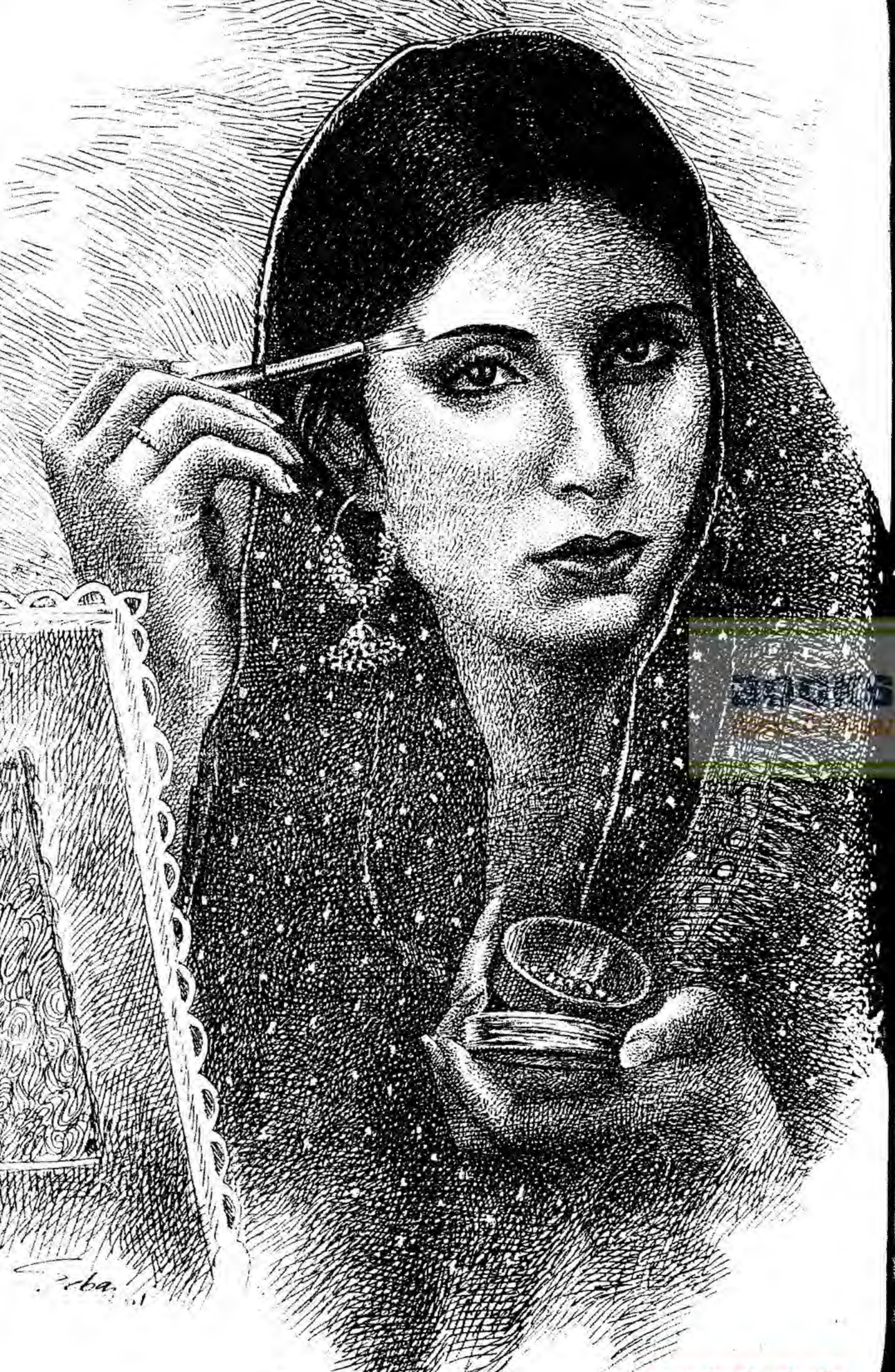

سمیرا حمید

راہِ نجات

زندگی کی محراب پر درج تحریر کا پہلا لفظ ''موت''..... ہے۔

مسجدوں میں فجر کی نماز کے لیے جماعتیں کھڑی ہو رہی تھیں اور وہ انہیں اپنی کار میں بٹھا کر مینٹل ہاسپٹل سے بھگا کر لے جا رہا تھا۔ کہیں بہت دُور۔ جہاں کوئی انہیں مرنے سے نہ روک سکے..... جہاں وہ تینوں اطمینان سے اجتماعی خودکشی کر سکیں.....

ہادی..... طلال..... ابراہیم.....

سفید کار لاہور کی حدود سے باہر نکل رہ
ہے۔ فجر کی نماز ان بے نمازیوں کی قضا ہو چ
ہے۔ جو زندگی کے فرض کو ''موت'' کی قضا سے
بدلنے جا رہے ہوں' انہیں نماز' روزہ' زکوٰۃ' بندگی' سے
کیا لینا دینا۔ انہیں کل بھی مرنا تھا اور آج
بھی..... انہیں زندگی سے رات بھی بے زاری تھی
آج اس نئے دن بھی.....

مایوسی ایسا اندھیرا ہے جس کے اس پار کو

مکمل ناول

چراغ جلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا.....

غم ایسی آگ ہے جو زندگی کے نخلستان کو جہنم میں بدل دیتی ہے.....

ابراہیم..... یہ ڈرائیونگ کررہا ہے۔ وہ ان دو سے قد میں لمبا ہے' پانچ فٹ دس انچ۔ سخت ورزشی جسم کا مالک ہے۔ اس کی ٹی شرٹ اور کھلے بٹنوں کی چیک شرٹ اس کے مسلز کی ساخت کو چھپانے میں ناکام۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی کا گمان تو ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر روشنی یہ یقین بھی دیتی ہے کہ اس کے اندر کہیں کوئی مشعل روشن ہے۔

ابراہیم نے ریڈیو آن کیا تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طلال نے ہاتھ بڑھا کر بند کردیا۔ طلال..... وہ ان دو میں سب سے زیادہ ہینڈسم اور چارمنگ ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کبھی وہ کسی انٹرنیشنل برانڈ کا ماڈل ایمبیسڈر رہا ہوگا۔ اس کے چہرے کی سختی اور آنکھوں کی نمی کا تال میل نہیں بیٹھتا۔ وہ پتھر ہونا چاہتا ہے' اور آنکھ میں سمندر رکھتا ہے..... کیوں؟؟ کس لیے؟

پیچھے سیٹ پر سر گرا کر' ٹانگیں پھیلا کر ہادی پڑا ہے۔ اسے سورج' چاند' ستاروں' آسمان' دن' روشنی' انسانوں سمیت' دنیا کی ہر شے اور ہر نظارے سے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے اس نے آنکھوں کو دونوں بازوؤں سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ جو آخری چیز دیکھنا چاہتا ہے وہ نئے ''دن کی روشنی'' ہے۔ وہ جس پہلی چیز سے دور بھاگتا ہے وہ ''اندھیرا'' ہے۔

''ہمیں کتنا وقت لگے گا وہاں پہنچنے میں؟'' ڈیڑھ گھنٹے بعد ہادی نے جھنجلا کر پوچھا۔ اسے راستے میں ریل کی پٹری نظر آئی تھی اور اس پر کٹا پڑا اپنا سر اور دھڑ.....

''ڈھائی تین گھنٹے اور لگ جائیں گے.....''

ابراہیم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر۔ سورج کی کرنوں نے زمین کو روشن کرنا شروع کردیا تھا۔ دُور ہر طرف کھیت لہلہا رہے تھے۔ نیلی' پیلی وردیوں میں بچے اسکولوں کی طر جارہے تھے۔ پیدل اور سائیکلوں پر لدے پھند ٹلیاں کھڑکاتے' سائیکلیں لہراتے..... اس نے ہا دیا تو انہوں نے شرارتاً کار کا راستہ روک لیا.....

''اسپیڈ بڑھا دو نا یار! ڈر کر پیچھے ہو جائ گے.....'' ہادی کے لہجے کی تندی گواہ تھی کہ اس اندر آگ لگی ہوئی ہے۔

''بچے ہیں یار! ذرا شرارت کر ر ہیں..... ابھی راستہ صاف ہوجائے گا.....''

''اگر انہیں جانے کی جلدی ہے تو مجھے بھ مرنے کی جلدی ہے..... تم اسپیڈ بڑھاؤ بس.....''

ابراہیم نے اسپیڈ تو نہیں بڑھائی لیکن اس ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ بچے گردنیں موڑ موڑ کر کار طرف دیکھنے لگے تھے۔ انہیں منہ چڑانے لگے۔ اسپیڈ بڑھا کر آگے نکلتا کہ سر پر گھاس کا گٹھا اٹھا پیدل چلتی ماں جی نے ہانپ کر گٹھا بونٹ پر رکھ دیا کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

''پتر! پانی ہے؟''

پتر ابراہیم نے پانی کی بوتل ان کی طرف بڑ دی۔ انہوں نے اطمینان سے پانی پیا۔ پلو سے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔ بہت آرام اطمینان سے گٹھے کو واپس سر پر جمایا اور کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

''اللہ بھلا کرے..... خیر پائے.....''

زندگی کی خیر کو' موت کے حوالے کرتا ہادی ہاسپٹل کی ساتویں منزل پر جا کر کھڑا ہو گ تھا۔ اندھیرے کا شہر' مصنوعی روشنیوں میں ٹمٹما تھا۔ اتنی زیادہ سختی کے باوجود وہ نائٹ ڈیوٹی اسٹاف کو چکما دینے میں کامیاب ہو کر' چھت کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جس وقت وہ تقریباً چھلانگ لگا ہی چ تھا' ٹھیک اسی وقت ابراہیم نے پیچھے سے آکر اسے پکڑ لیا تھا۔ پورے ہاسپٹل میں الارم گونج رہے تھے۔ سارا شہر اس ہاسپٹل کے ساتھ جاگ گیا

ساری دنیا نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ئیں۔ کائنات کی سانس وحیات نے اپنی آنکھیں لی تھیں.....

اسٹاف کے گیارہ لوگ اسے گھسیٹ کر نیچے اس کمرے میں لائے تھے۔ نرس اسے انجکشن لگا رہی تھی۔

''چھوڑ دو خدا کے لیے..... مجھے مرنے دو مجھے.....'' ہوش سے بے گانہ ہوتے ئے بھی وہ مسلسل یہی بڑبڑا رہا تھا۔ اپنا سر پٹخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے پھر بھی ہ تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

''تم مرنا چاہتے ہو؟'' اس کا سر سہلاتے ہوئے ابراہیم پوچھ رہا تھا۔

اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے ہادی نے سوال پوچھنے والے کو دیکھنا چاہا۔ یہ سوال پوچھنے والا وہ پہلا شخص تھا۔

''ہاں! میری مدد کرو پلیز.....'' اس کی دھندلی' بند ہوتی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔

''میں تمہاری مدد کروں گا..... میں کروں گا ..... میرا یقین کرو.....''

وہ اس کے کان میں سرگوشیاں کررہا تھا۔ ابراہیم صبح تک اس کے سرہانے بیٹھا رہا تھا' اور بار بار یہی دہراتا رہا تھا۔ ہادی کے نیم خوابیدہ دماغ نے ''میں تمہاری مدد کروں گا'' کا جملہ یاد کرلیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے لیے مدد آچکی ہے۔

''میں خود تمہیں ماروں گا۔ میرا وعدہ ہے تم سے..... لیکن تم خود سے کچھ نہ کرنا.....''

ہادی بے یقینی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہر ڈاکٹر' نرس' اسٹاف ممبر کی منت کرچکا تھا۔ انہیں پیسوں کا لالچ دے چکا تھا کہ وہ اسے زہر ا دیں' ورنہ ایک پسٹل یا پھر اس کا گلا گھونٹ دیں' ادی سے کود جانے دیں۔ وہ کسی کا کچھ نہیں لے رہا ۔ وہ تو اپنی چیز' اپنی زندگی لے رہا ہے۔ کسی کا اس سے کیا لینا دینا.....

''اجتماعی خودکشی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اسی دن شام کو ابراہیم اس سے پوچھ رہا تھا۔

''اجتماعی خودکشی.....؟'' اس کی طرح باقی دنیا بھی مرنا چاہتی ہے' اسے اب معلوم ہوا تھا۔

''ہاں..... میں تم..... اور روم نمبر تین کا طلال.....''

''وہ کیسے؟''

''ہاسپٹل سے باہر..... کہیں دُور.....''

''دُور کیوں.....؟؟'' وہ ایک ذہین اسٹوڈنٹ رہا تھا۔ ہینگ گلائڈنگ کا شاہین..... ماں کا شیر..... باپ کا ببر شیر..... اسے موت کو پالینے کی جلدی تو تھی لیکن لمبی میعاد اور فاصلوں سے نفرت تھی۔

''وہاں ہمیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں کفن دفن کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔''

''موت کے لیے مجھے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا.....؟'' اسے بس فوراً موت چاہیے تھی۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ مسیحا

گہت میما

قیمت -/400 روپے

"تھوڑا بہت تردد تو بہرحال کرنا ہی پڑے گا....." ابراہیم نے سکون سے کہا۔

"میں ٹرین کی پٹری پر لیٹ کر مرنا نہیں چاہتا نہ کسی پہاڑ سے کود کر۔ دریا میں چھلانگ لگا کر بھی نہیں، مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔ میں کنپٹی پر پسٹل رکھ کر یا زہر کھا کر مرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ تم میرا گلا گھونٹ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لاش گدھ کھائیں یا چیل کوے۔"

"فکر نہ کرو، تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم مر جاؤ گے۔" ایسی خوفناک بات ابراہیم نے مسکرا کر کی۔

"ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" اسے شک تھا کہ ابراہیم اسے بہلا رہا ہے۔

"وہ مجھ پر چھوڑ دو..... میں نے انتظام کر لیا ہے....."

اس نے انتظام کر لیا تھا۔ اسی لیے اذان فجر سے پہلے وہ انہیں اپنی سفید کار میں بٹھا چکا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر طلال کو اور پچھلی سیٹ پر ہادی کو..... ہادی جسے ہواؤں کا شاہین بننے کا شوق تھا۔

شاہین جو بلندیوں کا پرندہ ہے.....

شاہین..... جسے پستیوں سے کچھ لینا دینا نہیں.....

سڑکیں سنسان تھیں..... اندھیرا روشنی سے جا ملنے کے لیے تیار تھا اور..... "زندگی موت" سے.....

☆☆☆

صبح کی اُمید بھری فضا، دن کی مکاری میں بدلنے لگی۔

"ذرا تیز گاڑی چلاؤ....." وہ غصیلا، بدتمیز اور بے ادب۔ اس نے اپنی دوا نہیں کھائی تھی اسی لیے وہ پاگل پن کی حد تک چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"میں تھک چکا ہوں۔" اس نے کار کو سڑک کے کنارے روک لیا۔

"تم تھک چکے ہو تو ہمیں کیوں تھکا رہے ہو..... کیا چاہتے ہو..... اتنی دُور کیوں لے آئے ہو ہمیں؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم چپ رہو گے، کوئی سوال نہیں کرو گے۔ جو میں کہوں گا وہی کرو گے۔" ابراہیم نے اچٹتی نگاہ سے اسے دیکھا اور سیٹ سے نیچے ٹانگیں پھیلا لیں۔

"ہونہہ..... بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا پلان....."

کار سے اتر کر، دروازے کو دھاڑ سے بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا وہ کار کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اسے آس پاس کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جو اس کا کام تمام کرنے میں اس کی مددگار بن سکتی۔ ٹرین کی پٹری، وزنی پتھر ورنہ پہاڑ کی بلندی.....

تیزی سے کار سے نکل کر ابراہیم اس کی سمت بھاگا۔ پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے جبڑے پر مارا۔

"مردوں کی طرح مرنے جا رہے ہو، پہلے مردوں کی طرح زبان کا پاس رکھنا سیکھو۔ سمجھے.....؟؟"

ایک گھونسے کے بعد اس نے اسی گال پر دوسرا گھونسے مارے۔ خون سے اس کا منہ بھر گیا۔ تکلیف سے بے حال ہو کر وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پچھلے گیارہ مہینوں سے وہ تکلیف میں تھا۔ مہینے سے مینٹل ہاسپٹل میں تھا۔ دوائیوں پر تھا۔ اس کے جسم میں بچا ہی کیا تھا جو وہ تین گھونسے سہہ سکتا۔ ابراہیم کا ہاتھ روک لیتا ورنہ جوابی حملہ ہو دیتا۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا طلال اپنے ناخن چباتا رہا۔ اس نے گردن ان کی طرف گھما کر یہ تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسے سمیت دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بھی مر جائے اور ساری دنیا بھی تباہ و برباد ہو جائے۔ طوفان آئے یا زلزلہ۔ جنگ ہو یا کہرام بپا۔

وہ تین مہینے پہلے ہاسپٹل آیا تھا۔ اس ہاسپٹل میں ایک ہی بار خودکشی کی کوشش کی تھی۔

وہ طریقہ ایسا حیران کن اور ششدر کر دینے والا تھا کہ ڈاکٹرز اور ہاسپٹل کا پورا اسٹاف کتنی ہی دیر تک ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ اپنے لیے خطرہ بن سکتا۔ پھر بھی..... اپنی دو ٹانگوں کو قینچی بنا کر اس نے اپنی گردن کو اس میں ایسے پھنسا لیا تھا کہ اگر اسٹاف تیس سیکنڈ اور لیٹ ہو جاتا تو اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا ہوتا۔

زندگی کی محراب سے گر کر ٹوٹا ہوا ہادی زمین پر لاش کی طرح پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے سر پر کھڑا ابراہیم اسے افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا اور رومال نکال کر اس کے منہ سے خون صاف کرنے لگا۔

"اپنی اتنی توہین نہ کرو ہادی! ویسے بھی آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس دن پر تھوڑا سا تو احسان کرو۔ مرنے سے پہلے اسے زندہ رہ کر دکھاؤ۔"

ذرا سا سر اٹھا کر اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ اس کی پشت سے نکلتی سورج کی کرنیں اس کی اندھیرا آنکھوں کو تکلیف پہنچانے لگیں.....

"اُٹھ جا پتر! دن نکل آیا ہے، پرندے اپنا رزق کھا مکا بیٹھے ہیں۔ اُٹھ جا....." سورج کی کرنیں نیم کے درخت سے چھن کر، ماں کی گلابی چنی کو چومتی، اس کی آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

"دو ہفتوں کے لیے آیا ہوں ماں جی! سکون سے سونے تو دیں..... اور بھلا یہ سورج اتنی جلدی کیوں نکل آتا ہے۔"

"سورج اپنے وقت پر نکلتا ہے، تو اپنا وقت سو کر برباد نہ کر۔ اُٹھ جا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر چار باتیں کر لے۔"

ماں پتر دیاں چارگلاں.....

"اک ماں میری او پیاری..... اس ماں نال ہری یاری..... میرا دل تے میری حیاتی..... اس ماں توں جندواری....."

وہ اٹھا اور نقاہت سے چلتا ہوا کار کی چھت پر دونوں ہاتھ ٹکا کر ہانپنے لگا۔ آنسوؤں کے چند قطروں اس کی پوری آنکھیں بھگو دیں۔ ابراہیم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور اسے بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب آستین سے اپنی آنکھیں رگڑ رہا تھا.....

"پانی پی لو....." پانی کی بوتل لے کر وہ باہر نکلا۔

وہ اپنے آنسو پی چکا تھا، پانی کو اس نے اس قابل نہیں سمجھا۔ دروازہ دھاڑ بند کر کے، سیٹ پر آڑا ترچھا دراز ہو کر اس نے آنکھوں کو بازوؤں کی آڑ میں چھپا لیا.....

ماں پتر دیاں چارگلاں.....

☆☆☆

چالیس منٹ بعد وہ تینوں کھیوڑہ کان کے باہر کھڑے تھے۔ ٹکٹ ابراہیم کے ہاتھ میں تھے۔

"تم ہمیں یہاں سیر کروانے لے کر آئے ہو؟" ہادی نے خوں خوار نظروں سے ابراہیم کو گھورا۔ طلال بھی ابراہیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ پورے پاکستان میں کہیں نہیں ملے گی۔"

"ساری دنیا کو فتح کرتا سکندر اعظم جب یہاں سے گزرا تو اس کی فوج کے گھوڑوں نے پہاڑوں کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ پتھر کو توڑ کر دیکھا تو اندر نمک تھا۔ ایسے یہ کھیوڑہ کان دریافت ہوئی تھی۔ یہ دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان ہے۔ یہ اتنی گہری اور لمبی ہے کہ....."

گائیڈ اسکول کے بچوں کو کان کے دہانے کے پاس کھڑا کر کے لیکچر دے رہا تھا۔ ایک دم سے وہاں بچوں کا انتشار بڑھ گیا تھا کہ ان تینوں کو ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دینا پڑا تھا.....

"سکندر اعظم کان کے اندر گیا تھا؟" ایک بچے نے چلا کر پوچھا۔ دوسرے بچوں نے ایسے بے تکے سوال پر قہقہہ لگایا۔

''سکندر یہاں سیر سپاٹے کرنے نہیں آیا تھا' یہ خطہ فتح کرنے آیا تھا۔ جنگجو تھا وہ.....'' گائیڈ چڑ گیا۔

''پھر ہم اندر جا کر کیا کریں گے جب سکندر ہی کان کے اندر نہیں گیا تو.....'' بچے کو ساری دلچسپی صرف سکندر سے تھی۔

''تمہیں وہ نہیں کرنا جو سکندر نے کیا تھا' ''جنگ اور فتح''۔ تمہیں وہ کرنا ہے جو وہ نہیں کر سکا تھا۔ ''زندگی اور انسانیت سے محبت۔''

زندگی اور انسانیت سے محبت.....

تینوں بے زار سے کھڑے یہ آخری فقرہ سن چکے تھے۔ ہادی چند سیکنڈ تک ٹکٹکی باندھ کر ابراہیم کو دیکھتا رہا۔

''کیا تم ہمیں کسی بھی طرح سے پاگل بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں مینٹل ہاسپٹل سے بھگا کر لایا ہوں۔ تم پاگل ہی ہو.....'' اس کا لہجہ سخت اور سرد تھا۔

ان دونوں کے ہاتھ میں ان کے ٹکٹ تھما کر اس نے اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔ روشنی جو کان کے دہانے پر گر کر پھیلی ہوئی تھی' وہ اندر قدم بڑھاتے بڑھاتے معدوم ہونے لگی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چلتا رہا۔ اس کی حسیں پوری طرح سے بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے پیچھے طلال اور پھر ہادی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

کان میں عام لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ انہیں جگہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ہادی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرنے کے لیے نمک کی کان کا انتخاب بھی کیا جا سکتا ہے۔ کسی عوامی مقام کا۔ اسکولوں کے تین چار سو بچوں کی موجودگی میں انہیں مرنا ہوگا۔ ایک سال پہلے تک اسے پہاڑ بہت پسند تھے' لیکن صرف بلندی سے۔ اب وہ اس بلندی کی کھوہ میں جا رہا تھا۔ اسے اس عمل سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

''تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم یہاں کیسے مر سکتے ہیں؟'' ہادی نے پیچھے سے اس کے کالر کو پکڑ کر جھنجوڑا۔

''دوبارہ گریبان تک نہ آنا۔ ورنہ اس بار گھونسہ پیٹ میں ماروں گا اور آنتیں نکل کر باہر آ گریں گی۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو۔ اگر میں ہوتا تو تم مر کر بھی اس ہاسپٹل سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میرا احسان مانو۔ تمیز سے بات کرو اور سامنے دیکھ کر سیدھ میں چلتے رہو۔''

سامنے دیکھتے ہوئے وہ سیدھ میں چلتے رہے۔ کان کا نمک پانی بن کر ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ چھوٹی تنگ سی راہداری گیلی ہو رہی تھی۔ وہاں گھٹن تھی' اندھیرا تھا' اور ٹپ ٹپ پانی تھا۔ لوگوں کی باتیں' بچوں کی ضدیں' ماؤں کی تکراریں۔ نمک کی اس کان میں کتنا کچھ تھا۔ پہاڑ کی کھوہ میں بھی زندگی کی چہل پہل تھی۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' ہادی تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ دو گھنٹے سے مسلسل چل رہے تھے۔

''مرنے جا رہے ہو اور زندگی کی بوند بوند کے لیے تڑپ رہے ہو۔ کیسے دوغلے انسان ہو۔ پانی کی بوتل گاڑی میں رہ گئی ہے۔'' ابراہیم نے بے زاری سے کہا۔

کان کے جس حصے میں وہ آ چکے تھے یہاں اب عوامی رش نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ساری کائنات پر رات چھا گئی ہے۔ ابراہیم کے ہاتھ میں لیٹر تھا' اور وہ اسی کی روشنی میں چل رہے تھے۔ انتظامیہ کی طرف سے روشنی کا انتظام جہاں تک تھا' وہ حصہ وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

''آگے خطرہ ہے۔ اس طرف جانا منع ہے۔''

کھوپڑی کے کراس سائن کے نیچے ہدایات لکھی تھی۔ کھوپڑی اور تنبیہ دونوں کو صاف نظر انداز کر کے ابراہیم چھوٹے سے لوہے کے دروازے کو کھول کر' جھک کر' اندر چلا گیا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

غیر ارادی طور پر اندر جانے سے پہلے دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور انہیں روشنی کی

آخری کرنیں نظر آئیں۔ بچوں اور عورتوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ۔ کان سے باہر' آسمانی جھولے کی گڑگڑ۔ تیس روپے کی آئس کون والے کی صدا۔ دس روپے کے پاپ کارن والے کی پکار..... دور نیلے آسمان پر روشن سورج کا الوداعی سانس اور رات کے آسمان کے ستاروں کا سناٹا.....

کان کے اندھیرے میں سورج روشن تھا نہ ستارے..... وہاں بس اندھیرا تھا.....

کان کی ٹھنڈک میں زندگی کی گرمی تھی' نہ موت کی نرمی..... وہاں بس بے رخی تھی.....

دونوں سر جھکا کر خطرے کو نظر انداز کر کے اندر چلے گئے۔

چیک شرٹ کے بازو موڑے ابراہیم اطمینان سے چل رہا تھا۔ وہ اتنا پرسکون تھا' جیسے کسی ایسے غار کو ڈھونڈ رہا ہو' جہاں سے موت کے فرشتے' خوش گپیاں کرتے ہوئے نکلیں گے۔ ان سے ہاتھ ملائیں گے' خوش آمدید کہیں گے اور اپنی سواریوں پر بٹھا کر زندگی سے پرے کر موت کی طرف لے جائیں گے.....

ابراہیم..... اس جیسے ایشین گولڈ میڈلسٹ باکسر کو موت کا خیال آیا ہی کیوں تھا..... پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لے کر' ملکی جھنڈے کو لہراتے ہوئے وہ تو رنگ میں ناچتا' کودتا' دوڑتا پھر رہا تھا۔ اس نے ایشین گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔ اس نے ایمان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے منہ دکھائی میں ''گولڈ میڈل'' دے گا۔ منہ دکھائی کا تحفہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ نکاح کی تیاریاں بھی ہو گئی تھیں..... پھر..... پھر.....

خطرے کے نشان کو پار کر کے چلتے ہوئے انہیں کافی وقت گزر چکا تھا۔ وہ کان کے اس حصے میں آ چکے تھا جہاں انتظامیہ کے چند لوگوں کے سوا باہر کی دنیا کا کوئی انسان کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

''تم اس جگہ کو کیسے جانتے ہو؟ پہلے آ چکے ہو یہاں؟'' ہادی بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔

''کان کا نقشہ میں نے انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا۔'' اس نے ایسے کہا جیسے اس نے کوئی بڑا معرکہ سر انجام دیا ہو۔

''تو مرنے کے لیے تم نے اس جگہ کو ہی کیوں پسند کیا؟'' طلال نے یہ پہلی بات' پہلا سوال کیا تھا۔

''کیونکہ یہ جگہ ٹھنڈی ہے اور موت کی گرمی کو' تھوڑی ٹھنڈک بھی نصیب ہونا چاہیے۔ یہاں ہماری لاشوں کی بے حرمتی بھی نہیں ہوگی۔''

''مرنے کے لیے اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی پلاننگ تو زندہ لوگوں کو زیب دیتی ہے۔'' ہادی نے اداسی سے کہا۔

☆ ☆ ☆

یقیناً شام کے' چار پانچ بج چکے ہوں گے۔ کان کے ورکر ایک آخری چکر لگا کر بچے کھچے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر باہر نکال رہے ہوں گے۔ صرف نمک سے بنے اُس چھوٹے سے ہاسپٹل میں استھما کے چند مریض موجود ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر' نرس اور دو چار دوسرے لوگ۔ ورنہ ساری کان خالی ہو چکی ہو گی۔

''ایک دوسرے کی شرٹ پکڑ لو۔ ہادی تم میری طلال تم ہادی کی۔ اب بس میرے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چلو۔'' ابراہیم نے ایک دم سے لائٹر بجھا دیا۔

''تم نے لائٹر کیوں بند کر دیا ہے؟''

''اب ہم ایک خوفناک چھوٹے سے پل پر سے گزر رہے ہیں..... ویسے کیا تم خوف زدہ ہو؟'' اس نے ہادی کا سوال نظر انداز کر دیا۔

ہادی لب بھینچ کر چپ ہو گیا۔ اس نے ابراہیم کی شرٹ کا کونا پکڑ لیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں فٹ بلندی پر موجود ہیں۔ نیچے کھائیاں' دلدل' اور زہریلے سانپ بچھو ہیں۔ تین دن پہلے تک وہ زندگی کے خوف سے چیخیں مار رہا تھا۔ ''میں زندہ ہوں'' کہ خوف سے اس کی گھگھی بندھ جایا کرتی تھی کہ ساری خدائی کو اس کے حال پر ترس آیا کرتا تھا۔ اب وہ سانپ بچھوؤں سے ڈر رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ..... کل اس وقت تک ہم مر چکے ہوں گے۔"

ابراہیم نے لائٹر روشن کر کے آخری بار ان کی شکلیں دیکھیں اور پھر ذرا سا باہر کی طرف نکل کر لائٹر پھینک دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی کھوہ میں کھڑے تھے جہاں جھک کر کھڑا ہونا پڑ رہا تھا۔ جا بجا نکلی نمک کی قلمیں ان کے جسموں کو مس کر رہی تھیں۔

ایک لمحہ زندگی کا لمحہ بن کر آیا.....

"کان کے باہر رات ہونے والی ہوگی۔ چاند نکلنے والا ہوگا۔" کونے میں سکڑ کر بیٹھے ہادی نے زندگی کے بارے میں سوچا۔

اس اندھیری قبر سے باہر اس کے گاؤں میں ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہوں گے۔ مائی سوداں کا چرخہ گھوں گھوں کرتا ہوگا اور تالاب کے پانی میں بطخیں اپنے پر پھڑ پھڑاتی ہوں گی۔ دانے دنکے کی جنگ لڑتیں مرغیاں اور مرغے۔ کچی پگڈنڈیوں پر خالی ٹائر دوڑاتے بچے۔ نہر کنارے بنے اسکول کی گھنٹی کی ٹن ٹن، سبق کے رٹے اور لمبے لمبے سانس کھینچ کر پہاڑوں کے رٹے۔ یہ آوازیں آج بھی گاؤں میں سانس لیتی ہوں گی۔ دیسی انڈے، چوزے چرا کر بھاگتا رشید۔ غلیل سے چڑے مار مار، بھون بھون کھاتا وزیر۔ ان کی ہنسی ان کی ساری ہستی بنتی ہو گی..... آج بھی، گاؤں پر شام سہانی شہابی چنری اوڑھ کر اترتی ہوگی۔

ہادی کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ دوا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سر میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اندھیرا اسے خوفزدہ کرنے لگا تھا۔ لیکن کوئی شخص بازار سے اندھیرے لینے جائے اور یہ توقع رکھے کہ دکان دار بدلے میں اسے چراغ دے دے گا تو ایسا شخص دیوانہ ہی ہوسکتا ہے۔

تمہیں مرنے کے لیے کوئی آسان طریقہ نہیں ملا تھا۔" طلال پھٹ پڑا۔ وہ ایسے ہی ایک دم سے پھٹتا تھا۔

"سوچا شیروں کی طرح زندہ نہیں رہے تو شیروں کی طرح مر ہی جائیں....." ابراہیم نے طنز کیا اور قہقہہ بھی لگایا۔

طلال کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور اس کی گردن دبوچ لے۔ وہ اٹھا بھی، لیکن کمزوری کی وجہ سے ہادی کے پاؤں سے الجھ کر گر گیا۔

"زیادہ غصہ نہ کرو اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ شاباش۔" ابراہیم نے پچکارا۔ وہ اسے اور غصہ دلا رہا تھا۔

"منحوس انسان..... ہمیں تکلیف میں دیکھ کر تمہیں ہنسی آرہی ہے....." اس کی آواز گھٹنے لگی۔

"یہ تکلیف میں نے تو تمہیں نہیں دی؟؟"

"تم مکار اور چالاک ہو..... کمینے انسان....."

"او کے! میں یہ سب ہوں تم کیا ہو؟ عقل مند؟ سمجھ دار؟ بہادر؟؟"

جواب میں خاموشی رہی.....

☆☆☆

رات تین پہروں میں سے پہلے پہر میں داخل ہو چکی تھی..... پہلا پہر شیطان کے وسوسوں اور خوف کا پہر۔

ہادی پر نیم غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ اور جب اسے لگا کہ موت اس کے سرہانے آکر کھڑی ہو چکی ہے۔ سارا جہاں جو اس کی مٹھی میں بند تھا، ہاتھ سے پھسلنے لگا ہے تو اس نے ایک سسکی لی۔ آنسو اس کے گال پر پھسلے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسے مرنا پڑے گا۔ وہ تو زندہ رہنا چاہتا تھا..... ہمیشہ سے.....

☆☆☆

"دنیا میں سب سے خوب صورت کیا ہے.....؟؟"

"پرندے....."

"پرندوں میں سب سے خوبصورت.....؟؟"

"اونچی پرواز والے پرندے....."

"اونچی پرواز والوں میں.....؟"

جو پہاڑوں پر بسیرا کریں..... بلند پرواز، خلوت

...ن، تیز نگاہ، غیرت مند..... "شاہین۔"

کہہ کر بلند حوصلہ شاہین، جوش سے چلاتے ...ے پہاڑ کی بلندی سے کود گیا۔ ہینگ گلائڈنگ کی ...اس کی پہلی سولو پرواز تھی۔ (مصنوعی پتنگ کے ...ر لیے اڑنا)۔ بچپن میں وہ "چڑا" تھا۔ پھر چیل ہوا، ...اب وہ شاہین تھا۔ زمین کی بلندی سے پرواز کرتا ...وا، آسمان پر کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا۔

سبزے کے قطعے، پہاڑوں کا خاندان، جھنکار کی ...رح گرتی آبشار، پتلی لکیر بناتا دریا، پھر اڑان بھرتے ...چھوٹے پرندوں کا اہل وعیال..... اچھا تو اوپر سے ...زمین ایسی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے معلوم ہوتا تو وہ ...سفید بادلوں پر ایک گھر بنا لیتا۔ گھر کی کھڑکیاں کھول ...کر روز ایسا نظارہ کرتا.....

ہواؤں کے قافلے، روشنی کے مسافر اس کے لیے ...تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ اُڑ رہا تھا..... وہ اڑ رہا تھا .....

"ماں جی! آپ کا بیٹا شاہین بن گیا ہے۔" نیچے اترتے ہی اس نے سب سے پہلے ماں جی کو فون کیا تھا۔ خوشی سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"میرا پتر تو شیر ہے..... ہادی! بس اب گھر آجا۔ بہنوں کی شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔"

"بس ماں جی! آیا کہ آیا....."

انگلینڈ سے وہ جہاز سے آیا تھا۔ اڈے سے بس سے، اور پھر اسٹاپ سے جلال کی جیپ میں۔ تین دن پہلے اس کا سمسٹر ختم ہوا تھا۔ ماں جی نے اسی کی وجہ سے شادی کی تاریخ کو روکا ہوا تھا۔

نومبر کے آخری دنوں کی دھوپ نے جگنوؤں کو اپنا مہمان بنا کر ہڑپ کر لیا تھا۔ سونے میں چاندی کے ورق گھول کر روشنی کی کرنوں نے، نومبر پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس دن ماں بڑی خوش تھی۔ جہیز کے سامان کو دھوپ لگوا رہی تھی۔ ابا جی نیم کے درخت سے ذرا پرے، موڑھے پر بیٹھے ممدو کے ساتھ مل کر شادی کے انتظامات کا حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ چارپائی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں دراز دادا جی حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ بہنیں مہندی، چوڑی، گوٹا چنر کی مصروفیت کے ساتھ بڑی اترائی اترائی سی تھیں۔ کچھ دیر پہلے اس نے آپا کا پراندہ مٹھی میں لے کر کھینچا تو انہوں نے دھوپ میں سوکھتی مرچوں کو ہتھیلی پر مسل کر اس کی آنکھوں میں بھر دیا۔

"شیر ہو گا ماں کا..... میرے لیے تو ڈڈو ہے..... ڈڈو....."

ڈڈو نے بدک کر پھر سے آپا کا پراندہ پکڑنا چاہا لیکن جلال نے پیچھے سے آکر خلل ڈال دیا۔ بدلے کو مؤخر کیا اور جلال کے ساتھ چھت پر چڑھ گیا۔ اسے ہوا میں اُڑنے والی ہر چیز بہت پسند تھی..... پتنگ بھی.....

وہ چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ مانجھا لگی ڈور اتنی تیز نہیں تھی جتنی تیز اور کٹیلی ایک ساتھ کئی جیپوں کے رکنے کی آوازیں تھیں کہ ڈور اس کی ہتھیلی کو چیرا لگاتی ہوئی نکل گئی۔ خون کی پتلی دھار اس کی ہتھیلی پر ابھری اور اس کا سانس گم ہو گیا۔ جلال منڈیر کے پاس کھڑا تھا، اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔

گھر کا پھاٹک مردانہ ٹھوکروں سے دھاڑ کھلا تھا۔ آٹھ لوگوں کو مارنے کے لیے وہ اتنی فوج اور اسلحہ لایا تھا..... جب تک وہ نیچے جھانکنے کے لیے منڈیر تک آیا تب تک جہیز کو دھوپ لگواتی اس کی ماں کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ زمین پر گرے اس کے جسم کے قریب خون اپنے نشان چھوڑنے لگا تھا۔

"ابا جی....."

جب تک دوسری منڈیر کی طرف بھاگ کر اس نے حلق کے بل چلا کر کہا، تب تک فائر ابا جی اور دادا کے جسموں کے آر پار ہو چکے تھے..... اور جب تک وہ سیڑھیاں پھلانگتا، گرتا پڑتا، پہلی منزل کی سیڑھیوں تک آیا، اس وقت تک فائرنگ کی آوازیں سن کر کمروں سے نکل کر باہر کو بھاگتی اس کی بہنیں..... تینوں بہنیں.....

اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی..... وقت کی ساری کڑیاں' ٹوٹ کر بکھر چکی تھیں..... وہ جان گیا تھا کہ نیچے کوئی نہیں بچے گا۔

تین لاشیں پچھواڑے کے درخت کے پاس پڑی تھیں..... ابا جی' دادا جی اور ممدو کی۔ اس طرف ما ں کے ساتھ مائی رحمتاں کی..... اور..... اور گوٹا کناری لگے پیلے سوٹ میں آپا روزینہ کی۔ برآمدے کے پاس زینب کی' اور نیم کے درخت سے ذرا دُور' چھوٹی سحر کی۔ ابا کی لاڈلی' مرنے سے پہلے بھی ان ہی کی طرف بھاگی تھی.....

تین دن بعد اسے ایک چھوٹے سے ہسپتال میں ہوش آیا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر جلال نے اسے حویلی کے پچھلے پھاٹک سے باہر نکال لیا تھا۔ وہ گولیوں کے وار سے تو بچ گیا لیکن خاندان بھر کی موت کے غم کی کاٹ سے کیسے بچتا.....

اس کے دادا کو اپنے چچازاد سے نہری زمین کا مقدمہ نہیں جیتنا چاہیے تھا۔

اس کے ابا جی کو دادا جی کو روک دینا چاہیے تھا۔ وہ گاؤں ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اماں نے اتنا جہیز کس لیے اکٹھا کیا تھا۔ جب ان تینوں کو صرف کفن ہی نصیب ہونے والا تھا۔ سہاگ کے کپڑے اور یارات کی روٹی..... ماں جی نے کیسی بدشگونی کر دی تھی.....

ہوش میں آنے کے تین دن بعد تک وہ گم صم لیکن نارمل رہا تھا۔ پھر رات کے اندھیرے میں وہ گاؤں کے قبرستان گیا تھا۔ ماں جی کے پاس' ابا جی کے پاس۔ جھلمل ہنسی ہنسنے والیوں کے پاس۔ چھ قبروں کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں تھا۔ وہ کس کس سے لپٹ کر روتا۔ وہ کس کس سے بچھڑ جانے پر ماتم کرتا۔ لوگوں کی دنیا لٹتی ہے' اس کا تو جہاں ہی لٹ گیا تھا۔

اور پھر وہ پاگل ہو گیا۔ اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو چھ مہینے گزر چکے تھے۔ جلال اسے ایک مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا چکا تھا۔ وہ ہر مہینے اس سے ملنے بھی آتا تھا لیکن وہ اسے بھی نہیں پہچانتا تھا۔ چھ مہینے کے علاج کے بعد اس کی ذہنی حالت میں بہتری آنے لگی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا تھا' اور یہی برا ہو رہا تھا۔ ایک رات اسے سب یاد آ گیا تھا اور اسی رات اس نے پہلی بار گلے میں پھندا ڈالا تھا۔

ماں کی کھلی آنکھوں کی آہ' باپ کا ڈھلکا ہوا سر' بہنوں کی چیخیں اور اُڑتے ہوئے آنچل۔ جلال نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اسے چیخنے سے روک لیا تھا پھر بھی دوسری منزل کی کھڑکی سے اس نے دیکھ لیا تھا۔ دیکھ لیا تھا کہ ابا جی کے خون سے لت پت وجود پر وہ جھک رہا تھا۔ اپنے جوتے سے ان کا منہ مسل رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں اُوپر منڈیر کی طرف اٹھی رہ گئی تھیں۔ انہیں مرتے ہوئے بھی صرف اپنے شیر کی فکر تھی۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر بھی سلامتی کی دعا انہوں نے اسی کے لیے کی ہو گی..... آخری دعا..... ماں نے وہ بھی اس کے نام ہی کر دی ہو گی.....

زندگی دی چار ہی گلاں..... ایک ماں پیاری..... ایک باپ دلارا..... اک مائی جائی' اک ماں جایا.....

چار دن دی زندگی' زندگی دی چار ہی گلاں..... اک ماں پیاری..... اک ماں دلاری..... اک ماں' اک ماں.....

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر..... پناہ کا پہر.....

اپنی ساری ہمت جمع کر کے ہادی اٹھا' اور ٹٹول کر ابراہیم کے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''چوہے کی طرح بل میں گھس کر مردہ ہونے سے بہتر نہیں تھا کہ ہم زہر پھانک لیتے۔'' پہاڑوں سے کود کر' شاہین کی طرح آسمان میں اُڑنے وا چوہے کی طرح مرنے سے ڈر رہا تھا۔ ماں شیر..... باپ کا ببر شیر..... ہواؤں کا شاہین.....

ابراہیم نے سکون سے اس کے ہاتھ اپنے

سے پیچھے ہٹائے۔

''اتنے ہی باہمت تھے تو زندہ رہ کر دکھاتے نا۔ اچھا اب چلے جاؤ۔ باہر نکلو اور زہر پھانک لو' ٹرین کے نیچے آ جاؤ۔ بلڈنگ سے کود جاؤ..... پھندے سے لٹک جاؤ..... جاؤ۔'' ابراہیم عاجز آ کر چلانا بھی جانتا تھا.....

غصے سے ہادی کپکپانے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کھوہ کی دیواروں کو ٹٹول کر باہر نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ تین بار وہ طلال سے ہی ٹکرا کر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ وہ ذہنی مریض تھا' آسانی سے سوئی میں دھاگہ تک نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا ارتکاز منتشر ہو جاتا تھا۔ سامنے پڑی چیز مشکل سے دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ کان سے نکل کر' موت سے بھاگ کر زندگی تک کیسے چلا جاتا۔

وہ کھوہ سے باہر نکل گیا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ دُور سے سنائی دینے لگی۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ کا دس بار چکر لگا چکا ہے۔ اس کی سانس اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

''مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ کوئی ہے..... میری مدد کرو.....'' زمین پر گر کر وہ سسکتے ہوئے چلانے لگا۔

ابراہیم سچے جھوٹے ملاوٹ بھرے انداز سے مسکرا دیا۔ وہ انہیں کان میں اتنی دُور لے آیا تھا کہ اس حصے میں چھوٹا سا دھماکا بھی کر دیا جاتا تو اس دھماکے کی آواز باہر کسی انسان کو سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ پہاڑوں کے اوپر آوازیں گونجتی ہیں لیکن پہاڑوں کی تہوں میں آوازیں دم توڑ دیتی ہیں۔

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔'' بہت وقت بعد ہادی کھوہ تک واپس آنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''کیوں؟ مرنے کا ارادہ بدل دیا ہے؟'' ابراہیم پھر طنز سے ہنس دیا۔

''مجھے یہاں سے نکالو.....'' اس نے اپنے سر کو دیوار پر دے مارا۔ ''خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔'' وہ رونے لگا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لائٹر پھینک دیا ہے۔ اگر میں بھی چاہوں تو یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ میں نے تمہیں اور خود کو پوری طرح سے موت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب پرسکون رہو۔ جو تھوڑی بہت انرجی بچی ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہم میں بولنے کی سکت بھی نہیں رہے گی۔ غنودگی ہی ہم پر موت طاری کر دے گی اور پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم کیا کہتے ہو طلال..... طلال..... طلال؟''

ہادی نیم دیوانہ سا ہو کر طلال کو ٹٹولنے لگا۔ ''کیا وہ مر گیا..... اتنی جلدی..... اتنا خوش نصیب.....؟''

اس کی ناک پر ہاتھ رکھا تو سانس چل رہی تھی۔ ''طلال..... طلال.....؟؟'' اس نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔

''دفعان ہو جاؤ کتوں..... سکون سے مرنے تو دو.....''

''ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے.....'' ہادی چلایا۔ ''ایسے یہاں ہم جلدی نہیں مریں گے۔ بہت سسکنا پڑے گا۔''

ابراہیم نے قہقہہ لگایا۔ ''اب تم ڈر رہے ہو..... ہے نا؟ موت کوئی بٹن نہیں ہے کہ دبایا اور زندگی آف ہو کر موت آن ہو گئی۔''

''بکواس بند کرواپنی۔ سمجھے۔ تمہاری بات مان کر میں نے غلطی کی۔ میں مرنا چاہتا ہوں لیکن یہ اندھیرا..... یہ اندھیرا.....''

اندھیرے کی چادر پر اس کے گھر کی تصویریں بننے لگی تھیں۔ ماں چاول پھٹک رہی تھی۔ چھوٹی سہیلیوں کے ساتھ اسٹاپو کھیل رہی تھی۔ آپا بالوں میں مہندی لگا کر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ ابا شہر سے اس کے لیے پتنگیں اور ڈوریں لائے تھے۔ وہ پتنگوں کا تاؤ' ڈوروں کی تندی' مانجھا چیک کر رہا تھا۔

پھر مانجھا لگی ڈور اس کی گردن پر پھر گئی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری۔ اسے اسی لیے اندھیرے سے خوف آتا تھا۔ اندھیرا بڑا چال باز اور بہروپیا تھا۔ کبھی ماں جی بن جاتا کبھی ابا جی کبھی نومبر کی

دھوپ میں ڈھل جاتا کبھی خون میں..... ہر طرف خون میں.....

ابراہیم کو سانپ سونگھ گیا.....

"مجھے یہاں سے باہر نکال لو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میں کل تک نہیں مروں گا۔ میں دو دن تک اندھیرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس کے یہ وار نہیں سہہ سکتا....."

وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا تھا۔ نمک کی قلمیں اس کے آنسوؤں کی تڑپ پر ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔ زمین کی ساری بلندیاں اُوپر رہ گئی تھیں اور وہ زمین کی تہوں سے لگا تڑپ رہا تھا.....

"مجھے باہر جانا ہے۔"

طلال کی سسکی' ابراہیم کے گہرے سانس کے ساتھ جا ملی تھی۔ پہاڑوں کی تہوں کے سناٹوں نے زندگی کے شور کو اجاگر کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی کھوہ اور غاروں میں لمبے عرصے تک خاموشی رہے تو وہاں پریاں اُترتی ہیں۔ ورنہ جن۔ ورنہ موت کے فرشتے..... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان جگہوں کی تنہائیوں میں حکمت اترتی ہے..... درویشی..... اللہ سے قربت کے امکان..... الہام اور پیغام.....

☆☆☆

لائٹر وہ پھینک چکا تھا۔ ان کے جسموں سے آدھی جان ویسے ہی نکل چکی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے' کان سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تین' چار گھنٹوں میں ہی بالکل ادھ موئے ہو چکے تھے۔ ان میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ انہیں یہ سمجھنے میں بھی وقت نہیں لگا تھا کہ اب وہ اس کان سے مر کر بھی نہیں نکل سکتے۔ انہیں ایسے ہی سسک سسک کر یہیں مرنا ہو گا..... ادھ موئے ہو کر وہ زمین پر گر گئے۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

آواز ان کے قریب سے آئی۔ صحرا میں بھٹک جانے والے سراب کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ نخلستان دکھائی دیتے ہیں۔ پانی' آبشار' پھل اور سبز باغ۔ وہ بھی سراب کا شکار تھے اسی لیے انسانی آواز سن رہے تھے۔

ہادی نے اپنے سر پر ہاتھ کا لمس بھی محسوس کیا۔ "پیاس لگی ہے؟"

روشنی کی کرن اس کی آنکھ کے قریب آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید داڑھی' اور لالٹین کی پیلی روشنی پر اس کی نظر پڑی' جس نے لمحہ بھر کے لیے اسے اندھا کر دیا۔

"یہ لو پانی پیو۔"

وہ بے یقینی سے پانی کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بوتل پکڑ لی۔ اس کے غٹا غٹ پانی پینے کی آواز پر اوندھے منہ گرے طلال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر ابراہیم نے۔ طلال نے بوتل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ لالٹین ان کے پاس رکھ کر وہ اور پانی لینے چلے گئے۔

"یہ کھا لو....." انہوں نے دُودھ اور کھجوریں ان کے سامنے رکھ دیں۔ سہارا دے کر وہ تینوں کو اپنی کھوہ تک سر لے آئے تھے۔

ہادی نے دودھ کے پیالے کو منہ سے لگا لیا۔ طلال' ابراہیم کھجوریں کھانے لگے۔ چھوٹی سی کھوہ تھی۔ ہر طرف پیال بچھی تھی۔ دیوار سے ایک لالٹین لٹک رہی تھی۔ کونے میں جائے نماز بچھی تھی' جس پر بیٹھ کر بابا جی نے قرآن پاک کھول لیا تھا۔

"یہاں کیا کر رہے تھے؟" اپنی منزل ختم کر کے' قرآن کو جزدان میں لپیٹتے ہوئے انہوں نے ہادی اور طلال سے پوچھا۔

"مرنے آئے تھے....." جواب ابراہیم نے دیا۔

"پھر پانی کیوں پیا.....؟" نرمی' شفقت اور اطمینان..... مسکراہٹ میں سب کچھ تھا۔

"ایسے تڑپ تڑپ کر نہیں مرنا چاہتا۔" ہادی کو خود معلوم نہیں تھا کہ پھر پانی کیوں پیا۔ باہر جانے کی تمنا کریں گی۔

"جب تک انسان زندہ رہے' اسے بس زندہ رہنے کے لیے تڑپنا چاہیے۔"

"مجھے باہر جانا ہے۔" ان کا پانی' دودھ' کھجوریں کھا کر' ان کا شکریہ ادا کیے بغیر وہ انہیں حکم دے رہا تھا۔

"چلے جانا..... مجھے کچھ وقت دو، پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔"

اُٹھ کر وہ مٹی کی صراحی سے پانی نکال کر وضو کرنے لگے۔ ہادی نے بے چینی سے پہلو بدل کر انہیں دیکھا۔

رات کا تیسرا پہر..... اللہ سے کلام کا پہر.....

کعبے کی طرف رخ کر کے وہ اذان دے رہے تھے۔ پہاڑوں کی تہوں کے سناٹے اس آواز پر فدا تھے۔ ہر شے' ہر ساعت' مبہوت تھی۔ ہر سانس اس بلاوے کی حیات میں نمو پانے کے لیے بے قرار تھی..... سوائے انسان کے..... سوائے ان تین کے.....

"نماز کے لیے وضو کر لو۔ ایسی جگہوں پر نماز نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ پھر میں تمہیں باہر لے جاؤں گا۔"

وہ تینوں سمجھ چکے تھے کہ انہیں نماز پڑھنی ہی ہو گی ورنہ وہ انہیں باہر کا راستہ نہیں دکھائیں گے۔ سلام کے بعد انہیں یاد آیا کہ کل اس وقت وہ زندگی کو قضا کرنے کے لیے نکلے تھے..... فجر کے وقت..... اور آج اسی وقت وہ نماز فرض ادا کر چکے تھے.....

"باہر جانا ہے تو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔" دعا مانگ کر' آمین کہنے کے بعد انہوں نے مصلیٰ پر بیٹھے بیٹھے ان کی طرف رخ موڑ کر کہا۔

"کہ ہم مرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔" ہادی تلخی سے ہنسا۔

"موت کے خیال کو دل میں رکھو' بلکہ پختہ رکھو..... موت بری شے تو نہیں....."

"تو پھر.....؟" ہادی نے اپنی ناگواری چھپانے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی۔

"تو پھر....." ان کے چہرے کی شفقت معدوم ہونے لگی۔ "تو پھر یہ کہ میں تمہاری مدد کیوں کروں؟ کس لیے.....؟؟"

ہادی گڑبڑا گیا۔ اس نے چور نظروں سے دونوں کو بھی دیکھا۔

"اسے معاف کر دیں۔ ہماری مدد کریں پلیز۔" طلال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میں مدد کر دوں گا..... بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟؟"

تینوں کو سانپ سونگھ گیا۔ "کیا لیں گے آپ؟" ابراہیم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر کونے سے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا لائے۔

"یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے' اگر تم اس تک پہنچا دو تو مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا۔ پھر جو چاہے کرنا۔"

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہادی نے جھجکتے ہوئے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔

"ہم آپ کا یہ کام کر دیں گے..... ان شاء اللہ' یقین دہانی کروانے میں ابراہیم نے پہل کی تھی۔

☆☆☆

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟؟" ہادی کھوہ سے نکل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا تو ذرا سا اندر ہو کر پوچھنے لگا۔

"میں اکثر یہاں عبادت کے لیے آتا ہوں....." وہ لالٹین میں تیل ڈال رہے تھے۔

"یہاں..... اتنی دُور.....؟"

"ہاں..... اتنی دُور..... اللہ کے اتنے قریب....."

ہادی کا دل سکڑ گیا۔ اس کی تہجد گزار ماں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھی۔

"تہجد کی نمازوں کی توفیق بہت خاص لوگوں کو

نصیب ہوتی ہے۔'' ہادی کے قریب آ کر' اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ لالٹین والا ہاتھ اوپر کیا اور خود آگے ہو کر انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ تنگ راہداریوں سے گزرتے رہے۔ پھر نسبتاً کھلے حصے میں آ گئے۔ ایک دم بابا جی نے پلٹ کر لالٹین کی روشنی کا رخ ان تینوں کے چہروں کی طرف موڑ دیا۔ لالٹین ان کے ہاتھ میں جھولنے لگی۔ ان کے چہرے روشنی کے ہالے میں جلنے بجھنے لگے.....

'' تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ یہاں سے باہر جاتے ہی تم کسی بلندی سے کود جاؤ گے اور تم اپنی نبض کاٹ لو گے۔'' وہ ہادی اور طلا ل سے مخاطب تھے۔

ہادی کے پیر زمین نے جکڑ لیے۔ اس کی سانسوں پر گرہیں لگنے لگی تھیں۔ طلال تیزی سے ناخن چبانے لگا۔

''م.....مم.....'' ہادی نے بڑی بے بسی سے بابا جی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پاگل پن پر کڑا وقت آیا تھا۔

'' وعدہ کرو مجھ سے.....'' کہتے کہتے وہ رک گئے اور گہرا سانس لیا۔ ''انسان کی نیت ہی ٹھیک نہ ہو تو وعدے' حلف' عہد بھی دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ہی کیا رہتی ہے بھلا.....''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا کام کرنے کی پوری کوشش کروں گا.....'' ہادی کی زبان اس کی نیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

'' اس امانت کا امانت دار تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ اکیلا یہ سب کر سکوں۔ مجھ پر یہ احسان کر دو..... اللہ تم سے خوش ہو گا۔'' لالٹین زمین پر رکھ کر انہوں نے ان کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے.....

ابراہیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''میں آپ کے اس کام کی تکمیل کا وعدہ کرتا ہوں.....''

''شکریہ تمہارا..... آؤ..... میرے ساتھ.....'' سر ہلا کر وہ مسکرائے۔

چھوٹے سے پل سے گزر کر انہیں روشنی کی لکیر دکھائی دینے لگی تھی۔ کان کی انتظامیہ کی آوازوں کی بھنبھناہٹ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ تینوں نے بیک وقت گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھا اور بابا جی کو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے پایا.....

جیسے کوہ پیما آگے پیچھے بلندی کی طرف سفر کرتے ہیں' ویسے ہی وہ آگے پیچھے سفر کر رہے تھے۔ رات گزر چکی تھی' دن نکل آیا تھا۔

وہ اس کڑے سفر اور لمبی کان سے باہر نکلے تو ہادی نے سب سے پہلے روشنی کو محسوس کیا..... روشنی جو زندگی کی سائنس ہے۔ طلال نے کرکٹ کھیلتے' شور شرابا کرتے بچوں کو..... بچے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ ایک اور نئے جہاں کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف کر دیکھا.....

آسمان جس کی وسعت گواہ ہے کہ انسان پر اللہ کی رحمت بے حساب ہے.....

☆☆☆

چھوٹی بڑی پہاڑیاں کود پھاند کر وہ بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ طلال نے پانی کی بوتل سے سر کو گیلا کیا اور بالوں کو جھٹکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمبے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہادی دونوں ٹانگیں پھیلا کر ایک اونچے پہاڑی ٹیلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ چھلانگ لگا کر ابراہیم بھی اس کے پاس جا پہنچا اور ذرا نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک تینوں خاموشی سے دور تک پھیلے پہاڑی سلسلوں کو دیکھتے رہے۔

زبالنا کے نیچے دونوں انگلیاں پھنسا کر ابراہیم نے پورا زور لگا کر سیٹی ماری۔ اس کی سیٹی کی گونج کی پو کے ساتھ بڑی بھلی لگی۔ نیچے سے ہوٹل کے چھوٹے نے اوپر انہیں دیکھا۔ اور جلدی سے ان کے لیے تین کپ چائے اور تلوں والے نان لے آیا۔

نان توڑ توڑ کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتے' تینوں ٹوٹے پھوٹے بلے کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلتے بچوں کو دیکھتے رہے۔ اسکور کرنے کے لیے' میچ جیتنے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ ہار کوئی بھی ہو' خاطر میں نہیں لانی چاہئے۔ جیت کوئی بھی ہو سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے.....

جس وقت وہ گاڑی میں بیٹھے' اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ نمک سے بنی چیزوں کی ٹوکری کھڑکی کے سامنے لایا اور مسکرا دیا۔

'' بچے سے کچھ لے لو یار!'' ابراہیم نے گردن موڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ پہلی بات تھی جو کان سے نکلنے کے بعد اس نے کی تھی۔

ہادی نے ایسے ہی ہاتھ بڑھا دیا' بچے نے اس کی طرف نمک سے بنا ''شاہین'' بڑھا دیا۔ طلال کی سمت'' سفید پھول'' اور ابراہیم کی طرف اپنی مسکراہٹ اور ایک ''خنجر''۔ تینوں نے اپنی اپنی چیزیں غیر ارادی طور پر اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لیں.....

اور..... موت کا سلسلہ..... زندگی پانے کے لیے شروع ہو گیا.....

☆☆☆

گوجرانوالہ اڈے پر گاڑی روک کر ابراہیم نے چائے کے ہوٹل سے امام دین کے بارے میں پوچھا۔ بابا جی نے کہا تھا کہ اڈے کے ہوٹل سے ہی اتا پتا مل جائے گا۔

''انہیں بھولو کے گھر لے جاؤ۔'' ہوٹل کے مالک نے چھوٹے کو آواز دے کر کہا۔

''بھولو نہیں امام دین سے ملنا ہے.....'' ہادی کی آنکھوں نے چائے پھینٹتے' چائے والے کے ہاتھوں کی ''بلندی'' کا تعاقب کیا۔

''گوجرانوالہ میں کسی بھی بندے کا پتا کرنا ہو' بھولو کی حویلی سے ہی نشان ملتا ہے۔ چڑی کے بوٹ اور پہلوان کے لنگوٹ کا بھی۔''

ابراہیم کی ہنسی نکل گئی۔ چھوٹا فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بازار میں رش بہت تھا' اور وہ ہارن دے دے کر تھک چکا تھا۔ نہ ہی بھیڑ ہارن پر راستہ دے رہی تھی' نہ کھڑکی سے نکلے اس کے ہاتھ کے اشاروں پر۔ (منت سماجت) آدھے گھنٹے سے گاڑی بازار میں پھنسی ہوئی تھی۔

''یار! کوئی اور راستہ نہیں تھا وہاں جانے کے لیے.....'' ابراہیم نے مستقل ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایک ماں جی نے ونڈ شیلڈ کی طرف ہاتھ سے لعنت کے اشارے اور دو چار' دس بارہ گالیاں ارسال کیں تو اس نے ہڑبڑا کر ہارن سے ہاتھ ہٹا لیا۔

لڑکا اپنا سر کھجانے لگا۔ ''تھا تو..... پر میں نے سوچا آپ ذرا بازار کی سیر بھی کر لیں گے..... نئے ہیں نا اس شہر میں۔''

ہادی نے پیچھے سے بچے کے ریچھ جیسے بالوں کے گچھے میں ہاتھ پھنسا کر کھینچا۔ ''ہمیں سیر کروانی تھی یا خود کرنی تھی..... ویسے گھر والے تمہیں کیا کہتے ہیں..... بندر یا باندر؟؟''

'' جی باندر..... پر آپ کو کیسے پتا چلا جی.....؟؟''

''تمہاری اس کھجلی سے..... جو پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہے اور دونوں ہاتھوں سے کھجانے پر بھی ختم نہیں ہو رہی۔''

وہ کھی کھی ہنسنے لگا۔ ''بس جی کیا کریں' شکر ہے اللہ کا..... وہ جس حال میں رکھے.....''

''پانی گرم کر کے رگڑ رگڑ کر نہانے کے بعد کے حال میں آ کر دیکھو..... ساری مخلوق تمہیں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرے گی۔''

''یا اللہ تیرا شکر'' ابراہیم نے بروقت بریک پر پاؤں کا دباؤ ڈالا تھا۔ ورنہ سموسے والے کی گرم تیل کی کڑاہی اور آلو چنے والے کی ریڑھی مل ملا کر الٹ جاتیں۔ تو پورے بازار میں کہرام برپا ہو جاتا..... ساری نانیاں' دادیاں اسے کوستیں۔

''بڑی اچھی سیر ہو گئی ہماری بازار کی..... شکریہ

آپ کا باندر جی!'' اس نے اسٹیئرنگ پر سر کو گرالیا اور ترچھی نظر سے چھوٹے کو گھورا۔

''بس جی وہ رہی سامنے حویلی.....'' اس نے کمر اور پیٹ کو ایک ساتھ کھجاتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہیں بس سامنے نظر آرہی تھی ہے آنکھوں میں دوربین فٹ ہے؟؟'' طلال نے دور' بہت دور حویلی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر دیکھا۔

''گاڑی سے نکلیں جی..... اُڑ کر پہنچ جائیں گے..... آپ نکلیں تو سہی.....''

''کیوں گاڑی سے نکلتے ہی ہم راکٹ بن جائیں گے.....؟؟'' ہادی نے اس کے بالوں کے گچھے میں ہاتھ ڈالا تھا نا۔ اب وہ ہاتھ آرام سے نہیں بیٹھ رہا تھا..... بازو کھجا رہا تھا.....

تینوں راکٹ کلاں سے نکلے تو چھوٹا تیزی سے پیچھے کی طرف لپکا.....

''آگے آپ خود ہی چلے جائیں۔ میری ٹانگوں میں ویسے ہی جان نہیں ہے۔ پچھلی پچاس ڈنڈ بیٹھکیں ابھی رہتی ہیں۔ جرمانے کی ساٹھ الگ سے۔ موٹو گنتی میں بے ایمانی بھی بڑی کرتا ہے۔ نا بابا نا..... تسی جاؤ جی.....'' بندر کی طرح چھلانگیں مارتا باندر بازار کے ہجوم میں غائب ہوگیا۔

لال اینٹوں کی حویلی کا بڑا سیاہ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ پھاٹک پر ایسے آنا جانا لگا ہوا تھا جیسے اندر رس گلے اور جلیبیاں مفت تقسیم کی جا رہی ہوں۔ لسی' فالودہ' اور ساتھ دس دس کے نوٹ بھی..... پھاٹک کی دو سیڑھیاں چڑھ کر ہادی نے سر اندر کی طرف ترچھا کر کے جھانک کر دیکھا۔ اسے ہلکا سا ایک جھٹکا لگا۔ اس کی پشت سے سر اونچا کر کے ابراہیم نے جھانکا۔ پھر طلال نے جو بڑی بے نیازی سے پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ دیئے ہوئے تھا۔

اندر بڑا سا..... بہت ہی بڑا سا اکھاڑا تھا اور وہاں دنگل ہو رہا تھا..... مٹی کے میدان میں گوشت کے پہلوان ایک دوسرے کو پٹخ پٹخ کر زمین پر دے دے کر مار رہے تھے۔ آس پاس کچھ بچے' بڑے بوڑھے' کھڑے' بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہنسی ٹھٹھول' مذاق' مذاق رات' سب چل رہا تھا۔ ایک طرف ہر عمر' ہر ساخت' ہر رنگ کے بچے بچیاں ترتیب سے آگے پیچھے کھڑے ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہے تھے اور ایک چھوٹا پہلوان نما بچہ ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے گنتی گن رہا تھا.....

''تاڈے اٹھائیں۔ ساڈے اٹھائیں..... کچا اٹھائیں..... پکا اٹھائیں..... پونا اٹھائیں..... ہون ہویا پورا اٹھائیں۔''

تاڈا پہلوان' ساڈا پہلوان' کچا' پکا' پونا' پورا پہلوان..... انہوں نے زندگی میں بھائی جان تو بہت دیکھے تھے لیکن ''پہلوان'' پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ وہاں ادھر ادھر' دائیں بائیں' اوپر نیچے' اتنے پہلوان تھے..... اتنے کہ..... کہ ان تینوں کو ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ

''انسان لینڈ'' سے نکل کر ''پہلوان لینڈ'' میں آچکے ہیں۔ دنیا میں اب کہیں کوئی انسان باقی نہیں بچا ہوگا..... نہ چاند پر..... نہ مریخ' مشتری' پلوٹو وغیرہ پر۔

''وہ بھولو کہاں ہے؟'' قریب سے گزرتے ایک آدمی سے ہادی نے پوچھا۔ تینوں پھاٹک سے اندر آچکے تھے۔

آدمی رکا اور کھینچ کر ایک تھپڑ ہادی کے گال پر لگایا۔

''تیرے ساتھ کھیلتا رہا ہے بھولو..... تیرا ''بھالو'' ہے بھولو..... اپنے باپ کی عمر کے لوگوں کو ایسے بلاتا ہے تو۔''

اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کی باپ کی عمر کے ہیں.....

تھپڑ اتنا زور دار تھا' کچھ آدمی کی آواز ایسی دبنگ تھی کہ اکھاڑے کے سارے پہلوان اپنا اپنا کام (مار کٹائی) چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دیواروں پر بیٹھے سارے کوے ایک دم سے اُڑ گئے۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے بچے رک گئے' ان کے

دانت خواہ مخواہ نکل آئے۔ ساڑے' تاڈے' کچے' پکے کرتے پہلوان' بے ایمان بچے کی گردن پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

پہلوانوں کی بھیڑ میں سے ایک گرج دار آواز گونجی۔ ''کون ہیں یہ؟؟؟''

''پتا نہیں پہلوان جی کون ہیں..... کہتے ہیں ''بھولو'' کہاں ہے؟ دیکھو ذرا.....''

دیکھو ذرا..... حیرت سے ان تینوں کی آنکھیں ساکت ہوگئیں۔ طلال جو دیوار کے سہارے ایک پاؤں ٹکا کر کھڑا تھا' لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ کھڑے کھڑے بھاپ چھوڑنے کیسے جھوٹ گھڑ لیا تھا۔

''بھالو..... بھاء کو بھالو کہا.....'' یہاں وہاں' ادھر ادھر آگے پیچھے' دائیں بائیں' ہر طرف ''بھالو بھالو'' ہوگیا۔

''لاؤ اوئے ذرا انہیں اِدھر..... کھوتے اوتوں کھلوتے.....''

جو تھوڑا بہت شور شرابا تھا وہ بھی اس آواز کے بلند ہوتے ہی کنویں کی تہہ ہوگیا۔ کھلوتے کھوتے ذرا سا سہم گئے۔ ادھر آؤ کے بجائے بھولو نے کہا تھا۔ ''لاؤ انہیں اِدھر''۔ ابراہیم معذرت کرنا ہی چاہتا تھا کہ کوئی تین چار' دس بارہ ہاتھ' ادھر اُدھر سے آئے اور جیسے ہینگر میں کپڑے ہینگ ہوتے ہیں' ویسے انہیں اپنے بازوؤں میں ہینگ کر کے بھولو کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''کیا کہا ہے مجھے۔۔۔؟'' لکڑی کی کرسی پر کمر سیدھی رکھ کر بیٹھے ''بھولو'' نے سینے پر ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

''مجھے پتا نہیں تھا آپ پہلوان ہیں.....'' سب سے آگے ابراہیم ہی کھڑا ہوا تھا۔ سانس بھی اس کا ہی خشک ہو رہا تھا۔

''جو پہلوان نہیں ہوگا اس کی عزت نہیں کرو گے؟'' وہ ابراہیم کی پشت کا سہارا لینے والے ہادی سے پوچھ رہے تھے۔

''سوری! پتا نہیں تھا کہ آپ عمر میں بڑے ہیں.....'' ہادی نے سر۔۔۔ کھجایا پھر کان۔۔۔ اور پھر ٹھوڑی کو..... باندر اپنی بیماری' پوری ایمان داری سے اسے دان کر گیا تھا..... وہ بھی مفتا مفتی.....

''جو عمر میں چھوٹا ہوگا اسے بے عزت کرو گے؟؟''

ہادی کا سر چکرا گیا۔ ''وہ دراصل ہمیں امام دین سے ملنا ہے.....'' طلال نے اپنی طرف سے بات کو سنبھالنا چاہا.....

''امام دین تیرا یار ہے؟؟؟ چاچا ساتھ لگاتے موت پڑتی ہے۔'' بات سنبھل گئی..... کھری کھری سننے کے لیے مل گئیں۔

''ہمیں چاچا امام دین سے ملنا تھا۔''

تینوں ہی گھبرا' گھگھیا' ہکلا گئے۔ سارا ہجوم ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھولو پہلوان کی بات پر سارا مجمع بیک وقت سر کو ''ہاں'' میں ہلاتا تھا۔ ان کے جواب پر' سر گھما کر انہیں گھورتا تھا..... یہ تو کھلا تضاد ہوا.....

''چاچے سے بھی مل لینا' پہلے اپنے مامے سے ملو..... بھالو مامے سے.....'' بھالو مامے نے اپنی بانہیں ان کی طرف پھیلا دیں۔ پیچھے سے کسی پہلوان نے ایویں کہنی سے ٹھونگا مارا اور وہ باری باری کرسی پر بیٹھے ''بھالو مامے'' کے سینے سے جا لگے.....

زندگی میں کچھ واقعات پہلی بار ہوتے ہیں اور بڑے اندوہناک ہوتے ہیں..... آسمانی بجلی کا گرنا' سونامی طوفان کا آنا' پہاڑ کی چوٹی سے گر جانا..... اور پھر پہلوان کے سینے سے جا لگنا.....

ایک ہوتا ہے چولیں ہل جانا اور ایک ہوتا ہے' جو کچھ تھا سب کا ہل ہلا جانا۔ ان کے ساتھ یہ دونوں واقعات وحادثات ہوئے تھے۔

☆☆☆

تینوں بیٹھ گئے بلکہ بٹھا دیئے گئے۔ ہادی بھا بھولو کے کے دائیں' طلال بائیں اور ابراہیم ذرا سا دُور ہٹ (بچ) کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گلے لگنے کی صورت ہڈیوں کا کچومر بنوالیا تھا' اب وہ ان پر کالا نمک نہیں چھڑکوانا چاہتا تھا۔ احتیاط مار سے بہتر ہوتی

ہے۔

''کشتیاں دیکھی ہیں کبھی؟'' بھا بھولو نے ہادی اور طلال کے شانے پر اپنا ایک ایک ہاتھ (ہتھوڑا) رکھتے (مارتے) ہوئے پوچھا۔ ہاتھ پہلوان کا' اور سوال جان کا۔ دونوں نے آہ دبا کر' ناں میں گردن ہلا دی۔

''اب دیکھو..... چلو میرے پہلوان بچوں شروع ہو جاؤ۔''

پہلوان بچوں نے رکا ہوا دنگل پھر سے شروع کر دیا۔ کوئی تیس' چالیس کے قریب پہلوان کھڑے تھے' جو ایک ایک کر کے کشتی لڑنے لگے۔ ان کے لیے اندر سے لسی کے گلاس (بالٹیاں) آنے لگے۔ پھر پیڑے' پھر دودھ جلیبی..... پھر..... پھر.....

وہ ایک عرصے سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ ان کے جسم نارمل نہیں رہے تھے۔ وہ تھوڑا بہت' یا زیادہ کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے معدے ناتواں ہو چکے تھے۔ ہادی کھاتا جا رہا تھا' اور ابکائیاں کرتا جا رہا تھا۔ بھا پھر بھی باز نہیں آ رہا تھا۔ انہیں زبردستی کھلاتا جا رہا تھا۔ ناکسی ختم ہونے میں آ رہی تھی نا کشتی۔

''رستم زماں غلام محمد گاما پہلوان کو جانتے ہو نا..... یہ نہ کہنا کہ نہیں جانتے' ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔''

برا ہوا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے..... انہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی' اپنے علاوہ کسی اور کی خبر رکھنے کی۔

''تم نئے زمانے کے لوگ' اپنے ہیروؤں کے بارے میں جان کر کرو گے ہی کیا۔ بروس لی کو تو جانتے ہی ہو گے' جس کے نام کا ڈنکا آج بھی چار عالم میں بجتا ہے۔ وہ بروس لی ہمارے رستم زماں گاماں پہلوان کا بہت بڑا مداح تھا۔ اپنا استاد مانتا تھا رستم زماں کو۔ ان جیسی ورزشیں کرتا تھا۔ بہت کچھ سیکھا تھا اس نے ان سے۔ اب کچھ قدر ہوئی تمہاری نظر میں بھا گاماں کی؟''

تینوں شرمندگی سے نظریں چرانے لگے۔

''بائیس سال کی عمر میں رستم زماں بھا گاماں نے بارہ سو کلو وزنی پتھر اٹھا کر' سینے تک لا کر' چند قدم چل کر ساری دنیا کو حیرت سے بت بنا دیا تھا۔ یہ پتھر آج بھی انڈیا کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ بارہ سو کلو جانتے ہو کتنا ہوتا ہے؟''

طلال نے سر ہلا دیا..... ''تیس' بتیس آدمی مل کر اٹھائیں تو شاید اٹھایا جائے..... ورنہ کوئی کرین وغیرہ.....''

بھا نے سر ہلایا اور سارے مجمع کی طرف دیکھا۔

''انسان کے جسم میں اتنی طاقت ہے تو روح میں کتنی ہو گی؟ کیونکہ روح جسم سے افضل ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا غم اور تکلیف سہہ جاتی ہے۔ تو بس روح کو افضل رکھو..... روح کی طاقت ہی اصل طاقت ہوتی ہے۔ حقیقی پہلوان' پہلوانی داؤ' درویشی صفت سے جیتتا ہے۔ جس کی روح افضل ہے' اسے کوئی نہیں ہرا سکتا۔ سمجھ گئے سب؟''

سب نے بیک وقت ''سمجھ گئے جی.....'' کا نعرہ بلند کیا۔

لمبے برآمدے سے گزر کر وہ حویلی کے سرخ اینٹوں والے کھلے احاطے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تخت پر نیم دراز ہو کر بھا نے اپنے دونوں بازو ہادی اور طلال کی طرف بڑھا دیئے۔

''اکڑ گئے ہیں..... ذرا دم لگا کر دبانا.....''

''وہ جی امام دین' میرا مطلب چاچا امام دین.....'' ہادی نے ابرو اچکا کر ابراہیم کی طرف سوالیہ دیکھا تو ابراہیم نے سوال کر دیا۔

''آ جاتے ہیں وہ بھی۔ ہمارے ہی مہمان ہیں چاچے ہوری۔ اوئے کاکے ہادی! انسان بن' ذرا جان لگا یار!''

''ٹھیک ہے پھر آپ ان کی یہ امانت انہیں دے دیں۔ ہم چلتے ہیں۔'' ابراہیم نے چمڑے کا تھیلا بھا کی طرف بڑھا دیا۔

''میں تمہارا میزبان ہوں' تمہارا کمی کمین نہیں۔ خود دینا امام دین کو۔''

''کب تک آ جائیں گے وہ.....؟؟''

''آ جائے گا..... آ جائے گا..... مجھے ذرا اونگھ آ رہی ہے..... سو جاؤں تو مغرب کے وقت اٹھا دینا.....''

ہادی نے جھٹکے سے بھا کے بازو کو چھوڑا۔

''ٹھیک ہے پھر ابھی ہم چلتے ہیں.....''

بھا بھولو نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ''تم شراب پیتے ہو؟ یہ آنکھوں میں لال ڈورے کیسے ہیں؟''

''آپ کو اس سے کیا مطلب؟'' اب وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بدلحاظ اور بے ادب۔

''پتر جی! اپنے خون کی گرمی' یہاں سرد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے؟ میری ساری حویلی بھاں بھاں کرے نا تو بھی آٹھ دس پہلوان یہاں وہاں سے ایویں ہی نکل آتے ہیں۔ ایسے پٹخ پٹخ کر ماریں گے کہ.....''

''اچھا ہے ماریں' جان سے ہی مار دیں۔ بلائیں اپنے پہلوانوں کو۔ بڑی مہربانی ہو گی آپ کی۔'' ہادی کا دو بدو جواب دینا اور انگارہ لہجہ بھا کو بہت برا لگا۔

''یہ مہربانی میں تم پر ضرور کروں گا۔ او جیرے' اوئے مکھن! ادھر آؤ ذرا۔ لے جاؤ اس کاکے کو اور اسے مہربان ہو کر دکھاؤ۔''

جیرا' مکھن' ملائی' لسی' دودھ' انڈا' پراٹھا سب نکل آئے۔ اسے اٹھا کر لے گئے اور اکھاڑے میں پٹخ کر پھینکا۔ ابراہیم نے لاکھ معافی تلافی کی لیکن بھا نے آواز لگا دی.....

''رگڑ کر رکھ دو اسے..... سارے کس بل نکال دو' کوئی پیچ ڈھیلا نہ رہے.....''

ڈھیلے پیچ کسنے کے لیے پیچ کسوں نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا کر دیا اور گول گول گھمانے لگے۔ ابراہیم نے سہم کر بھا کی طرف دیکھا۔ پر بھا آنکھیں موند چکے تھے۔ طلال شرافت سے بھا کے بازو دبانے میں مصروف ہو گیا۔ دوسرا بازو اب ابراہیم کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ دبانے لگا اور دور سامنے اکھاڑے کو نظریں چرا چرا کر دیکھنے لگا۔ اتنے پہلوان اور اکیلا ہادی..... جیسے نہر کنارے کپڑے دھونے والیاں' کپڑوں کو دے دے کر مارتی ہیں۔ پھر تھاپے سے کوٹتی ہیں۔ وہی سلوک پہلوان ہادی کے ساتھ کر رہے تھے۔ تھاپے کا کام وہ ہاتھوں اور ٹانگوں سے لے رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے ''کشتیاں'' دیکھی تھیں۔ اب وہ ''دھینگا مشتیاں'' دیکھ رہے تھے۔

جب انہیں یقین ہو گیا کہ کپڑا دھل کر صاف ہو گیا ہے۔ ساری میل کچیل نکل گئی ہے۔ کپڑا نچڑ بھی گیا ہے تو وہ اکھاڑے سے سر ادھر بھا کی طرف کر کے پوچھنے لگے..... ''بس بھا جی؟''

کیسے ظالم انسان تھے۔ ساڈے' تاڈے' کچے' پکے' آدھے' پونے' پورے کس بل نکال کر بھی پوچھ رہے تھے ''بس؟''

بس ہی ہو گئی تھی۔ ابراہیم ہادی کی طرف آنے لگا تو آنکھیں موندے پڑے بھا نے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سیانوں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے۔ پڑا رہنے دو اسے مٹی میں.....''

وہ مٹی میں پڑا رہا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو مٹی کے گھوگھو گھوڑے بناتے بناتے ان ہی کے ساتھ سو جایا کرتا تھا۔ آنکھ کھلتی تو اوپر درخت کی چھاؤں ہوتی اور نیچے سر ماں کی گود میں.....

''پتر چارپائی پر سویا کر.....''

''گھوگھو گھوڑے کہتے ہیں کہ انہیں چارپائی پر نیند نہیں آتی.....'' وہ کچی پکی نیند میں آنکھیں جھپک جھپک کر ماں کو دیکھتا۔ ہاتھ بڑھا کر ماں کے گال کی چٹکی بھرتا..... ''سوہنی ماں.....''

''شیر پتر..... سو جا شاباش..... سو جا.....'' وہ پیشانی چومتی' سر تھپکتی' لوری گاتی۔

نہ لوری تھی' نہ تھپکی' نہ ماں اور نہ اس کا دلار۔ آنسو اس کی آنکھ سے نکلے اور وہ غنودگی سے گہری نیند میں

چلا گیا۔ وہ تو سو گیا لیکن آنسو نہیں سوئے۔ وہ اس کے گالوں پر بہتے رہے..... بہتے رہے.....

مائے نی میں کنوں اکھاں..... درد وچھوڑے دا حال.....

درد وچھوڑے دا حال..... تیرے بعد اس جندڑا حال.....

☆☆☆

نیند کا تعلق جسم سے ہے' اور لاعلمی کا روح سے.....

جو سوتے رہ جاتے ہیں' وہ کھوتے نہیں' ''کھو' جاتے ہیں۔ (گم ہو جاتے ہیں)

ان دونوں کی چارپائیاں بھاء کے دائیں بائیں تھیں۔ یہاں وہاں ہر طرف پہلوان ہی پہلوان سو رہے تھے۔ طلال کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ اپنی دوا لے کر نہیں آیا تھا۔ جب وہ نکلے ہی مرنے کے لیے تھے تو دوا ساتھ کیوں رکھتے۔ اب اس کے دماغ کا بیمار حصہ پھر سے جاگ رہا تھا اور ڈیپریشن اس پر حملہ کر رہا تھا۔

''سو جا پتر! سو جا.....'' اس کے سینے پر ہاتھ آیا اور بھاء تھپکیاں دینے لگے۔

''میں ذرا باہر سے تازہ ہوا کھا کر آیا.....'' وہ بے چینی سے اٹھ کر جانے لگا۔

''تجھے تازہ ہوا کی نہیں تازہ ایمان کی ضرورت ہے۔ اللہ سے شکوے شکایتیں کرو تو بھی ٹھیک ہے' کوئی تعلق تو بنا رہتا ہے۔ پر ایسے تعلق توڑ دینا ٹھیک نہیں ہوتا جی! اللہ کی ذات پر یقین رکھنا سیکھو۔ جان کو ایک تکلیف ملتی ہے تو سو سکھ بھی تو ملتے ہیں۔''

طلال ان باتوں کو سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اٹھنے کی کوشش کی تو بھاء نے اس کے سینے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

''جیرے اُٹھ ذرا!''

بھاء نے ہلکی سی آواز دی تھی' جو یقیناً جیرے نے خواب میں سنی ہوگی۔ اور فوراً حاضر جناب ہو کر بھاء کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بھاء نے ہاتھ کا اشارہ طلال کی طرف کیا..... بس..... ابراہیم نے کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھا۔ اشارے پر ہی جیرا کود کر طلال کے سرہانے بیٹھ گیا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اسے چارپائی پر الٹ کر رکھ دیا.....

''یہ..... یہ کیا.....'' طلال کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

جیرا شاید اب بہرا ہو چکا تھا۔ کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس کی کمر' اور ریڑھ کی ہڈی پر چھوٹے چھوٹے مکے (بم) مار رہا تھا۔ اس کے مکوں کی رفتار اور ترتیب میں اتنا توازن تھا کہ طلال کچھ بولتا تو اس کی آواز مکوں کی بم باری میں دب جاتی۔ اس نے ریڑھ کی ہڈی سے لے کر سر تک اسے اچھا خاصا رگڑ کر رکھ دیا تھا۔

''سیانے کہتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی میں نقص پڑ جائے تو سارے جسم میں نقص پڑ جاتا ہے۔ جس نے ریڑھ کے مہروں کو ٹھیک رکھا' اس نے سب ٹھیک رکھا۔ اب جا کے سو جا چیرے.....'' بند آنکھوں سے بھاء نے کہا۔ پھر جھک کر طلال کے منہ پر تین پھونکیں ماریں

''میں نے نیند کا دم بھی کر دیا ہے..... تسی وی سو جاؤ ہن.....''

''نیند کا دم..... ہونہہ.....'' وہ بڑبڑایا۔

اسے آسمان کے ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہاسپٹل کا اسٹاف اسے نیند کے لیے بہت ہیوی میڈیسن دیا کرتا تھا پھر بھی اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک بار وہ مسلسل چھ دنوں تک جاگتا رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا بورڈ ہنگامی میٹنگ کے لیے بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ اب بھی نہیں سویا تو مر جائے گا..... اور یہ پہلوانی داؤ..... یہ نیند کا دم..... یہ.....

آسمان کے ستارے گڈمڈ ہونے لگے تھے..... آنکھ مچولی کھیلتے' کودتے پھاندتے' دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب دُور نکل گئے تھے.....

☆☆☆

پتا نہیں کیا ہوا' تینوں ایک دم سے زمین پر آ کر گرے۔ کتنی ہی دیر تک وہ ناسمجھی سے سر اٹھا کر اپنے

سر پر کھڑے جنوں کو دیکھتے رہے.....

''ہم کہاں ہیں..... تم کون ہو.....؟؟'' انہیں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

''تم اکھاڑے میں ہو..... اور ہم پہلوان ہیں.....''

''آہ.....'' انہیں سب یاد آ گیا تھا۔

وہ مہمان تھے تو وہ ان سے نرمی سے پیش آتے رہے تھے۔ انہیں آوازیں دینے' ہلانے جلانے کے بعد وہ ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ چارپائیوں کو پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا اور انہیں زمین پر الٹ دیا تھا..... پکی اینٹوں کے فرش کی زمین پر.....

رات کے کسی پہر ہادی کو بھی کسی پہلوان نے آٹے کی بوری کی طرح کندھے پر لاد کر چارپائی پر پٹخ دیا تھا۔ اب وہ تینوں چوٹ لگے بچوں کی طرح زمین پر پڑ ہیر تھے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے.....؟؟'' ابراہیم نے غصہ دکھانے کی کمزوری کوشش کی۔

''تمیز سے منہ ہاتھ دھو کر اکھاڑے میں آ جاؤ.....''

''اپنے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو؟ آدھی رات کو چارپائیاں الٹ دیتے ہو.....؟؟''

''آدھی رات نہیں تہجد کا وقت ہونے والا ہے..... اُٹھ کر اپنے کام نپٹاؤ.....''

ہادی نے بے یقینی سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ''کام..... کون سے کام..... ہمارے یہاں کون سے کام ہیں بھلا؟؟''

''ڈنڈ بیٹھک..... ڈنٹر پیل..... دوڑ اور کسرت کے کام..... لیکن اس سے پہلے' اکھاڑے کی مٹی کھودنے کا کام.....''

ان تینوں کو ایک ایک بیلچہ دے دیا گیا اور اکھاڑے کی چکنی مٹی کھودنے پر لگا دیا گیا۔ پہلوانوں کی کشتیوں کی وجہ سے چکنی مٹی جم جایا کرتی تھی' روز اس وقت اسے کھودنا پڑتا تھا۔ ان تینوں کو اندازہ نہیں تھا کہ پہلوان کا مہمان بن کر انہیں ایسی ایسی قیمتیں (ذلتیں) چکانی پڑیں گی۔

پانچ منٹ بعد ہانپ کر ہادی نے بیلچہ نیچے دے مارا۔ ''لیکن ہم یہ کیوں کریں.....؟؟''

''بھاء کہتے ہیں جو بس سوال ہی کرتا رہ جاتا ہے' وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جو سر جھکا کر مان لیتا ہے' وہ پار ہو جاتا ہے.....'' ان کی نگرانی کرنے والے پہلوان نے ہادی کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جھک کر اسے بیلچہ اٹھا کر دیا۔

''ایک تو ان سب کو باتیں بڑی بنانی آتی ہیں۔'' ہادی نے ایک گہرا سانس لیا۔

دیکھنے میں جو کام جتنا آسان نظر آتا ہے' کرنے میں وہ اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ چکنی مٹی' ان کی جان پر چکنے پہاڑ کی طرح وزنی ثابت ہو رہی تھی۔ نہ وہ اپنی جگہ سے کھسک رہی تھی' نا یہ اسے کھسکا پا رہے تھے۔ تینوں بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ سامنے سارے پہلوان تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے.....

''حقیقی پہلوان' تہجد سے پہلے اٹھتا ہے اور تہجد کی نماز پڑھتا ہے۔ حقیقی پہلوان کو اسی وقت اصل طاقت نصیب ہوتی ہے' جب وہ حقیقی طاقت ور کو پہچان لیتا ہے۔ جب وہ اپنا سارا تن اور پورا من خدا کے حضور جھکا دیتا ہے۔'' دعا کے بعد بھاء نے بلند آواز سے کہا۔

تہجد کا وقت..... رات کا سب سے محبوب پہر.....

اس پہر سے پہلوان کبھی غافل نہیں رہتا..... رہ جائے تو وہ پہلوان نہیں رہتا.....

☆☆☆

تہجد کے بعد وہ اکھاڑے میں اتر آئے اور ڈنڈ بیٹھکیں' ڈنٹر پیلیں ہونے لگیں۔ وہ کیسے بچ رہ سکتے تھے۔ ہادی کو یاد آیا کہ اسے مرض کھجلی دان کرنے والا چھوٹا ڈنڈ بیٹھکوں سے بدک کر بھاگ گیا تھا۔ کوئی مذاق تھا ڈنڈ بیٹھکیں لگانا۔ بیس ڈنڈ بیٹھکوں کے بعد

وہ بھی بدک گیا۔

"اور نہیں لگانی مجھے..... چھوڑ دین بس مجھے..... میرا باپ بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے....." وہ ضدی اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"باپ ایک ہی ہوتا ہے..... کوئی اور بننے کی کوشش کرے تو اس کا منہ توڑ دینا چاہیے۔"

ان سب کی نگرانی کرتے بھاء نے ڈبنگ کہا اور اشارہ کیا۔ دو پہلوان آگے بڑھے' دائیں بائیں شانوں سے پکڑا' ایک پشت پر کھڑا ہو گیا۔ تینوں مل ملا کر اس کی ڈنڈ بیٹھکیں لگوانے لگے.....

"ایک..... سوا ایک..... آدھا ایک..... پونا ایک..... چاچا ایک..... ماما ایک..... لو ہو گیا پورا ایک....."

حویلی کے جھروکوں سے نسوانی قہقہے سنائی دیے۔ یہ تو شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ خجل ہو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد وہ سب دوڑ لگانے' کسرت کرنے لگے۔ ابراہیم موقع شناس تھا۔ کچھ عقل طلال کی بھی کام کر رہی تھی۔ دونوں کو اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا حکم مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اتنی ساری فوج کی موجودگی میں وہ حویلی سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن ہادی کی عقل نے ابھی ٹھیک سے کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ڈنٹر پیل وغیرہ سے ہی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دوڑ کے لیے اکڑ کر کھڑا رہا.....

کھڑا رہا..... کھڑا رہا..... کہ ایک پہلوان آیا' اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اکٹھا جوڑ کر کلائیوں میں کلک کی آواز کے ساتھ ہتھکڑی جیسا بینڈ فٹ کیا۔ نا سمجھی سے اس نے پہلوان کو دیکھا ہی تھا کہ اس بینڈ کے ساتھ آ کر ایک زنجیر منسلک ہو گئی۔ زنجیر جس کا آخری سرا پٹہ کی صورت کتے کے گلے میں فٹ تھا..... کتوں میں کتا' "خوں خوار کتا"..... پہلوان نے سیٹی ماری اور کتا..... کتا صرف کتا نہ رہا' ہوائی مخلوق بن گیا۔ یہ جا وہ جا..... پہلے جھٹکے میں ہادی منہ کے بل گرا۔ ناک منہ سے خون نکلا لیکن کتا نہیں رکا۔ ویسے بھی کتوں کا خون سے کیا لینا دینا۔ وہ کرین مشین کی طرح اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا رہا..... وہ گھسٹتا رہا..... دوسرے چکر میں وہ گرتے پڑتے دوڑنے لگا۔ کتا اسے سانس لینے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ اب یہ اس کی مرضی تھی کہ وہ زمین پر رگڑ کھا کر' گر کر' گھسٹ کر بھاگنا چاہتا تھا یا کھڑا ہو کر دوڑ کر..... اس نے دوڑ کر ذلیل ہونا مناسب سمجھا۔ تیسرے چکر میں اس کا سینہ پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔ چوتھے چکر میں' ساری دنیا' چرند پرند' گھومتے گھومتے رک گئے' صرف وہ اکیلا گھومتا رہا..... پانچویں چکر میں اس کا اور کتے کا تیل میل بیٹھ گیا۔ اسے دوڑنے میں مزا آنے لگا۔ چرند پرند' زمین آسمان' سب اپنی اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ چھٹے چکر میں وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا..... اپنے کھیتوں کے اطراف بھاگنے لگا..... ابا کی آواز سننے لگا.....

"شاوا میرے شیر! شاوا..... اک چکر ہور..... اک چکر ہو..... بس اک ہور....."

ساتویں چکر میں اسے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر کودتی پھاندتی آپا' زینب اور سحر اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

"ہاں جی ڈڈو صاب! کیسی چل رہی ہے فوجی ٹریننگ۔ ہی ہی ہی! چلو چلو بھاگو شاباش..... ایویں کہیں گر گرا نہ جانا۔ گاؤں کی لڑکیاں چھپ کر تمہیں دیکھ رہی ہیں' ہماری ناک نہ کٹوا دینا....."

گاؤں کی کون کون سی لڑکی اسے چھپ کر دیکھ رہی ہے' یہ دیکھنے کے لیے وہ رکا اور توازن بگڑنے پر گر گیا۔

"ہی ہی ہی! شوخاتے نکما شیر! تھوڑا لوفر تے لفنگا وی..... گاؤں کی لڑکیاں اتنی فارغ نہیں ہیں جو تمہیں دیکھنے کے لیے مری جائیں....."

"ہائے ماں..... تیرا لال مر گیا ماں....."

ماں کا لال زمین پر گر کر ہانپنے لگا تھا۔ کتوں میں

کتا خوں خوار کتا اب اسے ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔

"ناشتہ تیار ہے جی..... آ جاؤ سب....."

پہلوان بچے نے پہلوانوں کو دیکھ کر اعلان کیا اور گرے ہوئے ہادی کو دیکھ کر "چچ' چچ"۔

ناشتے کے لیے ہادی اور طلال کو بھاء بھولو نے خاص طور پر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ ابراہیم ڈٹ کر کھا رہا تھا۔ وہ باکسر رہا تھا' اسے تو جنوں بھوتوں والی بھوک لگا کرتی تھی۔ پانچ انگلیوں کا مکا بنا کر سامنے والے کو "مکا" ہی دینا آسان نہیں ہوتا۔ بکرے' دنبے' پایوں کا سالن تھا۔ لسی' دیسی گھی کے انڈے پراٹھے۔ بھاء بوٹی بوٹی توڑ کر ان کی طرف بڑھا رہے تھے۔

"کھاؤ کھاؤ شاباش! رزق حلال ہو' اور جسم میں خیر ہو..... شکر یہ یا الٰہی....."

پھر بھانے گودے والی ہڈی لی اور ہادی کا منہ ٹھوڑی سے پکڑ کر کھولا۔ ہڈی کے کنارے پر ہتھیلی سے ضرب مار کر گودا ہادی کے حلق میں اتار دی.....

"سوکھے ہوئے دماغ کو تر کرتا ہے یہ گودا۔ بات بات پر بہت بھڑکتے ہوئے تم۔ اب ٹھیک ہو جاؤ گے ان شاء اللہ۔ اسے گودا والی ہڈیاں دو نکال نکال کر۔"

بھاء کے کہنے کی دیر تھی' دسترخوان پر جتنے پہلوان بیٹھے تھے سب گودے والی ہڈی' بوٹی نکال نکال کر اس کی پلیٹ میں رکھنے لگے۔ بھاء ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر منہ کھولتے جاتے اور ہتھیلی کی ضرب سے گودا اس کے حلق میں اتارتے جاتے۔

"بس بس! میرا دماغ' دل گردے' پھیپھڑے' بال و پر سب تر ہو گئے ہیں۔" ہادی نے انکار میں ہاتھ بھی ہلائے اور پورا جسم بھی۔ پر.....

"سیانے کہتے ہیں، بڑے کھانے کے لیے زہر بھی دیں تو کھا لینا چاہیے۔ ایسے ہاتھ پیر نہیں مارنے چاہئیں۔"

ہاتھ پیر مارنے کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ آس پاس' آگے پیچھے' سب پہلوان غیر محسوس طریقے سے اسے دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو ایک انچ نہیں ہل سکتا تھا۔ ہاں پڑے، بے چارا بڑی بے چارگی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا کہ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اس کی بے چارگی نظر انداز کر کے ابراہیم سر جھکا کر دنبے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ کیونکہ سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے ورنہ اپنی گردن پھنس جاتی ہے۔

☆☆☆

"وہ چاچا امام دین؟" ان تینوں نے تقریباً اکڑ بکڑ کر طلال کو بھاء کے پاس جواب لینے کے لیے بھیجا تھا۔

"کہہ کر گیا تھا، ایک دو دن میں آ جاؤں گا۔ ابھی تک آیا نہیں۔"

"پھر آپ ان کی امانت رکھ لیں اور ہمیں اجازت دیں....." طلال بھاء سے کافی فاصلہ رکھ کر کھڑا تھا..... احتیاطاً.....

"کیا پتا، وہ سال' چھ مہینے تک دوبارہ یہاں کا چکر لگائے ہی نا..... امانت کا بہت بوجھ ہوتا ہے جی....."

"تو پھر.....؟" ایک تو طلال سے بھاء کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا تھا۔

"تو پھر اس کی امانت اپنے پاس رکھو۔ میں ایک دو بندے بھیجتا ہوں' ایک دو ٹھکانے اور ہیں امام دین کے۔ شاید کوئی اتا پتا مل جائے۔"

طلال نے آ کر ان دونوں کو سب بتا دیا۔

"دو دن اور دیکھ لیں؟" ابراہیم دونوں سے پوچھ رہا تھا۔

"لیکن میں اور ڈنڈ بیٹھکیں نہیں لگاؤں گا اور دوڑ بھی۔" وہ بدک کر کھڑا ہوا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے پہلوان بچہ "تزک پہلوانی" کی گنتی گن کر جہانگیری بچوں کی جان ہلکان کر رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر اسے گھور کر دیکھا تو بچے کی چھٹی ساتویں حس نے بیدار ہو کر اسے سر اٹھا کر اوپر دیکھنے کی تلقین کی۔ اس نے سر اٹھایا اور ہادی کو گھورتے

پایا.....

''آجائیں بھاء جی! آپ بھی.....ڈنڈ بیٹھک کی تھوڑی اور پریکٹس کروادوں آپ کو جی.....'' وہ بڑے خلوص سے مسکرایا۔

''پہلے اپنی گنتی ٹھیک کر موٹو' پھر مجھے ''پریکٹس'' کروانا.....'' ہادی نے جل کر کہا۔

''بہت بھولے ہو جی آپ.....'' موٹو قہقہے لگانے لگا۔

''اور تو پورا بدمعاش ہے۔'' ہادی معصوم سے پہلوان بچے سے باقاعدہ لڑ رہا تھا۔ابراہیم نے خائف ہوکر اسے دیکھا۔

''پھر اسی شہر میں کہیں اور رہ لیتے ہیں۔ یہاں سے چلے جاتے ہیں۔''

ابراہیم نے مسئلے کا آخری حل پیش کیا' جسے سب نے منظور کرلیا۔ وہ بھاء کو خدا حافظ کہنے کے لیے آگئے۔ ساتھ یہ بتانے کہ وہ چند دنوں بعد آکر چاچا امام دین کا اتا پتا معلوم کرلیں گے۔ ابھی فی الحال وہ یہاں سے جارہے ہیں۔

''میری مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا؟'' بھاء نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''کسریں نکال دی ہیں آپ نے ان کی جناب!'' جس نے پہلے دن ہادی کو چپیڑ ماری تھی' وہ کہہ کر کھی کھی ہنسنے لگا۔

''مہمان ایسے گھر چھوڑ کر جائے تو میزبان کی بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ سچی۔'' بھاء نے معصومیت پر بے چارگی بھی طاری کرلی۔

''دراصل یہ ڈنڈ بیٹھکیں' ڈنٹر پیل وغیرہ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ زبردستی بھی تو بہت کرتے ہیں۔'' ابراہیم نے کہا تو عام انداز میں تھا لیکن اس کے لہجے سے آگ پر تیل چھڑکنے کی بو آرہی تھی۔

''اب کوئی ڈنڈ بیٹھک وغیرہ نہیں ہوگی.....بس خوش.....؟؟'' بھاء نے وعدہ دینے والے انداز سے ہاتھ اٹھایا۔

پھر واقعی کوئی ڈنڈ بیٹھک نہیں ہوئی تھی۔ ہوجاتی تو اچھا تھا' کیونکہ اگلے دن انہیں گڑا (گرز) گردن پر رکھ کر اکھاڑے کے چکر لگانے پڑے تھے.....بس سب خوش.....؟؟

رستم زماں غلام محمد گاما پہلوان کا گڑا (گرز) دو من کا تھا۔ تاکہ ان کا حریف گردن پر بیٹھ جائے تو وہ اسے اُٹھا کر پٹخ سکیں۔ سنا ہے زندگی میں موت کا بخار بھی گردن سے سر کو چڑھتا ہے۔ پیٹھ سے بائیں رخ گھس کر' دل کی طرف نقب لگاتا ہے۔ دل و روح پر نقب کے لیے شیطان اسی رستے سے آتا ہے۔ اس بخار کو اتار پھینکنے کے لیے جسمانی طاقت کی نہیں' روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کا گڑ (گرز) ادو من کا نہیں تھا' جتنے بھی وزن کا تھا، ان تینوں نے گردن پر اٹھا کر اکھاڑے کے چکر لگانے شروع کردیئے تھے۔ بھاء ان کے چکر گن رہے تھے۔ سب کی اُردو کمزور تھی یا ان کے اسکولوں کے ماسٹر ہی ڈھیلے رہے تھے۔ کسی کو بھی ٹھیک والی گنتی آتی ہی نہیں تھی۔

''یہ بڑی بے ایمانی ہے۔ ایک' دو' تین.....ایسے ٹھیک ٹھیک گنتی گنیں نا.....یہ پا' ادھ پا' پونا' وغیرہ سب کیا ہوتا ہے؟'' ہادی نے جھنجھلا کر گڑے (گرز) کو زمین پر ٹکا لیا۔ اس کا سانس اس کے ہاتھ میں نہیں آرہا تھا۔

''بیٹا جی! یہ بھی گنتی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارے اُستادوں نے یہی سکھائی ہے۔ استاد کا علم افضل ہوتا ہے۔ چلو اب میں ادھ پا' پونا وغیرہ نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے؟ درمیان میں بولنے کی سزا پر پانچ نمبر پیچھے۔ چلو شاباش اب شروع ہوجاؤ۔''

''چھ شیر.....چھ شیر دا ابا.....چھ شیر دی اماں.....چھ شیر دی نانی.....چھ شیر دی ماسی.....سوہنا چھ.....اب ہوگیا پورا چھ.....''

''لغت پہلوانی'' نے ان کے گڑا کے نکال دیے تھے۔ دس چکر تھے کہ پورے ہونے میں نہیں آرہے تھے۔

''تمہیں درمیان میں بولنے کی کیا ضرورت

تھی؟ لو پھر گئے پیچھے.....چھ شیر دی کپتی پھوپھی.....'' طلال نے دانت پیسے۔

چھ شیر کی کپتی پھوپھی کے دانت نکل آئے.....

☆☆☆

کوشش کے باوجود وہ حویلی سے باہر نہیں جاسکے تھے۔ وہ بھاء سے ڈرتے تھے' پہلوانوں سے یا وہ خود ہی جانا نہیں چاہتے تھے.....

وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکے تھے۔ جب کبھی وہ چھپ کر' بچ بچا کر بھاگ نکلنے لگتے' ان کے ارادے کمزور پڑ جاتے۔ تھوڑی دور جا کر ہی واپس آجاتے۔ سوچتے بھاء کا دل برا ہوگا۔ انہیں بھاء کو خدا حافظ کہہ کر نکلنا چاہیے۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ وہ بھاء کے ٹرانس (اثر) میں چلے گئے ہیں۔ جب تک وہ بھاء کے آس پاس رہتے تھے' ٹھیک رہتے تھے۔ جانے کا سوچتے تھے تو ان کے دل بیٹھنے لگتے تھے۔ ڈیپریشن ہونے لگتا تھا۔ انہیں بھاء کی زبردستیاں اچھی لگنے لگی تھیں.....

یہ تو انہیں بھی نظر آرہا تھا کہ حویلی کے اکھاڑے میں خاص مقابلوں کے لیے کبڈی اور کشتیوں کی تیاری کی جارہی ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس دنگل میں انہیں بھی شریک کرلیا جائے گا۔ ایسے یا ویسے.....ورنہ کیسے بھی.....

جس میدان میں کبڈی اور کشتیوں کے لیے ڈھول پیٹے جارہے تھے' وہاں کم و بیش میلے کا سا سماں تھا۔ وہ غیر دلچسپی سے اس میدان میں چہل قدمی کررہے تھے۔ زمانہ نیا تھا لیکن زمانے کا بہروپ پرانے وقتوں میں بدل گیا تھا۔ تب شاید لوگ تانگوں' گھوڑا گاڑیوں' ریڑھیوں' سائیکلوں پر آتے ہوں گے۔ اب کاروں' موٹر سائیکلوں' چھوٹی بڑی بسوں' ٹرکوں وغیرہ پر آئے تھے۔ تب میلوں میں دنگل ہوتے ہوں گے۔ اب دنگل ہی میلہ تھا۔

کالج یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد آئی تھی۔ اسکولوں' مدرسوں وغیرہ کے بچے بچیاں۔ پتا نہیں گوجرانوالہ میں تفریح کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا' یا انہیں یہی تفریح پسند تھی..... بھاء بھولو کے پہلوانوں کی کبڈیاں اور کشتیاں.....

میدان میں نمایاں جگہ پر بھاء بھولو کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح سے وہ انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اب ان سے نظر ملی تو ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ہادی کو اپنے پاس بلایا۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب گیا' سلام کیا' تو انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تھپک کر اگلے ہاتھ میں منتقل کردیا.....پہلوان کے ہاتھ میں.....

''کھیل ہمارا ہادی شروع کرے گا.....'' بھاء نے بلند آواز سے کہا۔

''کھیل.....ہادی.....شروع.....'' وہ ان لفظوں کا مطلب سمجھتا اس سے پہلے پہلوان نے اسے گڑے (گزر) کی طرح اٹھا کر سر سے بلند کرلیا۔ ڈھول اور لوگوں کا شور اس کے بعد اٹھا اور کان پڑی آواز سنائی دینا بند ہوگئی۔

کھیل باقاعدہ شروع ہوچکا تھا۔ اسے اٹھائے اٹھائے پہلوان نے میدان کا چکر لگایا۔ بچے تالیاں مارنے لگے۔ لڑکے سیٹیاں۔ دنگل شروع کرنے سے پہلے' وہ بچوں' بڑوں کو محظوظ کرنا چاہتے تھے.....بس.....اتنی سی بات تھی.....

اتنی سی بات پر ہادی خواہ مخواہ ہاتھ پیر ہلا رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ جتنا وہاں شور تھا' اس کی آواز کس نے سنی تھی۔ پھر پہلوان نے اسے مجمع میں اچھال دیا۔ کالج کے چار پانچ لڑکوں نے اسے اچھی طرح سے کیچ کرلیا تھا.....

''اس بے چارے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نہیں ہوجاتا ہر بار؟'' طلال نے ابراہیم کو کہنی ماری۔

''آہستہ بولو ورنہ.....دس مرغی.....دس مرغی کا انڈا.....دس مرغی کا دوسرا انڈا.....دس مرغی کا تیسرا انڈا.....شروع ہوجائے گا۔ ان انڈوں میں سے چوزے نکل آئیں گے لیکن دس عدد کی گنتی پوری نہیں ہوگی۔''

ابراہیم نے بھرپور سنجیدگی سے کہا تھا۔ طلال بھی

پوری ایمان داری سے ہنسا تھا۔اس کی ہنسی ذرا دُور بیٹھے بھاء نے دیکھی اور خود بھی ہنس دیئے۔اور پھر طلال بلند ہواؤں کی سیر کرنے لگا.....اسے لڑکوں کی طرف اچھالا گیا تو وہ بہت خجل ہوا.....لیکن پھر مسکرا دیا۔

''بھاء کہہ رہے ہیں اک مرتبہ اور .....'' ہادی گرتا پڑتا غصے میں میدان سے ہی باہر جا رہا تھا کہ ایک پہلوان بھاگتا ہوا آیا اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔

''کس خوشی میں اک واری ہو .....چھوڑو مجھے.....'' ہادی نے غصے سے خود کو اس کی گرفت سے الگ کرنا چاہا لیکن پہلوان کو غصہ آتا نہیں اور پہلوان پر غصہ نکلتا نہیں۔

لوگ سیٹیاں مار رہے تھے' لڑکے تڑپ رہے تھے کہ پہلوان انہیں اٹھا کر اچھالیں لیکن جس کی طرف بھاء اشارہ کر رہے تھے' پہلوان اسے ہی اٹھا رہے تھے۔مجمع میں سے چند لاغر' ضعیف بوڑھوں کو بھی اٹھایا گیا۔پھر کچھ ایسے واپس اچھال دیا گیا' کہ نابابوں کو چوٹ آئی' نا کیچ کرنے والوں کو ان کی کوئی ہڈیاں چبھیں.....

دنگل شروع ہو چکا تھا۔ نیلی' پیلی کاغذ کی جھنڈیوں کی اوٹ سے تینوں بھاء کے جوش و خروش سے دمکتے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔یہ میلہ' یہ رونق' یہ دنگل' سب بھاء کی وجہ سے ہو رہا تھا.....انہیں اپنے پہلوانوں پر فخر تھا.....فخر تھا کہ ان کے پہلوان تین سو ساٹھ داؤ جانتے ہیں.....

تین سو ساٹھ داؤ.....

☆☆☆

''جس دن میرا دنگل تھا اس دن وہ میرے کان کے قریب آیا اور بس اتنا کہا۔''

''بھولو یہ دنگل تجھے ہارنا ہوگا ورنہ باؤلا ہو جائے گا۔''

''ایسی دھمکیاں اور ایسی للکاریں میں نے بہت سنی تھیں۔میرے استاد نے سکھایا تھا کہ دنگل بس دنگل ہوتا ہے۔جیت جاؤ تو بھول جاؤ' ہار جاؤ تو دوبارہ کمر کس لو.....بس.....مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنگل جیت چکا ہوں۔لوگ گنتی کرتے ہوں تو کرتے ہوں۔ جیت کو میں اکھاڑے کی مٹی میں دفنا کر نکلتا تھا۔لیکن.....کریم بخش اپنی ہار کو گن گن کر سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا تھا۔میرے اس ''دنگل'' کی بہت دھوم تھی۔ بے وقوف لوگوں نے بڑی بڑی شرطیں لگا رکھی تھیں۔دوسرے شہروں سے لوگ اس دنگل کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔لوگ باؤلے سے ہو گئے تھے.....''

''پھر.....آپ وہ کشتی جیت گئے.....؟''

''یاد نہیں.....لیکن باقی سب یاد ہے.....میری حویلی کی دیواروں پر لکھا تھا''جیت مبارک ہو بھولو.....''

تینوں نے ناسمجھی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔''کیا لکھا تھا؟''

''جیت مبارک ہو بھولو۔'' یہ لکھا تھا۔میرے بچوں کے خون سے۔میری ماں' میرے باپ' میرے شہہ جوان بھائیوں' میری سہاگن بہنوں کے خون سے.....ایک ایک دیوار پر لکھا تھا.....''

وار کاری بھی تھا اور جان لیوا بھی.....ہادی کے دل کو زوردار جھٹکا لگا.....

''س.....سب گھر والے؟'' ادھورا سوال.....پورا احساس.....

''پورا خاندان۔میرے بھائی' بھابھیاں' بہنیں' بہنوئی' ان کی اولادیں۔چاچے' مامے۔خاندان بھر کو اکٹھا کر کے میرا باپ مٹھائیاں کھلا رہا تھا۔ ماں شربت کے گلاس بھر بھر کر پلا رہی تھی۔ بہنوں کی نظریں چوکھٹ پر لگی تھیں۔میرے تینوں بیٹے کلف لگے سفید کرتوں. میں بھاگے دوڑے پھرتے تھے۔ماں نے چاہ میں ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔اتراتی پھرتی تھی۔کہتی پھرتی تھی.....

''میرا پتر سارے شہر دا مان اے۔اللہ جوانیاں مانیں.....''

رات اندوہناک تھی.....سیاہ کٹاری.....

اس دن کی روشنی بڑی قیامت خیز تھی۔سارا محلّہ' پورا شہر حویلی میں امڈ آیا تھا۔بھولو بھاگ بھاگ کر ایک ایک کا منہ چومتا پھر رہا تھا۔تالاب کنارے' چوباروں' دہلیزوں پر' اکھاڑے کی مٹی میں' کمروں اور مسہریوں پر۔لوگ اسے پکڑ پکڑ کر روک رہے تھے اور وہ سب کو پیچھے دھکیلتا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنی سفید پگڑی اتاری اور ایک ایک دیوار سے ایک ایک پیارے کا خون صاف کرنے لگا۔ لوگوں نے کہا ،بھولو باؤلا ہو گیا ہے۔ماں کی میت کے سرہانے غم سے گرا بھولو' دوبارہ نہیں اُٹھ سکا تھا۔اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو چکا تھا۔

سب سوال ختم ہو گئے.....تینوں نے چپ سادھ لی.....

''رستم زماں گاما پہلوان کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔گاما جی نے تکلیف سہہ کر' جھک کر سانپ کو پکڑ کر کچل دیا تھا۔سانپ کے دانت ان کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔انہوں نے پہلوانی کو دھبہ نہیں لگنے دیا تھا۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موقع پر ہی دم توڑ دیتا۔اسی لیے میرے باپ نے کہا تھا۔

''پتر! پہلوانی کو داغ نہ لگنے دینا۔تمہاری اصل طاقت پر ایک امتحان آئے گا۔ ایک آزمائش .....سرخرو ہو کر دکھانا.....''

ہادی کا حلق آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا.....

''من من کے گڑے (گُرز) اٹھائے تھے' پندرہ سولہ کلو کی بیٹوں کی میتیں نہیں اٹھائی گئیں۔سالم دنبے بکرے کھائے تھے'' کوڑی (کڑوی) روٹی کے دو نوالے نہیں کھائے گئے۔سیروں دودھ پیا تھا' صبر کے دو گھونٹ پینے بہت اوکھے لگے۔غم کا دنگل بہت کڑا تھا۔آزمائش کے اس اکھاڑے کی کشتی بہت مشکل تھی.....'' بھاء اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

''میں عمر بھر کے لیے مفلوج ہو چکا تھا۔ واقعی میں باؤلا ہو رہا تھا۔دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا۔پر پہلوانی میں تین سو ساٹھ داؤ سیکھے تھے میں نے' ایسے کیسے ہار مان لیتا۔ایک دن ایک داؤ کھیلا.....اگلے دن ماں کا غم مجھے ہرانے آیا' میں نے بھی اگلا داؤ چل دیا۔تیسرے دن بیٹے یہاں وہاں بھاگتے دوڑتے دکھائی دیے.....میں نے پھر داؤ چل دیا۔بہنوں کے لاڈ' بھائیوں کا مان.....میں داؤ پر داؤ چلتا رہا.....بس چلتا رہا.....میں رکا نہیں.....میں نے ہار نہیں مانی.....

اس طرح میں نے ہر روز ایک داؤ کھیلنا شروع کر دیا۔تین سو ساٹھ دن' میں نے رستم زماں بن کر کشتیاں کیں۔غم سے دو بدو دنگل لڑا۔سوگ اور روگ کا اکھاڑا تھا' اور ہر طرف مجھے چت کر دینے والے غموں کے پہلوان ہی پہلوان تھے۔

تین سو اکسٹھویں دن مجھے جیت نصیب ہوئی تھی۔ مجھے بس اپنی یہی جیت یاد ہے۔اللہ نے میرا دل ہلکا کر دیا تھا۔روح سے بوجھ اور روگ دونوں رخصت کر دیے تھے۔ مجھے صبر کے اتھاہ سمندروں کا مالک بنا دیا تھا۔اس دن مجھے ماں یاد آئی.....

''بھولو! ذرا ہنس کے تے وکھا.....''

پھر میں نے ہمیشہ ہنس کر ہی دکھایا اور حویلی کا پھاٹک کھول کر بیٹھ گیا۔اکھاڑے کی مردہ مٹی کو زندہ کرنے لگا۔جوان آنے لگے' پہلوان بننے لگے۔بڑے بڑے میدان فتح ہونے لگے۔حویلی میڈلوں اور ٹرافیوں سے بھرنے لگی۔پتا نہیں کون کون سے لوگ اور این جی او فنڈ دینے لگیں۔کوئی حساب کتاب نہیں۔ بس جو چاہیے ہوتا ہے وہ مل جاتا ہے۔اس حویلی سے باہر نکلو تو کہیں کوئی نشئی' ویلا' نکما' آوارہ' چور اچکا' نہیں ملے گا۔لوگ گردن سے پکڑ پکڑ کر حویلی چھوڑ جاتے ہیں کہ''بھاء اسے بندے کا پتر بنا دو۔

میں نے خدا کی رضا پر اپنا سوگ توڑ دیا' اللہ نے اپنی مخلوق مجھ سے جوڑ دی.....بھاں بھاں کرتی حویلی ہری بھری ہو گئی۔اب میں کسی کا چاچا ہوں' کسی کا ماما' کوئی دادا کہتا ہے،کوئی نانے کی طرح لاڈ کرتا اور کرواتی ہے۔بس بہت ہے اتنا۔اور انسان کو کیا

چاہیے.....''

''اور وہ.....انہوں نے مارا تھا.....؟؟'' طلال نے بھاء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت سے پوچھا۔

''اللہ کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں پتر! وہ سب دیکھتا ہے۔ ہر لمحہ دیکھتا ہے۔ انگلی اٹھانے والوں کو بھی اور گردنیں کاٹ دینے والوں کو بھی۔ میں نے جو پہلا داؤ کھیلا تھا وہ یہی تھا.....''

''کیا.....؟'' ہادی پوچھ رہا تھا۔

''میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں جمع کروادیا تھا۔ اس کے انصاف پر یقین کو کامل کر کے' الٹے پیروں واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اب وہ جانیں اور اللہ۔ بڑے دشمن ذرا سی ہار کو اپنی گردن پر نہیں سہار سکے تھے۔ میں نے اپنے خاندان کی منتیں اپنی کندھوں پر اٹھا کر دل پر صبر کا تعویذ سجالیا تھا۔''

''آپ کا دوسرا داؤ کیا تھا.....؟؟'' اسے شدت سے طلب ہوئی کہ اسے سب جواب ایک ہی سوال میں جان لے.....

''صبر کا.....اور میرا آخری داؤ ''اللہ کی رضا میں راضی ہو جانے کا تھا۔ اس آخری داؤ کو میرا ''پہلا'' داؤ ہونا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

''زندگی جیتنے کے لیے تین سو ساٹھ داؤ آنے چاہییں۔ ورنہ صرف ایک۔ انسان کو جینا آنا چاہیے' مرتو سب نے جانا ہی ہے۔

غم کو ہرانے کے لیے صرف تین داؤ بہت ہیں۔ ایمان' صبر' رضا۔

اور اللہ کی محبت جیت لینے کے لیے صرف ایک ..... ''جو میرے رب نے چاہا، میں اس پر راضی ہوا۔''

☆☆☆

چاچا امام دین نہیں ملے تھے۔ انہیں ان کے اگلے ٹھکانے کا اتا پتا مل گیا تھا۔ جس وقت وہ اپنی کار میں بیٹھ کر گوجرانوالہ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے' اس وقت انہیں ویسی ہی چپ لگی ہوئی تھی' جیسے کھیوڑہ کان سے نکلتے ہوئے لگی تھی۔ ابھی تو نہیں لیکن شاید کبھی وہ سمجھ جائیں کہ بھاء کے پاس وہ زندگی کے زیادہ قریب تھے یا موت سے بہت دُور.....ان سے دل کا تعلق تھا یا روح کا.....

اب وہ ملتان کی طرف رواں دواں تھے.....صوفیوں اور درویشوں کا شہر.....

محلہ کماں گراں کے ہنرمندوں اور بہاؤالدین زکریا کے شہر.....

''یار! یہی گھر ہے نا.....؟؟''

سب سے آگے طلال ہی تھا اور وہ اپنے پیچھے کھڑے ابراہیم سے پوچھ رہا تھا۔ گھر کے لکڑی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اندر باہر' ہر طرف سے گھر پوری طرح سے سفید تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے بیل بوٹوں' پھولوں' کلیوں کے نقش و نگار سے سجا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں گھر پر چھوٹی سی مسجد کا گمان ہوا تھا۔ دوسری نظر میں کسی مدرسے وغیرہ کا.....

''اس آدمی نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے آس پاس اور کوئی گھر بھی نہیں ہے۔'' تھوڑا شک ابراہیم کو بھی تھا۔

''السلام علیکم جی!'' بڑے سارے دوپٹے میں چھوٹی سی بچی دروازے تک آئی۔ مسکرا کر کہا

''وعلیکم اسلام! ہمیں اماں نوری سے ملنا ہے۔ چاچا امام دین یہیں ہیں؟'' طلال نے بچی کے گال کو مسکرا کر چھوا۔

''چاچا جی کل رات آئے تھے۔ اماں جی بازار گئی ہیں۔ آپ اندر آجائیں۔''

بچی نے بڑے مؤدب انداز میں ان کے لیے راستہ چھوڑ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اندر آگئے تو وہ ان سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی۔ ذرا دُور درختوں کی چھاؤں میں صفیں بچھی تھیں' جن پر بیٹھے بچے' بچیاں سفید پیالوں پر پھول' بوٹے بنا رہے تھے۔

بچی انہیں ایک کمرے میں لے آئی۔ طلال اور ہادی تخت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے موڑھا گھسیٹ لیا۔ ان کی پشت کی طرف کھڑکیاں کھلی تھیں۔ درختوں کی کچھ شاخیں کھلی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو' اور سبزے کی تازگی.....دو اور بچے اندر آگئے' اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر شیشوں سے سجے پنکھے سے انہیں ہوا دینے لگے۔

''بجلی نہیں ہے.....'' بچی نے پنکھا جھلنے کی وجہ بتائی۔

تینوں زیر لب ہنس دیئے۔ ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر بچے کے ہاتھ سے پنکھا لینا چاہا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔

''ابھی نہیں.....آپ کا پسینہ خشک ہو جائے پھر.....''

جن پیالوں پر بچے نقش نگاری کر رہے تھے' ان جیسے پیالوں میں ان کے لیے ٹھنڈا میٹھا پانی آگیا۔ کچھ دیر بعد بچوں نے ان کے لیے چٹائی بچھا کر دسترخوان لگا دیا۔ پتلی دال سے پیالے بھرے ہوئے تھے اور وہ بھاگ بھاگ کر ان کے لیے گرم گرم تنوری روٹیاں لا رہے تھے۔

''بس کر دو یار! پیٹ پھٹ جائے گا ہمارا.....'' ہادی نے ہاتھ کے اشارے سے بچوں کو روکا۔ وہ ایسے ہی گرم گرم روٹیاں لاتے رہتے تو وہ شام تک کھاتے ہی رہتے۔

''باجی کہہ رہی ہیں نماز کا وقت ہو گیا ہے' آپ کو مسجد تک لے جائیں.....'' کھانے کے بعد ٹوپیاں پہنے بیس بائیس بچوں کا گروپ ان کے سر پر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ نمازوں سے تو وہ بہت دُور نکل آئے تھے لیکن اتنے سارے بچوں کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اٹھے اور ان کے ساتھ مسجد تک چلے گئے۔

مسجد سے واپسی پر کمرے کی سمت جاتے جاتے طلال انہماک سے نقش بناتی بچی کو دیکھ کر رُک گیا۔ قدم بڑھا کر وہ اس کی سمت آیا اور پھر اس کے پاس نیچے ہی بیٹھ گیا۔

''بہت خوب صورت.....تمہارے ننھے ہاتھوں میں کمال کا فن ہے.....''

''آپ کو اچھا لگا؟ یہ میں آپ کے لیے ہی بنا رہی ہوں.....'' اس نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا۔

وہ ہنس دیا۔ ''میرے لیے.....لیکن تم تو مجھے جانتی بھی نہیں ہو.....''

''جب آپ مسجد جا رہے تھے تو باجی نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مجھے آپ کے لیے پیالہ بنانا ہے.....''

وہ حیران ہوا۔ ''اچھا.....انہوں نے ایسا کیوں کہا.....؟''

''انہوں نے کہا، آپ کے سر میں بہت درد رہتا ہے۔''

اس کے سر میں واقعی ہر وقت درد رہتا تھا۔ ''اور کیا کہا انہوں نے؟''

''کہا کہ مجھے ''یا ارحم الرحمین'' کا ورد کرتے ہوئے اس پر نقش بناتے ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد۔''

اس کے پاس سوال کرنے کے لیے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ نیلے آسمان کے نیچے پرندے گھسن گھیریاں بنانے میں مصروف ہو چکے تھے۔

''خیریت سے پہنچ گئے تھے یہاں۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟؟''

وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ شاید وہ اماں نوری تھیں۔ ضعیف و ناتواں لیکن خوش اُمید اور ہشاش بشاش۔ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''جی.....آپ کو ہمارے آنے کی خبر تھی؟'' اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سبزی کا تھیلا لے لیا اور ذرا دور رکھے تخت پر رکھ دیا۔

وہ ہنس دیں۔ ''ہم پرانے زمانے کے لوگ' آج بھی کوؤں کو بہت اہمیت دیتے ہیں.....''

''یہ میں نے بنا لیا ہے.....دیکھیں، کیسا بنا

ہے؟" بچی نے اپنا پیالہ اماں نوری کے سامنے کیا۔
"ماشاء اللہ۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ جاؤ اسے صالحہ کے پاس لے جاؤ۔" بچی کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اسے ساتھ لے کر درخت کے نیچے موڑھوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔
"ہم چاچا امام دین سے ملنے آئے ہیں..... کہاں ہیں وہ.....؟"
"صبح نکلے ہیں یہاں سے۔ کہہ رہے تھے رات تک آجاؤں گا۔"
"ہم گوجرنوالہ سے انہیں ڈھونڈتے یہاں آئے ہیں۔"
"چلو اب یہاں مل لینا....."
"یہ سب برتن آپ بناتی ہیں.....؟" طلال نے لکڑی کے تخت پر ترتیب سے رکھے پیالوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
"میں کچھ نہیں کرتی۔ میری بیٹی ہے صالحہ وہی یہ سب کرتی ہے۔ بچے بھی اسی کے پاس آتے ہیں۔ یہ جو برتن سامنے رکھے ہیں، یہ تیار ہو چکے ہیں، اب جن جن کے ہیں، وہ آتے جائیں گے اور لیتے جائیں گے۔"
"اور یہ گھر.....؟" گھر کے سکون کے تینوں پہلی ساعت میں ہی مداح ہو چکے تھے۔
"یہ گھر..... یہ بھی اسی کے ہاتھوں کا کمال ہے۔ جب کچھ اور نہیں کر سکی تو یہ کرنے لگی۔" ان کی آواز میں ہلکی سی اداسی سمٹ آئی۔
"میں نے آج سے پہلے کبھی اتنا خوب صورت گھر نہیں دیکھا۔" اس نے ایمان داری سے کہا۔
"مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا ہے اماں! مہمانوں کو بھی متوجہ کر دیں....."
درختوں کے پیچھے کہیں سے آواز آئی۔ اس نے اتنی خوب صورت آواز بھی کبھی کہیں نہیں سنی تھی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ جا چکی تھی.....
وہ جا چکی تھی تو اس کی آواز کیوں اس کی سماعتوں میں ٹھہری رہ گئی تھی.....

☆☆☆

اگلے دن صبح ابراہیم اماں نوری سے باتیں کرنے لگا اور ہادی بچوں کے ساتھ صف پر بیٹھ کر ایک سفید پیالے کو برباد کرنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے رنگوں سے بچوں کے گالوں پر کچھ کارٹون وغیرہ بنا دیے تھے۔ بچے اس سے بہت خوش تھے۔ چاچا امام دین رات کو گھر نہیں آئے تھے۔ انہیں آج کا دن بھی ان کے انتظار میں گزارنا تھا۔
وہ ٹہلتے ٹہلتے چھت پر آ گیا۔ چھت کی منڈیروں پر بھی فنکار نے اپنی فنکاری دکھا دی تھی۔ دُور کونے میں وہ لکڑی کے تخت پر بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔ پہلے اس نے واپس نیچے چلے جانا چاہا۔ لیکن جب وہ چاہ کر بھی وہاں سے ہل نہیں سکا تو اس نے اس کی سمت ہی قدم بڑھا دیے.....
پتلے باریک برش کو ہلکے نیلے رنگ میں ڈبو کر وہ پیالے کے پیندے میں آیتیں لکھ رہی تھی۔ جو لکھ رہی تھی، انہیں زیر لب دہرا بھی رہی تھی۔ وہ خاموش کھڑا دیکھتا رہا..... اسے گماں گزرا کہ اسے یہیں آنا تھا..... ہمیشہ سے.....
صالحہ نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے سر کو ذرا سا اس کے رخ پر موڑا۔ ایک جھلک دیکھ لینے پر وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹا تو وہ مسکرا کر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیالہ اٹھایا اور اس کے سامنے کیا۔
"یہ لیں، آپ کا آب خورہ بن گیا ہے۔"
وہ خاموش کھڑا رہا۔ ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ ذرا دُور بہاؤ الدین زکریا کے مزار کے سفید گنبد سے کبوتر پھڑاڑے۔ ان کے پروں کا شور اسے صاف سنائی دیا.....
"پینے کی ہر چیز اس میں ڈال کر پئیں۔ اللہ شفا دیں گے۔" پیالہ اسے تھما کر وہ پلٹ کر تخت پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ پھر جب وہ نیچے جانے لگی تو جاتے جاتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔
"ویسے آپ بھی ڈر گئے تھے کیا.....؟؟"

اس نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "آئی ایم ری....."
"اٹس اوکے۔ مجھے ویسے بھی عادت ہو چکی ہے۔ خوب صورتی کی انتہا ہو یا بدصورتی کی، انسان یکساں حیران ہی جاتا ہے۔"
"یہ..... یہ کیا ہوا.....؟؟" جھجکتے ہوئے اس نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔
وہ مسکرا دی..... "جھلس گیا..... تیزاب ہے....."

☆☆☆

وہ کالج سے بابا کی دکان کی طرف آ رہی تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اس سے اپنا دوپٹہ اور ہاتھ میں پکڑی فائل سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔ دوپٹے کے کنارے بار بار اس کے جسم سے آزاد ہو کر ہوا کے ساتھ پھڑ پھڑانے لگتے تھے۔ وہ عاجز آ چکی تھی اور جی چاہتا تھا کہ ہوا کو سامنے کھڑا کر کے مرغا بننے کے لیے کہہ دے۔
مرغا بننے سے پہلے ہوا نے ایک تیز جھونکا اس کی طرف اچھالا اور دوپٹہ جہاز کے بادبان کی طرح کھل کر لہرانے لگا۔ ایک آخری سرا اس کی گردن میں اٹکا رہ گیا تھا..... ششدر ہو کر اس نے سر پیچھے گھمایا تو اس کے دوپٹے نے پیچھے والے کا پورا چہرہ ڈھانپ دیا تھا اور وہ ہاتھ مار کر چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا..... بادل چھٹتے ہیں تو چاند نکلتا ہے..... دوپٹہ ہٹا تو چاند اور چاندنی دونوں نکلے.....
وہ دم بخود رہ گئی اور پورا زور لگا کر دوپٹہ کھینچا اور اپنے گرد کس لیا۔ غصے سے اسے گھورا جیسے یہ سب اسی کا کیا دھرا ہو۔ جبکہ اس کا کوئی قصور تھا نہیں۔
"دوپٹہ اس کا..... ہوا اللہ کی..... حادثہ حادثاتی..... وہ بے چارا انسان تو بس ملتان کا بازار دیکھنے نکل کھڑا ہوا تھا۔
"میری دادی کہتی ہیں، تیز ہوائیں چلیں تو پریاں بال کھول کر ہم انسانوں کو تنگ کرنے کے لیے ٹولیاں بنا کر باہر نکلتی ہیں..... اور میں یہ بتا دوں کہ میری دادی جھوٹ ووٹ نہیں بولتیں۔"
بلو کھینچ کر اس نے دوبارہ سر پر رکھا تھا، اور غصے سے چلتی ہوئی چند قدم آگے گئی ہی تھی کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔ کالے بادل مل ملا کر پورا زور لگا کر گرجے۔ اور اپنا کالا چھاتا پورا کھول کر سارے دن کو چھپا لیا۔ وہ ایسی تیز طرار تھی تو نہیں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں پلٹ کر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔
"اور میری نانی کہا کرتی ہیں کہ بادل گرجیں تو الوؤں کی شکل جیسے جن بھوت ہم معصوم انسانوں کا خون پینے کے لیے اکیلے اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑتے ہیں..... اور میں یہ بتا دوں کہ میری نانی بھی صرف سچ وچ بولتی ہیں....."
الو گردن کو جھٹکا دے کر ہنسا۔ اسی وقت بادل پھر سے گرجے اور بجلی نے کڑک کر پورے آسمان پر جال بچھا کر، اندھیرے کو روشن کر دیا۔ دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر اُوپر دیکھا۔ دونوں نے بیک وقت سر جھکا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک ہی وقت میں دم بخود ہوئے..... اور.....
"یا اللہ خیر!" اس کا دل دہل گیا۔ بجلی سے سہم کر کہا۔
"یا اللہ خیر!" اس کے دل پر بجلی گری اور اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ صالحہ نے ایک خفا خفا سی نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے بارش کی بوندوں پر ہاتھ مارتی، بابا کی دکان کی طرف بڑھ گئی۔
بارش برستی جاتی تھی..... وہ سامنے بھاگی جاتی تھی..... کالے بادلوں کے سائے میں وہ پیچھے چپ کھڑا تھا.....
چپ محبت بڑی اثر انگیز ہوتی ہے.....
وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کیسے اور کس طرح خبر ہو جایا کرتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جہاں جاتی، اسے پاتی۔ پیچھے سے آتے، سامنے سے گزر جاتے، شانے سے ٹکرا کر ہوا ہو جاتے.....
صالح لوگوں کی محبت بڑی پرامن ہوتی ہے.....

اس نے کبھی نظر بھر کر اسے دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کے بابا کی ڈاڑھی سفید تھی۔ ماں کی نظروں میں بڑی حیا تھی۔ لیکن دل انسان کا' وقت ارمانوں کا ہو تو نیند سے پہلے انسان بڑی جراتیں کر لیتا ہے۔ چوڑیوں کی کھنک پر اپنی ہنسی کو کھنکاتے ہوئے' اپنے پیچھے اس کے سائے کو محسوس کرتے ہوئے' وہ سوہنی' سسی' ہیر سب ہو گئی تھی.....

''دل بہت بے چین رہتا ہے جی! اس میں پانی پینے سے چین آ جائے گا؟'' ایک آب خورہ اٹھا کر وہ بابا سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اپنے دھیان سے بابا کی دکان میں آئی تھی۔ جب وہ پلٹا تو آب خورہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا جسے اس نے تیزی سے جھک کر پکڑ لیا۔ وہ وہیں بت سی بن کر کھڑی ہو گئی۔ بابا دُور کچھ برتنوں کے ساتھ مصروف تھے۔ جھکے جھکے اس نے سر کو تھوڑا سا اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپ ہمیشہ ایسے ہی یہاں وہاں بجلیاں گراتی ہوئی چلتی ہیں؟ ویسے ہی کہہ دیں 'مر جاؤ یوسف! میں مر جاؤں گا۔'' وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

''مر جاؤ.....'' اس نے دانت پیس کر' ایک اور بجلی گراتے ہوئے کہا۔

''پوری طرح سے مر مٹ گیا ہوں..... اس دل سے..... اس جان سے..... اور کوئی حکم؟'' اب وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ خوف زدہ ہو گئی۔ تیزی سے قدم اُٹھاتی دکان کے پیچھے کا چھوٹا دروازہ کھول کر گودام میں آ گئی۔ دروازے سے پشت لگا کر گہرے سانس لینے لگی۔ پھر درز میں سے جھانک کر اسے دیکھنے لگی۔ گیارہ مہینوں بعد اس نے ایسی جرأت سے اُسے دیکھنا چاہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے دیکھنے کا اس کے پاس بڑا حق ہے۔ وہ یہ حق حاصل کر چکی ہے۔

کچھ فیصلے چار لوگوں میں نہیں' چار لفظوں میں ہوتے ہیں۔ دو لمحوں' دو دلوں میں۔ کچھ نامحرم' صرف ایک دستک سے ہی محرم بن جاتے ہیں۔ دنیا کے قاعدے تو چلتے رہتے ہیں۔ محبت کرنے والے اپنا قاعدہ خود لکھتے' پڑھتے ہیں۔

ایک صراحی اس کے ہاتھ میں تھی اور اسے دیکھتے ہوئے وہ زیرِ لب ہنس رہا تھا۔ بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ لکڑی کے اس چھوٹے دروازے کے پاس آ کر رک گیا اور عین اس جھری سے آنکھ لگا دی' جس کے پیچھے اس کی آنکھ لگی ہوئی تھی.....

ایک لمحہ لگا..... دل ایک دھڑکن دھڑکا.....

دو آنکھیں چار نہیں ہوئی تھیں..... ''ایک'' ہو گئی تھیں.....

☆☆☆

سارے ظروف' جو وہ اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا تھا' وہ انہیں کتنے ہی دنوں تک اپنی ہتھیلیوں سے سہلاتی رہی تھی۔ اس نے محبت بہت اہتمام سے کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دکھ اٹھائے گی' شاید جدائی بھی کاٹنی پڑے لیکن پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسا کہ سب محبت کرنے والے مانتے ہیں کہ ایک دن بہار ہوتی ہے' ایک خزاں پھر عید ہو ہی جاتی ہے..... تو اس کو بھی یہ ماننا تھا.....

اس نے ملتان کی کوئی ایسی سڑک نہیں چھوڑی تھی جہاں رک کر اس کی راہ نہ دیکھی ہو۔ وہ کبھی اسے روک کر' ہاتھ پکڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اسے بات کرنے یا ملنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ جو کہتی' وہ سن لیتا تھا۔ جو وہ سوچتا' وہ پڑھ لیتی تھی..... بس اتنا ہی کافی تھا۔

اٹک سے یوسف اپنی اماں کو ان کے گھر لے آیا تھا۔ وہ اس شہر کا ہی نہیں تھا' ایک بار دوستوں کے ساتھ آیا تھا' اور پھر.....

''مجھے ایک ہی شوق تھا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر' انجینئر بن جائے۔ تینوں بیٹیوں کو پڑھا لکھا نے کی بہت کوشش کی لیکن میرے سسرال خاندان کا ماحول لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن یوسف کے لیے میں ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ بہت ذہین ہے میرا یوسف..... معصوم بھی بہت ہے.....

یوسف کی ماں جتنی دیر تک ان کے گھر رہیں' اس کے واری صدقے ہوتی رہی تھیں۔ بھولی بھالی سی خاتون تھیں۔ اماں' بابا کو رشتے پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن انہیں ایسے اونچے خاندان میں بیٹی دینے سے خوف آتا تھا۔ پھر غیر برادری۔ دونوں کو خاندان بھر کی ناراضی کا بھی ڈر تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ بیٹی کی پسند ہے۔ انکار کیا تو بیٹی روگ لگا کر بھی بیٹھ سکتی ہے۔ نئے زمانے کی چال سمجھتے تھے لیکن ایسے باغی بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگوں کی باتوں سے بھی ڈرتے تھے۔ بات چھپی تو رہے گی نہیں کہ غیر برادری میں لڑکی کا رشتہ کیوں دیا۔ سہولت کے لیے اماں ابا نے کچھ وقت مانگ لیا تھا.....

وقت، جسے بدلتے وقت نہیں لگتا.....

وہ بابا کی دُکان کی طرف جا رہی تھی۔ آج سکینڈ شفٹ میں اس کا بی اے کا پہلا پیپر تھا۔ اماں نے صبح کھیر پکائی تھی۔ اس نے سوچا کہ بابا کو کھیر بھی دے آئے گی اور انہیں سینٹر تک ڈراپ کرنے کے لیے بھی کہہ دے گی۔

چند دن پہلے اس نے یوسف کے لیے ایک پیالہ نقش کیا تھا۔ اس پر اپنا اور اس کا نام بھی لکھا تھا۔ زمین اسے گلستان اور آسمان چراغ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لمبی سفید چادر کا پلو ہلکی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اسے تمنا ہوئی کہ کاش کہیں سے یوسف اسے دکھائی دے جائے۔ دو ہفتے پہلے وہ اسے آخری بار نظر آیا تھا۔ گول گپے کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ موٹر سائیکل پر اپنے کسی دوست کو بٹھا کر بازار کے چکر لگاتا رہا تھا۔ وہ اتنی اتنی دور سے سفر کر کے ایک نظر اسے دیکھنے آتا تھا۔ تو وہ بھی ایک نظر اسے دیکھنا چاہتی تھی.....

ابھی وہ بابا کی دکان سے دس پندرہ دکانیں دُور تھی کہ ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آ کر رکی۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی ہی تھی کہ اس کی دل خراش چیخ نے وقت کا دم گھونٹ دیا.....

سانسیں آگ تھیں..... چیخیں انگارہ.....

وہ بازار' وہاں کھڑے لوگ' اس کی چیخیں' اس کی طرف بڑھتا ہجوم..... کہرام برپا ہوا..... قیامت آئی اور اس پر ٹھہر گئی۔

پورے پانچ دن وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رہی تھی۔ بیس دن بے ہوشی' نیم بے ہوشی میں اور تین مہینے ہاسپٹل میں رہی تھی۔ وہ مر مر کر زندہ بچ گئی تھی..... لیکن اس کا کوئی پیارا زندہ نہیں بچا تھا.....

جادتے سے اگلے دن صبح کے اخبار میں یہ خبر آ گئی تھی کہ رشتے سے انکار پر لڑکے نے لڑکی پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ لڑکی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ دوسرے دن بابا کا بیان آ گیا کہ وہ یوسف کو قتل کر دیں گے' جس نے ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی ہے۔ بازار کے کچھ دکان داروں کے بیان آئے کہ انہوں نے یوسف نامی لڑکے کو دکان کے چکر لگاتے دیکھا تھا۔ محمد رفیق کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ رشتہ بھیجا تو محمد رفیق نے صاف صاف انکار کر دیا۔ یوسف دھمکیاں دینے پر آ گیا تھا..... بات بہت بڑھ گئی تھی.....

پانچویں دن یوسف کے قتل کی خبر اخبار میں تصویر کے ساتھ آ گئی تھی۔ اسے اس کے ہاسٹل میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی دن شام کو پولیس محمد رفیق کو پکڑ کر لے گئی تھی۔

اب ہر روز ایک نئی افواہ ہوتی۔ ہر روز ایک نئی خبر چھپتی۔ مقدمہ چلنے لگا۔ چھ مہینے گزر گئے۔ ساتویں مہینے کے پہلے ہفتے وہ جیل میں ہی دم توڑ گئے۔

پولیس نے رپورٹ میں موت کی وجہ ''ہارٹ اٹیک'' لکھی تھی۔ جیل میں جو چند لوگ بابا کو جانتے تھے۔ انہوں نے موت کی وجہ کسی زہریلی چیز کو بتایا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ جیل سے باہر' خاندان والوں' محلے والوں کا ماننا تھا کہ بیٹی کے کرتوتوں نے جان لے لی۔ اتنی بدنامی پر بھی موت کو گلے سے نہ لگاتا تو کیا کرتا.....

بازار میں کوئی دکان دار ایسا نہیں تھا جو محمد رفیق

جیسے شریف' نمازی' پرہیز گار انسان کی ایسی شرم ناک موت پر ہاتھ اٹھا کر کانوں کو توبہ توبہ کرتے ہوئے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ خاندان کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس بد کردار لڑکی پر تھوتھو نہیں کرتا تھا۔ ملتان میں کوئی گھر ایسا نہیں بچا تھا جو اس جیسی بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی مر جانے کی دعائیں نہیں کر رہا تھا.....

گھر گھر اس کا نام تھا..... گھر گھر وہ بدنام تھی۔

''وہ چوری چھپے عشق معشوقی کرتی رہی تھی۔ ماں باپ نے رشتے سے انکار کر دیا تو بھڑک کر لڑکے نے تیزاب پھینک دیا۔ غیرت مند باپ نے لڑکے کو قتل کر کے خود کو بھی ختم کر لیا۔''

یہ کہانی باقی رہ گئی تھی' باقی سب ختم ہو چکا تھا۔ دنیا کو کڑوے سچ سے نہیں' چٹخارے دار جھوٹ سے مطلب ہوتا ہے..... بس.....

یوسف تین بہنوں کا اکلوتا بھائی' ماں باپ کی بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس کی بہنوں کے بچے اس سے عمر میں دو تین سال بڑے تھے۔ سالوں سے اس کے تایا' چچا تو یہ حساب کتاب لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اب جائیداد تینوں بیٹیوں کے حصے میں ہی آئے گی' اسی لیے انہوں نے بیٹیوں کے رشتے لیے تھے۔ لیکن یوسف نے حساب کتاب میں گڑبڑ کر دی تھی۔ لمبے وقت کی چال کو عین وقت پر الٹ دیا تھا.....

سارا شریکا اس ملی بھگت میں شریک تھا۔ تایا' چچا اور تینوں بہنوئی۔ بہنوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور سب نے مل کر وقت پر چال چل دی۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سلامت رہی.....

☆☆☆

اس کے علاج کے لیے اماں نے دکان کو بیچ دیا تھا۔ خاندان میں کوئی بھی اس کے علاج کے لیے ایک پھوٹی کوڑی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لوگ تو اس پر لعنتیں بھیج رہے تھے..... اس کے علاج کے لیے دوا کا انتظام کیوں کرتے؟

وہ تکلیف کی شدت سے ایسے چیختی' چلاتی اور کراہتی تھی کہ محلے والے اس سے عاجز آ چکے تھے۔

وہ گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر واویلا کرتے' انہیں دلاتے کہ خدا کے لیے یہ گھر' یہ محلہ چھوڑ دو..... چھوڑ بھی دو ہم سب کی.....''

وہ اپنی جان بھی چھوڑ دیتی لیکن اس کا کسی شے کوئی اختیار رہی نہیں تھا۔ دکان تو بک گئی تھی لیکن گھر بک رہا تھا۔ اماں بے چاری خاندان والوں' محلے والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتی تھی.....

''اور کچھ نہیں تو ترس ہی کھا لو میری صالحہ پر کیسے تکلیف سے مچھلی کی طرح تڑپتی ہے وہ.....''

''تو اپنے کرتوتوں کی سزا بھگت رہی ہے..... توبہ کرے..... توبہ.....''

''توبہ کر کے' اس جگہ سے ہجرت کر لینی چاہیے جس جگہ لوگوں کے دل پتھر اور عمل سیاہ ہو گئے ہوں۔''

چاچا امام دین نے آ کر اماں سے بس اتنا کہا اور ان کا تھوڑا بہت سامان سمیٹ کر انہیں اس گھر میں لے آئے تھے۔ گھر اجاڑ اور ٹوٹا پھوٹا تھا۔ لیکن اس کے آگے پیچھے احاطے بہت بڑے بڑے تھے کہ اس کی چیخیں اور کراہیں گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں۔

زندگی کی نبض پر بس ایک ہی احساس غالب تھا..... درد..... درد..... درد.....

اس درد کے ساتھ اسے بہت سے غم مل گئے تھے۔ ایک محبت کے ساتھ اسے سو لعنتیں ملی تھیں۔ باپ کی موت کے ساتھ تسلی دلاسوں کی بجائے بدکرداری کی تہمتیں ملی تھیں۔ وہ لوگوں کے لیے دو کوڑی کی ہو چکی تھی۔ اس کے باپ کی کمائی ساری عمر کی عزت' خاک ہو چکی تھی۔

خوب صورت آنکھوں والی کی ایک آنکھ کی بینائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی' دوسری کی دھندلا چکی تھی۔ تیز رنگ اس آنکھ کو تکلیف دیتے تھے۔ وہ تقریباً کلر بلائنڈ ہو چکی تھی۔ دو ہی رنگ اسے سکون دیتے تھے..... ''سفید اور نیلا''

آسمانی رنگ..... آفاقی رنگ.....

☆☆☆

صبح پچھلے صحن میں صالحہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی اور وہ تینوں اسے کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زندگی میں اتنا پرسکون چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس گھر جتنا خوب صورت گھر بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ زندگی کا کچھ حصہ اگر جہنم بنے تو اس کی پوری زندگی جہنم تھی..... پھر بھی وہ زندہ تھی..... نہ گلے میں پھندا ڈالا' نہ بلندی سے کود جانا چاہا..... لوگ اسے کالے منہ والی کہنے لگے تھے۔ اس کے پاس مرنے کے ہزار بہانے تھے۔ پھر وہ زندہ کیوں رہی؟

''اس واقعہ کے بعد..... کتنی تکلیف ہوئی تھی؟''

طلال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کن الفاظ میں سوال کرے۔

وہ ہنس دی..... ''کبھی ابلتے ہوئے تیل میں انگلی ڈبوئی ہے؟''

طلال کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ ''علاج کے باوجود تکلیف رہی؟''

''علاج؟'' وہ پھر سے ہنس دی۔ ''جب آگ بھڑکتی ہے تو اسے ٹھنڈا ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ آگ بجھ بھی جائے تو کوئلے سلگتے رہتے ہیں..... سلگتے رہتے ہیں.....''

''تم بہت باہمت ہو لڑکی..... م..... م..... میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''ایک بار مسکرا دیں..... اتنا کر سکتے ہیں؟''

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا نہیں سکا لیکن آب دیدہ ہو چکا تھا.....

''میں بہادر نہیں تھی طلال صاحب! میرے رونے چیخنے چلانے سے اماں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ابا بھی میری وجہ سے چلے گئے۔ اب اماں کو اپنی وجہ سے کچھ ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ تو میں نے ہر روز ایک چیخ' ایک تکلیف دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کی دیواروں پر نقش بنانے شروع کر دیے تھے۔ لیکن زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا..... چند دن کوشش کرتی رہی..... پھر دل میں خیال وارد ہوا کہ.....

''اس کی یاد میں ڈوب کر خود کو بھول جاؤ' جو بھٹکے ہوؤں کو بھی نہیں بھولتا.....''

تو مجھے خود کو بھلا کر' مٹا کر اس کی یاد میں منہمک ہونا تھا۔ اب میں ہر روز ایک آیت یاد کرتی' اسے دہراتی رہتی' دہراتی رہتی کہ میں بھول جاتی کہ میں کون ہوں' کہاں ہوں۔ میں نے پیالوں کے پیندوں پر ان آیتوں کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک..... دو..... تین مہینے گزر گئے..... یاد کرتی جاتی' لکھتی جاتی۔ دن بدل گئے..... وقت بدل گیا..... وہ تو سماں ہی اور ہو گیا پھر.....''

''تکلیف بھول گئیں.....؟؟''

''اپنا آپ بھول گئی۔ درد جسم میں موجود ہو تو ہو' لیکن اس کی موجودگی کا احساس مٹ گیا تھا۔''

''اور لوگ..... معاف کر دیا انہوں نے؟''

''لوگ کہاں معاف کرتے ہیں جی! انسان تو پتھر ہے' اللہ اس پتھر میں رحم ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بچی گھر آئی' وہ یہاں وہاں کھیلتی کودتی رہتی تھی۔ ادھر ادھر پیالے رکھے تھے' ان میں کھاتی پیتی رہتی تھی۔ اسے مرگی کا مرض تھا۔ پھر پتا نہیں چلا۔ کیا ہوا' کیسے ہوا' ادھر ادھر سے لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ کوئی بچہ لے آتا' کوئی بچی..... ایک دن ایک دکان دار آیا' بیس بائیس پیالے اٹھا کر لے گیا۔ آہستہ آہستہ دوسرے دکان دار بھی آنے لگے۔ ان کی مانگ بڑھ گئی۔ کوئی انہیں آسمانی پیالے کہتا ہے کوئی رحمانی۔

انسان کے بس میں کہاں ہے کہ وہ اللہ کے نظام اور اختیار کو سمجھ سکے۔ جس چہرے کی طرف دیکھ کر لوگ تھوکتے تھے' اس کے پاس آ آ کر اپنی تکلیفیں بتانے لگے۔ میرا نام صالحہ سے صالحہ نور ہو گیا اور اماں کا میرے نام کی نسبت سے اماں نوری..... مجھے تو پہلے بھی نہیں پتا چلا تھا کہ میں لوگوں کو بری کیوں لگنے لگی ہوں۔ مجھے اب بھی پتا نہیں چلا۔ لوگ مجھے پسند

کیوں کرتے ہیں۔"

"تو ان پیالوں میں شفا ہے.....؟"

"کبھی دوا میں شفا ہوئی ہے طلال صاحب؟ بے جان چیزوں میں شفا کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ تو اختیار والے کے کمال کا کمال ہے بس۔ اس نے چاہا کہ نیلی روشنائی "شفا" ہو جائے اور وہ ہوگئی۔ انسان پر یہ احسان کیا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کمال کروادیا جاتا ہے۔ ہم متکبر ہیں اور بے وقوف بھی۔ اللہ کے احسانوں کو اپنا کمال کہتے ہیں..... اسی لیے اللہ کا ارشاد ہے.....

"اور انسان بہت احسان نا شناس ہے۔" (القران)۔

طلال دنگ سا اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "تمہاری سمجھ بوجھ مجھے شرمندہ کررہی ہے....."

"میری عظمت کے گن نہ گائیں۔ شروع شروع میں، میں بہت روتی تھی۔ پاگل ہوگئی تھی۔ اپنے حسن کے گہن پر بہت ماتم کیا تھا میں نے۔ بہت روئی تھی میں۔ پھر ایک خیال الہام ہوا کہ "جس کا ایمان سلامت ہے اس کا سب سلامت ہے۔ حسن کو باہر کہاں ڈھونڈ رہی ہو؟ ذرا اندر جھانکو۔" میں نے اندر جھانکا تو مجھے میرا حسن مل گیا..... میرا ایمان..... میرا رب..... میرا آپ کا، ہم سب کا یہی تو حسن ہے۔ ہم کہاں کھال بال میں الجھے ہیں۔ ایک این جی او مجھے سرجری کے لیے باہر بھجوا رہی تھی، پر میں نے اپنی جگہ دوسری لڑکی کو بھیج دیا۔ دیکھیں نا، میں دیکھ سکتی ہوں، سن اور بول سکتی ہوں اور انسان کو کیا چاہیے۔ کھال کو چمکا کر کیا کروں گی..... ظاہری حسن کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے بھلا؟"

"تم نے اپنے دشمنوں کو معاف کردیا؟"

"وہ میرے دشمن نہیں ہیں، خود اپنے دشمن ہیں۔ جب انسان کسی کے ساتھ بُرا کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے ساتھ برا کرتا ہے۔ بھلا جو انسان اپنے لیے آگ اکٹھی کررہا ہو، وہ کسی کے ساتھ کیا بُرا کرے گا.....؟"

"اور محبت.....؟؟" اسے شدت سے اس کے جواب کی ضرورت تھی۔

"جب یہ جان لیا کہ حقیقی محبت کیا ہے تو مجازی محبت کا سوگ ختم کردیا۔ یہ سب ایسے ہی تھا، ہوگیا۔ باہر سے آنکھیں بند کیں تو اللہ نے اندر چراغاں کردیا۔ سب سوال مٹادیے، تو جواب خود بخود گھر کر سامنے آگئے....."

"جواب.....؟؟"

"ہاں جواب کہ..... تکلیف کے راستے رو ملتی ہے..... اور روشنی کے راستے "نور....."

☆☆☆

فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طلال نے کھلی کھڑکی میں رکھے بازو پر اپنا سر رکھا اور باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔

وہ یونیورسٹی کے پہلے دن، پہلی کلاس، پہلی نظر میں اریبہ کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور ڈیپارٹمنٹ میں غیر معمولی طور پر مقبول بھی۔ وہ گھر تک اس کا پیچھا کرتا تھا..... اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ اتوار کو بھی اپنے گلبرگ کے بنگلے سے، راوی پار کر کے اس گندے سندے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ اس کے دوست کہتے تھے کہ وہ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے خود کو خوار کررہا ہے۔

"میرے لیے اس کے سوا یہ ساری دنیا معمولی ہے..... بے کار اور بے وجہ....." وہ ہنس کر کہتا۔

"مجھ سے دور رہنا۔ لفٹ لینے اور لائن مارنے یہ گھسا پٹا انداز مجھ پر اپلائی نہ کرنا۔ نہ میں لائن میں آؤں گی نہ کسی سچی جھوٹی محبت کے چکر میں..... سمجھے....."

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا جو اتنی سختی سے اس سے بات کررہی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھا کہ کسی سے محبت کرتی ہے اسی لیے کسی بھی لڑکے کو گھاس نہیں ڈالتی۔ اس کا کوئی بچپن کا منگیتر جس کے لیے وہ ساری دنیا کے لڑکوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔

اس نے اپنی جوتی بدل لی تھی یا خیال، لیکن تیسرے سمسٹر میں وہ خود ہی اس کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔ شاید اسے اس کی محبت پر یقین ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے لفٹ لینے لگی تھی۔ لنچ ڈنر اور شاپنگ۔ پھر وہ اس کے گھر والوں سے ملا اور اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیج دیا۔

ان کی منگنی ہوئی۔ نکاح اور پھر شادی ہوگئی۔ ایڑھ سال تک وہ "سچی محبت" کے حصار کا قیدی بنا رہا تھا۔ اس سچی محبت کے لیے اس نے ہر قیمت ادا کی تھی۔ ماما کو اریبہ پسند نہیں تھیں، اور اریبہ کو ماما۔ اس نے اسے الگ گھر لے دیا تھا۔ اس کے کہنے پر پاپا سے اپنا بزنس الگ کرلیا تھا۔ سارے بینک اکاؤنٹ اریبہ کے ساتھ جوائنٹ کر لیے تھے۔ وہ اس پر اپنا دل ہارا تھا، بدلے میں ہر قیمتی چیز سے اسے جیت لینا چاہتا تھا.....

اگر انسان دانائی لے کر دنیا میں چلے پھرے، اور سچی محبت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے تو اس پوری دنیا میں شاید ہی چار پانچ لوگ سچی محبت کے امین ملیں۔ آدھی دنیا دھوکے میں، زیادہ جھوٹ میں، اور باقی ماندہ غلط فہمی کی محبت میں مبتلا ملے گی۔ ماں کی محبت کے علاوہ انسان شاید ہی کبھی "سچی محبت" کا مزہ چکھ سکے.....

اس رات وہ میٹنگ کے لیے دبئی گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے لینڈ کیا، اسے مطلع کیا گیا کہ میٹنگ کے لیے آنے والے ڈیلیگیشن کے ہیڈ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ آئی سی یو میں ہے۔

میٹنگ کینسل ہوچکی تھی۔ اس نے اریبہ کے لیے شاپنگ کی اور رات کی فلائٹ سے واپس آگیا۔

"بی بی گھر پہ نہیں ہیں؟" وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔ انٹرنس ڈور لاک تھا۔ اس نے گردن موڑ کر گارڈ کی طرف دیکھا۔

گارڈ نے نظریں چرالیں۔ "گھر ہی ہیں جی....."

"تو یہ لاکڈ کیوں ہے..... کوئی ملازم نہیں ہے اندر؟"

"سب ملازموں کو چھٹی دے دی تھی جی..... بس وہ ایک رقیہ....."

وہ حیرت سے گارڈ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پورچ میں ایک کار کھڑی تھی۔ یہ کار اریبہ نے اپنے بھائی کو گفٹ کی تھی۔ وہ انٹرنس ڈور پر ہاتھ سے دستک دینے لگا تو جرات کر کے گارڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے حیرت سے گارڈ کی طرف دیکھا۔

جس وقت وہ بیڈروم کی پچھلی کھڑکی سے اندر گیا، اسے اس وقت بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کررہا ہے۔ وہ پاگل یا بے وقوف نہیں تھا۔ اسے اریبہ پر ایمان کی حد تک یقین ہے۔ ساری دنیا اکٹھی ہوکر آجاتی تو بھی وہ.....

ساری دنیا خاک ہوچکی تھی..... دل کی دنیا دھول مٹی.....

☆☆☆

وہ جانتا تھا کہ پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں نہ کہیں اریبہ اس کے اسٹیٹس سے متاثر تھی۔ اس نے تو اریبہ سے محبت کی شادی کی تھی، لیکن اریبہ نے اور بھی بہت کچھ دیکھ کر شادی کی تھی۔ وہ اتنا سب کچھ جانتا تھا.....

لیکن یہ اس نے بعد میں جانا تھا کہ اس کی اتنی بے تحاشا محبت پر بھی اس کی بیوی تحفے میں اسے دھوکا دے رہی تھی۔ جب وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہے یا اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے تو وہ اچھی اداکاری کرتی ہے۔ اس نے سچی محبت نہیں پائی تھی، اس نے اچھی اداکارہ پائی تھی..... بس.....

محبت تو وہ اس سے کرتی تھی، جس کے لیے وہ اپنے شوہر کے بینک اکاؤنٹ خالی کرتی جارہی تھی۔ جسے وہ کار اور فلیٹ گفٹ کرچکی تھی۔ جس کے ساتھ وہ شاپنگ پر جاتی تھی۔ جس کے ساتھ وہ ایک بار سنگاپور بھی جاچکی تھی۔

"تمہیں دولت چاہیے تھی تو مانگ لیتیں۔" وہ

صوفے پر سر جھکا کر بیٹھا اپنے جسم کی کپکپاہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم دے دیتے؟'' وہ بے شرمی سے سینہ تان کر پوچھ رہی تھی۔

''ہاں دے دیتا..... تم پیسہ مانگ لیتیں لیکن مانگے بغیر مجھے یہ دھوکا نہ دیتیں.....''

''ہونہہ! تو اب دے دو۔ اپنا سب کچھ دے دو اور طلاق بھی.....'' وہ ابھی بھی اس کی محبت کا ثبوت مانگ رہی تھی۔

''میری محبت میں ایسی کیا کمی ہے؟ م..... مم.....'' اس کا اپنی سمت اٹھا ہاتھ بڑا کمزور اور ناتواں ہو گیا۔

''تم ہو کون؟ تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔'' محبت ہی اتنا بے خوف بناتی ہے۔ وہ بے خوفی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ دنگ اپنی بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا..... پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محبت..... اس نے تو اس پر اپنا سب کچھ وار دیا تھا۔

محبت..... اس نے بھی پلٹ کر ''کاری وار'' کیا تھا۔

☆☆☆

اس کا نروس بریک ڈاون ہوا تھا۔ وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی تھا کہ اریبہ اپنی محبت کے ساتھ ملک سے ہی باہر چلی گئی تھی۔ بینک اکاونٹ اس نے خالی کر دیے تھے۔ گھر اور بزنس کے شیئرز سیل کر دیے تھے۔

اس کے زخم بھر رہے تھے۔ وہ نارمل زندگی کی طرف آ رہا تھا۔ صبح اٹھتا' جوگنگ کرتا' جم جاتا' پھر پاپا کے ساتھ آفس۔ رات کا ڈنر وہ سب مل کر کرتے۔ کافی کے ساتھ کچھ دیر بزنس کے معاملات ڈسکس ہوتے..... پھر نیند کی گولیاں کھا کر وہ سو جاتا.....

آہستہ آہستہ نیند کی گولیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ پھر سرے سے نیند ہی غائب ہو گئی۔ وہ سائیکاٹرسٹ پر سائیکاٹرسٹ بدلنے لگا۔ ڈیپریشن بھی اپنے لیول بدلنے لگا۔ وہ ایک سے دوسری اسٹیج کی طرف جانے لگا۔ بظاہر وہ نارمل نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں پوری طرح سے ابنارمل تھا.....

''تم ہو کون.....؟'' وہ جب بھی خود کو شیشے میں دیکھتا اسے یاد آتا۔

''میں کون ہوں؟'' وہ خود سے پوچھتا۔ گھنٹوں شیشے کے سامنے کھڑا رہتا۔ دنیا کے بدصورت ترین انسان کو دیکھتا رہتا۔

''تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔''

اس نے گھر کے سارے آئینے توڑ دیے۔ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ چیخنے چلانے لگا۔ دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ خود کو زخمی کر لیا۔ گھر کے نوکر ملازموں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن وہ پنکھے سے لٹکتا ہوا ملا۔ ملازم نے بروقت آ کر اسے پیروں سے اٹھا کر اوپر کر لیا تھا اور پھر وہ مینٹل ہاسپٹل آ گیا۔

دنیا کا سب سے زہریلا زخم ''بے وفائی'' کا زخم ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے گہری چوٹ ''محبت کی چوٹ'' ہوتی ہے۔

☆☆☆

''یہ چاچا امام دین ہیں یا چاچا تارڑ دین؟ یہ ایک جگہ ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتے بھئی! جہاں جاؤ وہاں سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔'' ڈرائیونگ ہادی کر رہا تھا۔ جھنجھلا بھی وہی رہا تھا۔

''لگتا ہے یہ چاہتے ہیں کہ ہم مرنے سے پہلے سارا پاکستان گھوم پھر لیں.....'' ابراہیم نے ہنس کر کہا۔

''مرنے'' کے لفظ نے گاڑی کے اندر سناٹا طاری کر دیا..... انہیں یاد آیا کہ انہیں تو مرنا ہے۔

''اب چکوال جانا ہے' دیکھو وہاں بھی ملتے ہیں یا نہیں..... یہ نہ ہو کہ وہاں جا کر معلوم ہو کہ کے ٹو جاؤ۔ دیکھو اگر ایسا کچھ ہوا تو میری طرف سے صاف

انکار ہے یاروں! مجھے نہیں جانا کے ٹو۔'' طلال نے کار کے سناٹے کو معطل کرنا چاہا۔

''سنا ہے وہاں جا کر خون جم جاتا ہے۔ انگلیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں۔'' ہادی نے ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن تمہاری پہلے زبان جھڑ کر گرے گی' قینچی کی طرح چلتی ہے خیر سے.....''

اتنا کہہ کر کار کا دروازہ کھول کر ابراہیم باہر نکلا۔ اسے ایڈریس کنفرم کرنا تھا۔ صالحہ نور نے انہیں ایک چھوٹا سا کام کہا تھا' وہ اسی کام کے لیے اس طرف آئے تھے۔

ملازم انہیں باغ میں بٹھا کر اندر بتانے چلا گیا تھا۔

''کس چیز کی کمی ہے یار یہاں؟ بڑی عجیب سی جگہ لگ رہی ہے.....'' ہادی نے تین ایکڑ پر پھیلے فارم ہاؤس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ابراہیم سے پوچھا۔ سبزہ' درخت' پرندے سب کچھ تھا وہاں لیکن پھر بھی ہر طرف بوجھل پن تھا۔

''کمی نہیں زیادتی ہے..... وحشت کی..... دل چاہ رہا ہے اٹھ کر بھاگ جاؤں.....'' ابراہیم نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا!'' خاتون کی افسردہ سی آواز آئی اور وہ ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔

''وحشت ہی وحشت ہے یہاں ہر طرف۔''

ابراہیم گڑبڑا گیا۔ کارٹن کھول کر ان کے سامنے کیا۔

''یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔ اس پیالے میں بیمار کو کھانے پینے کی چیزیں دینی ہیں اور اس والے میں پینے کا پانی۔''

اب انہوں نے ذرا سا چونک کر تینوں کو دیکھا..... ہاتھ بڑھا کر پیالے نکال کر ہاتھوں میں لے لیے.....

''تم ملتان سے آئے ہو؟؟ صالحہ نے بھیجا ہے تمہیں.....؟؟

''جی.....''

کتنی ہی دیر تک وہ آنسو بہاتی رہیں۔ فارم ہاؤس کی وحشت بڑھنے لگی..... ہادی نے اشارہ کیا کہ چلو چلیں بس۔

''پنڈی جا رہے تھے' پتا نہیں کیسے ان کی جیپ نے آگ پکڑ لی۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں بچتا لیکن یہ بچ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دل' گردے' پھیپھڑے سب سلامت ہیں' بس کھال..... وہ ایسے جھلس گئی ہے کہ انہیں کسی پل چین نہیں آتا۔ بہت چیختے چلاتے ہیں۔ اسی لیے تو اس ویران جگہ آ کر رہنے لگی ہوں۔ اپنے بیٹوں اور بھائی کو بھی بہت یاد کرتے ہیں۔

سارا خاندان اجڑ گیا ان کا۔ چھوٹا بھائی کار کے حادثے میں فوت ہو گیا۔ میرے ہیرے جیسے بیٹے دریا میں ڈوب گئے۔ بھائی قتل ہو گیا۔ ماں باپ بیٹے کے غم میں مر گئے۔ چھوٹی بہن بیوہ ہو گئی۔ مجھے کس بات کی سزا ملی؟''

خاتون اپنا دل ہلکا کر رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''صالحہ نور آپ کی کیا لگتی ہیں.....؟'' طلال نے رک کر پوچھا۔

''اگر شادی ہو جاتی تو وہ میری بھابھی ہوتی۔''

اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

تینوں سناٹے میں آ گئے..... صالحہ نور نے اس شخص کے لیے پیالے بھیجے تھے.....

''کیا صالحہ نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟'' وہ سسکتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''معاف نہ کیا ہوتا تو شفا کیوں بھیجتی؟''

☆☆☆

طلال نے سڑک کے کنارے بنے چھوٹے سے کھوکے کے قریب کار روک کر' چاچا امام دین کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا۔

کپ سے پرچ میں چائے انڈیل انڈیل کر ''سڑکا'' لگاتے بزرگوار نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا۔

''میں جانتا ہوں.....'' اب وہ چائے میں کیک

رسک ڈبو کر کھا رہے تھے۔

"بتا دیں پھر....." ہادی اتنا ندیدا تھا تو نہیں لیکن وہ چائے اور کیک رسک کو دیکھنے لگا۔

"بتانے سے نہیں ملیں گے وہ' ساتھ لے کر جانے سے ملیں گے۔ آؤ چائے پی لو..... گڑ چائے۔ آجاؤ شاباش....."

بارش ہو تو درخت پودے' سبزہ نکھر کر گہرا سبز ہو جاتا ہے نا۔ یہ علاقہ ویسا ہی تھا۔ ہوا میں نمی تھی جیسے کچھ دیر پہلے بارش ہوئی ہو۔ اونچے نیچے راستے' ٹیلے' چڑھائیاں اور سبزے کے میدان۔ درخت اتنے کہ گماں ہوتا تھا کہ قریب ہی کہیں ایمزون جنگل کی چھوٹی بہن واقع ہے۔ دور پہاڑ ایسے دکھائی دیتے تھے کہ ذرا چلیں گے کہ تو بس قریب ہی آجائیں گے۔ ہوا بہت پرجوش اور خوش امید تھی۔

کھوکھا پتلی سڑک کے اس طرف تھا۔ کھوکھے کے پیچھے بڑا اور لمبا پانی کا تالاب تھا۔ الٹی چھلانگیں لگا لگا کر لڑکے اس میں کود رہے تھے' نہا رہے تھے۔ چائے کی "سڑک سڑک" کے ساتھ "شڑاپ شڑاپ" کی آوازیں ماحول میں رنگ بھر رہی تھیں۔

بابا جی نے انہیں گڑ چائے کو پرچ میں انڈیل کر "سڑکا" لگانے کا مشورہ دیا۔ اور demo (مظاہرہ) کر کے کر بھی دکھایا۔ تینوں نے کپوں سے چائے پرچوں میں انڈیل کر زوردار "سڑک" ماری اور بابا جی نے تالی۔

"یہ ہوتا ہے اصل طریقہ چائے پینے کا..... شہر سے آئے ہو؟"

لکڑی کے بینچ پر اسکول کے بچوں کی طرح شرافت سے بیٹھے' پرچ کو ہونٹوں سے لگائے انہوں نے ایک ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

"چاچا امام دین کے یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہوگے۔ کالجوں میں چھٹیاں ہوگئی ہیں نا....."

"ہم مینٹل ہاسپٹل سے بھاگ کر نکلے ہیں۔" ابراہیم زیر لب بڑبڑایا تو ہادی کا چائے کا گھونٹ پھوار بن کر باہر برس گیا۔ طلال کو ہلکا سا پھندا لگا۔ اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر ابراہیم کی کمر پر مکا مارا۔

"تم ذرا چپ نہیں رہ سکتے۔"

ابراہیم نے پرچ سے آخری گھونٹ سڑکا اور اپنا گولڈ میڈل مکا طلال کی کمر پر رکھا۔ "اب چپ ہو جاتا ہوں بھائی جان!"

"بہن بھائیوں نے چائے پی لی ہے تو چلیں.....؟" بابا جی کے کان بہت تیز تھے۔

بہن ابراہیم نے شرٹ کے بازو فولڈ کیے' چھپر میں نہانے والے بچوں کو ایک نظر دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"ٹھیک سے گاڑی چلا لیتے ہو نا؟" بابا جی خود ہی فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

ابراہیم زیر لب ہنس دیا۔ "میں چار شہر بھگتا کر آرہا ہوں جی۔"

"وہ اور بات ہوتی ہے....." بابا جی کھی کھی کرنے لگے۔

سانپ کی طرح لمبی پتلی لہراتی ہوئی سڑک تھی۔ آس پاس کا نظارہ بہت خوب صورت تھا اور پیچھے کا بھی..... جہاں سے دس گیارہ سالہ بچی اپنی گھوڑا گاڑی پر طوفان مچاتی آرہی تھی۔ لگامیں پکڑ کر کھڑی تھی اور گھوڑے کو پتا نہیں کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔ وہ پیچھے کہیں سے کار کے ساتھ اپنوں آپ ہی ریس لگاتی ہوئی آرہی تھی۔ تھوڑا سا ہانپ بھی رہی تھی۔ اب وہ ریس لگا رہی تھی تو اس نے بھی کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔ ادھر اسپیڈ بڑھی تو ادھر بھی بڑھ گئی۔ وہ بڑا حیران ہوا' یعنی گھوڑا گاڑی پر وہ اس کی کار سے ریس لگا رہی تھی..... بچے بھی کیسی کیسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں..... اس نے رفتار اور بڑھا دی' اس نے بھی ہار نہیں مانی۔ پتا نہیں کس زبان میں اس نے گھوڑے سے کچھ کہا کہ گھوڑا صرف گھوڑا نہ رہا..... وہ تو سیدھا ہوا سے باتیں کرنے لگا..... طلال کو شک ہوا کہ کہیں وہ ہوا میں اڑنے ہی نہ لگے۔

بابا جی نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور ہانک لگائی۔ "شاوا بچے! شاوا....."

اور سر اندر کر کے یہ۔ "بیٹا جی! اب تم جیت کے دکھاؤ۔" (دیکھو ذرا)

تینوں نے بابا جی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ تو مذاق مذاق میں ریس لگا رہا تھا۔ کہاں اس کی کار اور کہاں اس کا مریل سا گھوڑا' اور ٹوٹی پھوٹی گاڑی..... پھر بھی اب تو بات ہی عزت پر آگئی تھی۔ پیچھے سے ہادی نے گردن کو سیٹ کے درمیان پھنسا دیا تھا اور اس کے اوپر طلال نے..... ریس باقاعدہ شروع ہو چکی تھی.....

"یار او یار..... اسپیڈ بڑھا..... اسپیڈ....." ہادی نے لڑکیوں کی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔

"او بھائی کار ہے یہ' جہاز نہیں....." ابراہیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بچی آخر گھوڑے سے ایسا کہہ کیا رہی ہے کہ وہ بھڑک بھڑک کر اسپیڈوں اسپیڈ دوڑے جا رہا ہے۔

"تو اس کے پاس کون سا ہیلی کاپٹر ہے..... ایک مریل سا گھوڑا ہی تو ہے....."

"غور سے دیکھ بھائی! وہ گھوڑا ہی ہے نا؟" طلال نے ابراہیم کو چڑانا چاہا۔

"لگ تو گھوڑا ہی رہا ہے..... ویسے میں نے کبھی لائیو دیکھا نہیں لیکن کیا گھوڑے ایسے دوڑتے ہیں؟"

ان کی کار میں بیٹھ کر' بابا جی ان ہی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ابراہیم نے خائف نظروں سے بابا جی کو دیکھا۔

"شاوا بابا جی..... شاوا..... ہماری کار میں بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف..... دیکھو ذرا....."

"سامنے دیکھ کر بیٹا جی! ویسے ہی تم ہار رہے ہو....." بابا جی نے ونڈ اسکرین کی طرف اشارہ کیا اور ہنس دیے۔ ہی ہی ہی۔

پہلے دس منٹ تو دونوں تقریباً برابر رہے۔ کبھی ذرا سا آگے' کبھی بس ذرا سا پیچھے۔ پھر ایک دم سے..... بالکل ایک دم سے بچی نے "ہراہ" کہہ کر لگام کو جھٹکا دیا۔ گھوڑا' گھوڑا نہ رہا' راکٹ' میزائل' جہاز' باز' شاہین سب بن گیا..... یہ جا وہ جا.....

پورے ایک منٹ' چالیس سیکنڈ تک ان کی کار گھوڑا گاڑی سے پیچھے رہی۔ بچی نے پھر انہیں سڑک پر راستہ ہی نہیں دیا۔ وہ ساری سڑک مل کر اپنا گھوڑا دوڑاتی' لہراتی رہی.....

زندگی میں ان کا بہت کچھ ٹوٹا تھا' مان' دل' کبھی کوئی ہڈی وغیرہ' لیکن ایسے ان کا غرور نہیں ٹوٹا تھا۔ ایک دس سالہ بچی نے' گھوڑا گاڑی سے انہیں ہرا دیا تھا۔ کچھ ہار پر بہت مہنگی نہیں بہت سستی جگہ سے ملتی ہیں۔ کچھ تکلیفیں انجکشن کی سوئی کی طرح بڑی جان لیوا سی ہوتی ہیں۔ سی..... آہ..... ہائے.....

جیسے مقابلہ کے اختتام پر کھلاڑی آمنے سامنے آکر ہاتھ ملاتے ہیں۔ ویسے ہی بچی گاڑی سے کود کر ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ طلال کار کے بونٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ہادی کار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ ابراہیم سے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ سہارے کے طور پر اس نے دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے..... ہار سہارنا آسان نہیں ہوتا نا.....

"السلام علیکم جی....." ہاتھ سر تک لے جا کر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! شاباش' کس کلاس میں ہو؟" طلال نے بونٹ پر بیٹھے بیٹھے تالی ماری۔ بچی کی جیت کے واضح آثار دیکھتے ہوئے اس نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر سیٹیاں مارنی شروع کر دی تھیں۔ وہ بچی کو سپورٹ کرنے لگا تھا۔ ابراہیم نے جل کر اسے دیکھا اور پھر بچی کو جو بہت کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ تیل لگا کر کس کر چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اپنے قد سے کئی گنا بڑا دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ پوری مائی پھتاں لگ رہی تھی۔

"پانچویں میں جی....." اس مائی پھتاں نے دو ٹام کروزوں اور ایک گولڈ میڈلسٹ کو ہرا دیا تھا۔

ہادی لڑکھڑا کر گرتے گرتے رہ گیا۔ شرارتاً کھانستے ہوئے مسکرانے لگا۔ "تمہاری کیا عمر ہے

ابراہیم؟ پانچویں پاس ہو نا تم؟''

ابراہیم نے جل کر چاروں کو دیکھا۔ پھتاں نے واپس گاڑی پر چھلانگ لگائی' لگام کھینچی' ہانک لگائی اور غائب ہوگئی۔

''کیسی رہی پھر ریس؟'' لو اب بابا جی زخموں کے لیے نمک' مرچ' ہلدی لے آئے تھے۔

''گاڑی کی سروس نہیں ہوئی تو..... ویسے بھی سائنس کے بقول جانور مشین سے زیادہ ہوشیار اور تیز رفتار رہوتا ہے۔'' (یہ سائنس صرف اس نے ہی پڑھی تھی)

''کوئی بات نہیں بیٹا جی! اس ہفتے کروا لیتے ہیں ایک ریس۔ ایک جیسے گھوڑے' ایک جیسی گاڑیاں۔ مشینوں کو دفعان کرتے ہیں۔ بولو اب ہاں؟''

''بول کے دکھاؤ اب ناں.....'' ہادی نے اس کے شانے کو شانے سے ٹھوکا اور آنکھ ماری۔

''ہاں ہے بابا جی.....! ہاں ہی ہاں ہے.....'' طلال نے ہاتھ اٹھا کر' ڈیل ڈن کی.....

''بس پھر اس ہفتے..... تین تم..... تین ہماری بچیاں.....''

''تین.....؟'' طلال اور ہادی چونکے۔ وہ سمجھے بس ابراہیم کو للکارا جا رہا ہے۔

''ٹھیک ہے بابا جی! منظور ہے..... منظور ہے.....'' اب ابراہیم نے ہاتھ اٹھا کر ''ڈیل ڈن'' کی۔

''سیانے کہتے ہیں جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودو' اس میں انسان خود گر جاتا ہے۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے دونوں کو سیانوں کی بات یاد دلائی..... اور گڑھا..... جس میں وہ سب ہارنے کے بعد گرنے والے تھے..... شرم سے.....

☆☆☆

چھوٹا سا' ہنستا بستا گاؤں تھا۔ بہت ہی سادہ' اللہ لوک لوگ تھے۔ چند سال پہلے گاؤں کے ایک سیانے کو زہریلے بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ وہ دلدلی جھاڑیوں میں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہا تھا کہ اسکول سے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آتی سارہ نے چاچے کو زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ لیا۔

گاؤں تو بہت دور تھا' جیسے تیسے تینوں نے مل کر' چاچے کو گاڑی میں لٹایا اور سارہ نے گھوڑے کی لگامو ں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس نے شہر کی سڑک پر وخت ڈال دیا تھا۔ کسی بس' ٹیکسی' کار کو گزرنے نہیں دیا تھا اور چاچے کو ڈسپنسری پہنچا کر ہی دم لیا تھا.....

اس سے پہلے گاؤں والوں کو سارہ کے گھوڑا گاڑی چلانے پر بہت اعتراضات تھے۔ سیانے کہتے تھے وہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کر دے گی.....

نہ لڑکیاں خراب ہوئیں نہ گاؤں کا ماحول۔ چاچا اللہ بخش نے ہسپتال سے آتے ہی سب سے پہلے اپنی تینوں بیٹیوں کو اس کی طرح گھوڑا گاڑی چلانا سکھایا تھا۔ پھر گاؤں بھر میں ہوا چل پڑی تھی۔ ہر بچی اپنے باپ' بھائی' چاچے' مامے کی گھوڑا گاڑی کو اپنی سواری سمجھتی تھی۔ لڑکیوں کو سواری پر سوار ہونا بھی آنا چاہیے' اور سواری چلانا بھی..... وہ گھوڑا ہو' کار یا جہاز.....

☆☆☆

بابا شاوا' انہیں چاچا امام دین کے پاس اس ریس کے بعد ہی لے کر جانا چاہتے تھے۔ انہیں ان کے گھوڑے اور گاڑیاں دے دی گئیں کہ وہ پریکٹس کر لیں۔

''ہم بچیوں سے ریس لگاتے ہوئے اچھے نہیں لگیں گے بابا جی!'' طلال نے اپنی طرف سے ریس سے برطرف ہونا چاہا۔

''ڈر گئے ہو؟''

''ایسے ہی وہ ہار گئیں تو ان کا دل برا ہوگا..... ہو سکتا ہے وہ روئیں بھی.....''

''تم اس دن ہار گئے تھے تو روئے تھے؟ ان میں اسپورٹس مین شپ ہے۔ سمجھے.....'' بابا جی کو تو انگلش بھی آتی تھی۔ ''ہمیں اور ہمارے گاؤں کو ایویں کیویں نہ سمجھنا۔ پوری طرح سے ریس کی تیاری کر شاباش! پورا پورا مقابلہ ہوگا.....''

''پورا پورا مقابلہ..... وہ بھی ہم مرے مکوں سے.....'' تینوں کچھ فکر مند سے تھے۔

وہ صبح سویرے اپنی گھوڑا گاڑیوں پر نکلتے اور پریکٹس کرتے۔ شروع میں عجیب لگا پھر اچھا لگنے لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہوا میں اڑنا۔ جیسے ہر بوجھ سے آزاد ہو جانا۔ جیسے زمین کی حیات اور کائنات کی گردش کا حصہ بننا۔ گھوڑے بھی تھوڑی بہت ان کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ لگاموں پر گرفت مضبوط ہونے لگی تھی۔

''تم گھوڑے سے کچھ کہتی تھیں اور وہ تیز دوڑنے لگتا تھا۔ کیا کہتی ہو تم؟'' ایک دن وہ مائی پھتاں سے ٹپس لینے لگے۔ بچی نے زبان کو رول کر کے حلق سے کچھ آوازیں نکالیں جو کوشش پر بھی ان سے نہیں نکالی گئیں۔

''تم کہتی کیا ہو' بس وہی بتا دو.....''

''اوئے شیرا! چل اُڑ کے وکھا..... چیتا بن چیتا..... شاوا میرے ککڑ شاوا.....''

گھوڑا تے اوتوں شیر..... نالے چیتا فیر ککڑ..... شاوا بھی شاوا'' تینوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''گھوڑا مائنڈ نہیں کرتا کہ اسے شیر پھر ککڑ کیوں کہا؟ ویسے یہ دونوں ہی نہیں اُڑتے.....'' ہادی نے سنجیدگی سے پوچھا اور بتایا۔

''گھوڑے کا مائنڈ اس طرح کی باتوں کو مائنڈ میں نہیں رکھتا۔ پھر اس نے کون سا شیر کو دیکھا ہوا ہے۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''تو وہ خود کو شیر سمجھ کر دوڑتا کیسے ہے..... جب دیکھا ہی نہیں تو؟'' طلال بھی کنفیوز تھا۔ وہ واقعی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''کیونکہ وہ ہم انسانوں کی طرح بے کار کے سوالوں میں نہیں الجھتا۔ اب بھلا آپ میرا گھوڑا ہوتے تو سوال پوچھ پوچھ کر ہی میرا سر کھا لیتا تھا۔ اسی لیے آپ گھوڑا نہیں بنے..... چچ چچ.....''

''تمہیں گھوڑا ہم سے بہتر لگتا ہے.....؟''

ابراہیم کو ہنسی آ گئی۔

''ہاں! وہ چپ چاپ دوڑتا ہے..... اور جیت کر دکھاتا ہے.....'' اس نے فخریہ اپنے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی جیت کر دکھاؤں گا.....'' ابراہیم کو جوش آیا۔

''پہلے گھاس کھا کر دکھائیں..... ہی ہی ہی.....''

تینوں دل کھول کر ہنسے.....

ان کے پاس پریکٹس کے لیے دن تھے۔ وہ گھوڑوں کی پیٹھ تھپکتے' انہیں کھانا وانا کھلاتے' تالاب سے پانی پلاتے۔ پھر الٹی چھلانگیں لگاتے تالاب میں نہاتے۔ شام کی گڑ چائے بابا شاوا کی طرف سے ہوتی۔ وہیں گاؤں کے سب بڑے بھی آ جاتے۔ سب مل ملا کر چائے سڑکتے.....

یہاں وقت میں بہت برکت تھی۔ دن گزرتا نہیں تھا' وقت ڈھلتا نہیں تھا' آسمان کی طرح ٹھہر کر بڑا تسلی بخش سا لگتا تھا۔ ایک ایک سانس اپنی موجودگی کی خبر دیتی تھی۔ یہاں افراتفری اور بھاگم دوڑ کا کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ کیا یہاں کے لوگ اتنے صابر شاکر تھے کہ زندگی کا کارواں یہاں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا یہ وہی خطۂ زمین نہیں تھا جو قتل' ظلم' نا انصافی سے پاک تھا اور اسی لیے وقت برکت' فضا رحمت اور زندگی فضل و کرم سے مامور تھی۔ عقل والے ان ہی خطوں کی طرف ہجرت کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ رحمت کے فرشتے یہیں بسرام کرتے ہیں۔

وہ لمبی گھاس سے لہلہاتے اونچے نیچے راستوں پر چہل قدمی کرتے گاؤں کی خوب صورتی پر فدا ہوتے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اللہ نے سبز رنگ کو بہت پسند کیا ہے۔ ساری دنیا سبز رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سکون کے سارے خزانے سبز رنگ کی ملکیت میں ہیں۔ یہ انسانی آنکھ کو ٹھنڈک اور انسانی دل کو سکون اور اُمید دیتا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی لیے اس رنگ کو پسند کیا ہے۔

سبز، نیلی، پیلی اور گلابی کاغذی جھنڈیاں.....

"یہ ہو کیا رہا ہے..... انہوں نے ریس کو اتنا سیریس لے لیا ہے؟" طلال نے حیرت سے چیخ ہی ماردی۔

وہ تینوں دُور اوپر ٹیلے پر کھڑے تھے۔ نیچے کھلا میدان تھا۔ چھوٹے بچے رسی کے اُوپر جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ بین حرمومی کے میدان کی طرح انہیں گول گول گھومنا تھا، سفید چاک کی حد بندیاں کی جارہی تھیں۔ بابا جی شاواؑ ہر کام میں پیش پیش تھے۔ شام چار بجے ریس کا وقت تھا، اِدھر اُدھر ٹیلوں، درختوں پر بچوں کا ہجوم آکر جمع ہو رہا تھا۔ کچھ بڑے بوڑھے بھی موڑھوں، چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ایک بچہ نقلی پستول لہرا لہرا کر، گولی کے پٹاخے کو چیک کر رہا تھا۔ پستول نقلی تھی لیکن اس کا پٹاخہ بڑا اصلی تھا۔ اتنی زور سے گونجا کہ اُوپر کھڑا ہادی اس کی گونج سے سہم سا گیا۔

"یار یہ کون لوگ ہیں....." رینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔ پٹاخے نے اس کے دل کی دھڑکن کو بڑھا دیا تھا۔

یار لوگ، انہیں نیچے سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور گھڑی کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ بس وقت ہونے ہی والا ہے۔ وقت ہونے ہی والا تھا، اسی لیے گاؤں کی سادہ بھولی بھالی عورتیں بھی اس طرف آرہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رش بڑھنے لگا۔ شاید ساتھ کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ تینوں نے سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"دیکھنا کہیں ٹی وی چینل والے بھی تو نہیں آئے ہوئے۔ بہت بے عزتی ہونی ہے آج۔" طلال نے آنکھیں سکیڑ کر ہجوم کو گنتا چاہا۔

"ہاں یار ذرا چیک کرو، پتا چلے لائیو ٹیلی کاسٹنگ ہو رہی ہے....." ابراہیم کان کھجانے لگا۔ انہیں یہ گاؤں اچھا لگا تھا، یہاں کے سادہ، بھولے بھالے لوگ بھی۔

لیکن یہ معصوم بھولے بھالے لوگ..... اب چالاک ہو رہے تھے، ان کی جان نکالنے والے تھے..... دیکھو ذرا!

☆☆☆

ان کی گھوڑا گاڑی کے دائیں بائیں ایک ایک بچی کی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ تیل لگا کر کس کر بال بنائے ہوئے، سروں پر دوپٹے لیے ہوئے۔ بہت اعتماد سے گھوڑوں کی لگامیں پکڑ کر، گھوڑوں کے کانوں کی طرف جھک کر سرگوشیاں کرتے ہوئے، وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔

ان کی دیکھا دیکھی ہادی بھی گھوڑے کے کان کی طرف جھک گیا۔ "میرے شیر، میرے ککڑ، جتوا دینا یار! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔"

اللہ بھلا ہی کرنے والا تھا..... مقابلہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے دائیں بائیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر تیسرے نمبر پر کھڑے ہادی اور پہلے نمبر پر کھڑے طلال کو دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ اس نے دونوں سے کہہ دیا تھا کہ اب طے پا ہی گیا ہے تو وہ جیتنے کی پوری پوری کوشش کریں یعنی ان تینوں میں سے کوئی ایک تو جیتے۔

نقلی پستول کا اصلی پٹاخہ گونجا.....

چھ کے چھ نے اپنی اپنی لگاموں کا جھٹکا دیا۔ کوشش کر کے انہوں نے حلق سے مائی پھتاں جیسی آوازیں نکالنی سیکھ لی تھیں۔ زبان کو رول کر کر وہ وہی آوازیں نکال رہے تھے..... ابھی شیر، چیتے، ککڑ کہنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سب گھوڑے ایک رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ زمین کا سبزہ سمٹ کر ان کے گرد آگیا اور انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔ نیلا آسمان، سفید بادل، سورج کی ٹھنڈی روشنی، ان کے ساتھ بھاگنے لگے۔ ہادی اور طلال نے ہر شے کو اپنے گرد گھومتے پایا.....

پہلا چکر شروع ہوا.....

اللہ نے زندگی کو پسند کیا، اسی لیے اسے بنایا۔ اپنے لیے "بندگی" کو اسی لیے بندے میں روح

(زندگی) پھونکنے کو۔

دوسرا چکر ختم ہوا.....

زمین کہیں گلستاں ہے، کہیں صحرا، کہیں اجاڑ، کہیں آباد۔ راکھ اور پھول، کنکر، اور دھول..... اور یہی انسان کی زندگی.....

تیسرا چکر..... آخری چکر.....

ہر شے، ہر عمل، ہر فرض کی قضا ہے۔ "زندگی کی نہیں" ہر گناہ کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے، لیکن زندگی کی معطلی کے لیے نہیں۔ زندگی میں موت واجب نہیں۔ زندگی فرض اوّلین ہے۔ پہلی سانس سے، آخری سانس تک۔ اس فرض کی کوئی قضا نہیں۔ جینا ہی ہے..... جینا ہی ہوگا..... موت کی طلب حرام ہے، موت کی طرف پیش قدمی حرام ہے..... موت پر گرفت حرام ہے.....

طلال اور ہادی نے لگاموں کو قوت لگا کر جھٹکا دیا۔ ان کے حلق سے پر جوش آوازیں نکلیں۔ اس آخری چکر میں انہیں اپنی پوری جان لگا دینی تھی۔ انہوں نے لوگوں کے شور کو داد سمجھا..... ساتوں آسمانوں کو مہرباں پایا.....

ہادی ونگ لائن کراس کر گیا..... پیچھے ہی طلال..... نقلی پستول کے اصلی پٹاخے ترتیب سے پٹاخ پٹاخ گونجے، گاؤں والوں کا شور اور بچوں کی تالیاں.....

سب سے آخر میں ابراہیم نے لائن کراس کی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں، وہ انہیں آستین سے پونچھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

"ہم جیت گئے یار....." ہادی چھلانگ لگا کر طلال کی گھوڑا گاڑی میں کود گیا تھا۔ بابا شاوا بھی اسی گاڑی پر کود گئے تھے۔ گھوڑا گاڑی پر کھڑی بچیاں بھی ان کے لیے تالیاں بجا رہی تھیں۔ نیچے کھڑی مائی پھتاں بھی.....

"میں بھی جیت گیا..... یا اللہ تیرا شکر۔" اس نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کو۔

☆☆☆

پیارے قارئین: یہ "جیت" ان کے علاج کی آخری دوا تھی۔ کڑوی گولیوں کے ساتھ ڈاکٹر ایک میٹھی گولی دیتے ہیں نا؟ یہ وہی گولی تھی۔ جوش و جذبہ بیدار کرنے کا سیرپ.....

☆☆☆

"وہ سامنے اوپر پہاڑی دیکھ رہے ہو؟ وہی ہے چاچا امام دین کا ٹھکانا....."

"وہ دُور..... بہت دور سامنے اوپر..... اتنی بلندی پر.....؟" ہادی نے حیرت سے چاچا امام دین کو دیکھا۔

"جوان جہان ہو..... بلندیوں سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں جی وہ..... چڑھائی سے....."

"لفٹ تو یہاں کسی بھی پہاڑ پر نہیں ہے۔ پرندے بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اوپر نہیں لے جاتے۔" بابا شاوا نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

ہادی نے خائف ہو کر، طلال نے کھی کھی کرتے ہوئے بابا شاوا کو دیکھا۔ ابراہیم نے سلام دعا لے کر قدم اُوپر کی سمت بڑھا دیے۔

اللہ نے پہاڑوں کو بہت پسند کیا ہے۔ یہ وہ کیل ہیں جو زمین پر ٹھونکے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ وہ جلیل ہیں جو انسان کو بلندی، حوصلے اور استقامت کی ترغیب دیتے ہیں..... پہاڑ..... یہ امید اور سربلندی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔

تینوں چھوٹی سی کوٹھڑی کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اندر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ کی کمی تھی تو وہ باہر ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ چاچا امام دین بالآخر یہاں انہیں مل گئے تھے۔

"جب کوئی مرنے کا ارادہ کرتا ہے، غم زدہ اور پریشان ہوتا ہے تو کیا ساری خدائی خاموش نظارہ کرتی رہ جاتی ہے؟ اللہ کی رحمت جوش نہیں مارتی؟ اللہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ زمین پر انسانوں کو اور آسمان سے فرشتوں کو ہماری مدد کے لیے بھیجتا ہے۔ لیکن جس کے لیے مدد بھیجی جائے وہ اپنی ضد

چھوڑے تو سہی۔ ہدایت کو وصول تو کرے.....

بیٹا! تم جیسا پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹ اس بار بورڈ میں صرف پاس ہو گیا' ڈاکٹر بننے کے لیے ایڈمیشن نہیں ملا تو تم نے اپنی کلائی کاٹ لی۔ ایک لمحے کے لیے تم نے رک کر سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کس نے تمہیں روک دیا؟ کسان باپ تمہیں کھیتی باڑی میں لگانا چاہتا تھا' کیا پتا اللہ بھی یہی چاہتا ہو۔ دو تین سال کسان بنے رہتے' زمین کو سمجھتے' پرکھتے۔ زرعی سائنس دان بن جاتے۔ جو تم نے سوچا تھا وہی ہوگا تو ہی تم زندہ رہو گے؟ جو اللہ کا پلان ہے، وہ ہوگا تو تم خود کو ختم کر لو گے؟

بی بی! آپ کا جوان بیٹا حادثے میں شہید ہو گیا۔ تین سال گزر گئے اور رو رو کر آپ نے آنکھوں کی بینائی گنوالی۔ دل کی مریضہ بن گئیں۔ زندگی کو خود پر حرام کر لیا۔ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ زندہ انسان خود پر موت کو طاری کرے' لیکن آپ تو صرف بیٹے کی ماں ہیں' اللہ کا بندہ تھوڑی ہیں جو اللہ کی ناراضی کی فکر کریں گی۔ ماں' باپ' بیٹا' بیٹی' یہ رشتے ناتے تو دنیا کے لیے ہیں۔ ہماری پہلی حیثیت بھی بندگی ہے اور آخری بھی۔ جب سارا معاملہ ہی بندے اور بندے کے رب کے درمیان ہے تو آپ صرف ماں بن کر کیوں زندہ ہیں؟ صرف بیٹے کے لیے کیوں مر رہی ہیں؟ اللہ کو بھول گئی ہیں؟ بی بی! بیٹے کو یاد رکھیں' اس کی موت کو بھول جائیں..... غم سے نکل آئیں' اللہ کو راضی کریں۔

بیٹا! تم بچوں سمیت پہاڑ سے کود رہی تھیں۔ کس لیے کہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں؟ تین وقت کی روٹی کے لیے؟ لوگ عزت کے درپے تھے اس لیے؟ رشتہ داروں نے نظریں پھیر لیں؟

اللہ کی نظر میں تم ہو..... یہ کیوں بھول گئیں؟ تین بار تم نے مرنا چاہا' تینوں بار اللہ نے تمہیں بچایا۔ اللہ کی محبت کے اور کتنے ثبوت چاہتی ہو؟ جو تمہیں بچانے کے لیے مدد بھیج سکتا ہے' وہ روٹی بھی بھیج سکتا ہے۔ سر کی چھت بھی دے سکتا ہے۔ ایک شوہر کو ہی اپنی کل کائنات سمجھ لیا تھا؟ اسے اپنا رازق بنا لیا تھا؟

اس دنیا میں لوگ بھوک سے نہیں کم ہمتی سے مرتے ہیں۔ شیطان تمہارے دلوں میں بھوک کے وسوسے ڈال دیتا ہے۔ وہ تمہیں آنے والے وقت کی خوفناک تصویریں دکھاتا ہے۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم تنہا' اکیلے اور کمزور ہو۔ اور تم کم عقل یہ نہیں سوچتے کہ اللہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے..... تم تنہا اور اکیلے کیسے ہوئے؟

چھوٹی بی بی! آپ کوئی زہریلی چیز کھا چکی تھیں۔ آپ کی ماں بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔ آپ کا رنگ کالا ہے' آپ موٹی' بھدی اور بد صورت ہیں..... آپ نے اب تک اپنے بارے میں یہی سب جانا ہے؟ ان تین باتوں کے لیے آپ ہر روز موت کی طلب کریں گی؟ اس عظیم رب کو کتنی بار بتائیں گی کہ اس نے آپ میں ایسے ایسے خراب نقص رہنے دیے۔ خوب صورت ہوتیں تو آپ کی جلدی شادی ہو جاتی۔ بس یہی ہے آپ کی کل زندگی کی فکریں؟ آپ کا مقصد؟ ایک شوہر حاصل کرنا؟ خوب صورت نظر آنا؟ اپنی جھولی اور نصیب آپ کو خالی دکھائی دیتا ہے۔ اتنی سی وجہ کے لیے پاگل ہو گئی ہیں۔ زندگی کو جہنم بنا لیا ہے۔

اپنا جہنم آپ لوگ خود تیار کرتے ہیں..... اپنے ہی ہاتھوں سے.....

اس کائنات کی خوب صورتی بھی تمہاری خوب صورتی ہے۔ اللہ نے تمہاری اس صورت کو بنانا پسند کیا اسی لیے بنایا۔ اگر تم بدصورت ہو تو پھر کائنات کی ہر شے بدصورت ہے۔ اگر مالک اپنی بندگی کے لیے بدصورتی کو پسند کرتا ہے تو بس وہی شے خوب بصورت ہے۔ انسانوں کے پیمانوں کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اپنے لیے بنایا ہے' اپنی حیثیت کو پہچانو..... اللہ کے لیے خوب صورت بنو.....

ایک جھٹکا لگتا ہے اور ایمان ڈول جاتے ہیں۔ اللہ پر یقین ڈگمگا جاتا ہے..... ''اللہ ہے بھی یا نہیں' وہ

سنتا بھی ہے یا نہیں۔'' ہم یہ سوال کرنے لگتے ہیں۔ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے' یہاں سب کو آزمائش سے گزرنا ہوگا.....

''اتنے کم ہمت نہ بنو..... زندگی موت کے شکنجے میں دم توڑنے لگے تو بھی شیر بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو۔''

تینوں شیروں نے سر کو پوری طرح سے اندر کیا اور چاچا جی کو دیکھا.....

☆☆☆

''السلام علیکم.....'' سب جا چکے تو وہ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔

''وعلیکم السلام..... ٹھیک ٹھاک ہو اب؟'' خوشی سے ان کا چہرہ دمکنے لگا اور انہوں نے اٹھ کر تینوں کو گلے سے لگا لیا۔

چاچا امام دین..... یہ وہی ہیں جن کے پیچھے انہوں نے کھیوڑہ کان میں نماز ادا کی تھی۔

''پھر آپ نے ہمیں یہ امانت کے چکر میں کیوں ڈالا..... یا وہاں آپ کے کوئی جڑواں بھائی تھے؟''

''میری امانت یہ تھیلا نہیں' میری امانت تمہاری تندرستی تھی۔ زندگی کی طرف تمہاری واپسی تھی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ابراہیم نے میری امانت مجھ تک پہنچا دی ہے۔ تمہارا شکریہ ابراہیم.....'' وہ ابراہیم کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ہادی اور طلال نے چونک کر ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''زندگی کی محراب پر لکھی تحریر کا پہلا لفظ ''موت'' ہے۔ موت جوڑ ہے' توڑ نہیں۔ وقت مقررہ پر' اللہ کے حکم کے ساتھ۔ نہ لمحہ پہلے' نہ لمحہ بعد۔ موت کو یاد رکھنا عبادت اور اس کی چاہ کرنا گناہ ہے۔ موت بری شے نہیں' یہ اگلی منزل کی طرف سفر کا نام ہے۔ یہ سفر اسے ہی نصیب ہوگا' جس نے زندگی کی ٹرین میں بیٹھ کر جھکڑوں' طوفانوں' تکلیفوں' دکھوں' آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہوگا۔ اسے نہیں جو بیچ راستے میں ہی ٹرین سے کود گیا ہوگا۔ زندگی کے فرض کی کوئی قضا نہیں ہے ہادی..... زندگی کی ہر سانس فرض اولین ہے طلال.....''

دونوں خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے۔ پھر بابا جی امام دین کے ساتھ گڑ والی چائے سڑک کر باہر آ گئے۔ ابراہیم کے اشارے پر وہ اوپر اور بلندی کی طرف چڑھنے لگے تھے۔

''یہ سب؟ میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ابراہیم! کوئی پلان تھا؟'' تینوں کنارے سے پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سارا جہاں دکھائی دیتا تھا۔ ہادی پوچھ رہا تھا۔

''اللہ کے ہر کام میں حکمت' اور ہر بھلائی پلاننگ ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم ان دونوں کو ہی نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں بابا جی امام دین کے پاس لے کر گیا تھا..... بس.....''

''تم بابا جی امام دین کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''ہاں..... ایک بار ملا تھا.....'' اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ ''اب تک تم تھوڑا بہت سمجھ ہی گئے ہو گے۔ بابا جی امام دین نے تمہاری حالت کو پوری طرح سے سمجھ لیا تھا۔ جسمانی' روحانی' ذہنی' سب حالتوں کو۔ ڈاکٹر مریض دیکھ کر دوا تجویز کرتا ہے' تمہاری پہلی دوا بھاء بھولو تھے۔ انہوں نے تمہارے جسم سے ستر سے اسی فیصد بیماری نکال باہر کی تھی.....''

ہادی کو پھر سے بھاء یاد آ گئے۔ وہ انہیں بہت مس کرتا رہا تھا۔ ''وہ بھی ڈاکٹر ہیں.....؟؟''

''ہاں ڈاکٹر..... تم ایک سال سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ نیند کی گولیاں کھا رہے تھے۔ قدرتی نیند نعمت ہوتی ہے' یہ نیند تم دونوں کو وہیں آئی تھی۔ انہوں نے ہی تمہارے دماغوں سے منفی سیلز صاف کیے تھے.....

اگر انسان دکھ پر صبر نہ کرے تو یہ دکھ ناسور بن جاتا ہے۔ پھر اس ناسور کی جڑیں گہری ہونے لگتی ہیں۔ غم' نا اُمیدی اور مایوسی میں بدل جاتا ہے۔ زیادہ دکھی رہنے اور غم کرنے سے اسی لیے منع کیا گیا ہے۔ سائنس کی عام زبان میں غم کی ان جڑوں کو منفی سیل یا کیڑے کہا جاتا ہے۔ دماغ میں منفی کیڑوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک بہت بڑا خوں خوار جانور بن جاتا ہے۔ یہ جانور

پورے دماغ کو کنٹرول کرنے لگتا ہے۔اب انسان وہی کرتا ہے جو یہ جانور (منفی دماغی سسٹم) چاہتا ہے۔

اسی لیے ہمیں منفی جذبوں سے دور رہنے کا درس دیا گیا ہے۔غصہ' نفرت' حسد' لڑائی جھگڑا' دشمنی' غرور' جہالت، بے جا غم' وغیرہ۔اسی لیے اسلام نے پہلا درس ''صبر'' قناعت اور درگزر کا دیا ہے کہ ہم ان منفی کیڑوں سے بچے رہیں۔بھاء کی حویلی میں جو جو کچھ ہوا' وہ سب تمہارے جسم سے بیماری نکالنے کے لیے ہوا۔

تمہاری بیماری کا سلسلہ تمہارے دکھوں سے شروع ہوا تھا۔تم نے بھاء کا داؤ ''صبر' رضا' ایمان'' لگایا ہوتا تو نوبت موت تک نہ آتی۔جب ان کا کام ختم ہو گیا تو انہوں نے تمہیں صالحہ نور کے پاس بھیج دیا۔جس کے ہاتھوں میں اللہ نے شفا دی ہے۔

''تو ہمارے اس سفر میں جو جو کچھ ہوا وہ سب کچھ.....''

''وہ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔مدد بھی اللہ کی۔ہمیں لگتا ہے کہ آسمان سے فرشتے اُڑتے ہوئے آتے دکھائی دیں گے تو ہی ہم یقین کریں گے کہ اللہ نے ہمارے لیے مدد بھیجی ہے۔ہمارے لیے کوئی معجزہ ہوا ہے.....ہمارے لیے ہر روز کئی معجزے ہوتے ہیں۔ہمیں ہر روز کئی سبق دیے جاتے ہیں لیکن ہم اپنی بند آنکھیں کھولتے ہی نہیں.....''

''اسی لیے ہم بھاء کے ٹرانس میں چلے گئے تھے.....؟''

''کہہ سکتے ہو.....جس انسان نے غم کے پہاڑ سر کیے ہوں' صبر کے سمندر پیے ہوں' اس کی حیثیت معمولی تو نہیں ہو گی۔تم چاہتے بھی تو ان کی حویلی سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔اللہ نے انہیں اپنا مددگار چنا ہے.....بہت خاص ہیں وہ۔''

''تم بابا امام دین سے کیسے ملے تھے.....؟''

ابراہیم کے چہرے کے رنگ بدلے۔''اسی طرح جس طرح تم ملے۔'' اس کی اداسی بہت دل گرفتہ سی ہو گئی۔

''کیوں مرنا چاہتے تھے تم؟ کیا ہوا تھا؟'' وہ اب تک ایک ابراہیم کے بارے میں ہی نہیں جان پائے تھے۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں لیکن پھر وہ مسکرا دیا۔

''اماں ابا نہیں تھے میرے۔ماموں نے بیٹوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا۔باکسر بھی بنایا۔ان کی بیٹی تھی ایمان۔دوست تھی میری' پھر محبت بھی ہو گئی۔بہت معصوم سی تھی۔اس کا خالہ زاد بھی اسے پسند کرتا تھا۔رشتہ بھی بھیجا لیکن ماموں نے میری وجہ سے انکار کر دیا۔بہت تلخیاں' لڑائی جھگڑے ہوئے۔میں ایشین اولمپک کے لیے گیا ہوا تھا۔پیچھے سے ماموں کا فون آیا کہ گولڈ میڈل لے کر ہی آؤں۔ان کی ناک پر بات آ گئی ہے۔

''میں نے گولڈ میڈل جیت لیا' شادی کی تیاریاں ہونے لگیں.....'' کہہ کر وہ رک گیا۔غیر محسوس انداز میں اس نے ایک پتھر کو گرفت میں لے لیا۔

''نکاح سے ایک دن پہلے مہندی کی رات ایمان پنکھے سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔''

طلال اور ہادی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا.....

دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

''میری خالہ شادی کے لیے مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں۔مہندی کے لیے سارا خاندان وہیں موجود تھا۔ایمان اپنے گھر میں تھی۔اوپر اپنے کمرے میں اکیلی تھی.....وہ اس کے کمرے میں آ گیا.....'' ضبط سے ابراہیم کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

''وہ بے چاری اپنی بے حرمتی کی چوٹ نہیں سہہ سکی۔اس چوٹ کے ساتھ وہ میری زندگی میں بھی نہیں آنا چاہتی تھی.....اس نے اسی رات.....''

سارے جہاں نے ابراہیم کے ساتھ ایک سسکی بھری.....

''اگر وہ زندہ رہنے کی ہمت کر لیتی تو میں سب کچھ سنبھال لیتا۔بس وہ زندہ رہ لیتی.....''

''تم نے کیوں مرنا چاہا پھر.....؟''

''نفرت ہو گئی تھی ساری دنیا سے.....لیکن جب

زندگی کی قیمت کا احساس ہوا تو فیصلہ کیا کہ اب سلور یا گولڈ میڈل نہیں لوں گا.....انسانوں کا مددگار بنوں گا.....بابا امام دین کی طرح.....بھاء کی طرح.....''

''تو ہم تمہارے مریض تھے.....'' ہادی ہنس رہا تھا۔

''مریض نہیں.....احسان.....تم وہ احسان ہو جو اللہ کی رحمت نے ہم پر کیا ہے۔ہمیں بھلائی کے اس نظام میں مددگار بنا کر۔ویسے تم دونوں کی دوائیاں میرے پاس موجود تھیں۔طلال تمہارے ماما، پاپا گوجرانوالہ تک ہمارے پیچھے پیچھے رہے ہیں اور یاد آیا تمہیں بچے نے نمک کی چیزیں دی تھیں کہاں ہیں وہ؟

طلال گڑبڑا گیا۔''وہ پھول تو میں نے صالحہ کو دے دیا.....''

''کیوں بھلا.....؟'' ہادی مسکراہٹ چھپا کر پوچھ رہا تھا۔

''بہت خدمت کی تھی اس نے ہماری.....'' وہ کان کھجانے لگا۔''کل ریس کے بعد میں نے بھاء کو فون کیا تھا' کہا کہ ہماری شادی میں آنا ہے۔کہنے لگے اکیلا نہیں آؤں گا۔پر تم پہلوانوں کی فوج کو دو لیسے کی روٹی کھلا دو گے؟ سوچ لو.....''

دونوں نے قہقہہ لگایا۔''بڑے تیز ہو یار! لڑکی کو پھول بھی دے دیا' شادی کی ساری پلاننگ بھی کر لی۔بھاء سے کیا کہا پھر؟''

''وہ تو پھر میں نے ماما سے پوچھا کہ کیا ہم اتنے امیر ہیں کہ پہلوانوں کی فوج کو چند دن مہمان رکھ سکیں؟''

''ہاہاہا.....'' تینوں کے قہقہے ایک ساتھ چھوٹے۔

''تمہارا ولیمہ کھانے کے بعد میں واپس جا کر اپنی اسٹڈی مکمل کروں گا۔یار! بچے نے تمہیں ''خنجر'' دیا تھا' اس کا کیا مطلب تھا؟

''کہ میں تمہارے اندر موجود موت کی خواہش کا گلا کاٹ دوں۔مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا' کہ میں جیت جاؤں گا۔''

''بھائی جی! آپ میں شاہین بھاء جی کون ہے جی؟'' ایک بچہ ہانپتا ہوا ان کے پاس آیا۔شاید بابا جی نے بھیجا تھا۔

شاہین بھاء جی نے اسے گھور کر دیکھا۔''کیوں کیا کام ہے.....؟''

''شاہین کے پر لایا ہوں جی! بابا جی نے کہا ہے آپ کو دے دوں۔ہم سب بچے وہ وہاں کھڑے ہیں' ذرا اڑ کے دکھا دیں.....''

دو تین اور بچے ہینگ گلائڈنگ کے بیگ پشت پر لادے ہوئے اُوپر چڑھے۔ہادی نے حیرت سے انہیں اور پھر ابراہیم کو دیکھا۔ابراہیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا' پھر کمر پر مکا مارا.....''چلو شاباش! ذرا اڑ کے دکھاؤ ککڑ صاب!''

ککڑ' تیتر' بیٹر اور شیر نے جسم پر فٹنگ کی.....طلال اور ابراہیم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے.....'' ہادی نے کنارے پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔اس کی آنکھیں نم تھیں۔اسے پھر سے ماں یاد آئی لیکن مسکراتی ہوئی' اس کی بلائیں لیتی' اس پر نثار ہوتی ہوئی۔سر گھما کر دونوں کو دیکھا' جوش سے چلایا اور کنارے سے اٹھ کر آسمان کی طرف اُڑنے لگا.....

آسمان جو گواہ ہے کہ زندگی ''بلندی'' ہے اور ہم اس کے ''شاہین۔''

☆

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

عفت سحر طاہر

خوب سیرت کا

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگاہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگاہ کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تائی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگاہ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی اور تکبر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاحہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرا لیے ہیں۔

نمیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان و شوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ ملاحہ شدید پریشان ہے۔

کبیر کے گھر میں ملاحہ کا شاندار استقبال ہوا۔ کبیر کی بہنوں نے کبیر کے منع کرنے کے باوجود اس سے مختلف نیگ کی رقم بٹوری۔

صدیقہ بیگم کا صدمہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا اگلی صبح مہر ماہ حیران رہ جاتی ہے جب موحد، ملاحہ کے گھر لے جانے کے لیے ناشتہ کا بہت سا سامان لے کر آتا ہے۔ صدیقہ بیگم کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ بہت ناراض ہوتی ہیں اور ناشتے کا منع کرتے ہوئے ـــــ ولیمے میں بھی شرکت کا منع کر دیتی ہیں جس پر موحد انہیں بتاتا ہے کہ پورا خاندان ولیمے میں مدعو ہے۔

مہر ماہ موحد کے ساتھ ناشتہ لے کر جب ملاحہ کے گھر پہنچتی تو ملاحہ کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ خاندان کے خوف سے سب ولیمے میں شرکت کرتے ہیں۔

طلال اور تزئین میں صلح ہو جاتی ہے۔ مہر ماہ کے پاس نمیر آفندی کا خون آتا ہے۔

آغا جان صدیقہ بیگم سے کہتے ہیں کہ ملاحہ کو بلاؤ وہ کئی دن سے میری خیریت پوچھنے نہیں آئی۔

موحد، ملاحہ کو آغا جان سے ملنے کے لیے بلا لیتا ہے اور آغا جان کو ڈرائنگ روم میں لے آتا ہے۔

ستائیسویں قسط

ایک طوفان تھا جو وہاں موجود سب لوگوں پر سے تباہی اور بربادی مچاتا ہوا گزر گیا۔ وہ اس دنیا کا آخری شخص بھی باقی رہ جاتا تو آفندیز میں سے کوئی نہ مانتا کہ یہی نمیر آفندی ہے۔

"تت..... تم....." آغا جان کا کوئی خواب سا ٹوٹا تو جھرجھری لیتے ہوئے ان کی آواز لڑکھڑا سی گئی۔

بعض اوقات ہماری کرنیوں کے بوجھ ہم پر اس طرح لدے ہوتے ہیں کہ ضمیر کا آئینہ دیکھ کر زبان اللہ سے شکوہ کرنے سے بھی شرما جاتی ہے۔

اوّل جھٹکے سے نکلنے کے بعد وہ سب جیسے اس مذاق پر جی بھر کر بدمزہ ہوئے اور اب اسے لتاڑنے پر اُتر آئے تھے۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔ ہر جگہ مذاق کے لیے نہیں ہوتی۔" سہیل آفندی نے بگڑے ہوئے لہجے میں اسے جھاڑ کر رکھ دیا۔ جبکہ صدیقہ بیگم کا دل ہول ہول کر گہری کھائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ انہوں نے دہل کر مہرو کی زرد پڑتی رنگت طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف لان میں کھڑے پودوں کی طرح ہی گویا زمین میں گڑ گئی تھی۔

"تم پہلے ہی میرا بہت دل دکھا چکے ہو۔ اب یہ جھوٹ اور بکواس پھیلا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" آغا جان نے تلخی سے کہا۔

"یہ سچ کہہ رہا ہے آغا جان!" ثمرہ کی ٹھہرے پانیوں جیسی پُرسکون آواز نے ان سب کے اطمینان کو زیرو زبر کر ڈالا۔ تائی جان نے بے یقینی سے پھٹی نظروں سے انہیں دیکھا۔ بھلا کوئی ماں اپنی اولاد کے بارے میں غلط گواہی دے سکتی ہے؟

"تو پھر تم نے اب تک جھوٹ کیوں بولا ہم سے؟" آغا جان غصّے سے دھاڑے اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"اور..... اور اگر یہ..... وقار کا بیٹا ہے تو پھر میرا موحد کہاں ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی آواز کسی خوف سے کپکپا کر رہ گئی۔

نمیر کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ پھیلی۔ وہیں ثمرہ کی آنکھوں سے جیسے لہو بہہ نکلا۔ مہر ماہ بے جان قدموں کو گھسیٹتے ہوئے قریبی کرسی پر گر سی گئی۔

☆☆☆

آفندی ہاؤس سے نکلنے کے بعد فاران آفندی نے اپنے ایک دوست سے رابطہ کیا۔ فی الحال تو انہیں رات گزارنے کی جگہ چاہیے تھی۔ تیز بخار میں مبتلا موحد کے تپتے جلتے وجود کو وہ سڑکوں پر موسم کی سختی کی نظر نہیں کر سکتے تھے۔

"اللہ غارت کرے ایسی دولت کو جو خون میں سے مروّت اور لحاظ ختم کر دے۔" ثمرہ روتی ہوئی موحد کی

تپتی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ فاران آفندی کے دوست کے گھر انہیں فی الحال رہنے کو ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔

"فکر مت کرو۔ صبح ہوتے ہی ہاسپٹل داخل کروا دیں گے موحد کو مکمل علاج کے لیے۔" فاران انہیں تسلی دے رہے تھے۔

"بابا! کیا آغا جان نے... ہمیں گھر سے نکال دیا ہے؟" پپڑیاں جمے ہونٹوں کے ساتھ موحد نے بند آنکھیں کھول کر باپ کا چہرہ دیکھا تو ان کے ساتھ ثمرہ کا دل بھی کٹ گیا۔ وہ آغا جان کا اکلوتا اور لاڈلا پوتا تھا ان کی تمام تر محبت کا مرکز۔ جس کے منہ سے نکلی فرمائش شام سے پہلے پوری کر دی جاتی تھی۔ اب وہ اسے کیا بتاتیں، آفندیز میں لاڈلوں کے ساتھ بہت برے سلوک کا رواج تھا۔

"نکالا تو نہیں.... ابھی وہ غصے میں ہیں اس لیے ہم ان کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں جب ان کا غصہ اُتر جائے گا تب ہم دوبارہ ان کے پاس چلے جائیں گے۔"

فاران نے بہت محتاط لفظوں میں بیٹے کی آس برقرار رکھی۔ مگر دل آغا جان کی طرف سے بہت دکھا ہوا تھا۔ جنہوں نے پوتے کی بھی پروا نہیں کی تھی اور نگار سے ان کی ہمدردی کو غلط معنی پہنا کر انہیں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہم گھر کب جائیں گے؟" وہ بے چین تھا۔ دونوں میاں بیوی بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس سوال کا فی الحال ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اگلے دن موحد کو ہاسپٹل لے گئے تب پتا چلا کہ اسے نمونیہ ہو چکا تھا۔ اسے فوری ایڈمٹ کر لیا گیا۔ موحد کی حالت اس قدر بگڑ رہی تھی کہ فاران کے ذہن سے زرنگار اور نمیر کے نام گویا مٹ ہی گئے۔

"میں آغا جان کو ساری زندگی معاف نہیں کروں گی فاران! اگر میرے بیٹے پر آنچ بھی آئی تو۔" شدت گریہ سے سرخ ہوتی آنکھیں لیے ثمرہ نے متنفر لہجے میں کہا۔

"اللہ بہتر کرے گا ثمرہ! تم اپنے بیٹے کے لیے دعا کرو بس۔ باقی سب کو بھول جاؤ۔ ہر کسی کا عمل اپنے ساتھ ہے۔" فاران نے اس پریشانی کے وقت میں بھی کمال کا ضبط برقرار رکھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے بعد کے دن ان کے لیے کڑی آزمائش کے دن تھے' موحد کی حالت دن بہ دن سنبھلنے کے بجائے بگڑتی جا رہی تھی۔

"بے وقوفی مت کرو فاران! تم اچھی طرح سے اپنے آغا جان کو جانتے ہو۔ اس وقت وہ غصے میں تھے تمہارا اپنی بھابی اور بھتیجے کی حمایت کرنا انہیں پسند نہیں آیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعی تمہیں ہمیشہ کے لیے گھر سے نکالنا چاہتے تھے۔ تمہارا لوٹ جانا ہی بنتا ہے۔" ان کا دوست ہاسپٹل کے سرد کوریڈور میں کھڑا انہیں سمجھا رہا تھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ مجھے وقار کی بیوہ اور یتیم بچے کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے؟" فاران نے پوچھا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔

"میرا یہ مطلب نہیں....."

"آفندی ہاؤس واپس لوٹنے کی یہی ایک شرط ہے عاصم! جو کہ مجھے منظور نہیں۔" وہ حتمی لہجے میں بولے۔

"اچھا... پھر ان کا اتنا تو حق بنتا ہے نا کہ انہیں ان کے پوتے کی بیماری کی اطلاع کر دی جائے۔" وہ تائید طلب نظروں سے فاران کو دیکھنے لگا۔ عاصم ان کا بہترین دوست تھا' وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی بھی طور آغا جان

فاران کو معاف کردیں۔ فاران بجھے دل سے مسکرائے۔
"وہ تم کردو..... اور سن لینا جو وہ کہیں گے۔"
عاصم اتنے میں ہی پُرجوش ہوگیا۔ وہ ہیں اپنے موبائل سے ان کے سامنے ہی آغا جان کو کال کی۔ اور اپنا تعارف کروا کر محتاط لفظوں میں موحد کی بیماری اور فاران کی دربدری کا قصہ سنایا۔
"ہاہ..... اب ہوش ٹھکانے آگئے ہوں گے برخوردار کے۔ بڑی اکڑ کے ساتھ بیوی بچے کو لے کر تم جیسے دوستوں کے سر پر ہی تکیہ کر کے نکلا ہوگا۔"
آغا جان کے غرور و تکبر کی حد نہ تھی۔ لاڈلے پوتے کی بیماری کی خبر کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بیٹے کی نافرمانی کو ڈسکس کر رہے تھے۔ عاصم خفت زدہ ہوگیا۔ اسپیکر آن تھا اور پاس بیٹھے فاران ساری بات سن رہے تھے۔
"ایسی بات نہیں ہے آغا جان! وہ تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کے حق میں ہی نہیں، یہ تو میں نے سوچا کہ....." وہ صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہنے لگا تھا کہ آغا جان نے گرج کر اس کی بات کاٹ دی۔
"واہ.... بہت خوب. یعنی اسے باپ کی پروا نہیں اور تمہیں اس کی دربدری کا درد اٹھ رہا ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں تم جیسے دوستوں کو۔ جب تک اس کی جیب میں پیسہ تھا تب تک دوستی تھی۔ اب جب تمہارے در پر آپڑا ہے تو بہانے بازی کر رہے ہو۔" عاصم کے چہرے ہی نہیں کانوں سے بھی دھواں نکلنے لگا۔ اس قدر بے عزتی۔
"ہم تھوک کر چاٹنے والوں میں سے نہیں۔ سمجھے تم.... لیکن اگر فاران نے یہ ہنر سیکھ لیا ہو تو اس سے کہو خود لوٹ آئے۔ ہمارے پوتے کو واپسی کا چارہ نہ بنائے۔"
وہ رعونت سے کہہ رہے تھے۔ فاران کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہوا۔ انہوں نے موبائل عاصم سے لے کر لائن کاٹ دی۔ عاصم نے شرمندہ چہرے کے ساتھ عزیز از جان دوست کی طرف دیکھا۔
"چلو.... تمہیں بھی اندازہ ہوگیا کہ میں اب کیوں واپس لوٹنا نہیں چاہتا۔" وہ نارمل سے انداز میں کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"آئم سوری یار! میں تمہاری میزبانی سے تنگ نہیں۔ میں تو بس چاہتا تھا کہ....."
"میں اچھی طرح جانتا ہوں عاصم! تمہاری محبت پر تو شک ہی نہیں کوئی اور نہ ہی دوستی کی بے غرضی پر....." وہ آغا جان کی باتوں کے ازالے کے طور پر اس کا شانہ تھپتھپا کر تیقن سے بولے تو اس کی رنگت کچھ بحال ہوئی۔ ورنہ آغا جان تو دو منٹ کی اس کال میں اس کی دوستی کی عزت اتار کر ہاتھ میں تھما چکے تھے۔
"مائنڈ مت کرنا فاران! مگر میں نے اتنے سخت دل باپ کم ہی دیکھے ہیں۔" واپسی پر عاصم جھرجھری لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"بے جا انا اور حسب ونسب کے غرور میں مبتلا ہیں بس۔" فاران نے پھیکے لہجے میں تصحیح کی۔ عاصم نے اپنی بیوی کو تمام قصہ عبرت کے لیے سنایا تو اس نے عورتوں والی مخصوص عادت کے باعث تمام باتیں ثمرہ کے گوش گزار دیں۔ تب ثمرہ نے دل میں تہیہ کرلیا کہ کبھی آفندی ہاؤس واپس نہ لوٹیں گی۔
"دل کو نرم رکھتے ہیں ثمرہ! سخت دل تنگ نظری کی مثال ہوتے ہیں۔" فاران نے انہیں نرمی سے سمجھایا۔ راتیں بیمار بیٹے کے ساتھ جاگ کر گزارتی ثمرہ کے دل پر ہاتھ پڑا۔
"اور آغا جان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ انہوں نے اخلاقیات کے یہ باب نہیں پڑھے۔" وہ

متنفر تھیں۔
"موحد کو ٹھیک ہو لینے دو پھر میں خود آغا جان سے بات کروں گا تم دیکھنا وہ بھابی اور نمیر کو بھی قبول کرلیں گے۔"
لیکن موحد کی طبیعت اس کے بعد سنبھلنے کے بجائے مزید بگڑ گئی۔ اس رات کی صبح قیامت خیز تھی۔ شدید صدمے کی کیفیت میں گھری ثمرہ چیخیں چلائیں..... مگر حقیقت نہ بدلی۔ شدید صدمے میں ڈوبی ثمرہ کو مامیں چلی گئیں۔ فاران آفندی کی جیسے دنیا ہی تباہ و برباد ہوگئی۔ بھلا نمونیہ سے بھی کوئی مرا کرتا ہے؟ وہ ثمرہ کی بند آنکھوں پر نظریں جمائے بے یقینی کی کیفیت میں سوچتے انہیں یقین نہ آتا تھا۔ اپنے پیاروں کے چھوڑ کر جانے کا کبھی یقین نہیں آیا کرتا۔
انہوں نے ثمرہ کے شارجہ میں مقیم بھائی کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تو وہ اپنی بیوی اور آٹھ سالہ بیٹی سومیہ کے ساتھ اگلی ہی فلائٹ سے پاکستان چلے آئے۔ فاران کا دل ایک بار بھی نہ چاہا کہ وہ آفندی ہاؤس اطلاع کریں۔ انہیں اب احساس ہوا کہ وقار آفندی کس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا ہوگا۔
اپنی اُجڑی دنیا کا غم منانے کے بعد فاران کو ننھے نمیر کا خیال آیا تو وہ انہیں ظالم گلی کوچوں میں چلے آئے جو ان کے پیارے وقار آفندی کو نگل گئے تھے وہاں ان کو وقار کے ہمسایوں سے پتا چلا کہ زرنگار بیمار تھی اور کسی سرکاری ہسپتال میں داخل تھی۔ وہ سیدھے ہاسپٹل گئے تو وہاں زرنگار کو کسمپرسی کی حالت میں وارڈ کے ایک کونے میں زمین پر بچھے بستر پر پڑے دیکھ فاران کا دل مٹھی میں آگیا۔ ماں کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس زرد چہرہ لیے موجود نمیر ماں کی متوقع جدائی کے خوف سے نچڑا ہوا بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھ کر خود پر سے قابو کھو بیٹھا اور دوڑ کر ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگا۔ نہ جانے کتنے دنوں اور راتوں سے وہ خود پر ضبط کر رہا تھا۔ چودہ سال کا بچہ گزرے دنوں اور راتوں میں ایک قیامت سے گزر چکا تھا۔ ماں کے سر میں تکلیف اٹھتی تو اسے درد کے دورے پڑتے اور ہر دورے کے دوران وہ زرنگار کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتا کہ کہیں وہ بھی وقار آفندی کی طرح اسے چھوڑ کر نہ چلی جائے اور اب وہ فاران آفندی کے مہربان سینے میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔
دو ماہ سے مسلسل دن رات وہ ثمرہ کے پاس تھے مگر وہ کوما کی گہری پرسکون نیند میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھیں. اور ابھی نرس تیز قدموں سے ان کے کمرے سے باہر نکلی تو فاران آفندی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔
"آپ کی مریضہ کو ہوش آگیا ہے۔ میں ڈاکٹر کو انفارم کرتی ہوں۔" نرس نے ان کو اضطراری انداز میں بینچ پر سے کھڑے ہوتے دیکھ کر تیز لفظوں میں بتایا اور خود ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔
"یا اللہ تیرا شکر۔" فاران کی آنکھیں دھندلا گئیں وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔
وہ ہوش میں آئیں تو کمرے میں نرس کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ وہ چت لیٹی ہسپتال کی سفید چھت کو گھور رہی تھیں جیسے کہ یادداشت کا سفر طے کر رہی ہوں۔ نرس ڈاکٹر کو اطلاع کرنے نکل گئی۔ تب ہی دروازے پر کھٹکا ہوا تو انہوں نے میکانکی انداز میں چہرہ موڑ کر دیکھا۔ فاران آفندی دروازہ کھول کر اندر چلے آئے تھے۔ ثمرہ کا دل بھر آیا اور بے اختیار ان سے پوچھا۔
"میرا موحد کہاں ہے فاران۔" انہوں نے آگے بڑھ کر ثمرہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔ فاران مرد تھے، ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

BOOKS PK Books & Magazines

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''موحد..... کہاں ہے فاران..... مجھے اس کے بارے میں بتائیں۔'' ذہن مکمل طور پر جاگا تو وہ تیز لہجے میں بولیں۔ان کا نفس تیز تر ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔اسی وقت ڈاکٹر اسی نرس کے ہمراہ آ گیا۔

''السلام علیکم مسز فاران! کیسی ہیں آپ.... جانتی ہیں پورے دو ماہ بعد کم بیک ہوا ہے آپ کا۔'' ڈاکٹر نے ان کا موڈ بھانپتے ہوئے خوش مزاجی سے پوچھا اور ساتھ ہی نرس کو انجکشن تیار کرنے کا اشارہ کیا تو ثمرہ اونچی آواز میں رونے لگیں۔جیسے موحد آج ہی ان سے بچھڑا ہو۔فاران باہر نکل گئے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے تو نیند کا انجکشن ثمرہ کو غنودگی میں دھکیل رہا تھا۔

ڈاکٹر انہیں تسلی دیتے ہوئے چلا گیا۔ثمرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔انہیں لگا فاران کے ساتھ موحد کمرے میں آیا ہو۔انہوں نے دھندلاتی نظروں سے اس کے نقوش دیکھے۔

''اللہ کی امانت تھی ثمرہ! اللہ نے واپس لے لی' ہمارا شکوہ کرنا نہیں بنتا وہ اللہ ہے، مسبب الاسباب ہے۔بڑا بے نیاز ہے ثمرہ! اگر کچھ لیتا ہے تو اس سے زیادہ بخش دیتا ہے بندے کو۔''

انہوں نے نمیر کا ہاتھ تھام کر ثمرہ کے ہاتھ پر رکھا تو انہوں نے نم آنکھیں موند لیں' ذہن اس وقت کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا مگر ہاتھ میں تھمے اس ننھے ہاتھ نے ان کے دل میں ایک سکون سا بھر دیا تھا۔

☆☆☆

زرنگار کے برین ٹیومر کا بہت پیچیدہ آپریشن ہوا مگر اس دوران ان کی یادداشت بری طرح متاثر ہوئی۔فاران آفندی اپنی بینک میں بچی کھچی جمع پونجی کے ذریعے باہر جانے کا سوچ رہے تھے تب ثمرہ کے بھائی نے ان کی بہت مدد کی۔فاران شارجہ چلے گئے۔

ایک ڈیڑھ سال کا تکلیف بھرا وقت ثمرہ نے زرنگار اور نمیر کے ساتھ ان کے کرائے کے مکان میں گزارا اور اس کے بعد فاران نے کچھ قرض لے کر اور کچھ سال بھر میں جمع کر کے ان تینوں کو بھی شارجہ بلانے کا بندوبست کر لیا۔زندگی طوفان بلاخیز سے مقابلہ کرتے کرتے بالآخر پرسکون ہو گئی۔

زرنگار کی یادداشت جانا ایک المیہ تھا جو نمیر کو ساری زندگی کا ایک نہ ختم ہونے والا غم دے گیا اگر آغا جان یا صدیقہ تائی بروقت آپریشن کے لیے ان کی مالی معاونت کر دیتے تو ٹیومر اتنا نہ بڑھتا۔ثمرہ کی گود نمیر آفندی نے خالی ہونے سے بچالی۔ثمرہ نے اگر اسے ماں کا پیار دیا تو اس نے بھی صحیح معنوں میں ثمرہ اور فاران کو موحد آفندی بن کر دکھایا۔وہ سومیہ کا بہترین دوست تھا۔موحد کے روپ میں ہی سہی۔

زندگی تہہ در تہہ غم اور خوشیوں کے انبار لیے گزر رہی تھی۔راتوں کے ڈراؤنے خواب نمیر آفندی کو اس کا دکھ بھرا ماضی بھولنے نہیں دیتے تھے۔

جب گھر میں ایک بار پھر سے پاکستان جانے کا غلغلہ اٹھا۔تو وہ دم بخود رہ گیا۔ تب پہلے ثمرہ نے واپس جانے سے انکار کیا اس سرزمین سے ان کی بہت تلخ یادیں جڑی ہوئی تھیں اور نمیر کو تو یوں بھی آفندیز سے نفرت تھی۔وہ زندگی میں اب دوبارہ کبھی ان راہداریوں میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا جو بالکل آفندیز کے مزاج جیسی سرد اور ظالم تھیں۔مگر فاران آفندی کی ضد اور احترام میں ان دونوں کو فاران کا کہنا ماننا پڑا۔

مگر وائے قسمت..... فاران کو باپ سے دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوا مگر بعد میں ان ماں بیٹے کو فاران کی خواہش کے احترام میں واپس آنا پڑا۔زرنگار کو اچھے سے اولڈ ہاؤس میں داخل کروا دیا گیا۔

''میں ان سے نمیر بن کر نہیں ملنا چاہتا ماما!'' پاکستان آنے سے پہلے نمیر نے قطعی انداز میں ان سے کہا تو ان

کا دل ڈوب سا گیا۔

مگر وہ جانتی تھیں کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

اور اس کے بعد کا سارا کھیل نفرت اور انتقام کا تھا۔وہ وائس چینجر کے ذریعے مہر ماہ سے نمیر بن کر رابطہ کیا کرتا تھا ورنہ وہ شروع ہی میں اسے پہچان لیتی۔

☆☆☆

وہ مطمئن سا کرسی پر جھول رہا تھا۔آج اس ڈرامے کی اخیر ہوئی جو نمیر آفندی کے موحد بن کر اس گھر میں آنے کے بعد شروع ہوا تھا۔آغا جان کی متحیر نگاہ ساکت تھی۔

''بکواس مت کرو موحد! تم دونوں ماں بیٹا اول روز سے ملے ہوئے ہو اس خبیث شخص سے۔'' مبین آفندی نے حواس میں لوٹتے ہوئے دانت کچکچائے۔تائی جان کو ذرا حوصلہ ہوا تو وہ تلخی سے بولیں۔

''اس کی ماں کو بھی بڑی ہمدردی ہے وقار کی بیوی سے... مجھے تو لگتا ہے کہ ڈراما تب نہیں اب کھیلا جا رہا ہے۔''

اس قدر غیر متوقع صورت حال پر ہر کوئی دنگ تھا مگر آغا جان گم صم سے اس کا چہرہ دیکھے جاتے تھے جہاں اعتماد تھا اور عجیب سی چمک۔ثمرہ نے تاسف سے تائی جان کو دیکھا۔آسمان کا تھوکا آج اس عورت کے منہ پر آ گرا تھا مگر اس کے کس بل ڈھیلے نہ ہوئے تھے۔

نمیر نے ایک اچٹتی نگاہ جامد کھڑی مہرو پر ڈالی جو سفید پڑتی رنگت کے ساتھ اسی کو دیکھ اور سن رہی تھی۔اس کی ایک نگاہ میں کیا کیا نہ تھا... گزرے حالات کی اذیتیں.... اور باندھ لینے کا ہر تاثر۔

جیسے بہ زبان نگاہ کہہ رہا ہو کہ لو آج ہر وعدہ وفا ہوا.... وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر' وہ حساب آج چکا دیا۔

وہ جیب میں سے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر آگے جھکتے ہوئے میز کی سطح پر رکھ رہا تھا۔مہر ماہ کی نگاہ دھندلانے لگی۔وہ اس شخص سے نفرت کرتی تھی مگر اسے محبت بھی اسی شخص کے ایک روپ سے ہوئی تھی۔وائے قسمت.....

وہ نمیر آفندی تھا... موحد آفندی کا دوسرا رخ۔

''تم..... الو کے پٹھے... ہمارے بیچ رہ کر ہماری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپتے رہے تم۔''

اس نے دانت پیستے ہوئے مبین آفندی کو نمیر کی طرف بڑھتے دیکھا تو اسے لگا جیسے آنکھوں کے سامنے سفید سی دھند تیر گئی وہ وہیں اپنی جگہ پر ڈھے گئی۔تائی جان لپک کر اس کی ہتھیلیاں مسلنے لگیں۔ثمرہ اٹھ کر تیزی سے نمیر اور مبین آفندی کے بیچ آئیں۔مبین آفندی کا اٹھا ہوا ہاتھ انہوں نے جھٹک دیا۔

''خبردار..... خبردار جو کسی نے اس کا بال بھی بیکا کرنے کی کوشش کی ہو تو..... میں اپنے موحد کو ایک بار کھو چکی ہوں لیکن اس بار میں حشر مچا دوں گی' یاد رکھیے گا آپ سب۔''

سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے ثمرہ نے غراتے ہوئے غضب آمیز لہجے میں کہا۔

مبین آفندی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے نمیر تیزی سے خود سے بے خبر گھاس پر گری مہر ماہ کی طرف بڑھا۔اس کا مطمع نظر جان کر تائی جان چیخیں۔

''دور رہو میری بچی سے.... زندگی تو برباد کر ہی چکے ہو اس کی. اب کیا جان بھی لو گے۔''

''میری بیوی ہے یہ۔'' اس کا انداز معتدل تھا. وہ مہر ماہ کی طرف سے پریشان تھا اور اس وقت بس اسے

ہوش میں دیکھنا چاہتا تھا۔
''دفع ہو جاؤ تم۔ کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا اس کے ساتھ۔ اب تو سامنے آ گئی ہے اصلیت..... کل ہی خلع کا مقدمہ کروانی ہوں میں۔''
تائی جان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان کا تو دھاڑیں مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا' کیا ہی جوتا پڑا تھا ان کے منہ پر۔ جس کی ولدیت کو ہی وہ مشکوک کہا کرتی تھیں۔ آج وہ ان کے سامنے داماد کے طور پر موجود تھا۔ سائرہ چچی لطف لینے والی نظروں سے سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ مہرو ذرا حواس میں لوٹی تو وہ ازراہ ہمدردی اسے سہارا دے کر اندر لے گئیں۔

''تم..... تم دھوکا دیتے رہے ہو مجھے... ہم سب کو۔ موحد بن کر؟'' آغا جان کو اس کا نمیر کی آئی ڈی والا آئی ڈی کارڈ دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا تھا' ان کا لہجہ لڑکھڑا گیا۔
''دھوکا؟'' وہ استہزائیہ انداز سے کہتا ان کی طرف پلٹا۔ ''یہ ماں ہیں میری۔'' اس نے ثمرہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک مرتی ہوئی ماں کو بچانے کی خاطر موحد بنا تھا میں۔ اگر نمیر بنتا تو کبھی اس گھر میں قدم بھی نہ رکھتا۔ اس گھر کے مکینوں اور اس کے در و دیوار سے نفرت ہے مجھے۔''
وہ زہر خند لہجے میں بولتا انہیں سناٹے میں دھکیل گیا۔ انہیں لگا ان کا دل پھٹ گیا ہو۔
''گولی مار دیں اسے آغا جان! سڑکوں پر رولا ہے اس نے ہمارے گھر کی عزت کو۔''
سہیل آفندی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اور آغا جان تو گنگ سے تھے.... وہ اول روز سے موحد آفندی بن کر ان کے پاس آیا تھا اور انہوں نے اس کے بچپن کی محرومیوں کے ازالے کے طور پر اس سے بے پناہ محبت کی تھی....
تو کیا محبت صرف نام کی بنیاد پر ہوا کرتی ہے؟
''مگر بہت افسوس ہے مجھے کہ میں نمیر آفندی بن ہی نہیں پایا... نفرت میں آفندیز سے بازی نہیں لے پایا میں۔'' وہ حد درجہ متاسف تھا۔
''بکواس کرتے ہو تم... میرے گھر کا شیرازہ بکھیر کر بھی معصوم بن رہے ہو تم۔'' مبین آفندی اسے کچا چبا جانے کو تھے۔
''بھائی صاحب! بس کر دیں.... کون سا شیرازہ بکھر گیا ہے آپ کے گھر کا۔ ملاحہ کے چہرے کی خوشی دیکھی ہے آپ نے؟ کہیں اور شادی کرتے تو مر جاتی وہ۔ نمیر نے تو اس کا بھائی ہونے کا حق ادا کیا ہے۔''
''اور مہرو.... اغوا کیا تھا اس ذلیل نے اسے۔ زبردستی کا نکاح... اور آپ کہتی ہیں کہ یہ بے قصور ہے۔'' مبین آفندی کی مارے صدمے کے آواز ہی گم ہو گئی۔ تائی جان دوپٹے میں منہ دیے پھپھک کر رو دیں۔
''بدلہ لینے والا ہوتا تو نکاح کے بعد مہرو کو گھر واپس نہ چھوڑتا بھائی صاحب!'' ثمرہ نے چبھتے لہجے میں کہا تو ان کی بات کی گہرائی میں اتر کر مبین صاحب کا چہرہ رنگ بدل گیا۔
''بدلہ لے ہی تو نہیں پایا کسی سے یہ..... کبھی مہرو کی فکر..... کبھی ملاحہ کا دھیان..... وقار آفندی کا خون ہے نا اس کی رگوں میں اور زرنگار کی تربیت کا اثر، تو آپ لوگوں کی طرح سخت دل نہیں بن پایا اور نہ ہی ظالم۔'' ثمرہ نے تلخ لہجے میں کہا تو آغا جان کا چہرہ ضبط کے مارے سرخ پڑ گیا۔
''اپنی ماں کو لو اور اس گھر کو صبح ہونے سے پہلے چھوڑ دو۔'' انہوں نے نمیر کو اٹل لہجے میں حکم سنایا تو ثمرہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔

''کیا نام بدلنے سے جذبات بھی بدل جایا کرتے ہیں آغا جان!'' ثمرہ نے گویا ان کے دل کی بات بوجھ لی۔
''اگر یہ موحد آفندی بنا رہتا تو آپ ساری زندگی اس سے محبت کرتے رہتے۔ کیونکہ یہ آپ کا اکلوتا پوتا ہے... لیکن کیونکہ اب یہ نمیر ثابت ہو گیا ہے تو آپ کو اس سے نفرت ہو گئی ہے.... چہ خوب۔'' وہ استہزائیہ انداز سے مسکرائیں۔
''کسی سے نفرت کرنے کے لیے ہمیں بدگمانی کا بس ایک پل چاہیے ہوتا ہے اور محبت کرنے میں ہم برسوں لگا دیتے ہیں۔ دل بدلنا ہی تھا تو نمیر کی محبت میں بدلتے آغا جان! وقار آفندی کا بیٹا ہے یہ۔''
آغا جان تو اس پل نمیر کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ درحقیقت وہ اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہ رہے تھے کہ وہ ان کا موحد نہیں تھا۔
''تم سب جا سکتے ہو... دفع ہو جاؤ سب۔ کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا میں۔ مار دیا ہے تم سب نے آغا ذوالفقار کو۔ روند ڈالا ہے اس کی جاہ و حشمت کو چوراہے پر۔''
''میں تو کہتا ہوں کہ دھوکا دہی کے الزام میں اندر کروائیں اسے۔ ثابت کر دیا اس نے کہ اس کی رگوں میں کس کا خون.....'' سہیل آفندی کے زہر خند جملے کو نمیر نے غرا کر کاٹا تھا۔
''مائنڈ یور لینگویج مسٹر سہیل آفندی! میری رگوں میں آپ ہی کا ''خاندانی'' خون دوڑ رہا ہے۔ میرے خون کو گالی دیں گے تو آپ سیب کو جائے گی۔'' وہ دھاڑتے ہوئے ان کی بات کاٹ گیا پھر آغا جان کی طرف پلٹا اور گویا یاددہانی کراتے ہوئے تلخی سے بولا۔
''دیکھ لیجیے گا..... آپ کا بینک بیلنس، آپ کا بزنس' آپ کا یہ عالی شان رہن سہن سب اسی طرح برقرار ہے جو لیا تھا سب واپس کر دیا کیونکہ میں آفندی نہیں بن پایا۔ باپ کے خون نے اتنا اثر نہیں کیا جتنا ماں کی تربیت نے کر دیا۔ جائیے معاف کیا آپ کو۔'' اس کا انداز کمال کا استہزائیہ تھا کوئی اور دیکھتا تو اش اش کر اٹھتا۔ آغا جان

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو

نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں

میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی

فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم

تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

نے نگاہ پھیر لی۔
''مبین، سہیل! اس سے کہو، دفع ہو جائے۔ جیتے جی مار ڈالا ہے اس نے مجھے.... کس پر محبت لٹاتا رہا میں۔'' وہ متاسف تھے۔
''یہ دھوکا نہیں تھا آغا جان! خون کی کشش نہ ہوتی تو نمیر کو کبھی اتنا پیار نہ دیتے آپ۔ مان کیوں نہیں لیتے کہ وقار دکھائی دیا تھا اس میں آپ کو۔'' ثمرہ نے کہا۔
''کل تک یہ سب مجھے اس گھر میں دکھائی نہ دیں اور مبین! تم کل اول فرصت میں طلاق کے کاغذات پر سائن کرواؤ اس سے۔ ہماری عزت گوارا نہیں کرتی کہ ہم ایک دھوکے باز سے رشتہ استوار رکھیں۔'' وہیل چیئر کا رخ اندر کی طرف موڑتے ہوئے وہ قطعی انداز میں کہہ رہے تھے۔
''یہ بھول ہے آپ لوگوں کی۔'' وہ پیچھے سے اونچی آواز میں بولا تو لب ولہجہ چیلنجنگ تھا۔
''یہ گھر تو میں چھوڑ جاؤں گا مگر مجھ سے منسلک سب لوگ میرے ساتھ جائیں گے۔''
''شٹ اپ..... جتنا کھیل کھیلنا تھا' تم نے کھیل لیا۔ اب میری بیٹی کا نام بھی اپنی زبان پر لائے تو اچھا نہیں ہوگا۔'' مبین آفندی بھڑکے۔ آغا جان اپنا حکم سنا کر نمیر کی بات سننے کے بعد بھی رکے نہیں تھے۔
وہ رونا چاہتے تھے شاید..... کسی کونے میں جا کر۔ جہاں ان کی شکست سے کوئی واقف نہ ہو سکے۔ کمرے میں جا کر وہ بدقت وہیل چیئر سے اٹھ کر بستر پر گر سے گئے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ تھوڑا بہت چلتے بھی تھے اور جسمانی و اعصابی کمزوری بھی دور ہو رہی تھی مگر آج لگنے والا جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ اب ان کا پورا جسم غم و غصے سے کپکپا رہا تھا۔ وہ نمیر کو اس کے منہ پر گالیاں دینا چاہتے تھے مگر نہیں دے پائے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے گندا خون اور کسی اور کی اولاد کہنا چاہتے تھے مگر نہیں کہہ پائے اور اب جبکہ انہیں وہیں رک کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے ان کا وجود لرز رہا تھا اور آنکھیں نمی سے جل رہی تھیں۔
''موحد!'' وہ بچوں کی طرح بلک اٹھے۔ دل کی پراگندگی کو نکلنے کا ایک بہانا مل گیا۔ ان کا موحد مر چکا تھا۔ کہنے کو چودہ، پندرہ سال پہلے..... مگر ان کے لیے آج ہی۔

☆☆☆

وہ تن فن کرتی کمرے میں آئیں تو مہرو گم صم سی لیٹی تھی۔
''اب بتاؤ..... تم بھی ملی ہوئی تھیں ثمرہ اور اس کے بیٹے سے۔ تم بھی واقف تھیں ان کے راز سے؟'' مہرو متوحش ہو کر سیدھی ہو بیٹھی۔
''مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ مجھے موحد بن کر دھوکا دے رہا ہے امی!'' مہر ماہ نے آدھا سچ بولا۔
''غضب خدا کا۔'' انہوں نے بے بسی سے ماتھا پیٹ لیا۔
''فلموں اور ڈراموں میں دیکھا کرتے تھے یہ سب۔ کتنی دیدہ دلیری سے ہمارے گھر میں گھسا سب کی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔''
مہر ماہ کا دل دکھی تھا۔ وہ بھی تو اس روز ریسٹورنٹ میں موحد کو نمیر کے روپ میں دیکھ کر یوں ہی شاکڈ رہ گئی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ موحد اسے دوست کے روپ میں ایسا دھوکا بھی دے سکتا تھا۔
مگر پھر کیا کرتی..... پیروں میں مجبوریوں کی زنجیر پڑ گئی۔ زرنگار کو دیکھتی تو ہر چیخ حلق میں اٹک جاتی۔ ثمرہ نے مکمل کہانی سنائی تو موحد کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا غم اس کے سینے پر بھی ہاتھ مارنے لگا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی اصلیت کسی کو نہ بتا پائی تھی۔ وہ ثمرہ سے چاہ کر بھی ان کا موحد دوبارہ نہ چھین پائی تھی۔

''آغا جان کہاں ہیں؟'' مہرو نے ذہن سے سب کچھ جھٹکتے ہوئے پوچھا۔
''آغا جان تو اللہ جانے اس صدمے کو کیسے سہیں گے۔ بہت شوق تھا انہیں پوتے کا۔ ہونہہ! اللہ نے اچھی سزا دی۔ اب ان سب کو گھر سے نکلنے کا آرڈر ہوا ہے اور شکر ہے کہ یہ سامنے آ گیا۔ کم از کم اب تمہاری طلاق والا معاملہ تو حل ہو ہی جائے گا۔'' وہ تنفر سے بولیں تو مہر ماہ سناٹے میں رہ گئی۔
''کہہ رہا تھا کہ خود سے جڑے تمام رشتوں کو ساتھ لے کر جائے گا.... ہم بھی یہیں ہیں اور یہ بھی۔ دیکھتی ہوں میں، کیسے لے کر جاتا ہے تمہیں ساتھ..... بھلا اغوا اور زور زبردستی سے ہونے والے نکاح کی بھی کوئی حقیقت ہوا کرتی ہے۔''
تائی جان اپنے اندرونی خلفشار کو مسلسل بول کر ختم کر رہی تھیں مگر ان کی لاڈلی کیسے بت بن گئی تھی' یہ انہوں نے غور نہ کیا تھا۔

☆☆☆

آغا جان لٹے پٹے بیٹھے تھے۔ صحیح معنوں میں تو وہ آج خالی ہوئے تھے..... اندر تک۔
''آپ نے اس کمینے کو اتنی آسانی سے جانے کا کہہ دیا آغا جان! جیل میں ڈلوانے کا اچھا موقع تھا۔'' سہیل آفندی کا خون ابل رہا تھا۔ وہ کل کا چھوکرا کیسے ان کے پاس رہ کر انگلیوں پر نچاتا رہا تھا اور وہ سب بے وقوف بنتے رہے۔
''جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے ''ہو چکے'' کا ماتم کب تک مناتے رہو گے۔'' وہ اب سنبھل چکے تھے۔ ہنکارا بھر کر بولے تو سہیل آفندی کے چہرے پر ناپسندیدہ تاثرات ابھرے۔
''آگے کا تو بھائی صاحب سے پوچھیں' ان کی تو دامادی میں ہے۔ میرا تو ابھی تک سر چکرا رہا ہے اس موحد اور نمیر کے چکر میں۔''
مبین آفندی کا چہرہ لال ہوا۔
''شوق سے دامادی میں نہیں لیا اسے میں نے۔ حرام خوری کی ہے اس نے۔ پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولے تو آغا جان کے خون میں جیسے یکا یک ابال آیا۔
''بکواس بند کرواپنی..... اور سیدھا حل بتاؤ۔''

وہ دھاڑے تھے۔ ساری رات کی جاگتی اور غم مناتی آنکھیں فجر کے اس پل لال انگارہ ہو رہی تھیں۔
''میں اسے دھوکا دہی کے جرم میں سخت سزا دلوانا چاہتا ہوں آغا جان!'' مبین آفندی سے تو یہ دھوکا دہی برداشت ہی نہ ہو رہی تھی۔
(اس نے اپنے باپ کو کسمپرسی کی حالت میں مرتے دیکھا ہے آغا جان! اپنی ماں کو جیتے جی کھو دیا۔ سامنے ہو کر بھی وہ اسے پہچان نہیں پاتی۔ اس کی مہربانی ہے کہ مجھ جیسی نفسیاتی کیس بن چکی ماں کے لیے وہ اپنا نام چھوڑ کر موحد بن گیا)
ان کی سماعتوں میں ثمرہ کی دکھ میں ڈوبی آواز ٹکرا رہی تھی۔ رات گئے ایک ماں اپنے بیٹے کا مقدمہ لڑنے ان کی عدالت میں آئی تھی۔
''ایک ایک پائی وصول کریں اس سے.... اس کا اکاؤنٹ چیک کروائیں پھر یہاں سے لات مار کر نکالیں اسے اور اس کی ماں کو... کیا گند کھایا تھا وقار نے سالوں پہلے۔ بھگتان ہمیں بھرنا پڑ رہا ہے۔'' سہیل آفندی اب کھل کر اظہار رائے کیا کرتے تھے۔

(برسوں سے زرنگار آپ کے بیٹے کی عزت سنبھال کر بیٹھی ہے۔ طوائف ہوتی تو اپنے عیش وعشرت میں واپس لوٹ جاتی. غربت کا ذائقہ تو آپ کے بیٹے کی زندگی میں آنے کے بعد چکھا تھا اس نے اور سلام ہے اس کی ہمت کو فاقے کاٹ کر بھی دوبارہ ان گلی کوچوں میں واپس نہیں لوٹی) ان کا دھیان بھٹکا۔

''میں ہر حالت میں مہر ماہ کی طلاق چاہتا ہوں آغا جان! اس کے بعد اسے یہاں سے جانے کی اجازت دی جائے۔ ابھی اسے منہ زبانی طلاق دے باقی کی خانہ پری بعد میں ہوتی رہے گی۔'' مبین آفندی کی انا مچلی گئی تھی وہ تو بس ابھی اور اسی وقت آر یا پار والا فیصلہ چاہتے تھے۔

(مانا کہ اس کا مہرو سے زبردستی نکاح کا فیصلہ بالکل غلط تھا اور مجھے بتائے بنا تھا لیکن اس نے مہرو سے اس بات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ موحد سمجھ کر آپ لوگوں نے دوبارہ اسی کے ساتھ مہرو کا نکاح کروایا تھا۔ مگر وہ مہر ماہ کو دھوکے میں رکھ کر کوئی تعلق استوار نہیں کرنا چاہتا)۔

''ہمم.....'' وہ کھنکھارے، جیسے ذہن پر سے کچھ جھٹکا ہو۔

''ابھی اسے اس گھر سے مت نکلنے دو۔ ہر بات کا فیصلہ کرنے کے بعد ہی آخری قدم اٹھانا بہتر ہوگا'' آغا جان نے کہا تو مبین آفندی کو اطمینان ہوا وہ مہر ماہ کی طلاق لیے بنا نمیر کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے اس خبیث کا کیا بھروسا..... آگے بھی ان سب کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتا۔ سہیل آفندی کے تاثرات بگڑے۔

''دن چڑھتا ہے تو مہرو کو بھیجو میرے پاس۔'' وہ کہتے ہوئے لیٹ گئے درحقیقت ان کے اعصاب تھک گئے تھے یہ جھٹکا ان کے جوڑ جوڑ کو ہلا گیا تھا۔

☆☆☆

میں اپنے لہجے کی تلخیوں سے!!
تمھارے خوابوں کے سارے موسم جلا رہا تھا
میں اپنے لفظوں کے روکھے پن سے!!
تمہارے اُجڑے چمن کو اَبتر بنا رہا تھا
میں اپنے اندر کی ہر تھکن کو!!
تمہارے بوجھل بدن کی زینت بنا رہا تھا

میں اپنے دامن میں خوشیاں بھر کے!!
تمہارے دل میں دُکھوں کا میلہ سجا رہا تھا
برا نہیں میں بہت برا ہوں!!
وفا کے دامن پہ داغ کہہ لو!!
جو سب سے گندا لقب تمہارے خیال میں ہے
میں اس لقب سے بھی آگے خود کو سمجھ رہا ہوں
جو تم نے سوچا، مجھے بھی اس پہ گماں نہیں ہے
''میں جب سے اب تک وہیں کھڑا ہوں''
جو فاصلہ ہے تمہارے قدموں کا طے شدہ ہے
ذرا رکو تم!! سنو
جو تم کہو گے وہی چلے گا!!

(عائبی مکھنوی)

مہر ماہ نے موبائل اسکرین پر سانس روک کر پڑھا اور پھر سے چھت پر ٹہلنے لگی۔ دل بہت اداس تھا اور بوجھل بھی۔ فجر پڑھ کر تلاوت سے فارغ ہوئی تو حسب عادت و معمول تازہ ہوا میں سانس لینے کی غرض سے چھت پر چلی آئی۔ شاید اسی طرح اندر کی گھٹن کچھ کم ہوتی مگر اس کے بھیجے الفاظ پڑھ کر دل اور بھی کڑھنے لگا پھر کچھ سوچ کر بہت تنفر سے اس نے منہ توڑ جواب بھیجا۔

اپنے حصے کی چال تم چل بیٹھے
ہمارے منتظر رہنا، کہانی ختم کرنی ہے

وہ پھر سے ٹہلنے لگی۔ وہ اس شخص کو کبھی بھی معاف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے رخ پلٹا تو اس سے ٹکراتے ہوئے بمشکل بچی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' سنبھلتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''میں تمہاری کہانی سننے آیا ہوں۔ تم نے اینڈ کیا لکھا ہے اس کا؟'' وہ اس کا میسج پڑھ کر آیا تھا۔

''اور میں نے تم سے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری کہانی میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہے۔'' وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔ نمیر نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ سیاہ اور سفید لباس میں ملبوس سینے پر بازو لپیٹے کھڑی وہ زرد لگ رہی تھی اور اکھڑ بھی۔

''وہ تو تم نے موحد سے کہا تھا۔''

''ہاہ..... وہ موحد جو کبھی تھا ہی نہیں۔'' مہرو کا دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہا۔ مگر اس سنگ دل کے سامنے ایک آنسو بہانا بھی اسے اپنی توہین لگ رہا تھا۔ مارے ضبط کے آنکھیں گلابی ہو گئیں۔

''اب تو تم نمیر بن چکے ہو..... نمیر آفندی۔'' اسے جتایا۔

''نام بدلنے سے رشتہ نہیں بدل گیا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''مگر حالات و واقعات ضرور بدل جاتے ہیں اور بعض اوقات نظریات بھی۔'' وہ تلخ ہوئی۔

''تم جانتے ہو کہ یہ رشتہ صرف تمہاری مرضی سے جُڑا تھا۔''

اس نے دفعتاً مہر ماہ کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ ہک دک ہوئی پھر لال بھبھوکا ہوتے چہرے کے ساتھ اپنے ہاتھ کھینچے مگر نمیر نے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے۔

''جب تک موحد تھا تب تک اس حق کو استعمال نہیں کیا میں نے۔'' وہ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ مہر ماہ کو غصہ آیا۔

''تم اب بھی کوئی حق نہیں رکھتے اس بات کا۔'' اس نے نمیر کے ہاتھ جھٹکے مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

''میں نمیر کی حیثیت سے یہ ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔''

''تو شب خون کیوں مارا... سامنے آتے بتاتے کہ میں ہوں نمیر.... اتنے تم شہزادے تھے نا کہ میں فوراً مرمٹتی اور ہامی بھر لیتی اس نکاح کی۔'' وہ چیخی۔

''تب تک یہ نکاح محض ایک بدلہ تھا۔'' اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر دکھ سے بولی۔

''ہاں..... یہی کہنا چاہتی ہوں میں بھی کہ یہ ایک بدلہ ہی تھا۔ اسے اب کسی اور رشتے میں بدلنے کی کوشش مت کرو۔''

''قسمت سے بندھا ہے یہ رشتہ مہر! ورنہ اللہ تمہارے بارے میں میرے دل کو کیوں بدلتا؟''

BOOKS PK Books & Magazines

''مجھے لفظوں کے جال میں مت الجھاؤ نمیر! اور ہاتھ چھوڑو میرے۔'' وہ سختی سے بولی۔

''تم وجہ بنی ہو میرے دل' میرے خیالات کو بدلنے کی مہرو... ورنہ کیا میں ملاحہ کا بھائی بن پاتا؟ کبیر کے مسائل سے میرا کیا لینا دینا تھا لیکن میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا... تم سے تمہاری خوشیاں چھینی تھیں تو تمہاری بہن کے ذریعے تمہیں تھوڑی سی خوشی لوٹانے کی کوشش کی ....اور یہ لو.....چھوڑ دیے یہ ہاتھ۔'' اس نے بات کرتے کرتے اچانک سے تھوڑا اونچے کر کے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

''جو چاہو فیصلہ کرو مگر یہ یاد رکھنا مہر ماہ آفندی! کہ میں ساری عمر اس رشتے کو نبھانا چاہتا تھا۔'' وہ دکھ سے بوجھل لہجے میں کہتا واپس پلٹ گیا۔ مہر ماہ گم صم سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ مہر بہ لب آغا جان کے سامنے موجود تھی۔ کمرے میں بالکل خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ صدیقہ بیگم کو دادا پوتی کی اس خوف ناک خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ بے آرامی سے پہلو بدل کر انہوں نے مہرو کو گھورا. پھر انہوں نے خود ہی کھنکھار کر بات شروع کی۔

''اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے آغا جان! مہرو کی جان چھڑائیں اس شخص سے اور ان ماں بیٹے کو دھکے دے کر نکالیں یہاں سے۔''

مہر ماہ نے سلگتی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ مارے ضبط کے اس کی ناک کی نوک سرخ پڑنے لگی۔ آنسو پلکوں کے کناروں تک آئے تھے۔

''یہی .....آپ کی یہی سنگ دلی مجھے بدلے کی اس لڑائی میں پیس گئی امی! کیوں دھکے دے کر نکالیں۔ ان کا بھی یہاں اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا' وقار چچا بھی آغا جان کی اولاد ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی تو صدیقہ بیگم ہک دک سی اسے دیکھنے لگیں آنسو مہر ماہ کی پلکوں کی نوک تک آئے۔

''بس کر دیں اب امی! خدا کے لیے۔ وہ یہاں اپنی شناخت کے لیے آیا تھا۔ بدلہ لینے کے لیے میدان میں اترا تو وہ بھی ڈھنگ سے نہیں لے پایا اور آپ اب بھی اس شخص کو سمجھ نہیں پا رہیں۔''

''سارا پیسہ لوٹ لیا تھا اس نے ہمارا، موحد بن کر۔''

''مان لیا.....سارا پیسہ لوٹا تھا اس نے مگر یہ نظر نہیں آتا آپ کو کہ آپ ہی کی بیٹی کی خوشیوں کی ضمانت بنا کر وہ پیسہ پھر سے لوٹا دیا تھا اس نے۔ فقط ملاحہ کی خوشی کی خاطر۔'' وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے تلخ ہوئی۔

''واہ.....کیا خوب خوشیاں ڈھونڈی ہیں اس نے میری بیٹی کے لیے.....ایک ڈرائیور۔'' انہوں نے کہا۔

''وہ آپ کی اپنی بیٹی کی پسند تھا امی! نمیر نے اسے خود ملاحہ کے لیے نہیں چنا بلکہ صرف اسے باعزت طور پر رخصت کیا تھا۔'' اس نے بات نہیں کی تھی گویا ان کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا۔ وہ بلبلا اٹھیں۔

''منہ توڑ دوں گی میں تمہارا.....آغا جان دیکھ رہے ہیں اس کی زبان درازی۔''

''آغا جان بھی اس درد سے گزرے ہیں امی! ایک بہت قریبی رشتہ کھونے جا رہا ہے ان کا۔'' وہ دکھ سے بولی۔

''تم اپنی بات کرو.....ارادے تو تمہارے بھی مجھے اچھے نہیں لگ رہے۔'' انہوں نے آغا جان کی مسلسل خاموشی پر دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے دانت پیسے۔

''میرا فیصلہ آغا جان کریں گے۔'' وہ ایک دم سے قطعی انداز میں بولی تو آغا جان کے ساتھ ساتھ صدیقہ بیگم بھی متحیر رہ گئیں۔

''میں تو ابھی تک خود کو یہی سمجھا نہیں پا رہا کہ وہ میرا موحد نہیں ہے۔''

''اور میں بھی۔'' وہ بے اختیار بولی پھر خفیف سی ہو کر متاسفانہ گویا ہوئی۔

''میں بھی اسے معاف نہیں کر پائی۔ لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ آپ کبھی بھی خود کو یہ باور نہیں کروا سکیں گے آغا جان! کیونکہ آپ نے اسی میں موحد کا روپ دیکھا ہے' اس سے بنا کسی غرض کے محبت کی ہے۔''

''وہ محبت موحد کے لیے تھی۔'' تائی جان جلبلا کر بولیں۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا اپنی ''وکیل صفائی'' بنی بیٹی کو دو چار جڑ دیتیں۔ اوپر سے آغا جان کی خاموشی بھی نظر انداز کیے جانے والی نہیں تھی۔ مزاج کے خلاف باتوں پر تو وہ سب کو جھاڑ کر رکھ دیا کرتے تھے.....پھر ان باتوں کو برداشت کرنا.....بہت معنی خیز تھا۔

''اولاد ہو یا اولاد کی اولاد.....ان کے وجود سے ایک سی خوشبو پھوٹا کرتی ہے آغا جان! نام بدلنے سے رشتوں پر فرق نہیں پڑا کرتا اور نہ جذبات پر۔''

یہ مہر ماہ کی آخری بات تھی جس نے آغا جان کو سُن کر دیا۔

''وکیل کو بلاؤ سہیل! میں وصیت میں کچھ تبدیلیاں کروانا چاہتا ہوں۔'' آغا جان نے ایک طویل خاموشی کے بعد سہیل آفندی سے کہا تو وہ چونکے۔ پہلے معنی خیز نظروں سے بھائی کو دیکھا پھر آغا جان کو۔

''اس قدر افراتفری میں کیا تبدیلی کروائیں گے اب آغا جان!'' انہوں نے ناگواری دباتے ہوئے دبا دبا سا اعتراض کیا تو آغا جان نے ابرو اچکا کر تیکھی نگاہ ان پر ڈالی۔

''تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''جی ہاں.....ہے اعتراض۔'' وہ ایک دم سرد مہری سے بولے تو آغا جان دنگ رہ گئے۔

''یہ سب کچھ ہماری محنت کی کمائی سے بنا ہے اگر آپ اس وہم میں ہیں کہ ترس کھا کر اپنے اس نام نہاد پوتے کو اس کے باپ کا حصہ دے دیں گے تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔''

سہیل آفندی یک دم ہی بل سے باہر آئے تھے. آغا جان تو ایک طرف رہے، دل میں ان کی ہر بات سے متفق ہونے کے باوجود مبین آفندی بھی تیورا کر بے یقینی سے ان کو دیکھنے لگے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم.....ابھی میں زندہ ہوں جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہوں۔''

''آپ بزنس اور جائیداد کے تمام فیصلوں کا اختیار مجھے دے چکے ہیں آغا جان! شاید آپ بھول رہے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول
شائع ہو گئے ہیں
☆ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم راحت جبیں قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز قیمت: -/400 روپے
خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہیں۔'' سہیل آفندی کی اکھڑ لہجے میں کہی بات نے انہیں سناٹے میں دھکیل دیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو سہیل!'' مبین آفندی نے انہیں ٹوکا۔

''آپ چپ چاپ یہ سب برداشت کر سکتے ہیں مگر میں اب ہاتھ آیا سرمایہ نہیں چھوڑ سکتا بھائی صاحب! میری بچیاں، میرے داماد سب وارث ہوں گے۔ یہ ساری جائیداد ہم نے لٹانے کے لیے نہیں کمائی۔''

وہ دوٹوک بولے تو آغا جان دکھ سے مدھم سا مسکرائے۔

''واہ..... شاباش..... بہت خوب میرے بیٹے!'' وہ جیسے خود اذیتی پر اُترے۔ ''ایک تم ہو جس کی تربیت میں نے کی۔ تمہیں بہترین کھلایا پلایا اور آج تم میرے مدمقابل آ کھڑے ہوئے ہو اور ایک وہ ہے..... جو ساری عمر راندہ درگاہ رہا اور پھر بھی ہاتھ آیا سارا پیسہ، کاروبار ایک ہی وار میں واپس لوٹا دیا..... چہ خوب..... واقعی۔''

ان کا وار اس قدر کاری تھا کہ سہیل آفندی کی پیشانی چمک اٹھی. مگر نرم پڑنے کا مطلب تھا' نمیر آفندی کو قبول کرنا.....

''آپ جو بھی کہیں آغا جان! مگر میں اسے قبول کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔'' انہوں نے اکھڑ لہجے میں کہا تو آغا جان نے آنکھیں موندتے ہوئے مبین آفندی کو مخاطب کیا۔

''مبین! وکیل کو بلاؤ۔ مجھے کچھ بڑے فیصلے کرنے ہیں۔'' سہیل آفندی کو یکبارگی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ آغا جان جب چاہتے پاور آف اٹارنی واپس لے سکتے تھے۔ ان کے جیتے جی تو سہیل کو اس قدر من مانی کا سوچنا بھی نہیں چاہیئے تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

☆☆☆

ٹوٹا ہوں اتنی بار کہ گنتا نہیں ہوں اب
چھوڑو میرے وجود کو جُڑتا نہیں ہوں اب
ماریں گی اب یہ کیا مجھے نفرت کی برچھیاں
مارا ہے اتنی بار کہ مرتا نہیں ہوں اب

مہر ماہ نے موبائل آف کر کے پرے ڈال دیا. وہ دل کو اس راہ پر چلانا ہی نہیں چاہتی تھی' اسی لیے آغا جان کو اپنے تمام فیصلوں کا اختیار دے آئی تھی۔

مگر یہ دل..... نجانے کیوں..... تب سے جہاں دل تھا وہاں اب صرف درد تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آغا جان کا فیصلہ کیا ہوگا۔

وہ چائے کا پین رکھ کر پلٹی تو نمیر کو تیز قدموں سے کچن میں داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مہر ماہ کا بازو بے دردی سے جکڑا۔

''تم..... تم نے اختیار دیا تھا آغا جان کو ہماری زندگی کے فیصلے کا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے اسے قدرے جھنجوڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور مہر وجانتی تھی' آغا جان نے کیا فیصلہ کیا ہوگا' اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''وہ تمہیں مجھ سے چھین لیں گے مہر! یہ جنگ تمہاری وجہ سے ختم کی ہے میں نے اور تم.....''

وہ کہہ رہا تھا اور مہر ماہ..... جسے صدیقہ بیگم بتا چکی تھیں کہ آغا جان نے وکیل کو طلاق کے پیپرز لے کر آنے کا کہہ دیا ہے اس کی گرفت میں ہی حواس کھو بیٹھی تو وہ گھبرا کر اسے سنبھالتا رہ گیا۔

(آخری قسط اگلے ماہ ان شاءاللہ)

فاخرہ جبیں

تو سہ ایک دو ہے تین

بہت ہولے سے ہوا چلی اور دھان کی نازک فصل دور تک لچکتی چلی گئی..... جیسے کنواری دوشیزہ محبوب کی پہلی نگاہ پر شرماتی' لجاتی، جھکتی چلی جاتی ہے۔ کھڑکی میں بیٹھی منشا نے یہ منظر دیکھا تو بے اختیار ہی اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس کی۔ باہر کے منظر سے نظر ہٹا کر اس نے گود میں لیٹے بلاول کو دیکھا۔ جو دودھ پیتے پیتے سو چکا تھا۔ سفید شرٹ، نیکر میں صحت مند اور تندرست بلاول جو خوب

صورتی اور قد، میں اپنے باپ پر گیا تھا۔

منشا نے ہولے سے اسے خود سے جدا کیا اور چارپائی پر لٹا کر خود باہر آ گئی..... ہاڑ کا سورج تپ رہا تھا..... ذرا سی دیر میں دھرتی کو بھی سلگا کے رکھ دیتا۔

اسے اپنے جانوروں کو چارہ، پانی دے کر چھاؤں میں کرنا تھا..... دوپہر کی ہانڈی روٹی کرنی تھی۔

ابا آج صبح سے نکلا..... اور ابھی تک نہ لوٹا تھا۔

ہوا چل رہی تھی..... تیز، گرم لو جیسی نہ تھی..... ہولی سی گرماہٹ لیے..... کسی بہت ہی پرانی گوڑھی سہیلی کی طرح چٹکیاں لیتی..... کچھ کہتی..... کچھ سرگوشیاں کرتی..... منشا کے بدن کو چھوتی تو وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر کھڑی ہو جاتی..... فصلوں سے پرے دور تک نظر دوڑائی..... عجب بے قراری روئیں روئیں میں بھری تھی..... انگ انگ میں جیسے درد بھرا تھا..... کسی کام میں دل نہ لگا تو وہ بان کی کھری چارپائی پہ آ لیٹی..... بالکل سیدھی چت.....

پیپل کے گھنے درخت میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں چھن چھن کر اس کے چہرے پر آ رہی تھیں۔ اسے یاد آیا..... سہاگ رات میں ایسا ہی جھلمل گوٹے کناری والا ڈوپٹا اوڑھا تھا اس نے۔ جس کے سونے جیسے رنگ نے اس کے نوخیز بدن کو دمکا دیا تھا۔ اور اب یہ جگ مگ کرنیں اسے گدگدا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں موندیں اور پھر دونوں بازو پھیلا کر چارپائی کی وسعت کو محسوس کیا۔

اور جب ایسی ہی کسی خاموش گرم دوپہر میں وہ شرارت سے اس کے برابر آ لیٹتا تھا تو چارپائی چھوٹی پڑ جاتی تھی۔

ہائے..... اور اب..... فصلوں سے پرے..... ریل کی پٹڑی کے اس پار، نہر کے قریب جو قبرستان تھا۔ اس میں سب سے بڑی اور سب سے جوان قبر اس کی تھی۔ اس کے سر کے سائیں محمود حسین کی۔ جسے اس سے بچھڑے دن، مہینے، سال نہیں، صدیاں بیت گئی تھیں۔

''منشے..... او منشے!'' ابا اسے پکار رہا تھا۔

وہ جانے کن خیالوں میں تھی۔ دہل کر اٹھی۔

''پانی پلا.....'' ابا تپا ہوا تھا..... اس کا چہرہ بتا رہا تھا۔

پانی کا کٹورہ اس کے ہاتھ میں دے کر وہ چولہے میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔

''یہ لوگ..... گاؤں، برادری والے۔ نہ کچھ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں..... بس باتیں کرنی آتی ہیں ان کو تو کیے جاتے ہیں۔''

گاؤں کے چوہدری نے ابے کو بلایا تھا۔ منشا جانتی تھی۔ کیوں بلایا تھا۔ یہ بھی جانتی تھی ابا نے کیا کہا ہوگا وہ جاننے کے باوجود نہ جاننا چاہتی تھی۔

''ارے ہمیں دین، مذہب کی پٹی پڑھاتے ہیں۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور پھر کون سا دین کہتا ہے کہ دوسرے کے معاملات میں دخل دو۔ دوسروں کے گھروں میں گھس کر انہیں عقل، تمیز دو..... ارے میری دھی ہے تو..... مجھ سے زیادہ کسے غم ہوگا تیرا..... میں نے تو صاف کہہ دیا..... ہم ذات کے جاٹ ہیں جاٹ..... کمی کمین نہیں ہیں کہ پہلے ایک کھونٹے سے باندھا، پھر دوسرے سے.....''

منشا نے ماچس کی تیلی جلا کر چولہے میں ڈالی..... خشک بالن نے آگ پکڑی اور بھڑ بھڑ جلنے لگی۔ ایسا بھانبھڑ اس کے اندر بھی مچ گیا۔

''نصیب میں سکھ ہوتا تو وہ محمود حسین کیوں مر جاتا۔ بس بیوگی کا دکھ ملنا تھا مل گیا..... قسمت، مقدر سے کون لڑ سکتا ہے۔ جو دکھ لکھے ہیں وہ تو بھوگنے ہیں میری لاڈلی..... پھر پرائے مال کی ذمہ داری کون لیتا ہے۔ بیٹی کا دھن ہوتا تو اور بات تھی..... اب تو پتر ہے تیری گود میں..... زمین جائیداد کا مالک..... لوگ جان کے دشمن ہو جاتے ہیں..... گھر بسانے میں گود اُجڑ گئی تو کون ذمہ دار ہوگا.....''

ابا حقہ گڑگڑائے جا رہا تھا۔

''اور پھر یہ لوگ کیا جانیں..... خاندانی شرافت کیا ہوتی ہے.....؟ ہم ذات کے اصیل ہیں اصیل..... تیری پھپھی کو صرف چھ مہینے میاں کی محبت ملی تھی۔ وہ چل بسا تو بیوگی کی بکل ایسی ماری کہ سارا زمانہ ہار گیا اس کے سامنے' پر وہ کسی کے ساتھ دو بول پڑھنے پر راضی نہ ہوئی۔''

منشا نے سر اٹھا کر کوٹھڑی کی طرف دیکھا۔ جہاں چارپائی پر چمڑا منڈھی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ جو سانس لیتا تھا اور ہر دوسری سانس کے نہ آنے کی دعا کرتا تھا۔

اس ذات کی اصیل نے کھڈا نہیں کھوہ کھودا تھا۔ جس میں آئندہ آنے والی نہ جانے کتنی نسلوں کی بیواؤں نے دفن ہونا تھا۔ کیا ہوتا اگر یہ ذات کی اصیل کوئی درست فیصلہ کر لیتی' جگ والے نہ ہارتے' یہ ہار جاتی' کوئی درست فیصلہ کر لیتی تو آج جانے کتنوں کی راہ سوکھی ہو جاتی.....''

دیسی مرغ کا شوربہ پکنے کو رکھا تھا۔ آٹا گوندھتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دیکھا..... احاطے کی چھوٹی دیوار سے پرے جاتی کچی پکی سڑک پر کوئی گاڑی آ کر رکی تھی..... اور گاڑی والا بونٹ کھولے اس میں سے نکلتے دھوئیں کو دیکھ رہا تھا.....

ابا کا حقہ پھر سے گڑگڑایا۔

''اور میں نے تو صاف کہہ دیا چوہدری سے..... مجھے انکار نہیں..... میں تو آج دو بول نکاح کے پڑھوا دوں کسی کے ساتھ..... پر میری دھی..... بڑی شرم وحیا والی ہے..... ماں باپ کی لاج رکھنے والی..... وہ کبھی نہ مانے گی۔ کسی دوسرے کا پلّو تھام لے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' منشا نے آگ میں کچھ اور بالن جھونک دیا تھا۔

☆☆☆

بلاول بھی تک سو رہا تھا.....

ابا نے گاڑی دیر سے کھڑی دیکھی..... تو مسافر کو ساتھ لے آیا.....

''روٹی، ٹکر تیار ہے باؤ..... کھاؤ پیو..... جب تک میں مکینک کو بلا کر لاتا ہوں.....''

سرمئی سوٹ پہنے وہ لمبا چوڑا خوبرو جوان تھک ہار کر چارپائی پر آ لیٹا تھا۔

''منشے..... کوئی میٹھا شیٹھا بنا لو..... مہمان کے بہانے ہم بھی دعوت کھا لیں گے۔'' کھانے کے ساتھ ہمیشہ گڑ کی ڈلی کھانے والے ابے کے لیے صرف میٹھا ہی پوری دعوت سے کم نہیں تھا۔

سورج سوا نیزے پر آ گیا تھا..... دوپہر گرم سے گرم تر ہونے جا رہی تھی۔ منشا نے دیسی گھی میں الائچی کڑکڑائی اور پھر سوجی بھوننے لگی۔ کبھی کبھار گردن موڑ کر مسافر کو دیکھا..... گرم دوپہر میں پیپل کی چھایا تلے وہ بے سدھ پڑا تھا..... پورب سے چلنے والی ہوا دھان کی نوخیز فصل کو چھیڑ چھاڑ کر اس طرف آتی اور مسافر کے پسینے کو ٹھنڈا کر کے اسے نیند کی وادیوں میں دھکیلتی تھی..... شرارتی کرنیں بھی وہیں تھیں..... مسافر کے پسینے پر..... اس کے بالوں پر اودھم مچاتی..... سنہری حلوہ چینی کی پلیٹوں میں نکال کر اس نے چاندی کے ورق لگائے..... کولر سے برف نکال کر جگ میں پانی ٹھنڈا کیا۔

دیسی مرغ کا شوربا..... پتلی نرم گرم گرم روٹی..... کشمش اور ناریل بھرا خوشبودار حلوہ..... اس سے بڑھ کر من وسلویٰ کیا اترنا تھا۔ اس نے ٹرے تیار کر لی تھی۔

ابے کے انتظار میں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس نے نلکا چلا کر ٹھنڈا پانی بالٹی میں بھرا پھر مسافر کو جگانے کے لیے پیپل کے درخت کی طرف چلی آئی۔

پرے دھریک کے درختوں میں چھپی کوئل کس زور سے کوکی تھی۔

جگانے کو یہ کوک ہی کافی تھی..... مگر ایسی گہری

نیند.....

وہ ذرا سا مسکرا کر سامنے ہوئی..... پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے۔ سر کے نیچے رکھے وہ بڑی گہری نیند میں تھا.....

''ہائے ..... محمود حسین..... ! کوئل پھر سے کوکی۔

وہ بھی تو یوں ہی لیٹا کرتا تھا۔ مندی مندی آنکھوں سے چوری چھپے اسے دیکھے جاتا اور لبوں سے کچھ گنگنائے جاتا تھا۔

پیپل پہ گھونسلہ بناتی چڑیا سے مہین سا تنکا چھوٹا اور سیدھا اس کے بالوں میں آ کر اٹک گیا۔

پتا نہیں کیسے وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی..... ہاتھ بڑھا کر وہ تنکا سمیٹا پر خود بکھر گئی..... نگاہ چوک گئی..... چوک گئی اور اب ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔

''کتنا خوبصورت ہے یہ.....'' چوڑی پیشانی، کھڑی ناک والے اس ساحر نے جیسے سحر ہی پھونک دیا تھا۔

سیاہ روئیں والا سرخ و سپید ہاتھ اب سینے پر دھرا تھا۔ صاف ستھرا، ترشے، ناخنوں والا مضبوط مردانہ ہاتھ..... جسے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا، اٹھائے اور اپنی کلائی پر رکھ دے۔

''ہائے نہیں..... دھیان بھٹکا تو ضمیر کا اژدھا زور سے پھنکارا.....

وہ یوں کانپ کر کئی قدم پیچھے ہٹی جیسے سچ مچ کا بھیڑ دیکھ لیا ہو.....

''لاحول ولاقوۃ..... لاحول ولا.....''

''کیسا خیال آیا..... کسی غیر مرد کے لیے..... یا میرے مولا..... مجھے معاف کر دے..... مجھے بخش دے.....'' وہ چولہے کے قریب رکھی چوکی پر جا بیٹھی..... دہکتے انگاروں پر سفید راکھ جم گئی تھی..... اس نے ذرا سنا کر یدا اور دہکتے سرخ انگاروں پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

ابے کے حقے میں آگ ڈالنی تھی..... اور حقہ اس طرف پڑا تھا..... جس طرف دیکھنا بھی اس کی روح کھینچ رہا تھا۔ کتنی دیر وہ خود کو باندھ کر بیٹھی رہی۔

''میں ابے کی شرم وحیا والی دھی ..... لاج رکھنے والی..... اور پھر محمود حسین کیا سوچے گا..... تھو تھو..... کتنی پاگل ہوں میں..... خوامخواہ شیطان آ گیا دل میں.....'' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سورۃ الناس اور آیۃ الکرسی پڑھ کر خود پر دم کیا۔

''وہ بیٹھی ہے ناں اندر..... ذات کی اصیل..... کچھ اسی سے سبق سیکھ۔'' اس نے روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر تک پھپھی نے کھانے کے لیے اپنا سوٹا (لاٹھی) بجانا تھا منجی سے..... تب یہ کٹوری اسے دینی تھی۔

اور پوچھوں گی ذات کی اصیل سے..... کون سے پتھر، وٹے مارتی تھی شیطان کو بھگانے کے لیے..... کون سا منتر، تسبیح پھونکتی تھی خود پر کہ تن اور من دونوں ویران ہو گئے..... بنجر کر لیے ساری عمر کے لیے..... جب جاڑے میں راتیں لمبی ہو جاتی تھیں۔ جب گرم راتوں میں پورے چاند کو دیکھ کر چکوریں شور مچاتی تھیں..... جب ساون بھادوں کی رت میں چھاجوں مینہ برستا تھا' جب پپیہا پی، پی پکارتا تھا تو کیسے..... کیسے..... وہ گھٹنوں میں سر دیے بے پھل کی ہلکی ٹہنی کی طرح جھول رہی تھی۔

''اور جب ماڑھ کی گرم دوپہر میں کوئل کوکتی تھی۔ اور ایک جوان مرد بان کی کھری چارپائی پر بے سدھ سوتا تھا۔ تو کیسے..... تو کیسے بھگائی تھی شیطان کو..... آنکھوں سے بے رنگ پانی کا سیال نکلنے کو بے تاب تھا جیسے بہنے سے پہلے ہی وہ رگڑے جا رہی تھی..... بند باندھ رہی..... خیال پر..... سوچ پر..... جذبات پر.....

وہ ایسی کھیتی تھی..... جس پر بادل کبھی کھل کر برسا تھا۔ اور اب وہ زمین کا سوکھا ٹوٹا تھی..... تڑختا تھا اور ترستا تھا کہ بادل پھر سے اس پر کھل کر

برسے..... اس کی زرخیزی میں تڑپتے پودے نمو پائیں اور وہ اپنے لہو سے ان کی آبیاری کرے.....

''لیکن کیوں.....؟ میں ایسی کیوں.....؟ کیا میں ذات کی اصیل نہیں .....'' وہ کٹوری اٹھائے کوٹھڑی کی طرف بڑھی.....

''پھپھی..... روٹی .....'' ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا اور بے دانت کے جبڑے شتابی سے ہلنے لگے۔

منشا نے کٹی پل وہاں بیٹھ کر گزار دیے۔ پر باہر کوئی تھا..... جو بلا رہا تھا، آوازیں دے رہا تھا۔

''منشے ..... او منشے ..... وہ لپک کر باہر آئی۔ پھر قدم تھم گئے۔ وہ سو رہا تھا۔ پر اب اکیلا نہیں تھا۔ بلاول اس کے چوڑے سینے پر اوندھا لیٹا تھا اور اس کا ہاتھ بلاول کی پشت کو ہولے ہولے تھپک رہا تھا۔

''کب جاگا بلاول..... کب اٹھ گیا..... کیا سمجھ کر سینے سے جا لگا.....''

''ہائے میرے مالک.....! کیا میرا بچہ یونہی ترسے گا..... پرائی چھاؤں میں جگہ ڈھونڈے گا.....'' وہ تڑپ کر آگے بڑھی..... بلاول کو لینا چاہا لیکن مسافر نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''تو وہ جاگ رہا ہے۔'' منشا نے نظر اٹھائی۔

وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا..... گہری سیاہ آنکھیں جن میں کچی نیند کا خمار اور سرخی بھری تھی۔

''وہ..... میں اسے اٹھانے آئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں..... سونے دو.....'' وہ بلاول کے بال سنوار رہا تھا۔

''محمود حسین ہوتا۔ تو میں ادھر ہی بیٹھ جاتی۔ پاٹی پر اور اسی پیار سے اس کے پاؤں کے تلووں کو ہلاتی..... کوئل پھر سے کوکی تھی۔

''ہائے یہ نامراد کوئل..... جا کہیں اور دفع ہو۔'' اس نے لکڑی اٹھا کر دھریک کی طرف اچھالی۔

''کھانا ..... تیار ہے۔ میں لے کر آتی ہوں..... آپ منہ ہاتھ دھولو.....'' اب کی بار دیکھے بغیر بولی تھی۔

''منشا..... نامراد بھی ذات کی اصیل نہیں..... چھی..... چھی.....''

اس نے میز اٹھا کر چارپائی کے قریب رکھی۔ پھر سارے لوازمات رکھ دیے۔ وہ بلاول کو احتیاط سے لٹا کر منہ ہاتھ دھونے چلا گیا تھا۔

واپس آیا تو بالوں پر پانی کے ـــــ قطرے ابھی تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابا مکینک کے ساتھ گاڑی پر جھکا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ چارپائی پر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

آبیٹھا۔اور پھر کھانے لگا۔دھیرے دھیرے، آرام آرام سے۔

گرمی بہت ہے..... میں پنکھا لے کر آتی ہوں۔'' وہ بھاگ کر اندر آئی۔ٹرنک کھول کر ہاتھ والا پنکھا نکالا۔جس پر سرخ کپڑے کی جھالر سجی تھی اور شیشے بھی۔

''بس ..... آج..... صرف ایک دوپہر ..... دل کی تسلی کے لیے.....'' وہ واپس آئی تو سانس اتھل پتھل تھی..... بڑے استحقاق سے چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر وہ اسے پنکھا جھلنے لگی تھی..... ویسے ہی جیسے محمود حسین کو جھلتی تھی۔ جب وہ دیسی گھی میں پکے کھانے کھاتا تھا۔ بہت مگن ہوکر۔ یوں جیسے سب سے ضروری کام یہ ہی ہو۔ ویسے ہی وہ بھی کھا رہا تھا مگر شتابی سے نہیں بڑے صبر سے، ایک ایک نوالہ توڑتا۔منہ میں رکھتا..... چباتا..... پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے قدموں کی چاپ سنی۔

ابا آ گیا تھا۔

''لو جی گاڑی ٹھیک ہوگئی آپ کی.....''

وہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا..... حلوے کی پلیٹ ابھی آدھی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے چمچہ واپس رکھ دیا۔

منشا نے تڑپ کر باپ کو دیکھا.....

''اونہیں نہیں، کھانا تو ٹھیک سے کھا پتر!'' ابّے نے اصرار کیا۔

''میں نے پیٹ بھر کر کھایا ہے۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ بہت شکریہ آپ لوگوں کا۔''

''ارے بیٹھو تو سہی یار..

''بہت دور جانا ہے جی..... ویسے بھی گھڑی بھر آرام نے تروتازہ کردیا ہے۔اب باقی کا سفر آرام سے کٹ جائے گا۔'' وہ ابا سے مصافحہ کررہا تھا۔

''نہیں..... باقی کا سفر آرام سے کیسے کٹے گا۔ سفر تو کانٹوں سے بھرا ہے۔ لمبے لمبے تیز، نوکیلے..... کیکر کے کانٹے جو ایڑی میں کھبے تو درد روح کو ہلکان کردیتا ہے۔'' وہ بند ہونٹوں سے تڑپی.....

''چلتا ہوں اب ..... اللہ حافظ .....'' ایک الوداعی نظر..... جو پتھر کردینے کے لیے کافی تھی۔

اب کے کوئل کو کی جو نہ تھی..... پتا نہیں کہاں مر گئی نامراد.....

''ابھی نہ جاؤ..... ابھی تو سورج سوا نیزے پر ہے۔ابھی تو پہر بہت گرم ہے۔ شام تو ہونے دو۔ مت جاؤ، ابا روک لوناں اسے' اس بھری دوپہر میں کہاں جائے گا۔ روک لوناں.....'' وہ چھوٹی سی منڈیر پر دونوں ہاتھ سختی سے جمائے کھڑی تھی۔

پر جانے والا مسافر تھا۔گھڑی بھر کا مہمان..... اسے جانا تھا۔سو وہ جارہا تھا۔لیکن اس کے گلے میں پھندا ڈال گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا جارہا تھا اور اس کے گلے میں پڑا پھندا کھنچتا جارہا تھا۔ اتنا پیچھے کہ اس کا سر اس کی پشت سے جالگا تھا۔آنکھیں الٹ گئی تھیں..... منڈیر ہاتھوں سے چھوٹی تو خالی ہاتھ مڑنے لگے تھے۔

ابا واپس لوٹا تو منشا صحن میں تپتی زمین پر لوٹ رہی تھی۔

''او تیرا بیڑا تر جائے..... پھر سے دورہ پڑ گیا.....'' ابّے نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا..... اور پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارنے لگا۔

''بھری دوپہر میں درختوں کے نیچے گھومتی ہے۔ ہزار بار سمجھایا پر مانتی کہاں ہے..... سایہ ہوگیا ہے اس پر.....'' ابا منشا کو ہوش میں لانے کے جتن کررہا تھا۔ ادھر اندھیری کوٹھڑی میں ذات کی اصیل کا سوٹا بار بار منجی سے ٹکرا رہا تھا۔

''منشے نے پانی تو دیا ہی نہیں۔'' اس کا سوکھا بدن پانی مانگتا تھا سو گھڑی گھڑی پانی پیتی تھی۔

''ساری عمر بیت گئی۔ پتا نہیں کیسی پیاس ہے۔ بجھتی ہی نہیں.....'' ذات کی اصیل بے دم ہوکر پھر سے لیٹ گئی تھی۔

☆

ایک یار کی چاہت نے کہیں کا نہیں رکھا
اس پیار کی عادت نے کہیں کا نہیں رکھا

اک تیری محبت میں کسی کا نہ ہوا میں
اس تیری محبت نے کہیں کا نہیں رکھا

تم نے تو محبت بھی سیاست کی طرح کی
ہم کو تو دیانت نے کہیں کا نہیں رکھا

دُنیا بھی گئی ہاتھ سے، عقبیٰ بھی عزیزو
ہم کو تو محبت نے کہیں کا نہیں رکھا

چھوڑی نہ روش ہم نے شرافت کی بہر طور
حالانکہ شرافت نے کہیں کا نہیں رکھا

اچھا تھا اگر مانتے ہم عقل کے احکام
اس دل کی حکومت نے کہیں کا نہیں رکھا

تتلی کو پکڑنا، کبھی جگنو کو پرکھنا
بچوں کی سی عادت نے کہیں کا نہیں رکھا

عظمیٰ جوناں

وقت کی عدالت،

ہوائیں چُپ ہیں
ہر اک شجر دم بخود کھڑا ہے
شگوفے اور پتیاں
کچھ اس طرح ٹہنیوں سے لپٹ رہی ہیں
کہ جیسے پُر ہول جھکڑوں کی صدا سے پہلے
پرند اپنے پروں میں چھُپ جائیں
اجنبی خوف سے سمٹ کر
سکوت گہرے سکوت کے
زرد سائباں سے
ڈھکا ہوا شہر
وقت کی جاگتی عدالت سے
اپنی آواز مانگتا ہے

پروین فنا سیّد

ادگارڈ

ایلن کی سسکرین

بندر

سیاح خاوند، میں تمہارے لیے افریقہ سے ایک بندر لایا تھا لیکن وہ راستے میں ہی بھاگ گیا۔"
بیوی۔"چلو وہ نہ سہی تم تو آ گئے۔"

مالک مکان

مالک مکانوں کا ڈسا ہوا ایک کرائے دار ایک مشہور قلعہ دیکھنے گیا۔ گائیڈ نے بتایا"یہ پانچ سو سال پرانا قلعہ ہے۔ آج تک اس کا پتھر بھی تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس کے کسی حصے کی مرمت نہیں کی گئی۔ غرض یہ کہ پانچ سو سال سے یہ عمارت جوں کی توں کھڑی ہے۔"
کرائے دار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔"اس کا مالک، مالک مکان جیسا ہی بے حس معلوم ہوتا ہے۔"

پتھر گوشت

وکیل نے الزام لگایا کہ گاہک نے ریستوران کے منیجر کے سر پر پتھر مارا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا۔
گاہک نے قسم کھاتے ہوئے بتایا۔"میں نے ہرگز منیجر کے سر پر کوئی پتھر نہیں مارا بلکہ وہ جو گوشت کی بوٹی میرے لیے لایا تھا، میں نے اسے اس کے سر پر دے مارا تھا۔"

فرض شناسی

"کیا کلینک نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے؟" کام ختم ہو جانے کے بعد فورمین نے نئے ہیلپر سے پوچھا۔ جس کا پہلا دن تھا۔
"جی ہاں جناب! اس نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔"
"بہت خوب۔" فورمین خوش ہوا۔"کیا بتایا تھا؟"
"جناب! اس نے کہا تھا کہ جب میں آپ کو آتا دیکھوں تو اسے فوراً جگا دوں۔"

انجیوگرافی

میری انجیوگرافی کر کے بولا ڈاکٹر مجھ سے
دل کی رگوں میں سینکڑوں اسپیڈ بریکر ہیں

فرسودہ خیالات

بعض فرسودہ خیالات کے مالک شوہر یہی سمجھتے ہیں کہ کھانا پکانا عورت کا کام ہے اور مرد کو کھانا ٹھونسنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جب کہ ٹی وی کے ہر کھانا پکانے کے پروگرام میں ایک مرد کھانا پکاتا اور اس کے ساتھ ایک عورت باتیں بناتی نظر آتی ہے۔

عوامی بکرا

اس طرح کے بکروں میں گوشت کم ہوتا ہے بس جسم پر کھال ہی کھال ہوتی ہے۔ عوامی بکرا کھانے پینے کا شوقین نہیں ہوتا۔ اس کو جو کچھ بھی ملے، خاموشی سے کھالیتا ہے۔ اکثر گھاس پھونس کے"بل" دیکھ کر اس کی بھوک اڑ جاتی ہے۔ ٹیکس کے نام سے چڑتا ہے۔ قربانی کے بعد اس کی کھال بھی کوئی نہیں لیتا کہ کھال کی کوئی قیمت نہیں لگتی۔

میک اپ

ہے ان کی آرزو میک اپ سے مثل حور ہو جانا
مگر ممکن کہاں، کشمش کا پھر انگور ہو جانا!!

موروثی بیماری

موروثی بیماریوں کی تعریف کرتے ہوئے میڈیکل کے ایک طالب علم نے اپنے امتحانی پرچے میں لکھا۔
"ورثے میں ملنے والی بیماریوں کو موروثی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کے دادا کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ کے والد کے ہاں بھی اولاد نہیں ہوگی اور عین ممکن ہے آپ کے ہاں بھی نہ ہو۔"

مساوات

کسی نے ایک دفعہ چاچے بخشے سے عرض کیا کہ خواتین کو برابر کے حقوق دینے چاہئیں۔
چاچا۔"پتر! اصولی طور پر تو میں اس کا حامی ہوں۔ لیکن تمہاری چاچی مجھ سے چار ہتھ ودھ (آگے) ہے۔"
"وہ میری برابری پر مانے گی نہیں۔"

باعث حیرت

کراچی کی سڑک پر ایک صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل ان کی طرف اشارہ کر کے کار سوار سے کہہ رہا تھا۔
"مجھے پتا چلا ہے آپ نے اسے اپنی کار سے ٹکر مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔"
"آپ قسم لے لیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ صاحب گھبرا کر بولے۔"میں نے ان صاحب کو سڑک پار کرتے دیکھ کر احتراماً روک لی تھی۔ اس پر یہ صاحب حیرت سے بے ہوش ہو گئے۔"

سیلز مین

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" تمہیں شرم آنی چاہیے۔"باس نے آفس بوائے کو ڈانٹا۔"جانتے ہو جو آفس بوائے جھوٹ بولتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟"
"جانتا ہوں جناب! فرم انہیں سیلز مین بنا کر فیلڈ میں بھیج دیتی ہے۔" آفس بوائے نے جواب دیا۔

حیرانی

اصغر!"میں حیران ہوں کہ رحیم اپنی زیادہ تنخواہ کا کیا کرتا ہے، نہ اس کے پاس کل روپے تھے اور نہ آج۔"
اسلم: کیوں کیا وہ تم سے ادھار مانگ رہا تھا۔"
اصغر:"نہیں میں اس سے ادھار مانگ رہا تھا۔"

سرپرائز

ایک نرس جڑواں بچے لے آئی اور پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔"پروفیسر صاحب دیکھیے، آپ کے بچے کتنے پیارے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے افق پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔"سسٹر! میری بیوی سے اس کا ذکر مت کرنا، میں اسے یہ خوش خبری خود سنانا چاہتا ہوں۔"

مشورہ

ایک آرٹسٹ نے بیس دن کی زبردست محنت کے بعد اپنی شاہکار پینٹنگ مکمل کی۔ انہوں نے عالم نزع میں ایک شخص کی منظر کشی کی تھی۔ وہ موت کی ہولناکی اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ اسی روز ان کے ایک دوست آ گئے جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ آرٹسٹ نے بڑے فخر سے اپنی پینٹنگ دکھائی اور ان کی رائے طلب کی۔
ڈاکٹر صاحب کافی دیر تک مختلف زاویوں سے پینٹنگ کا معائنہ کرتے رہے، پھر بولے۔"میرے خیال میں تو یہ شخص ملیریا سے مر رہا ہے، ویسے نمونیا بھی ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے تم کسی اسپیشلسٹ سے بھی رائے لے لو۔"

BOOKSPK Books & Magazines

شگفتہ سید، شاہ

رزق حلال حاصل کرنے کی دعائیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور اچھے طریقے سے (اعتدال کے ساتھ) روزی طلب کرو، کیونکہ کوئی انسان اپنا رزق پورا لیے بغیر نہیں مرے گا۔ اگرچہ اس (رزق کے حصول) میں دیر ہو جائے۔ چنانچہ اللہ سے ڈرو اور اچھے طریقے سے روزی طلب کرو۔ جو حلال ہے، وہ لے لو اور جو حرام ہے وہ چھوڑ دو۔"

فوائد و مسائل:۔

حلال روزی کا اہتمام کرنے والا روزی سے محروم نہیں رہتا۔ اللہ پر توکل کرتے ہوئے حرام روزی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

جس طرح دنیوی زندگی کی مدت مقرر ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوگی، اسی طرح رزق بھی متعین ہے لیکن انسان کو اس کی صحیح یا غلط کوشش کی وجہ سے ثواب یا گناہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اللہ کا وعدہ،

حضرت عبیداللہ بن محمد بن عائشہؓ کہتے ہیں۔ ایک سائل امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آ کھڑا ہوا۔

حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ سے کہا۔

"اپنی والدہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، میں نے آپ کے پاس چھ درہم رکھوائے تھے۔ ان میں سے ایک درہم دے دو۔"

وہ گئے اور انہوں نے واپس آ کر کہا۔ "امی جان کہہ رہی ہیں کہ وہ چھ درہم تو آپ نے آٹے کے لیے رکھوائے تھے۔"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "کسی بھی بندے کا ایمان اس وقت تک سچا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو جو چیز اس کے پاس ہے، اس سے زیادہ اعتماد اس چیز پر نہ ہو جائے جو اللہ کے خزانوں میں ہے۔

اپنی والدہ سے کہو کہ چھ درہم بھیج دیں۔"

چنانچہ انہوں نے چھ درہم حضرت علیؓ کو بھجوا دیے جو حضرت علیؓ نے اس سائل کو دے دیے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی نشست بھی نہیں بدلی تھی کہ اتنے میں ایک آدمی ان کے پاس سے ایک اونٹ لیے گزرا جسے وہ بیچنا چاہتا تھا۔

حضرت علیؓ نے کہا۔

"یہ اونٹ کتنے میں دو گے؟"

اس نے کہا۔ "ایک سو چالیس درہم میں۔"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "اسے یہاں باندھ دو۔ البتہ اس کی قیمت کچھ عرصہ کے بعد دیں گے۔"

وہ آدمی اونٹ وہاں باندھ کر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا۔

"یہ اونٹ کس کا ہے؟"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "میرا۔"

اس آدمی نے کہا۔ "کیا آپ اسے بیچیں گے؟"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "ہاں۔"

"اس آدمی نے کہا۔ "کتنے میں؟"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "دو سو درہم میں۔"

اس نے کہا۔ "میں نے اس قیمت میں یہ اونٹ خرید لیا۔"

اور حضرت علیؓ کو دو سو درہم دے کر وہ اونٹ لے گیا۔

حضرت علیؓ نے جس آدمی سے اونٹ ادھار خریدا

تھا۔ اسے ایک سو چالیس درہم دیے اور باقی ساٹھ درہم لا کر حضرت فاطمہؓ کو دیے۔

حضرت فاطمہؓ نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

حضرت علیؓ نے کہا۔ "یہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبانی ہم سے وعدہ کیا ہے۔"

والد کا احترام،

حضرت ابوغسان ضبیؒ کہتے ہیں میں ۔۔۔ اپنے والد کے ساتھ (مدینہ منورہ کے) پتھریلے میدان میں چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرے والد ہیں۔"

انہوں نے فرمایا۔ "ان کے آگے مت چلو کرو بلکہ ان کے پیچھے یا ان کے ساتھ پہلو میں چلا کرو اور کسی کو اپنے اور ان کے درمیان نہ آنے دو اور اپنے والد کے مکان کی ایسی چھت پر نہ چلو جس کی منڈیر نہ ہو کیونکہ اس سے ان کے دل میں (چھت سے تمہارے نیچے گر جانے کا) خطرہ پیدا ہو گا (اور وہ اس سے پریشان ہوں گے) اور گوشت والی ہڈی پر تمہارے والد کی نگاہ پڑ چکی ہو تو تم اسے نہ کھاؤ، ہو سکتا ہے، وہ اسے کھانا چاہتے ہوں۔"

بہتر،

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں ایک آدمی نے حضرت عثمانؓ سے کہا۔

"اے مال والو! نیکیاں تو تم لے گئے ہو کہ تم لوگ صدقہ کرتے ہو۔ غلاموں کو آزاد کرتے ہو، حج کرتے ہو اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرتے ہو۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ "اور تم لوگ ہم پر رشک کرتے ہو۔"

اس آدمی نے کہا۔ "ہم لوگ آپ لوگوں پر رشک کرتے ہیں۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! کوئی آدمی تنگ دستی کی حالت میں ایک درہم خرچ کرے، وہ ہم مال داروں کے دس ہزار سے بہتر ہے کیونکہ ہم بہت زیادہ میں سے تھوڑا سا دے رہے ہیں۔"

تین چیزیں،

تین چیزیں ایمان کو تباہ کر دیتی ہیں۔

1۔ امیروں کی محفل۔
2۔ عورتوں کی صحبت۔
3۔ جاہلوں سے بحث۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

باتیں یاد رکھنے کی،

، کسی بھی حال میں اللہ سے مایوس نہ ہونا اصل طاقت ہے۔

، جب ہماری تمنا کے پاؤں حاصل کی چادر سے باہر نکل جاتے ہیں تو ہمیں سکون نہیں مل پاتا۔

، آپ کے وسائل محدود ہیں۔ اس میں قسمت کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن آپ کی سوچ محدود ہے اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔

، اچھے لوگوں کا تمہاری زندگی میں آنا تمہاری قسمت ہوتی ہے اور انہیں سنبھال کے رکھنا تمہارا ہنر۔

شبنم شمشاد۔ یزمان

بے کار،

وہ علم جس پر عمل نہ ہو، وہ عمل جس سے نفع نہ ہو اور وہ زندگی جو فائدہ نہ پہنچائے، تینوں ایسے ہیں جیسے ایک مکان جس میں سکونت نہ ہو اور وہ خزانہ جس کا پتا نشان نہ ملے اور وہ کھانا جو کھایا نہ جائے۔

(حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

انصٰی ناصر۔ گلستان جوہر

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

م۔الف

پارٹ ٹائم جاب کے طور پر ایک پرائیویٹ ادارے میں جاب بھی شروع کر دی تھی۔ تھیسس مکمل کرتے ہی اپنے ہی ڈپارٹمنٹ سے جاب آفر ہوئی کہ ساتھ ایم فل کر لیں لیکن اس وقت کی ترجیحات میں جاب پہلے نمبر پر تھی تو جناب کنٹونمنٹ کے علاقے میں کالج میں انگلش لیکچرر کے عہدے پر فائز تھی۔ زندگی بہت بامقصد تھی۔ ویک اینڈ پر بی ایڈ کی کلاسز کو پڑھاتی تھی۔

ماشاء اللہ ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور سب ہی تعلیم سے وابستہ۔ عمران سیریز، شعاع و خواتین کے دلدادہ۔ زندگی میں کچھ کر گزرنے والا عزم لیے ہم سب بہن بھائی تعلیم کے راستے پر گامزن تھے اور الحمدللہ سارے خاندان اور ملنے جلنے والوں کے لیے قابل رشک۔

میں اپنے ایک ماموں سے بہت اٹیچ تھی۔ چونکہ وہ خود کمپیوٹر انجینئر ہیں تو انہوں نے شروع سے ہی مائنڈ سیٹ کیا ہوا تھا کہ زندگی میں کچھ بننا ہے۔ تو جناب جب ہم جماعت دوستوں کی منگنیوں کی مٹھائیاں گھر آتی تھیں، ہماری ڈگریوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ خیر اب اس سے زیادہ کیا لکھوں؟ صفحات کم پڑ جانے کا خدشہ ہے حالانکہ قلم تو تھمنے میں ہی نہیں آ رہا۔

س۔ ''شادی کب ہوئی؟''

ج: میری شادی 29 دسمبر 2014ء کو ہوئی۔

س۔ '' شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟''

ج: شادی سے پہلے پڑھائی، جاب اور مقابلے کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں ایم اے انگریزی لسانیات میں یونیورسٹی سے پوزیشن ہولڈر تھی۔ چوتھے سمسٹر میں تھیسس کرنے کے ساتھ ساتھ

قسم کی چڑ تھی سو انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنتے ہوئے گھر میں وہ تماشا لگایا اور امی کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ادھر شادی کی تو تمہیں طلاق دے دوں گا اور بیٹیوں کو بھی گھر سے نکال دوں گا۔ بس گھر میں پھیلی ہوئی نحوست اور افراتفری میں سر پڑی افتاد کی طرح اس رشتے کو قبولیت بخش دی گئی (افتاد اس لیے کہ میری دس نندیں ہیں) میری ایک فیصد بھی مرضی شامل نہیں تھی کیونکہ سوچ کر ہی میری سانس بند ہونے لگی تھی کہ میں اتنی بڑی فیملی کیسے سنبھالوں گی۔ خیر قسمت ادھر ہی لکھی تھی اور ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

س: ''جیون ساتھی کا تصور اور وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ ان میں دیکھنا چاہتی تھیں؟''

ج: خوبیاں..... ہاہ!!! جناب بہت سیلف میڈ ٹائپ کی زندگی گزاری تھی شادی سے پہلے تو جیون ساتھی کے حوالے سے بھی یہی چاہتی تھی کہ ایجوکیٹڈ، کیئرنگ اور خیال رکھنے والا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ اپنی شریک حیات کو بخشا ہوا یقین و اعتماد ہی مثالی زندگی کی ضمانت بنتا ہے، دل کا محرم شریک سفر ہی ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔ اور خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بہنیں جن کو ذہنی ہم آہنگی والا جیون ساتھی ملتا ہے لیکن کاتب تقدیر نے ہماری تقدیر میں یہ خانہ خالی رکھا۔ شوہر صاحب اور میرے نقطہ نظر قطعی مختلف ہیں۔ اپوزٹ پولز ہیں ہم دونوں اور پسپائی تو ازل سے عورت کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے سو بجائے ان کو قائل کرنے کے ہم دل مار کر رہ جاتے ہیں شروع شروع میں یہ کوشش کر کے منہ کی کھانی پڑتی تھی کیونکہ وہ گیارہ بہن بھائی کٹر اور بے لچک قسم کی شخصیات کے مالک ہیں۔

س: ''منگنی کتنا عرصہ رہی؟ فون پہ کبھی بات ہوئی؟''

ج: منگنی تین ماہ کے قلیل عرصہ تک رہی جو کہ اب بہت افسوس ہوتا ہے کہ تھوڑا لمبا عرصہ رہتی تو ان لوگوں کے طریقہ زندگی کا کچھ تو اندازہ ہوتا لیکن ان کی طرف سے جلدی — مچائی گئی کیونکہ ان کو کہیں سے رشتہ نہیں مل رہا تھا (حسب منشا لڑکی خوب صورت ہو، پڑھی لکھی ہو متوسط گھرانے سے ہوتا کہ ہمارے آگے بول نہ پائے۔ یہ ان کی خواہشات تھیں جو کہ پوری ہوئیں)

رہی فون پہ بات تو ہمارے گھر میں بھی امی کی تلقین تھی کہ فون پہ بات نہیں کرنی۔ برا امیج بنتا ہے اور ادھر سے میری نندوں کی بارہا بتائی گئی معلومات کہ ''جی ہمارا بھائی تو بہت شرم و حیا والا ہے۔ وہ بہت برا سمجھتا ہے اس بات کو تو بات یا ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔''

س: ''سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟''

ج: شادی کے ایک سال تک خیالات اچھے ہی تھے۔ ابھی بھی وہ لوگ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں تو میرا دل صاف ہو جاتا ہے لیکن ان کے دل سے ریاکاری نہیں جاتی۔ میرے سسر (معذرت کے ساتھ) بہت چرب زبان واقع ہوئے ہیں۔ لوگوں کو قائل کرنا اور شیشے میں اتارنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انہوں نے کہا میری بیٹی کام کرنے کی عادی نہیں ہے تو میں کام والی رکھ دوں گا۔ میں یہ کروں گا۔ وہ کروں گا لیکن اب انہوں نے آنکھیں ماتھے پہ رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹے کی پیدائش کے ساتویں مہینے رمضان تھا اور میں بارہ بجے کی کچن میں گھسی شام پانچ بجے نکلی تو کسی بات پہ گھر میں گھمسان کا رن پڑا۔ میں ایک طرف اور میری تین نندیں، ساس، سسر، ایک طرف اور میاں صاحب درمیان میں اللہ میاں کی گائے۔ میرے سسر نے کہا ''تم میرے توسط سے ادھر رہ رہی ہو میں ابھی چاہوں تو تمہیں طلاق دلوا دوں۔'' خیر بہت دل دکھتا ہے جب یاد کروں تو۔''

س: '' شادی سے پہلے آپ کو تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی اور قربانی؟''

ج: جی ہاں بالکل! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا نا کہ میرے بہن بھائی چھوٹے تھے اور سب ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو میں ہی اپنے بہن بھائیوں کو سپورٹ کر رہی تھی تو یہ قربانی دینی پڑی کیونکہ میری بڑی نند پہلے مہینے ہی بارہا باتوں باتوں میں باور کروا چکی تھیں کہ فلاں چچا سسر کہتے ہیں کہ تمہاری بھابھی کی تنخواہ پہ تو اب تم لوگوں کا ہی حق ہے اور جب میں نے پہلے مہینے ہی تنخواہ انہیں نہیں دی تو انہوں نے منہ بنا لیے۔

مزید قربانی اپنے کیریئر کو چھوڑ کر دی' صرف ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے۔ اور وہ ایسے تنگ دل و تنگ نظر کہ دوبارہ اتنے اچھے چانسز ملے جاب کے مگر اب جاب نہیں کرنے دیتے کہ کہیں یہ خود مختار ہو کر ہمارے اختیار سے باہر نہ ہو جائے۔ گورنمنٹ جاب کے لیے انٹرویو دینے جاتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے اپنے سیاس، سسر کو کہتے سنا۔ میری ساس میرے سسر کو کہہ رہی تھیں۔

''ہمارا بیٹا ایسا زن مرید ہے بیوی کو لے کے گھومتا ہے نوکریوں کے لیے کیونکہ ہماری بہو کی بے بے (امی) چاہتی ہے کہ میری بیٹی جاب کرے'' تو آگے سے میرے سسر کہتے ہیں ''جب ہمارا بیٹا کچھ کام ہی نہیں کرتا تو دونوں نے بھوکا مرنا ہے اگر بیوی سے بھی نوکری نہ کروائے تو۔'' یہ سب میں نے اپنے کانوں سے سنا اور میرا دل ڈوب ڈوب گیا ان کی بدگمانیاں سن کے۔

یہاں پہ یہ بتاتی چلوں کہ میرے سسر کا بھینسوں کا باڑہ ہے جہاں انہوں نے بیٹے کو بھی لگایا ہوا ہے۔ میرے شوہر بھینسوں کی دیکھ بھال، دودھ، دوہنا اور فصلیں کاشت کرتے ہیں۔ جس کو بھی میری شادی کا پتا چلتا ہے وہ حیران ہو کر یہی کہتا ہے کہ آپ کے امی ابو کو آپ سے کیا دشمنی تھی جو آپ کی شادی ادھر کر دی ہے۔ میں ایک دم سے اتنے مہذب ماحول سے نکل کے جیسے پسماندہ گاؤں میں آ گئی ہوں۔

دن رات دل کڑھتا ہے اپنی پھٹی ایڑیاں اور پھٹے انگوٹھے دیکھ کر۔ گندم کی صفائی، چاولوں کی فصل (دھان) کو چھت پر سکھانا پھر مشین سے چھڑوانا اور پھر سے چاولوں کو چھاننا، لہسن کو گھر لا کر باندھ کے رکھنا غرضیکہ تمام ایسے کام جو زمین دار گھرانوں میں کیے جاتے ہیں وہ تمام مجھ سے کروائے جانے کی توقع ہے بلکہ کروانے کے لیے لڑائی رہتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں جو بندہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتا رہا ہو وہ کیسے گندم کو دھوئے اور صاف کرے۔ اور اس پہ مستزاد بیٹیاں جو کہ شادی شدہ ہیں ہر وقت کسی نہ کسی کے سسرال والوں کی آمد اور بیٹیاں خود تو خیر بارہ مہینوں میں چار، پانچ مہینے ادھر ہی رہتی ہیں! ایسے میں' میں اکیلی کیسے اتنے کنبے کو کھلاؤں، پلاؤں اور کپڑے دھو دھو کر دوں۔

بہت دفعہ ڈرتے ڈرتے کہا کہ ایک کام والی رکھوا دیں۔ لیکن ان کے پورے خاندان میں آج تک کام والی رکھنے کا خیال بھی نہیں گزرا سو یہاں بھی ناممکن ہے۔

ایک دفعہ شادی کے تیسرے مہینے میری دو نندیں جو کہ دیورانی جیٹھانی بھی ہیں۔ دونوں امید سے تھیں اور سسرال والوں سے اس بات پر بضد کہ ہم نے گاؤں میں نہیں رہنا۔ شہر میں رہائش لے کے دیں۔

وہ دونوں ہمارے گھر آ گئیں اور بچوں کی پیدائش تک پانچ مہینے ادھر ہی رہیں۔ ان کے اور ان کے بچوں کے کپڑے بھی میں ہی دھوتی تھی اور وہ پھر سارے کپڑے پھیلا کر دیکھتیں کہ کہاں سے داغ نہیں اتارے اور میرے سسر بھرے گھر کے سامنے مجھے کہتے کہ میرے کپڑے تم نے صاف نہیں دھوئے اور داغ نہیں اتارے' لکھنے کو تو بہت سے واقعات ہیں لیکن صفحات کی کمی کے باعث لکھ نہیں سکتی۔

س: ''شادی بخیر و خوبی انجام پائی؟''

ج: جی ہاں شادی بخیر و خوبی انجام پائی چونکہ

کوئی خاص رسمیں میرے پھوپھو کے بیٹے نے کرنے ہی نہیں دی تھیں تو بدمزگی بھی نہیں ہوئی۔

س: ''شوہر نے آپ کو دیکھ کر کہا؟''

ج: شوہر کو مجھے دیکھنے کا موقع ہی بہت لیٹ ملا۔ کیونکہ میری رخصتی کروا کر لانے کے بعد میری نند کی بارات آئی اور میرے شوہر بہن کو رخصت کرنے، بارات کا استقبال کرنے میں مصروف ہو گئے اور میں انتظار کرتے کرتے سو گئی۔

س: ''شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟''

ج: شادی کے بعد زندگی بہت بے رنگ، ویران اور اداس ہو گئی کیونکہ شادی کے فوراً بعد ہی انہیں مجھ میں کیڑے نظر آنے لگے۔

بات ان پڑھ ہونے کی نہیں ہوتی اگر کوئی سلجھا ہوا خیال رکھنے والا خاندان ہو۔ لیکن میرے سسرال میں تو سب سے زیادہ میرے سسر میرا مذاق اڑاتے تھے اور ہیں بھی۔

شادی کے دو ماہ بعد خاوند کو کہا کہ ڈائجسٹ لا دیں (خواتین، شعاع) انہوں نے سستی کی بنا پر بھانجے کو کہہ دیا اور اس نے اپنی نانی اور خالاؤں کے درمیان میں آ کر کہا۔ ''ممانی! آپ کا ڈائجسٹ نہیں ملا۔'' تو میری ساس کہتی ہیں وہ کیا ہوتا ہے؟ میری نند کہتی ہیں ''امی! جس میں عشق و محبت کی داستانیں ہوتی ہیں۔'' ساس نے کہا۔ ''دفع دور ایسی کتابیں۔'' تو اندازہ لگا لیں کہ کیسی ذہنی حالت ہو گی ایسے لوگوں کی جو پڑھائی لکھائی کی طرف راغب ہی نہیں ہیں۔

س: ''شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟''

ج: شادی کے ایک ماہ بعد ہی جاب چھوڑ دی تھی اور باقاعدگی سے اس کے بعد کام سنبھالا، لیکن روایتی جو کھانا بنوایا جاتا ہے وہ شادی کے اٹھارہویں دن نند نندوئی کی دعوت میں نرگسی کوفتے بنائے تھے۔

س: ''میکے اور سسرال کے کھانے میں ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟''

ج: بہت زیادہ فرق محسوس ہوا۔ ہمارے میکے میں جو چیز بھی بنتی۔ سب کی پسند ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر بنتی اور وافر بنتی جبکہ سسرال میں ایسا عجیب رواج کہ جو کھانا بھی بنتا۔ وہ وقت کے وقت ہی ختم ہو جاتا' اگر کسی کا تھوڑی دیر بعد کھانے کو جی چاہتا تو جی سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا۔ ایک دفعہ شروع میں' میں نے بریانی بنائی اور سارے کنبے کو پیش کی۔ بعد میں سسر صاحب بولے ''وہ چاول کھانے والے تو نہیں تھے لیکن بہرحال ہم نے کھا لیے تھے۔'' چاول نرم رکھتی (ساس سسر کے خیال سے) تو کہتے ملیدہ بنا دیا ہے اور اگر ایک کنی رکھ کر ابالتی تو کہتے سخت ہیں۔ خیر آج تک ان کی نظر میں فیل ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرنے کے بجائے بڑی بیٹی کو (جو کہ دوگلی چھوڑ کر رہتی ہے) اسے بلوایا جاتا ہے۔ خیر بلوانے کی کیا بات ہے وہ رہتی ہی ادھر ہے بچوں سمیت۔ اور دوسری بات امی کے گھر جب جو کھانے کو دل چاہتا وہ بنا لیتے لیکن سسرال میں ساس صاحبہ کی اجازت درکار ہوتی ہے' جو انہوں نے کہنا ہے وہی پکے گا۔

س: ''سسرال میں کن باتوں پر تنقید اور کن باتوں پر تعریف ہوئی؟''

ج: سسرال میں صرف اور صرف تنقید ہوئی اور سب سے زیادہ تنقید میری تعلیم اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے پر ہوتی ہے۔ میری ساری نندیں بالترتیب پرائمری، مڈل، میٹرک پاس ہیں اور وہ مجھے میرے منہ پر کہتی ہیں کہ ہم آٹھ پڑھ کر تم ایم۔اے سے زیادہ اچھی ہیں۔ کبھی اکٹھی بیٹھ کر کہتی ہیں یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیاں بہت آوارہ ہوتی ہیں۔ باہر پھر کر آ جاتی ہیں اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے ان کی جہالت دیکھ کر۔

میری نند کی شادی کے موقع پر میرا بیٹا بھی پیدا ہونے والا تھا۔ ابھی دو ماہ گزرے تھے اور میں بھاگ بھاگ کر لوگوں کو ناشتے کھانے پیش کر رہی تھی پھر بھی

کام میں دیر سویر ہونے پر سب کے سامنے میری نند نے کہا۔ ''بدسلیقہ اور پھوہڑ عورتیں چاہے ایم۔اے بھی کرلیں وہ ویسی ہی رہتی ہیں۔''

اب میں اپنی قسمت کو روتی ہوں کہ میری ایک بھی خوبی ان کو نہیں بھاتی۔

اس کے علاوہ اپنی بیٹی کو صاف ستھرا رکھنے کے چکر میں اسے تین دفعہ کپڑے بدلوانے پر بھی بہت تنقید ہوتی ہے' اس کے ساتھ انگلش کا کوئی جملہ بول لوں تب بھی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔

س: ''سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جس پر آپ کا حق تھا اور گھریلو معاملات میں رائے لی جاتی تھی؟''

ج: بالکل بھی نہیں مقام ملا۔ مجھے بالکل یاد ہے دو سال پہلے میری نند کی شادی تھی تو اس کے رشتہ آنے اور بات پکی ہونے تک مجھے نہیں معلوم تھا حتیٰ کہ میں کمرے میں داخل ہوتی تھی تو ساس سسر کو چٹکی کاٹ کر خاموش ہوجانے کا اشارہ کردیتی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں اکلوتی بہو ہوں آپ نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا تو کہنے لگے ''ہماری مرضی ہم تمہیں بتائیں یا نہ بتائیں۔''

س: ''بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی کا بہت بڑا مرحلہ ہوتا ہے خصوصاً پہلا بچہ؟''

ج: پہلا بچہ پیدا ہونے کے تمام عرصے میں میری ساس کہتی رہیں ہم نے تو بیٹا لینا ہے۔ لیکن پیدا بیٹی ہوگئی تو میری ساس اتنی رنجیدہ و اداس کہ ان کی شکل رونے والی ہوگئی اور وہ ابھی تک اپنی پوتی سے پیار نہیں کرتیں۔ جب وہ دو، تین ماہ کی تھی تو اسے چیت لگا کر کہتیں ''کتنی تیز ہو تم چپ کرو'' اس کو فرش پر لٹا کر خود بیڈ پر لیٹ کر مجھے آواز لگاتیں۔ ''اے تمہاری بچی شور کررہی ہے رو رو کر۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ میرے سر میں درد کردیا ہے۔'' ایک دن میں کچن میں کام کررہی تھی تو اپنے خاوند کو کہہ رہی تھیں کہ ''دیکھ لینا اس کی ماں نے لاڈ پیار میں اس کو بگاڑ دینا ہے۔''

س: ''آپ جوائنٹ فیملی سسٹم کو پسند کرتی ہیں یا علیحدہ؟''

ج: جوائنٹ فیملی سسٹم تو ایک نعمت ہے اگر اس میں خلوص، محبت اور درگزر ہو تو ایک مثالی گھرانہ بنتا ہے۔ لیکن جہاں دلوں میں کینہ و بغض ہو وہاں علیحدہ ہوجانا ہی بہتر ہے لیکن میں تو علیحدہ بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ ایک ہی بیٹا ہے۔ میرے خاوند صاحب تو اس چکی میں پسیں گے ساری زندگی۔''

س: ''آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی؟''

ج: سسرال کو بہتر بنانے کی کوشش — ؟ جناب وہ لوگ فرشتے ہیں اپنی دانست میں۔ ان کو کون مائی کا لعل درست کرے گا۔ الٹا وہ مجھے ہر بات میں ناقص العقل سمجھتی ہیں۔ ان کا دین ان کی اپنی مرضی کا، ان کی ہر چیز لاجواب ہے۔ ان کو اپنی نمازوں پر بہت غرور ہے۔ شادی سے پہلے میری جس اچھی شکل کے خواہاں تھے اب کہتے ہیں۔ ''اچھی شکلوں کو دفع کرو اگر دل ہی اچھا نہ ہو۔''

خیر انگلش سیکھنے کا کبھی کبھی چھوٹی نند کو دورہ پڑتا ہے تو پوچھتی رہتی ہے البتہ باقی کسی معاملے میں مجھے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ خیر میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ میرا احوال ضرور شائع کریں کیونکہ تمام قارئین کی طرح میں خواتین و شعاع کو اپنا خاندان سمجھتی ہوں اور میرا احوال میری بہنوں تک پہنچے یہ میری خواہش ہے۔ میرے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔

زندگی جہد مسلسل کی طرح کاٹی ہم نے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں!

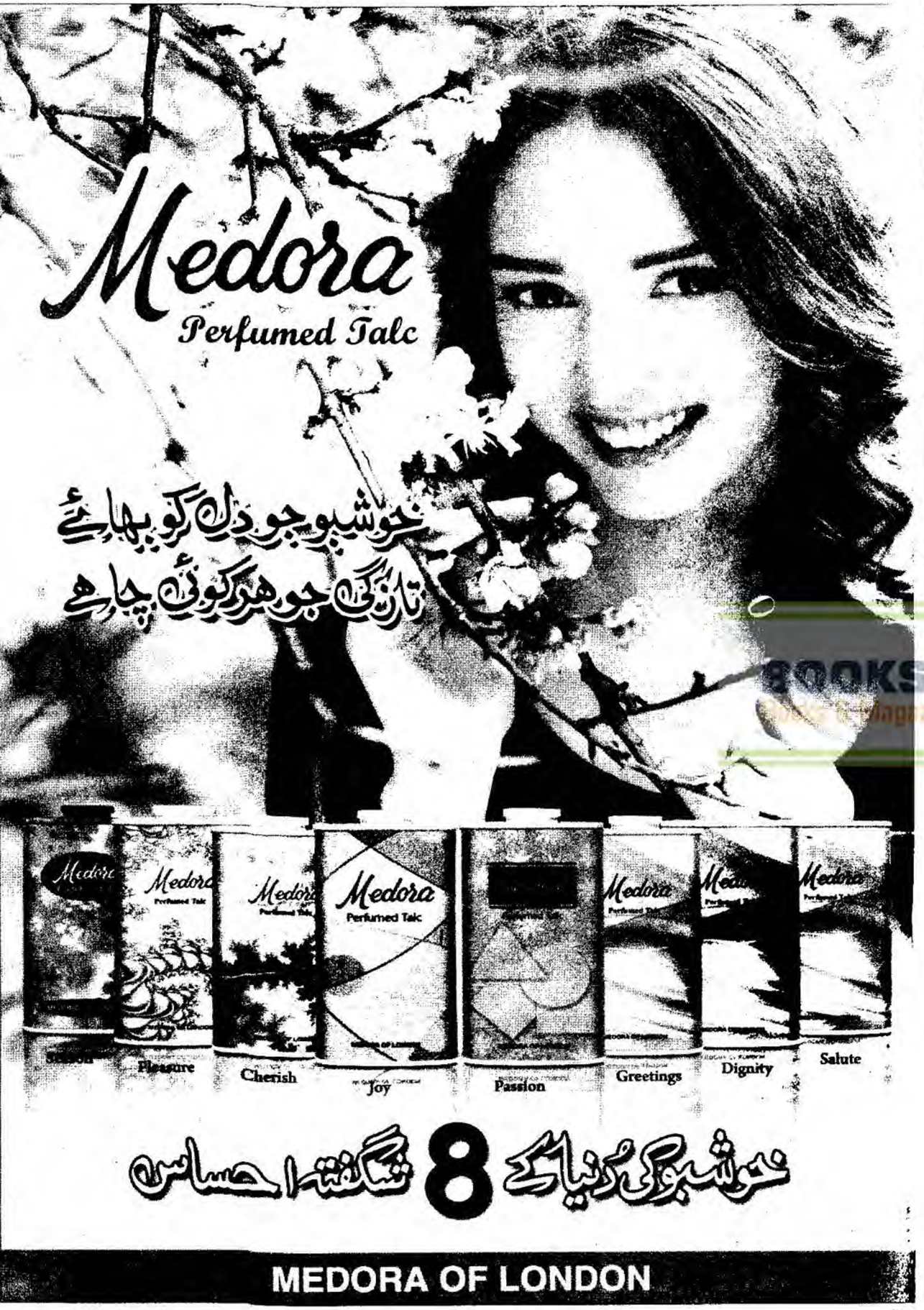

خط بھجوانے کے لیے پتا

ماہنامہ **شعاع** - 37 - اُردو بازار، کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔

پہلا خط رحیم یار خان سے ثناء ذوالفقار کا ہے، لکھتی ہیں

جولائی کا سادہ سا ٹائٹل اچھا لگا۔ حمد اور نعت پڑھنے کے بعد نبی ﷺ کی باتیں پڑھ کر علم میں اضافہ کیا۔ ''عہد یوسفی'' نعیمہ ناز نے بہت اچھا لکھا۔

''دستک'' میں شگفتہ بھٹی سے ملاقات اچھی رہی۔ دستک میں ہر ماہ کسی رائٹر کا ہی انٹرویو لیا کریں۔ ''بندھن'' میں زارا نور اور اسد صدیقی نیو کپل کے بارے میں اچھا لگا۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا'' بہت عرصے کے بعد ایک خوش گوار ناتا پڑھنے کو ملا۔

''شہرزاد'' میں شکر ہے ہم زاد کے راز سے پردہ اٹھ ہی گیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید ہادی ہم زاد ہے۔ درشہوار کا تو پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ لیکن شاہ میر کی تو مفت میں جان چھوٹ گئی۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

''نہ جائے ماندن'' ام طیفور نے بہت اچھا لکھا ویسے کہانی کے نام کا مطلب کیا ہے؟ شیخ جی کا صدقے کا فارمولا تو بہت انٹرسٹنگ تھا۔ جمشید کی ساری عمر ماں باپ کے گھر بیٹھے رہنے والی بات پر ایسی بے ساختہ ہنسی آئی کہ امی پوچھنے لگیں ''کیا ہوا؟''

''خواہشوں کے حصار میں'' اچھا ناول تھا۔ ویسے مجھے یہ کہانی ''من وسلویٰ'' کے شیراز سے ملتی جلتی لگی۔ ''ایک نگاہ کے اسیر'' میں بالآخر صلہ کو اس کی خوشیاں مل ہی گئیں۔

''یار دل دار'' افشین نعیم کی اچھی سیریز ہے۔ ''جھوٹی'' اچھا لگا۔ ''شعاع کے ساتھ'' سلسلے کا کافی عرصے سے انتظار تھا، اس شمارے میں دیکھا تو اچھا لگا۔

☆ پیاری ثناء! جب قارئین شعاع کے لیے پسندیدگی ظاہر کرتی ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ ہماری محنت اور کوشش کامیاب ہوئی۔ شعاع آپ کو پسند آیا، بہت شکریہ۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن فارسی کا محاورہ ہے۔ مطلب یہ کہ ایسی صورت حال جہاں نہ جاتے بن پڑتے نہ ہی ٹھہر پاتے۔

فرحانہ مہناز گوجرہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

جون کا پورا مہینہ اسلام آباد میں گزار کر یکم جولائی کو آتے ہی پہلا کام شعاع کا حصول تھا۔ عام روٹین کی طرح پڑھنا شروع کیا لیکن شعاع کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اف آپی جان میرے پسندیدہ شعر کیوں سنسر کردیے؟ اور بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے ہم اتنا بھی برا نہیں گاتی تھیں (ہاہاہا)۔ اس کے بعد اپنا فیورٹ ''خواب شیشے کا'' پڑھا۔ نمیر کا میسج پڑھ کر جہاں مہر ماہ کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے آیا وہاں میری آنکھیں اس کستوری کو پڑھ کر روشن ہوگئیں، بے حد خوب صورت الفاظ تھے۔ پلیز آخری قسط میں مہر ماہ کو تھوڑا سا ہنسا دیں۔ ''شہرزاد'' بھی دلچسپ موڑ پر آ گئی ہے۔ ویسے بھی صائمہ اکرم کا یہ ناول پچھلے سال بھی اور اب بھی اسلام آباد اور مری میں میرے ساتھ ساتھ رہا۔ مری جا کر تو مجھے درشہوار اور ہادی یاد آتے ہیں۔ بچے مال روڈ انجوائے کرتے ہیں تو میں ان دو گھروں کو ڈھونڈتی ہوں جن کا نقشہ صائمہ جی نے کہانی کے آغاز میں بتایا تھا۔

''بن پاکھی'' پچھلی قسط سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی، تسلسل ٹوٹنے نہ پایا۔ نادیہ احمد کا ناول بہت اچھا لگا۔

''خواہشوں کے حصار میں'' تھوڑا نہیں بہت ہی پرانا موضوع، کچھ خاص نہیں لگا۔ پانچوں افسانے بھی اچھے تھے، اکلوتا ناولٹ ابھی پڑھا نہیں (چھٹیاں ہیں نا تو مہمانوں یعنی رحمتوں کا نزول ہے) سادہ کیک میں بھی بہت بناتی ہوں لیکن ریت نہیں بچھاتی بلکہ پریشر ککر میں پینتالیس منٹ ہلکی آنچ پر رکھتی ہوں۔

☆ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

طلعت ساجد نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میرا اگر اس بار بھی خط شائع نہ ہوا تو..... میں..... میں چند ماہ بعد دوبارہ ہمت کرلوں گی (ناراضی ختم جو ہوجائے گی)۔ پرچہ تو سارا ہی زبردست تھا مگر اس بار ''شہرزاد'' ٹاپ پر تھا۔ ''بن پاکھی'' سیکنڈ تھا اور تھرڈ پر ہے ''تیری اک نگاہ کے اسیر۔'' بہت خوب صورت منظر نگاری، پانیوں پر پُرخطر سفر، واؤ فرح جی تسی گریٹ ہو۔ رافع کی بے قراری (ویملا کے گم ہونے پر) بہت خوب صورت انداز میں بیان کی ہے آپ نے۔ (لیکن حیرت ہے اسے محبت کیوں نہیں کہا؟) جمال دادا کی دی ہوئی کشتی میں، رات کے اندھیرے میں تاحد نگاہ پانی اور جنگل کو دیکھتے ہوئے اس نے ویملا کو پکارا تو اس پکار میں ہی اس کے دل کی بے قراری واضح ہوئی اور پھر اندھا دھند جنگل میں بھاگتے ہوئے اس کی آوازیں پتا نہیں کتنے ہی شیروں اور سانپوں کی ڈسٹربنس کا باعث بنی ہوں گی۔ شکر ہے کہ وہاں کوئی باگھ نہیں آ نکلا..... اور ویملا اس نے جتنی ہمت سے رافع کو دلدل سے نکالا اس کی ہمت کی داد دینی ہوگی لیکن رافع دلدل میں سر تک ڈوب کر بھی اتنی جلدی نارمل ہوگیا۔ اس پر حیرت بھی ہوئی..... اور نادیہ احمد کی ''تیری اک نگاہ'' اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد باری آئی ''ام طیفور'' کی مطلب ''نہ پائے ماندن'' نام کچھ عجیب سا تھا مگر شیخ جی نے بے ساختہ قہقہے اگلوا دیے۔ ''خواہشوں کے حصار میں'' اسٹارٹ سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اینڈ کیا ہوگا مگر کہانی میں ٹوئسٹ تو اورینب نے دیا ہے، کتنی خوب صورتی سے آصف کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ارے مگر وہ شعر کیا ہے جس میں..... کیا، لوٹا..... اور ہرجائی آتا ہے۔

''یار دلدار'' بھی مزے کا تھا، سچے دوست ایسے ہی ہوتے ہیں، ایک پریشانی سے نکال کر دوسری میں ڈال دیتے ہیں، ہاہاہا۔ اب حیدر بے چارا کرتا پھرے گھر، بنگلہ، گاڑی کا انتظام..... آخر میں یہ بھی بتادوں کہ میرا شوق صرف رسالے پڑھنا ہی نہیں بلکہ لکھنا بھی ہے۔

☆ پیاری طلعت! یہ صحیح ہے کہ آپ نے خط لکھے، یہ بھی بجا ہے کہ ہمیں موصول بھی ہوئے لیکن اتنی تاخیر سے کہ پرچا تیار ہوکر پریس جاچکا تھا۔

حمیرا نوشین کی ہیروئن اورینب صاحبہ یقیناً پروین شاکر کی طرح فراخ دل نہیں ہوں گی۔ تب ہی انہوں نے اپنے ''ہرجائی'' کے ایک بار جانے کو بھی معاف نہیں کیا۔ پروین شاکر نے تو بار بار جانے کو بھی اس ایک اچھی بات پر معاف کردیا تھا کہ وہ ہرجائی ہر بار لوٹ کر ان ہی کے پاس آتا تھا۔

کہانیاں ضرور بھجوائیں، اجازت کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی آپ کے خط سے انداز ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔

راہی حمید نے ضلع کوہاٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اب آتے ہیں جولائی کے شعاع کی طرف، ماڈل اچھی تھی اور ہمیشہ کی طرح حمد ونعت اور مختلف احادیث سے آغاز کرتے ہوئے آگے بڑھے اور بندھن میں زارا نور کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی اور اچھا لگا۔ شہرزاد پڑھا اور درشہوار نے جو کیا۔ اسے ہم بے وقوفی ہی کہہ سکتے ہیں، اس نے تو محمد ہادی کو اچھا پھنسا دیا ہے، پتا نہیں کیا ہوگا اور پھر انیلا طالب کا افسانہ دعا پڑھا۔ حمیرا عروش کا ''چھوٹی'' پڑھ کر اچھا لگا۔ اب ام طیفور جی کے ناولٹ ''نہ پائے ماندن'' کو پڑھ کر تو مزہ ہی آ گیا۔ ناظمہ زیدی کے

BOOKSPK Books & Magazines

افسانے ''الٹا چکر'' کو پڑھا۔ ''بن پاکھی'' اچھا ہی لگا، فرح بخاری کا۔ اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے، آگے کیا ہوتا ہے مگر میں فرح بخاری جی کو کہوں گی کہ مجھے تو لگتا ہے کہ آگے جا کر یہ جو کہانی کی ہیروئن ویملا ہے، یہ اسلام قبول کرے گی تب ہی یہ محمد رافع کے ساتھ شادی کریں گی۔ یہ تو میرا اندازہ ہے آگے فرح بخاری جی بہتر جانتی ہیں کہ وہ کہانی کا انجام کیا کریں گی۔ نیر فہیم خان کا افسانہ مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو بھی اچھے موضوع پر تھا۔ نادیہ احمد جی کے مکمل ناول ''تیری اک نگاہ کے اسیر'' مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ حمیرا نوشین جی کا مکمل ناول ''خواہشوں کے حصار میں'' اچھے موضوع پر تھا۔

☆ پیاری راہی! آپ کے حالات جان کر افسوس ہوا اور خوشی بھی۔ خوشی اس بات کی کہ آپ سب مل کر محنت اور کوشش سے حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور افسوس اس بات کا کہ اتنی چھوٹی عمر میں آپ کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شاء اللہ یہ وقت گزر جائے گا اور اچھا وقت آئے گا تو آپ کو یہ سب یاد بھی نہیں رہے گا۔ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نور سسٹرز جیکب آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

تقریباً تین سال سے شعاع، خواتین اور کرن کے مستقل قاری ہیں، اس سے پہلے ہماری پھوپھو اور خالہ تقریباً بیس بائیس سال سے خاموشی قاری ہیں اور یہ شوق ہمیں ان دونوں سے ملا ہے۔ سب سے پہلے پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں پڑھی، بہت سی باتوں کی معلومات ملی۔ اب آتے ہیں اپنے فیورٹ ناول ''شہرزاد'' کی طرف۔ ہم زاد سب کے سامنے آ گیا لیکن بہت اچھا لگا، سب کردار بہت اچھے ہیں سوائے درشہوار کے۔ میری چھوٹی سسٹر کو انابیہ کا کردار بہت پسند ہے، پلیز اس کے ساتھ برا نہ کیجیے گا۔ نادیہ احمد کا ''تیری اک نگاہ کے اسیر'' موضوع پرانا تھا مگر اچھا لگا۔ ''بن پاکھی'' پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم جنگل میں گھوم رہے ہیں۔ ''یار دلدار'' حساس دلوں کی کہانی تقریباً سارے سلسلے اچھے لگے۔ بندھن کے سلسلے میں فرحان سعید اور عروا حسین کو شامل کریں۔

☆ پیاری نور! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صائمہ امیر جوہر کالونی سرگودھا سے، لکھا ہے

سچ جانیں کہ آج تک کسی کہانی کا اتنی شدت سے انتظار نہیں رہا، جتنی شدت سے مجھے ''بن پاکھی'' کا رہا ہے۔ فرح بخاری نے کمال کر دیا، یہ کہانی میرے خوابوں میں آتی رہی ہے۔ فرح نے کیا خوب صورت منظر کشی کی ہے کہ ہم یہاں بیٹھے وہاں کے سب منظر گھوم آئے، اتنی پرکشش منظر کشی، اتنی جان دار اسٹوری پر فرح بخاری آسکر کی حق دار ہیں۔ میرے خیال سے فرح بخاری، سمیرا حمید تک پہنچنے لگی ہیں۔ لو یو ویملا، لو یو فرح بخاری۔ دوسرا فیورٹ ناول ''شہرزاد'' ہے جو اکثر مسنگ ہوتا ہے، یہ ظلم کیوں؟ ہم زاد کی حقیقت جان کے دلی خوشی ہوئی کہ وہ ہادی نہیں تھا۔

☆ پیاری صائمہ! آپ کی رائے شامل ہے، محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

حمیرا لطیف حور نے رائے ونڈ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل کو سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے چھلانگ لگائی ڈائریکٹ ''شہرزاد'' پر۔ یہ کیا صائمہ آپی! ہم ''ہم زاد'' کے روپ میں حمزہ خالد کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم زاد کے کریکٹر پر تو ہادی ہی پورا اترتا ہے، پلیز آپی! حمزہ خالد صاحب کو کہانی سے باہر نکال دیں نا (وہ بھی باعزت طریقے سے بھئی..... دھکے دے کر نکالنے کا مشورہ نہیں دیا ہم نے)۔ درشہوار لگتا ہے ہادی کو پھنسوا کر ہی دم لے گی۔ انیلا طالب گڈ۔ ''یار دلدار'' ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی اسٹوری تھی۔ ''چھوٹی'' واؤ..... سبق آموز کہانی تھی۔ ''نہ پائے ماندن'' ہاہاہا، زبردست ام طیفور جی۔ ناظمہ زیدی نے بھی اچھا لکھا۔ ''بن پاکھی'' شدت سے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ نیر فہیم خان نے بھی بہت اچھا لکھا۔ نادیہ احمد گریٹ۔ ''صلہ'' نام کچھ عجیب سا تھا (اگر نادیہ جی نے میری اس بات کو مائنڈ کیا تو میں ان سے ناراض ہو جاؤں گی، اس لیے بی کیئر فل)۔ ''خواہشوں کے حصار میں'' کہانی تو اچھی تھی لیکن اورینب کا مطلب بتا دیں پلیز۔ ''خواب شیشے

کا'' شکر ہے نمیر آفندی سامنے آ گیا۔ ''تاریخ کے جھروکوں سے'' مونث فیورٹ سلسلہ ہے۔ آپی پلیز نمرہ احمد سے لکھوائیں۔ نمرہ احمد کا بھی انٹرویو لیں نا۔

☆ پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے دل کی گہرائیوں سے ممنون ہیں۔ اگر نمرہ راضی ہوئیں تو ان کا انٹرویو ضرور کریں۔ ''برف زاروں کی تتلی'' فاخرہ جبیں کا ناول تھا، مہینہ اور سال ہمیں یاد نہیں۔

اور حمزہ خالد نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اسے نکالنے کے درپے ہیں؟

میانوالی سے عصمہ کا خط ہے، لکھتی ہیں

''شہرزاد'' میں ہیرو ظاہر ہوئے تو شکر ادا کیا کہ میجر نکلا ہادی نہیں۔ ''بن پاکھی'' بہت زبردست۔ فرح بخاری کی یہ اپنی تحریر ہے یا معذرت کے ساتھ کسی کا ترجمہ تو نہیں، مطلب بنگالی زبان کا۔ خدا کے لیے فنکاروں کو بند کریں۔ کسی ماہر ہربل سے ہمارے لیے مشورہ لیں یا کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔

☆ پیاری عصمہ! ہماری بہت سی قارئین فنکاروں کے انٹرویو پسند کرتی ہیں۔ ہم آپ کے لیے اتنی تبدیلی کر سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں فنکاروں کے ساتھ دیگر شخصیات کے انٹرویو بھی شامل کر لیں۔ ماہر ہربل سے مشورہ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔

فرح بخاری کی کہانی طبع زاد ہے۔ بنگالی سے ترجمہ نہیں ہے۔

نتاشہ انصاری نے لکھا ہے

ہم نے تو عفت صاحبہ سے سسپنس ختم کرنے کو کہا تھا، یہ تو کہانی ہی ختم کرنے والی ہیں۔ خیر بہت اچھا ناول لکھا عفت صاحبہ نے۔ ہر ماہ بے چینی سے اس کہانی کا انتظار کیا ہے۔ لگتا ہے نمیر اور مہر وایک ہو ہی جائیں گے لیکن موحد کے لیے برا لگ رہا ہے۔ افسانے بھی سب ہی پسند آئے (بہت ہی اعلا)۔ ناولٹ بھی اچھے رہے۔ آخر میں اپنی تحریر کے بارے میں پوچھنا چاہوں گی۔

ہادیہ خاتون، ہارون آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

''شب تاب'' کس خوب صورت انداز سے زرناب کو مصطفیٰ کی زندگی میں شامل کیا ہے، بہت اچھا لکھا۔ تصویر والی بات کا آپ نے غلط مطلب لیا۔ تصویر دینی ہے تو مکمل تصویر دے دیا کریں جس سے ڈریس تو نظر آئے۔

اب بات کرتے ہیں جولائی کے شعاع کی، اگر سب کہانیوں پر الگ الگ تبصرہ کروں تو خط بہت لمبا ہو جائے گا۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی تمام ناولز اور افسانے ٹاپ پر رہے اور ''شہرزاد'' کی تو بات ہی کیا ہے۔ اس ماہ جس سلسلے وار ناول کا سب سے زیادہ شدت سے انتظار تھا وہ ہے فرح بخاری کا ''بن پاکھی''۔ مجھے ان کا خطرناک قسم کا دریائی سفر بہت اچھا لگا اور رافع محمد کا ویملا کی عزت کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگانا۔ بہت زبردست اور منفرد قسم کا ناول ہے۔

☆ پیاری ہادیہ! چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں کہ تصویر پوری دیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب سے میڈیا کو آزادی ملی ہے ہماری ماڈلز بہت ماڈرن ہو گئی ہیں۔ نہ سلیقے کے کپڑے پہنتی ہیں نہ ہی دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ اس لیے ہم صرف چہرے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس نے

گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل اچھا تھا۔ گجرات میں کچھ ماہ سے شعاع بہت لیٹ مل رہا ہے۔ پہلی شعاع کی باتیں دل میں اتریں۔ بندھن میں دونوں کپل فیورٹ رہے۔ خاموشی ڈرامہ شعاع کے ایک ناول آپا کی کہانی تھی ناں..... تجھ سے ناتا اس ماہ بیسٹ لگا۔ نورین آپ کے لیے اللہ پاک آسانیاں پیدا کرے۔ شعاع کا ہاٹ فیورٹ ناول ''شہرزاد'' پڑھا۔ اف..... توبہ ہے۔ یہ لڑکی درشہوار اور کتنی محبت میں خوار ہو گی۔ اب ہادی کا بھی بیڑا غرق کرے گی، کیا ایسا کرنے سے ہادی اپنے دل کی دہلیز پار کرنے دے گا اسے۔ ایویں ہی ہم سب نے رولا ڈالا ہوا تھا۔ ہم زاد کو منظر عام پر لائیں۔ سچی میرا تو سارا چارم ہی ختم ہو گیا ہے کہ ہم زاد حمزہ خالد ہیں۔

شعاع کا دوسرا ہاٹ کیک ناول ''خواب شیشے کا'' میں شرطیہ بلکہ اعلانیہ یہ کہتی ہوں کہ موحد ہی نمیر آفندی ہے۔ اور میرا پکا یقین ہے ایسا ہی ہو گا۔ چلو جی یہ پکا مہر ماہ

اور موحد کی جوڑی ہی رہے گی۔ نمیر آفندی کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ تیسرا ناول ''بن پاکھی'' پڑھا۔ جولائی کے شمارے میں اس کا مطلب بھی پتا چل گیا، جنگل کا پرندہ۔ رائٹر خود تو اتنا نہیں تھکتی ہوگی، جتنا پڑھتے ہوئے مجھ کو تھکن ہوئی، اب بس بھی کریں۔ اتنی تھکن زدہ تحریر کو تیسری قسط لاسٹ ہی رکھیں۔ توبہ ہے بھاگ بھاگ کر دونوں کا حشر ہی کر دیا ہے اور کہیں رومانس کا نام ونشان نہیں۔ حد ہے بھئی، پر ہے دوسرے ناولوں سے ذرا ہٹ کے یہ تحریر۔ ''تیری اک نگاہ کے اسیر'' (معذرت کے ساتھ) یہ تحریر ذرا جو متاثر کر سکی ہو۔ موضوع بہت پرانا اور تھکا دینے والا ہے۔

حمیرا نوشین کا ''خواہشوں کے حصار میں'' پرائے مال پہ عیش کرنا کوئی سوکھی گل نہیں ہوتی۔ عزت نفس کو مارنا پڑتا ہے، آصف کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

ایک بار پھر معذرت نہ جائے ماندن کے لیے، اُف مجھے ام طیفور سے یہ امید نہیں تھی۔ لگتا ہے ہی نہیں ایک ماہر قلم نگار کی یہ کاوش ہے۔ ایک نے اتنی گرمی۔ اللہ پاک کائنات کی ہر سانس لیتی مخلوق کو مکئی کے دانوں کی طرح بھون رہا ہے، اوپر سے ایسی تحریر اور بھون بھان کے رکھ دیتی ہے۔ قسمے آکھاں اے جے جھوٹ بولاتے، دشمناں دے سر گنجے ہوئے۔ افسانوں میں ''یار دل دار'' اس بار بس ایویں ہی لگا۔ دعا اور چھوٹی دعا کے لیے دل دکھا، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ ''چھوٹی'' پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔ توبہ کتنی چالاک نند تھی، شاید یہ بھول گئی تھی اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔ ''الٹا چکر'' بھی ایک نصیحت لیے ہوا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے جو ظلم کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں، جیسی کرنی ویسی بھرنی ضرور ہے۔

باقی تمام کا تمام شعاع بیسٹ رہا، خط آپ کے خوب محفل جمی رہی ہمارے بغیر۔ قاری بہنوں کے سوال ہوتے ہی عجیب ہیں اور آپ کے جوابات عجیب تر ہوتے ہیں۔

واصفہ سے کہنا اس بار آئینہ خانے میں کچھ کرارا نہیں تھا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ پڑھ کر اچھا لگا۔ موسم کے پکوان بھی اچھا تھا۔ ذرا موسم اعتدال پر آئے تو پھر سادہ کیک خود بناؤں گی۔

☆ فوزیہ! اف اتنی سخت تنقید اس بار ایک بھی تحریر آپ کو پسند نہیں آئی۔ یقین آ گیا کہ گجرات میں شدید گرمی ہے۔ اور یہ کیا بات ہوئی کہ بن پاکھی میں رومانس کا کہیں نام نہیں۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ ویملا نے خود کو شادی شدہ ظاہر کیا ہے اور رافع منگنی شدہ ہے پھر بھی ان کے درمیان جو نرم و نازک سا محبت کا خاموش رشتہ ہے وہ تو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی محبت خود بولتی ہے۔ ضروری نہیں کہ بھاری بھرکم الفاظ میں اظہار کیا جائے۔

در شہوار جیسی لڑکیاں جنہیں اپنی عزت نفس کا خیال نہیں ہوتا ہمیشہ خسارے میں رہتی ہیں۔ اس طرح زبردستی محبت حاصل کرنا خود کو گرانا ہے۔ عزت بہر حال محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔ عشق تو ویسے بھی بقول شاعر خلل ہے دماغ کا اور یک طرفہ محبت کے تو ہم قائل ہی نہیں۔ مزا تو تب ہے جب دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔

انعم محمود نے فیصل آباد سے لکھا ہے

سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ نمیرہ احمد، نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، ثمرہ بخاری، نبیلہ عزیز، صائمہ اکرم سب ہی میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ سب ہی کو میرا سلام۔ شعاع کو پڑھا تو جانا کہ دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔

☆ پیاری انعم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ حقیقت افسانے سے زیادہ سفاک ہوتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ہم لکھ بھی نہیں سکتے۔ اشعار قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

راولپنڈی سے صبا غضنفر کا خط موصول ہوا ہے لکھتی ہیں

پہلے صبا الیاس کے نام سے لکھتی تھی مگر جب سے شادی ہوئی تو شوہر کا نام جوڑ دیا اپنے نام کے ساتھ۔ آپ کے جواب بہت محبت اور خلوص بھرے ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے امید ہے مجھے بھی محبت بھرا جواب ملے گا۔

ج: پیاری صبا! ہمارے جواب ہی خلوص اور محبت بھرے نہیں ہوتے، ہمارے دل میں بھی آپ سب کے لیے بہت خلوص اور محبت ہے۔ اطمینان رکھیں اگر کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ جہاں تک واپس لوٹانے کی بات ہے تو

یہ ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ ہم ہر ماہ پرچے میں خاص طور پر یہ بات لکھتے ہیں کہ کہانی کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

سعدیہ وحید سعدی نے اسلام آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شکر ہے میرے میکے والوں کو بھی ہوش آیا شعاع میں خط لکھنے کا۔ بھئی حاصل پور والوں کی بات کر رہی ہوں۔ مابدولت کا میکہ آباد ہے وہاں۔ اب تو بہاول پور سے بھی سندیسے آتے ہیں۔ بھئی میرا دوسرا میکہ وہی ہے تین عدد پھوپھو اور چاچو چاچی۔ سو میکے والو آتے جاتے رہا کرو دل خوش ہو جاتا ہے، اب آتے ہیں شعاع کی طرف۔ سب سے پہلے تو سالگرہ مبارک شعاع کو۔ ''یار دلدار'' ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ افشین نعیم نے اچھا سلسلہ شروع کیا ہلکی پھلکی تفریح۔ دعا کی مجھے تو ذرا سمجھ نہیں آئی کہ کیا پیغام تھا کہانی میں (معذرت کے ساتھ) ''چھوٹی''۔ وہی مکافاتِ عمل اچھی تھی۔ ام طیفور، ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔ ویل ڈن شہر زاد۔ اور ''خواب شیشے کا'' اچھی رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ میری کہانیوں کا بتا دیں۔

ج: سعدیہ جی! بالکل درست ہے عورت کو میکہ اتنا ہی پیارا ہوتا ہے کہ میکے کا شہر، اس کی گلیاں اس کے لوگ سب ہی اچھے لگتے ہیں۔ صرف نام ہی دل میں پھول کھلا دیتا ہے اور سندیسہ تو واقعی سردیوں میں دھوپ اور گرمیوں میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہوتا ہے۔

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ شبانہ عندلیب نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

19 مئی تیسرے روزے کو امّی اچانک ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس صدمے سے ہم سب گھر والے اب تک نہیں سنبھلے ہیں۔ کیونکہ امی کو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا بس معمولی کھانسی تھی۔ جو جان لیوا ثابت ہوئی تمام قارئین سے امی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

اس بار ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے پہلی شعاع پڑھی۔ سالگرہ نمبر کے سروے کے سوالات بھی اچھے لگے۔ مگر میں سروے میں حصہ لیتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ شاید آپ کو میرے جواب پسند نہ آئیں۔ کیونکہ باقی سب بہنوں کے جواب تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ عہدِ یوسفی پر نعیمہ ناز کا مضمون بہت پسند آیا۔ بندھن میں زارا نور عباس سے ملاقات مختصر پر اچھی رہی۔ دستک میں شگفتہ بھٹی کا انٹرویو ان کے نئے سیریل سے متعلق بہت پسند آیا۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' بھی ٹھیک تھا۔

افسانوں میں ''یار دل دار'' نے دل خوش کر دیا۔ ثمرہ بخاری کے جوادی اور شبلی کے بعد یار دلدار کو پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ ثمرہ جی تو ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ نیر فہیم خان کا افسانہ اس بار بس ٹھیک ہی تھا۔ نادیہ احمد کا ناول ''تیری اک نگاہ کے اسیر'' پسند کی سند پا گیا ——— ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' میری اور میرے سب گھر والوں کا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ''تاریخ کے جھروکے سے'' تو میں کبھی نہیں چھوڑتی ہوں۔

ج: پیاری شبانہ! آپ کی والدہ کی وفات کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا، ماں جیسی ہستی کی اچانک جدائی کا غم سہنا آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ افشین نعیم واقعی یہ ہلکی پھلکی مختصر سی کہانیوں کی سیریز بڑی خوب صورتی سے لکھ رہی ہیں۔

اور یہ ڈرنے والی بات ہمیں بالکل ٹھیک نہیں لگی۔ آپ نے یہ کیوں سوچا کہ ہمیں اچھا نہیں لگے گا۔ یہ بھی تو سوچ سکتی تھیں کہ ہمیں پسند آئے گا اور شائع ہو جائے گا۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

سونیا کا کہنا ہے کہ ''ہمارے ملک میں فلم سے زیادہ لوگ ڈرامے دیکھنا پسند کرتے ہیں (جی، جب ہی آپ لوگ ڈراموں کی طرح فلمیں بناتے ہیں) اچھے موضوعات کی فلمیں کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' (ہاہاہا)۔

خواہش

عذیر جیسوال گلوکاری اور اداکاری ساتھ لے کر چل رہے ہیں (یا کوشش کر رہے ہیں..... بھئی چلنے کی)۔ ڈراموں کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہتے مگر موسیقی میں وہ کچھ کر دکھا رہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے مومنہ مستحسن کے ساتھ 'ہمیشہ' کیا اور کامیاب رہا۔ عذیر جیسوال کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان میں نئے فلمی ماحول کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ (ہائیں کیوں؟

واصفہ سہیل

کہکشاں

اعتراض

سونیا حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ (اب تعارف مانگ بھی کون رہا ہے)۔ سونیا حسین ٹی وی ڈراما، ماڈلنگ سے اب فلم کی طرف گئی ہیں۔ اس بارے میں سونیا کہتی ہیں کہ ''میں ڈراموں سے فلموں میں جا رہی تھی، مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میری پہلی فلم نے مجھے سمجھایا کہ سینما کیا ہوتا ہے (اس سے پہلے آپ کو نہیں تھا، پتا کہ سینما کیا ہوتا ہے جی؟)۔

سونیا نے مزید کہا کہ آج کل بننے والی زیادہ تر فلموں کو دیکھ کر تو پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ ٹی وی کے لیے بننے والا ڈراما ہے۔ (ڈراما ماڈرن ہو گیا ہے بھئی، فلم کی کمی دور کر رہا ہے) یا سینما کے لیے بننے والی فلم، مجھے تو آج کل کی فلمیں ٹی وی کا لانگ پلے لگتی ہیں (وہی تو..... ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ.....)

دیکھ رہے ہیں بھئی غور سے؟) اور سنجیدگی سے فلموں کے لیے پلے بیک گائیکی کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ (باقی جگہ وہ غیر سنجیدگی سے گائیکی.....؟) اگرچہ وہ اس کام کو بہت مشکل سمجھتے ہیں (گائیکی کو یا فلمی کی گائیکی کو؟)۔ مگر عنقریب وہ اپنا یہ شوق بھی پورا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ (کیا فلمی لوگ بھی انہیں لینے کے خواہش مند ہیں یا.....؟)۔

ڈر

پچھلے دنوں فرحان سعید نے ''سنو چندا'' میں کام کر کے اداکاری کی دنیا میں قدم دوبارہ رکھ دیا ہے۔ فرحان سعید ڈراموں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''لوگ اب خاندانی سیاست سے لبریز ڈرامے دیکھ دیکھ کر بور ہو چکے ہیں۔ (اب تو دو بہنوں یا دو بھائیوں کے ڈرامے ہی آ رہے ہیں۔) کرداروں کے چناؤ سے متعلق فرحان سعید کہتے ہیں کہ ''میں

کرداروں کے چناؤ میں اب بہت محتاط ہو گیا ہوں ''سنو چندا'' میں ارسل کا کردار بھی بہت سوچ سمجھ کر لیا تھا (حالانکہ اس میں سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔) یہ ایک سادہ دل نوجوان کا کردار تھا جو میرے لیے کرنا یوں بھی آسان تھا کہ میں خود بھی عام زندگی میں ارسل جیسا ہی ہوں۔ (آہم!)۔

فرحان سعید کا مزید کہنا ہے کہ ''میں گلوکاری سے اداکاری کی طرف آیا ہوں (تو.....؟) میں نے میوزک وڈیوز میں کام کر کر کے اداکاری سیکھی تھی (تھی کا مطلب؟) اور اب زیادہ سے زیادہ ڈائریکشن دے کر اداکاری کے گر سیکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔ کیمرے کے پیچھے سے ہدایات دیتے ہوئے اداکاری کو سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ آپ ٹی وی مانیٹر پر سب کی خوبیاں اور خامیاں زیادہ بہتر انداز میں جانچ سکتے ہیں (یعنی اب اداکاروں کو خوب صورت ڈائریکٹر سے ڈرنا چاہیے۔ بھئی وہ اداکاری زیادہ اچھے انداز میں جو سیکھ جاتے ہیں۔)

جدوجہد

علی ظفر نے شوبز میں اپنی جدوجہد کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ میں لاہور میں پلا بڑھا ہوں۔ وہ دن نہیں بھول سکتا، جب ایک لوکل آرٹسٹ کے طور پر ہوٹل میں پانچ سو روپے کا اسٹیج بناتا تھا۔ وہاں سے یہاں تک کا سفر کیسے طے ہوا، یہ میرے جیسے انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ یہ اللہ کے کام ہیں، یہ آپ لوگوں کا پیار ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ سب دوست اور چاہنے والے میری فیملی کی طرح ہیں۔ میری اہلیہ میری طاقت ہے۔ علی ظفر نے اپنی فلم کے بارے میں کہا کہ ''اس فلم کو پولینڈ کے شہر وارسا اور لاہور میں شوٹ کیا گیا ہے۔ میں نے اس فلم میں اپنی زندگی بھر کی پونجی لگا دی ہے۔ یہ میرا خواب تھا جو جستجو کے ساتھ شروع کیا تھا۔''

ادھر اُدھر سے

میاں صاحب کے نااہل قرار دیے جانے کے بعد مریم نواز جس ہمت اور جرأت سے اپنے والد کا ساتھ دیا ہے۔ پنجاب کی ماؤں، بیٹیوں اور سہاگنوں میں وہ ایک مثالی کردار بن چکی ہیں۔ ہم جذباتی قوم ہیں۔ عشق پر یقین رکھتے ہیں، جہاں تحقیق ہوتی ہے نہ دلیل۔ وہ آن اور شان سامنے رکھی جاتی ہے جس سے مخالفین اور شریکوں کو للکارا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مریم نواز اپنے باپ اور چچا دونوں سے زیادہ مقبول ہیں۔

(محمود شام۔ مملکت، اے مملکت)

سیاست ہو یا جنگ، لڑائی ایسا کھیل ہے جسے شروع کرنا آسان ہے لیکن خاتمہ کا ٹائم ٹیبل دینا مشکل اور اپنی پسند کا نتیجہ حاصل کرنا اس سے بھی مشکل۔ یہ غیر یقینی کا کھیل ہے۔ سارے پتے ہاتھ میں ہوں تب بھی جیتنے کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور اب تو معاملہ خطرے کے نشان کو چھو رہا ہے۔

(وقائع نگار خصوصی..... امت)

شامت اعمال

نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو حکم دیا کہ جو بھی ملے اسے قتل کردو۔ اس قتل عام میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اس کے بعد شہر کو لوٹنے کا حکم صادر ہوا۔

۲۶ مئی ۱۷۳۹ء کو وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ تیس کروڑ روپے کا مال تھا، وہ سونے، چاندی اور جواہرات کے علاوہ شاہ جہان کا بنوایا ہوا تخت طاؤس بھی اپنے ساتھ ایران لے گیا۔

اس تباہی پر کچھ لوگ مرزا مظہر جان جاناں کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں نادر شاہ کے عذاب سے نجات دے تو انہوں نے جواب دیا۔

شامت اعمال باصورت نادر گرفت

(برے اعمال کی شامت نے نادر کی صورت میں گرفت کی ہے۔)

دعا اور دوا

شہزادی جہاں آرا بیگم مغل شہنشاہ شاہجہان کی نہایت عزیز دختر تھی۔ ایک روز وہ بادشاہ کے پاس سے اپنی خواب گاہ کی طرف جارہی تھی۔ ایوان میں سرراہ ایک شمع روشن تھی۔ اتفاق سے شہزادی کے دامن کا کنارا شمع سے مس ہوگیا۔ شاہی دوشیزاؤں اور خواتین کا لباس بے حد مہین اور نازک ہوتا تھا۔ اس پر معطر روغن ملے جاتے تھے لہٰذا آناً فاناً آگ بھڑک اٹھی اور تمام لباس جل اٹھا۔ جب تک خدمت گار پانی لاتے شہزادی کی پیٹھ اور ہاتھ جل چکے تھے۔ اس واقعے سے بادشاہ بہت دل گیر ہوا۔ وہ دل بستگی سے بہ نفسِ نفیس بیٹی کی تیمارداری میں لگ گیا۔ پہلے اس نے علاج کا روحانی طریقہ آزمایا۔ شہزادی کی صحت یابی کے لیے تین دن تک روزانہ پانچ ہزار مہریں اور پانچ ہزار روپے محتاجوں میں تقسیم کیے گئے۔ سات لاکھ روپے قیدیوں کے ذمے واجب تھے، وہ معاف کردیے گئے۔ نیز حکم جاری کیا گیا کہ ایک ہزار روپے روزانہ یعنی تین لاکھ ساٹھ روپے سالانہ شہزادی جہاں آرا بیگم پر صدقہ کرکے تقسیم کیے جائیں۔

فیاضی وسخاوت وانعام التفات
یہ مملکت تو آپ کی جاگیر ہوگئی

پھر بھی اس دریادلی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر اسے مادی اور جسمانی علاج کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ کتاب ''بادشاہ نامہ'' کی دوسری جلد میں صفحہ ۶۳ تا ۳۶۹ پر مرقوم ہے۔ اس کے بعد شاہجہاں جسمانی علاج کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں کہیں نامی گرامی طبیب اور جراح تھا، اس نے علاج ومعالجے کی سعادت بھی حاصل کی۔

فاتح عالم

فاتح علم سکندر اعظم ہندوستان میں تھا۔ اس کے سردار اور سپاہی اس کی مسلسل مہم جوئی سے عاجز آچکے تھے اور وطن واپس جانا چاہتے تھے۔ سکندر اعظم نے پنجاب میں تین سال تک قیام کیا پھر بہار پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے نے سپاہیوں کے لیے وطن واپس جانے کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ لشکر میں پراسرار سرگوشیوں کا آغاز ہوگیا۔ سکندر کو اس صورت حال سے تشویش ہوئی۔ اس نے فوجیوں میں منادی کرادی۔

''فرزند آفتاب سکندر اعظم کے حکم سے اعلان کیا جاتا ہے کہ مستقبل کی فوجی مہارت کی بنا پر کئی سال تک

وطن واپسی کا امکان نہیں ہے۔ فوج کے جو سردار اور سپاہی اپنے اہل خاندان، محبوباؤں اور دوستوں کو خط لکھنا چاہیں۔ وہ آج تک شام اپنے خطوط ملفوف کر کے محکمہ ابلاغ کے افسر کو دے دیں تاکہ ایک تیز رو جہاز کے ذریعے انہیں ایتھنز روانہ کر دیا جائے۔''

شام تک افسر ابلاغ کو ایک ہزار لفافے موصول ہوئے۔ دوسرے روز صبح ان ایک ہزار مکتوب نگاروں کو میدان میں کھڑا کر دیا گیا۔ وہاں ایک ہزار پھانسی کے پھندے تیار تھے۔ ہر مکتوب نگار کو اس کا خط بلند آواز سے سنانے کے بعد پھانسی دے دی گئی۔ ان خطوط میں سکندر سے بے زاری اور اسے قتل کر دینے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔

خروشیف کا غصہ

ستمبر ۱۹۵۹ء میں جب آنجہانی خروشیف امریکہ کے دورے پر پہنچے تو انہیں تقریباً تمام قابل ذکر مقامات کی سیر کرائی گئی۔ لاس اینجلس میں انہوں نے امریکی فلمی دنیا ہالی ووڈ کے متعدد اسٹوڈیوز دیکھے۔ اس موقع پر مشہور اداکار فرینک سناترا اور شرلے میک لین نے ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیے۔

کیفے ڈی پیرس میں روسی مہمانوں کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ طعام کے دوران مسز خروشیف نے اپنے شوہر کو بتایا کہ پروگرام میں تبدیلی کر دی گئی ہے اور یہ کہ اب وہ ڈزنی لینڈ کی سیر نہ کر سکیں گے کیونکہ لاس اینجلس کی پولیس ان کے تحفظ کی ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں۔

خروشیف کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود انہوں نے والٹ ڈزنی کی تخلیق کردہ یہ عجیب و غریب دنیا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ہم اس شہر میں آئے تھے جو امریکی فنون کا گہوارا کہلاتا ہے۔ اس شہر میں آنے کے بعد مجھے، ایک وزیراعظم کو ایک پروگرام دیا گیا جس میں بتایا گیا کہ کس سے ملنا ہے کس سے نہیں ملنا، کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں جانا۔''

پھر انہوں نے میز پر مکے مارے اور مزید کہا۔

''اور ابھی ابھی بتایا گیا ہے کہ میں ڈزنی لینڈ نہیں جا سکتا۔ اس پر میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر میں کیوں نہیں جا سکتا۔ کیا وہاں تم امریکیوں نے راکٹ لگا رکھے ہیں، کیا وہاں ہیضہ پھیل گیا؟ کیا ڈزنی لینڈ پر غنڈوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ خودکشی کر لوں؟ میں تمہارا مہمانوں ہوں اور یہ صورت حال کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں اپنے عوام سے آخر کیا کہوں گا جا کر؟''

بعد میں جب خروشیف کو اس مسئلے پر دوبارہ سوچنے کا موقع ملا تو انہوں نے معافی مانگی اور کہا۔ ''اسٹوڈیو کے میزبان نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں غصہ ضبط نہ کر سکا۔

وفاقی ملک

سوئٹزرلینڈ کی طبعی اور سیاسی ساخت بھی عجیب ہے کہ سارا ملک پہاڑی ہے اور بائیس کینٹونز میں بٹا ہوا ہے۔ کسی کینٹون کی آبادی آٹھ لاکھ تک پہنچتی ہے اور کسی کی صرف تیرہ ہزار ہی ہے۔ پورے ملک میں صرف چار شہر ہی ایسے ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ سے اوپر ہے، یہ شہر زیورخ، بیزل، جنیوا اور برن ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں کئی ثقافتیں ایک جگہ اکٹھی ہیں اور بیک وقت چار زبانیں جرمن، فرنچ، اطالوی اور رومانش بولی جاتی ہیں۔ اتنے زبردست تضاد اور تنوع کے باوجود سوئٹزرلینڈ نے اتحاد اور یگانگت کی غیر معمولی مثال قائم کی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی نے اس ملک پر قبضہ کرنا چاہا اسے منہ کی کھانا پڑی۔ نپولین نے ایک مرتبہ پیرس میں سوئٹزرلینڈ کے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ کے ملک کو قدرت نے وفاقی بنایا ہے، اس ملک پر قبضہ کی کوشش کرنا دانش مندی نہیں ہو سکتی۔''

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کلیجی اور ٹماٹر کا سلاد

اشیاء:۔

کلیجی	ایک پاؤ
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	آدھا کپ
پالک (کٹی ہوئی)	ایک کپ
سلاد پتہ	ایک عدد
تیل	چار کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک (چوپ کیا ہوا)	دو چائے کے چمچے
اجوائن (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچ
گارلک بریڈ	تین عدد

ترکیب:۔

سلاد کے پتے دھو کر ایک پیالے میں رکھ لیں۔ ایک برتن میں تیل گرم کریں اور اس میں لہسن، ادرک اور اجوائن ڈال کر تین چار منٹ کے لیے پکائیں جب سنہرا ہو جائے تو اس میں کلیجی، نمک اور پسی ہوئی سیاہ مرچ ڈال کر چمچہ چلائیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو اس میں ٹماٹر اور پالک ڈال کر تھوڑی دیر بھونیں، اس کے بعد ڈھکن ڈھک کر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ سرونگ پلیٹ میں سلاد پتا بچھا کر اس پر کلیجی اور پالک کا آمیزہ رکھیں اور گارلک بریڈ کے ساتھ پیش کریں۔

پشاوری گوشت

اشیاء:۔

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
چربی	سو گرام
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہوئی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

دیگچی میں آدھا لیٹر پانی، گوشت، نمک اور چربی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو اس میں پسی ہوئی سیاہ مرچ ڈال کر بھون لیں، پیش ڈش میں نکال کر لیموں کا رس چھڑک کر کچی ہری مرچ، پیاز اور گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

گائے کے پائے

اشیاء:۔

پائے	دو عدد
دہی	دو کپ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک، لہسن	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	دو عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)	چار عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	پکانے کے لیے

ترکیب:۔

پائے سب سے پہلے اچھی طرح سے دھو لیں اور ایک بڑی دیگچی میں تقریباً آدھے سے زیادہ پانی لیں اس میں ثابت لہسن کی دو گٹھیاں ڈال کر پائے ڈال دیں اور ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ چھ گھنٹے ابلنے دیں جب پائے اچھی طرح گل جائیں نکال کر الگ رکھ دیں۔ یخنی کسی برتن میں چھان کر رکھ لیں۔ اسی دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز براؤن کر لیں اور باہر

نکال لیں، ٹھنڈی کر کے باریک پیس لیں۔ پسی ہوئی پیاز میں دہی، پسی لال مرچ، پسا دھنیا، ہلدی، پسا ہوا ادرک، لہسن، پسا ہوا گرم مسالا، لیموں، ہرا دھنیا، ہری مرچ، نمک سمیت ملا کر تیل میں ڈال دیں اور بھونیں۔ اس کے بعد پائے ڈال کر یخنی ڈال دیں، ہلکی آنچ میں توے پر دم کے لیے رکھ دیں۔ جب تیل اوپر آ جائے تو جان لیں کہ پائے تیار ہیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ نوش کریں۔

روسٹڈ تندوری ران

اشیاء:۔

بکرے کی ران	ڈیڑھ کلو
(دھو کر صاف کر کے گہرے کٹ لگا دیں)	
سویا ساس	تین کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	تین کھانے کے چمچے
پسی مرچ	ایک کھانے کا چمچ
تل	دو کھانے کے چمچے
تندوری مسالا	ایک پیکٹ
کچری پاؤڈر	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

پیالے میں پسی ہوئی لال مرچ، سویا ساس، سفید سرکہ، چانپ، تندوری مسالا، کچری پاؤڈر اور نمک ڈال کر پیسٹ بنالیں۔ ران پر تیل لگا کر مسالوں کا آمیزہ اچھی طرح لگائیں کہ وہ کٹ کے اندر تک لگ جائے، اوپر سے تل چھڑک کر تیس سے پچاس منٹ تک ریفریجریٹر میں رکھیں۔

پری ہیٹ اوون میں 150c پر ران رکھ کر پینتالیس سے پچاس منٹ تک بیک کریں۔ ایک طرف سے پک جائے تو پلٹ کر دوسری طرف سے بھی بیک کریں۔ تیار ہو جائے تو سرونگ ڈش میں نکال کر لیموں کے سلائس کے ساتھ پیش کریں۔ اوون نہ ہو تو کسی بڑے دیگچے میں ران کو رکھ کر ذرا سا تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر رکھ دیں، ایک طرف سے پک جائے تو دوسری طرف سے پکالیں۔

کشمیری چانپ

اشیاء:۔

چانپ	چھ عدد
سونٹھ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن	چار پانچ جوے
دار چینی	دو تین ٹکڑے
بیسن	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
جاوتری	ایک ٹکڑا
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
الائچی	تین عدد
دہی	ایک کپ
دودھ	دو کپ
تیل	تلنے کے لیے
لونگ، تیز پات، زیرہ	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چانپ کو گیلے کپڑے سے صاف کر کے ہلکا سا کچل کر رکھ لیں۔ باریک کپڑے میں سونٹھ، سونف، دار چینی، الائچی، لونگ، تیز پات، زیرہ، جاوتری، ڈال کر پوٹلی بنالیں۔ ایک دیگچی میں چانپ، دودھ، نمک اور مسالے کی پوٹلی ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ چانپیں گل جائیں اور دودھ خشک ہو جائے تو مسالے کی پوٹلی نکال لیں بصورت دیگر تھوڑا سا دودھ اور ڈال دیں، لہسن پیس کر چانپوں کو لگا دیں۔ دہی میں نمک، سرخ مرچ ڈال کر پھینٹیں اس کے بعد بیسن بھی ڈال دیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کریں چانپ بیسن کے آمیزے میں ڈبو کر تل لیں۔ دونوں طرف سے سرخ ہو جائے تو نکال لیں۔

تکے کٹے مسالے والے

اشیاء:۔

گائے کا گوشت	آدھا کلو
(انڈر کٹ کی بوٹیاں تکوں کے لیے)	
تیل	آدھا کپ
لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
ادرک پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
پیاز (بڑی)	ایک عدد
دہی	آدھا کپ
کچری	دو چائے کے چمچے
جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لونگ	پانچ عدد
کالی مرچ	دس عدد
بڑی الائچی	ایک عدد
کچا پپیتا	دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
کالا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
دار چینی	ایک ٹکڑا
سونف	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سوکھی بڑی سرخ مرچ	چار عدد
کباب چینی	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

تکوں کو سل یا لکڑی کے ٹکڑے پر پھیلا کر کسی بھاری چیز سے ہلکا سا کچل لیں یا کانٹے سے گود لیں۔

ثابت دھنیا، سفید زیرہ، کالا زیرہ، کباب چینی، دار چینی، سونف ملا کر بھون لیں۔ بھنے ہوئے مسالے میں لونگ، کالی مرچ، بڑی الائچی، جائفل جاوتر، ہلدی، نمک، لال مرچ اور کچری ملا کر موٹا موٹا پیس لیں۔

پسا ہوا مسالا، لہسن، ادرک پسا ہوا، کچا پپیتا اور ایک کھانے کا چمچہ تیل تکوں میں اچھی طرح لگا کر دو سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

تیل گرم کر کے پیاز تل لیں۔ اس کے بعد اس کو تیل میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی دہی بھی شامل کر دیں۔ پہلے تیز آنچ پر ابال آنے دیں پھر ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔ یہاں تک کہ گوشت گل جائے اور مسالا بھن جائے۔ کٹے ہوئے ہرے مسالے، لیموں کے ٹکڑوں اور نان کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

اگر چاہیں تو تکوں کو سیخ میں لگا کر انگیٹھی پر سینک لیں یا اوون میں بیک کر لیں۔

گولا کباب

اشیاء:۔

قیمہ	آدھا کلو
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک چائے کا چمچہ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کچری	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

قیمہ میں پسی لال مرچ، پسی کالی مرچ، کچری پاؤڈر، پسا ہوا ادرک، لہسن، گرم مسالا اور نمک ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے گول کباب بنا کر سیخوں پر لگاتے جائیں۔

انگلیوں سے آمیزے کو اچھی طرح دبا دیں۔ کوئلے پر سینک لیں۔

کباب تیار ہو جائیں تو سلاد اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

خوبصورتی کے لیے

آنکھوں کی حفاظت

آنکھیں ہمارے جسم کا اہم ترین عضو ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحفہ ہیں اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں ان کی خاص طور پر حفاظت بھی کرنی ہوتی ہے کیونکہ اگر ہم حفاظت سے کام نہ لیں تو کالے موتیے جیسی خطرناک بیماری، اس کے علاوہ روشنی کم ہونا اور خشک آنکھیں بھی اہم مسائل ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں فضائی آلودگی بھی آنکھوں کی بیماریوں میں اضافے کا اہم سبب ہے۔ آیئے آج ہم آپ آنکھوں کی حفاظت سے متعلق کچھ معلومات دیں۔

متوازن غذا: یوں تو صحت مند جسم کے لیے متوازن غذا ایک لازمی عنصر ہے۔ اسی طرح آنکھوں کے لیے بھی ہمیں ایسی غذا کا استعمال کرنا چاہیے جس میں وٹامن اے، وٹامن بی ٹو اور وٹامن سی وافر مقدار میں ہوں۔ ان میں سرفہرست گاجر اور ہرے پتوں والی سبزیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچی سونف کا استعمال بھی فائدہ مند ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو شروع ہی سے ایسی غذاؤں کا عادی بنانا چاہیے۔ مچھلی، انڈے کی زردی، پھلوں میں خوبانی بھی شامل کریں، یہ اشیاء آنکھوں کی چمک اور بینائی میں اضافہ کرتی ہیں۔

فیملی ہسٹری: اگر آپ کے خاندان میں کسی کو ہائی بلڈ پریشر یا ذیابیطس جیسے امراض ہیں تو اپنا خاص خیال رکھیں۔ خاص طور پر ذیابیطس جیسے مرض میں ذرا سی لاپروائی آنکھوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

سن گلاسز کا استعمال: آنکھوں کی حفاظت کے لیے سن گلاسز بہترین ہتھیار ہیں۔ یہ نہ صرف آپ کی آنکھوں کو سورج کی مضر صحت شعاعوں سے بچاتے ہیں بلکہ گرد و غبار سے بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ سن گلاسز خریدتے وقت اس کی کوالٹی کا خاص خیال رکھیں۔ سن گلاسز نہ زیادہ ڈارک کلر کے لیں اور نہ ہی زیادہ ہلکے اور اگر UV 400 والے گلاسز مل جائیں تو انہیں خریدیں۔

کمپیوٹر کا استعمال: جب بھی کمپیوٹر استعمال کریں، اس بات کو مدنظر رکھیں کہ بیس منٹ سے زیادہ نظریں نہ جمائیں۔ ہر بیس منٹ کے بعد نظروں کو ادھر اُدھر گھمالیں اور ہر دو گھنٹے کے بعد دس پندرہ منٹ کا وقفہ لیں اور کوشش کریں کہ اسکرین کی اوپری سطح آپ کی نظروں کی سطح کے لیول پر ہو۔ اس کے لیے مناسب کرسی استعمال کریں۔

آنکھوں کی ورزش کو اپنا معمول بنالیں اور اس کے لیے درج ذیل ورزشیں کریں۔

۱۔ اپنے سر کو حرکت دیے بغیر تھوڑی دیر پہلے چھت کی جانب دیکھیں اور پھر فرش کی۔ یہ عمل دس مرتبہ دہرائیں۔

۲۔ آنکھ کی سیدھ میں دیکھیں اور پھر آہستہ آہستہ دائیں اور بائیں جانب۔ یہ عمل تین چار دفعہ دہرائیں۔

۳۔ آنکھوں کی پتلی کو دائروں کی شکل میں گھمائیں، پہلے کلاک وائز اور پھر اینٹی کلاک وائز۔ پانچ، پانچ دفعہ اس کو دہرائیں۔

ہمیشہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے وقت مناسب روشنی کا استعمال کریں۔ روشنی ہلکی نہ ہو اور نہ دائیں بائیں یا پیچھے سے آئے۔

☆